جون 2016
شعاع
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خوبصورت اشعار

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

جون 2016
جلد 30 شمارہ 10
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91-بی، ایل بلاک، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ پورا ماحول ہی بدل جاتا ہے۔ ہر جانب ایک پاکیزگی، روحانیت کا احساس چھا جاتا ہے۔

یہ مہینہ صبر کا، غم گساری کا اور پروردگار کو راضی کرنے کا مہینہ ہے۔ یہ ختم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ تعلیمات پر عمل کرنے کا تربیتی پروگرام ہے۔ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے اور گناہوں کی بخشش کا موقع ہے لیکن ہم اکثر اپنی لاپروائی کے باعث رمضان المبارک کی برکتوں سے پوری طرح فیض یاب نہیں ہو پاتے ہیں۔

اس مہینے میں ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق اپنا دسترخوان وسیع کرتا ہے۔ ایسے میں خواتین کی مصروفیت بڑھ جاتی ہے۔ سہ پہر سے افطاری کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ افطاری اور سحری کا اہتمام دیکھ کر لگتا ہے کہ روزہ کھانے پینے اور سونے کا عمل ہے۔ جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ کھانے پینے میں سادگی کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور فرائض کی ادائی کے ساتھ ساتھ تلاوت اور نفلی عبادات پر بھی زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔ اپنے ماتحتوں کا کام ہلکا کیا جائے خصوصاً اپنے گھر میں کام کرنے والی محنت کش خواتین کے ساتھ اس ماہ میں رعایت کریں۔ یہ بھی نیکی ہے۔ غیبت، دل آزاری اور فضول وقت ضائع کرنے سے بچیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مہینے کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عید نمبر،

جولائی کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ اس میں عید کی مناسبت سے افسانے، ناولٹ، ناول شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ مہندی کے ڈیزائن، عید کے پکوان، عید کے اشعار اور قارئین سے خصوصی عید سروے بھی شامل ہوگا۔

مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ عید نمبر میں شامل ہو سکیں۔

عید سروے،

ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہماری ذہین اور باصلاحیت قارئین کی صلاحیتیں سامنے آئیں اور زیادہ سے زیادہ قارئین کو موقع دیا جائے۔ اس لیے ہم خاص نمبر میں قارئین سے سروے ضرور شامل کرتے ہیں۔

سروے کے لیے سوال یہ ہیں۔

1۔ آپ عید کیسے مناتی ہیں؟

2۔ عید پر کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

3۔ کیا آپ کے خاندان میں عید کے موقع پر کوئی روایتی ڈش بنتی ہے؟ اس کی ترکیب ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 15 جون تک موصول ہو جائیں۔

بیپال ساز،

ایمل نوعمر تخلیق کار ہیں۔ مختصر مدت میں ہی انہوں نے اپنی علیحدہ شناخت بنالی ہے۔ ایمل کے ہاں نظر بہت تیز اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ ان کی نظر زندگی کی ان الجھی ہوئی حقیقتوں کو بھی دیکھ لیتی ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔

اس شمارے میں ان کا طویل ناول "بیپال ساز" شامل ہے۔ اس ناول میں انہوں نے زندگی کے صفحوں پر بکھرے احساس اور جذبوں کو اجاگر کیا ہے۔ انھیں دیکھا میں پہلے اللہ تعالیٰ سے تخلیق سمجھنے جو کسی میں آ سکتے ہیں، نہ بصارت کی حدود میں۔ ایک تخلیق کار کے دل کی آنکھ ان شاہکاروں کو ان رنگوں میں دیکھتی اور محسوس کرتی ہے۔ یہ آپ بیپال ساز کے کرداروں میں دیکھیں گے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ یہ ناول پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔

لاکھ پردوں میں نہاں ہے تیری ذات
اپنی قدرت سے عیاں ہے تیری ذات

قہر بھی تیرا مثالی ہے مگر
سب سے بڑھ کر مہرباں ہے تیری ذات

ہے ترے ہاتھوں میں سب کی باگ ڈور
چارۂ بے چارگاں ہے تیری ذات

تُو ہے معبودِ حقیقی بالیقیں
مالکِ کون و مکاں ہے تیری ذات

ہے تری فرماں روائی چار سُو
شہنشاہ دو جہاں ہے تیری ذات

تُو اگر چاہے تو سب کو بخش دے
آسرائے عاصیاں ہے تیری ذات

ہے جو مخلوق پہ سایہ فگن
رحمتوں کا سائباں ہے تیری ذات

ریاض حسین قمر

قدرت کا شاہکار مدینہ
شہروں کا سردار مدینہ

جس کی خوشبو جنت جیسی
ایسا ہے گلزار مدینہ

ترسی آنکھوں کو دکھلا دو
کیسا ہے سرکارؐ مدینہ

دل کی راحت آنکھ کی ٹھنڈک
رحمت کی منجدھار مدینہ

ہر جانب رحمت کی بارش
منبعِ انوارِ مدینہ

ساقیِ کوثرؐ کا مسکن ہے
سب لوگوں کا پیار مدینہ

جو لاریب حبیب اللہ ہیں
ان کا ہے دربار مدینہ

ریاض حسین قمر

ادارہ

زیادہ سے زیادہ نیکیاں

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے۔ اور رمضان میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل علیہ السلام آکر ملتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ سخی ہو جاتے تھے اور جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا دور کرتے تھے۔ پس یقیناً" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے بھلائی (مال و دولت وغیرہ) میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

اس میں رمضان المبارک میں دو کاموں کے کثرت اور اہتمام سے کرنے کا بیان ہے۔ ایک فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ تاکہ لوگ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ عبادت کے لیے وقت نکال سکیں اور اپنے دنیاوی مشغلوں میں کمی کرلیں۔

دوسرے قرآن کریم کا دور اور مدارستہ یعنی ایک دوسرے کو قرآن کی منزل سنانا جیسے قرآن کریم کے دو حافظ ایک دوسرے کو اپنا آموختہ سناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم اور رمضان المبارک کا باہم نہایت گہرا تعلق ہے۔

آخری عشرہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب (رمضان کا آخری) عشرہ شروع ہو جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب بیداری فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے اور (عبادت کے لیے) کمر کس لیتے۔ (بخاری و مسلم)

ویسے تو پورا رمضان ہی نیکیوں کا موسم بہار اور عبادت وطاعت کا خصوصی مہینہ ہے لیکن اس کا آخری عشرہ تو اس موسم عبادت کا نقطہ عروج ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ان دس دنوں اور راتوں میں تو بالخصوص خوب محنت اور جدوجہد کر کے اپنے رب کو راضی کرنے کی اور اسی طرح لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اسی لیے ان دس دنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کرنے کا بھی خصوصی اہتمام فرماتے تھے اس پر بھی عمل کرنا چاہیے۔

روزہ نہ رکھے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص رمضان سے ایک روز یا دو روز پہلے روزہ نہ رکھے۔ ہاں مگر وہ شخص جو پہلے ہی سے ان دنوں کا روزہ رکھتا ہو تو وہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔" (بخاری و مسلم)

1۔ پہلے سے ہی ان دنوں کا روزہ رکھتا ہو کا مطلب ہے کہ مثلاً "سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھنا کسی کا معمول ہو یا ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن چھوڑنا اس کا معمول ہو تو اس معمول کی صورت میں وہ ایک دو روز قبل بھی روزہ رکھ سکتا ہے کیونکہ اس کا روزہ استقبال رمضان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے مستقل معمول کا ایک حصہ ہے۔

2۔ بعض نے ایک دو روز قبل سے مراد شعبان کے نصف ثانی کے پہلے ایک دو روز مراد لیے ہیں کیونکہ روایات میں نصف شعبان کے بعد بھی روزہ رکھنے کی ممانعت وارد ہے۔ اس اعتبار سے شعبان کی 16، 17 تاریخ کو بھی روزہ رکھنا صحیح نہیں' الا یہ کہ کسی کے معمول میں آجائے۔

رمضان سے پہلے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رمضان سے پہلے روزہ مت رکھو۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھنا چھوڑو۔ اگر چاند سے ورے بادل حائل ہو جائے (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس دن پورے کرو۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

1۔ رمضان سے قبل' سے مراد شعبان کا دوسرا نصف ہے' یعنی 15 شعبان کے بعد نفلی روزے نہیں رکھنے چاہئیں۔ تاکہ رمضان کے فرضی روزوں کے لیے اس کی قوت و توانائی برقرار رہے۔ جس کا آغاز چند دن بعد ہی ہونے والا ہے۔

2۔ اگر چاند مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے تو شعبان کے 30 دن پورے کر کے روزے شروع کیے جائیں۔ اسی طرح شوال کا چاند نظر نہ آئے تو 30 روزے پورے کر کے عید الفطر منائی جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب شعبان کا آدھا مہینہ باقی رہ جائے تو تم روزے نہ رکھو۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

شک کا روزہ

حضرت ابو یقظان عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"جس نے شک والے دن روزہ رکھا' اس نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔" (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ: مشکوک (شک والے) دن سے مراد 30 شعبان کا دن ہے۔ یعنی بادلوں کی وجہ سے 29 ویں دن کو چاند نظر نہیں آیا تو کوئی شخص یہ سمجھ کر روزہ رکھ لے کہ پتا نہیں یہ شعبان کا تیسواں دن ہے یا رمضان کا پہلا دن۔ نہیں یہ یکم رمضان ہی نہ ہو۔ اس طرح شک والے دن میں روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ گنتی پوری کی جائے۔

چاند دیکھتے وقت کی دعا

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب چاند دیکھتے تو فرماتے۔

"اے اللہ! اس کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ نکال۔ اے چاند! میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ اے اللہ! یہ چاند ہدایت اور بھلائی کا چاند ہو۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔)

فائدہ: چاند دیکھ کر مسنون دعائیں پڑھنی چاہئیں جن میں سے ایک یہ دعا بھی ہے۔ جو اوپر مذکور ہوئی۔

سحری کی تاکید

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سحری کھایا کرو' اس لیے کہ سحری کھانے میں یقیناً برکت ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھانا مسنون ہے' چاہے تھوڑا ہی کھالے کیونکہ اس کھانے میں برکت ہے' اس وقت کھانے پینے سے سارا دن اس کی قوت و توانائی برقرار رہے گی۔ اس کے برعکس جو شخص رات ہی کو کھا پی کر سو جائے تاکہ سحری کے لیے اٹھنا نہ پڑے یا سحری بہت جلدی کھالے اس

کے آخری وقت میں نہ کھائے تو اسے جلد ہی بھوک پیاس ستانے لگ جائے گی کیونکہ ان دونوں صورتوں میں بھوکا پیاسا رہنے کا وقفہ بڑھ جائے گا' جس سے یقیناً" روزے دار کو تکلیف ہوگی۔ سبحان اللہ! اسلام کی تعلیمات میں کس طرح انسان کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

سحری کا وقت

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی' پھر ہم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سے پوچھا گیا سحری کے خاتمے اور نماز کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ انہوں نے فرمایا پچاس آیات (پڑھنے) کی مقدار (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ سحری بالکل آخری وقت میں کھائی جائے۔ یہی مسنون طریقہ ہے' تاہم صبح صادق سے پہلے پہلے کھالی جائے۔ اور یہ وقفہ بقدر پچاس آیات اندازاً" دس منٹ ہو۔

دو مؤذن

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مؤذن تھے۔ حضرت بلال اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بلال رات کو اذان دیتا ہے' لہٰذا جب تک ابن ام مکتوم اذان نہ دے اس وقت تک تم کھاؤ پیو۔"

حضرت ابن عمر نے (مزید) فرمایا۔ ان دونوں کی اذانوں کے درمیان اتنا ہی وقفہ ہوتا تھا کہ یہ (بلال) اذان دے کر اترتے اور یہ (ابن ام مکتوم) اذان دینے کے لیے چڑھتے۔ (بخاری و مسلم)

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہد رسالت میں صبح کے وقت دو مؤذن ہوتے تھے اور دو اذانیں ہوتی تھیں۔ پہلی اذان کا مقصد یہ تھا کہ روزے دار اگر سحری کھا رہے ہوں تو وہ متنبہ ہو جائیں کہ سحری کا وقت ختم ہو چلا ہے اور اب نماز کی تیاری کرنی چاہیے اور اس کے فوراً" بعد دوسری اذان دوسرے مؤذن کے ذریعے سے ہوتی جو اس بات کا اعلان تھا کہ کھانے پینے کی گنجائش ختم ہوگئی ہے اب نماز پڑھو۔

2۔ یہ معمول صرف رمضان ہی میں نہیں تھا۔ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مستقل معمول تھا۔ یہ دونوں اذانیں اب بھی مسجد نبوی اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں جاری ہیں' ہمیں بھی اس سنت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

3۔ دونوں اذانوں کے درمیان وقفے کے بارے میں علما نے کہا ہے کہ حضرت بلال اذان دینے کے بعد دعا وغیرہ میں مصروف ہو جاتے اور طلوع فجر کا انتظار کرتے۔ جب طلوع کا وقت قریب ہو جاتا تو نیچے اترتے اور ابن ام مکتوم کو اطلاع کرتے' وہ وضو وغیرہ کرتے اور اذان دینے کے لیے چڑھ جاتے اور طلوع فجر کے آغاز میں اذان دیتے۔ (ابن علان)

اہل کتاب

حضرت عمر بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔" (مسلم)

گویا سحری کھانا امت مسلمہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے' جس سے اللہ نے اس امت کو نوازا ہے۔

افطار میں جلدی کی فضیلت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگ برابر بھلائی میں رہیں گے جب تک وہ روزہ کھولنے میں جلدی کریں گے۔" (بخاری و مسلم)

بھلائی سے مراد دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ روزہ جلدی کھولنے کا مطلب' غروب شمس سے پہلے روزہ کھولنا نہیں بلکہ غروب شمس کے بعد بلا تاخیر روزہ کھولنا ہے۔

محض اس بنا پر تاخیر نہ کی جائے کہ روزے میں جو مشقت ہے اس کو مزید بڑھایا جائے۔ ان سختیوں میں برکت نہیں ہے بلکہ اصل برکت اتباع سنت میں ہے۔ اسی لیے جلدی افطار کرنے میں بھی اس اتباع سنت کی وجہ سے دین و دنیا کی بھلائی مسلمانوں کے حصے میں آئے گی۔

اللہ عزوجل نے فرمایا ہے "مجھے میرے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جو ان میں سے افطار میں جلدی کرنے والے ہیں۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے)

سنت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے قبل چند تازہ کھجوروں سے روزہ کھولتے تھے۔ اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو چند چھواروں سے (روزہ افطار کرتے۔) اور اگر وہ بھی نہ ہوتے تو پانی کے چند گھونٹ بھر لیتے۔ (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

روزہ کھولتے وقت اس ترتیب کو سامنے رکھا جائے تو بہتر ہے تاکہ سنت کا ثواب بھی مل جائے اور طبی طور پر بھی یہی مفید ہے کیونکہ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے گرم اور کمزور ہوتا ہے' اس لیے مرغن چیزیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں (ارواء الغلیل' حدیث 922)

زبان اور اعضا کی حفاظت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم میں سے کسی کا روزے کا دن ہو تو نہ دل لگی کی باتیں کرے اور نہ شور و غل کرے۔ چنانچہ اگر کوئی اس کو گالی گلوچ کرے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ میں تو روزے دار ہوں۔" (بخاری و مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ روزے دار کے لیے جس طرح کھانا پینا اور بیوی سے قربت منع ہے' اسی طرح روزے کی حالت میں اپنی زبان اور اپنے دیگر اعضا کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی اشتعال دلائے بھی تو مشتعل نہ ہو بلکہ یہ یاد رکھے کہ میں روزے دار ہوں' مجھے ان چیزوں سے اجتناب کرنا ہے اور جہاں تک ہو سکے اپنی زبان کو اللہ کے ذکر اور تلاوت قرآن میں مشغول رکھے۔

جھوٹ بولنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے۔" (بخاری)

اس میں بھی اسی امر کی تاکید ہے کہ روزے کی حالت میں روزے کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے ایک طرف اللہ کی رضا کے لیے روزہ رکھنے کا بھی اہتمام ہو اور دوسری طرف اللہ کے خوف سے یہ بے نیازی ہو کہ نہ جھوٹ سے اجتناب ہو اور نہ دھوکا و فریب دہی اور دیگر ناجائز کاموں سے بچنے کا جذبہ۔ حدیث میں

ایسے شخص کے لیے جن الفاظ میں وعید بیان ہوئی ہے اس سے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کا روزہ بے کار جائے اور وہ ثواب سے محروم رہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے لوگ روزے کی حالت میں کھانا پینا شروع کر دیں بلکہ اصل مقصود اس تنبیہہ سے یہ ہے کہ ہر قسم کی معصیت سے اپنے آپ کو بچائیں تاکہ ثواب کے مستحق بھی بن سکیں۔

بھول چوک

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم میں سے کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے' کیونکہ اللہ نے اسے کھلایا اور پلایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

اس میں بھی اسلام کی ایک شفقت و سہولت کا

بیان ہے کہ روزے کی حالت میں اگر بھول کر کوئی ایسا کام کرلیا ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' جیسے کھانا' پینا وغیرہ تو نسیان کی وجہ سے اس کا روزہ برقرار رہے گا' بشرطیکہ یاد آتے ہی فوراً" اس کام کو چھوڑ دے۔ ایسے روزے کی قضا ہے نہ کفارہ۔

وضو

حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

" اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے وضو کی بابت بتلایئے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کامل طریقے سے وضو کرو' انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک میں پانی ڈالنے کا خوب اہتمام کرو۔ (جیسے زور سے خوشبو سونگھی جاتی ہے) مگر یہ کہ تم روزے دار ہو۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

عام حالات میں کامل وضو کے لیے یہ بھی ضروری اور فرض ہے کہ ناک میں پانی اچھی طرح ڈالا جائے' اسی طرح خوب کلی کی جائے۔ لیکن روزے کی حالت میں احتیاط ضروری ہے تاکہ پانی ناک یا منہ کے ذریعے اندر نہ جائے۔ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

فوائد و مسائل

1۔ اعتکاف والے کو بلا ضرورت مسجد سے نکلنا منع ہے۔

2۔ قضائے حاجت کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے۔

3۔ اگر مسجد کے ساتھ بیت الخلا کا انتظام نہ ہو تو اعتکاف والا اس غرض کے لیے گھر جاسکتا ہے۔

4۔ مریض کی بیمار پرسی کے لیے اعتکاف سے نکلنا درست نہیں' لیکن اگر کسی جائز سبب سے باہر نکلا ہو اور راستے میں مریض مل جائے تو اس سے حال پوچھنا جائز ہے' تاہم اس کے پاس بات چیت کے لیے رک جانا درست نہیں۔

عیادت اور جنازہ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مالک سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اعتکاف والا جنازے کے ساتھ جاسکتا ہے اور بیمار کی بیمار پرسی کرسکتا ہے۔"

معتکف کا بیوی سے ملنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت صفیہ بنت حیی سے روایت ہے۔

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مسجد میں تشریف لے گئیں' جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں مسجد میں معتکف تھے۔ وہ عشا کے وقت کچھ دیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرتی رہیں' پھر اٹھ کر واپس چل دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں (مسجد کے دروازے تک) چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب مسجد کے اس دروازے تک پہنچیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے کے قریب تھا تو پاس سے دو انصاری گزرے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور چل دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا۔

"ٹھہرو۔ یہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔"

انہوں نے کہا۔

"سبحان اللہ! اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔" (ہم آپ پر کس طرح شک کرسکتے ہیں؟)

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ش۔م..... چکوال

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" اک ایسا سلسلہ جس نے بہت سی تلخ و شیریں یادوں کی کھڑکیوں کو ذہن کے دریچوں میں جگمگانے پر مجبور کر دیا۔ یقین مانیے یہ ہرگز بھی اپنی مظلومیت کو بیان کرنے کا اور دکھ بھرے قصوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا پلیٹ فارم نہیں ہے۔ نہ ہی یہ خود ساختہ دکھ ہیں، جو ہر کسی سے بیان کر کے انسان کو دلی خوشی ملتی ہے۔ یہ سیکھنے اور عبرت حاصل کرنے کی درسگاہ ہے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس خوب صورت اور پُراثر انگیز سلسلے کو شروع کرنے کی تعریف کرتی ہوں "شعاع" کا اک اور ایسا قدم جس نے تعریف پائی جس نے سیکھنے اور سکھانے کا اک اور موقع دیا۔ ایسی اچھوتی سوچ کے خوب صورت ذہن کو سلام!

س : شادی کب ہوئی؟

ج : یہ خوب صورت حادثہ جس نے اپنوں پرایوں کے نقاب شدہ چہروں کو واضح کر دیا، میکے کی چھاؤں سے سسرال کی چلچلاتی دھوپ میں کندن بننے کے لیے تیار کرنے والا یہ سانحہ 23 اپریل 2006ء کو ہوا۔

س : شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج : شادی سے پہلے فائن آرٹس کے لیے جہاں سے جو کچھ ملے اٹھا لینا۔ ان سے ڈرائی ارینجمنٹ کے لیے خوب صورت اشیاء بنانا۔ کزن جو اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھیں، ان کو چارٹ اور ہینڈی کرافٹ چیزیں بنا بنا کر تعریفیں وصول کرنا تھیں۔ کالج میں چاک سے لڑکیوں کے دوپٹوں پر فول لکھنا۔ گرہیں لگانا۔ نت نئی شرارتیں کرنا تھیں! بلکہ ایک دن ہیلتھ اینڈ فزیکل ایجوکیشن کی ٹیچر ساجدہ نے مجھ سے نیزہ پھینکنے کو کہا چونکہ ساری کلاس پھینک چکی تھی تو مجھ سے نہیں پھینکا جا رہا تھا۔

میرا پاؤں بار بار منتخب لائن سے آگے چلے جاتا تو میں نے درخواست کی کہ لائن تھوڑی آگے بڑھائی جائے کہ قدم میرا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہیں۔ عرضی پر غور و فکر کے بعد منظوری دے دی گئی مگر یہ کیا حیرت۔ افسوس، صدمہ! میں نیزے کو ہاتھ میں لے کر بھاگتی ہوئی آئی اور میرا پاؤں پھر لائن سے آگے! میں شرمندگی سے دہری ہوتی جا رہی تھی کلاس اور میڈم ہنس ہنس کر دہری۔ لیکن کچھ دیر بعد میرے قہقہے ان سے بھی بلند تر! تب میڈم ساجدہ نے کہا۔

"تم نے ایسے ہی کام کیے تو تمہاری ساس تمہیں ایک ہفتہ بھی نہیں رکھے گی!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میڈم انہوں نے مجھ سے نیزے تھوڑی پھکوانے ہیں اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔"

ہائے افسوس تقدیر ہنس رہی تھی کہ۔

آگے تو چل عشق کے امتحان ابھی اور بھی ہیں۔

س : اس فیصلے میں آپ کی مرضی تھی یا والدین کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج : اس فیصلے پر میری مرضی اتنی ہی تھی جتنی کسی مشرقی لڑکی کی۔ ماں باپ نے پسند کیا۔ اور مجھ سے پہلے امی نے پوچھا کہ تمہارے ماموں رشتے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں میں نے کہا "امی اس عمر میں اور ہمارے گھر کیوں؟"

امی نے کہا "بے شرم کبھی کسی بات کو سنجیدگی سے بھی لے لیا کرو! وہ اپنے بیٹے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔"

جب یہی بات پھوپھو نے پوچھی تو میں نے کہا۔ "وہ آرمی میں ہیں کتنی سی تنخواہ ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "زندگی میں کبھی پیسہ عزیز رکھنا پڑے تو خود بھی کما لینا۔ پھر پتا چلے گا کہ تنقید آسان ہے

یا نہیں۔"

بس پھر کیا میں نے کہا "ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔"

س : ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج : فقط اٹھارہ سال میں شادی ہو گئی فرسٹ ایئر میں رشتہ طے ہوا تھرڈ ایئر میں شادی ہو گئی۔ کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کو میں چاچو بولتی تھی۔ کیوں کہ کہیں کسی رشتے سے وہ چاچو بن ہی جاتے تھے۔ میری پھوپھو کے پاس ہی پڑھا۔ دراصل میری پھوپھو میرے ابو کے ساتھ ہی رہائش پذیر ہیں۔ ان کے شوہر کی وفات نائجیریا میں اس وقت ہوئی جب وہ اپنی فیملی کو لینے پاکستان آ رہے تھے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو کہ نو سال میں یرقان سے وفات پا گیا تب دادا جان نے ساڑھے تین کنال کی حویلی میں دونوں سائیڈ بھائیوں کے لیے چھوڑی اور درمیان میں پھوپھو کا مکان بنایا۔

میں قارئین سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہر سسرال بری نہیں ہوتی شاید یہ حالات ہوتے ہیں جو انہیں برا بنا دیتے ہیں۔ میرے ابو کی امی کے ساتھ دوسری شادی ہے۔ ابو اور امی خالہ زاد بھی ہیں۔

میرے ابو کی پہلی بیوی بھی ان کی خالہ زاد تھیں۔ انہوں نے ایک ماہ بعد خلع لے لی کہ پہلے اپنی بہن کو بولو یہ نہیں اور رہے۔ ایسے میں جب شوہر اور اکلوتے بیٹے کی وفات سے ایک عورت ٹوٹ چکی ہو اور دوسری عورت جو کہ خالہ زاد بھی ہو وہ ہی سنگدلی کے پہاڑ توڑے یقین جانیں ہماری امی کی وہ قدر و منزلت ہے کہ حساب نہیں ہمارے دادا جان کہتے تھے پہلا کھوٹا سکہ نکلا اور ہماری جھولی میں ان کے والدین نے ہیرا ڈالا ہے۔ پھوپھو نے رشتہ طے کیا" کہتی تھیں شریف ہے۔ میرے پاس پڑھا ہے۔ مجھے اس پر یقین ہے اور شکر خدا کا انہوں نے یقین ٹوٹنے نہ دیا۔

س : منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ۔

ج : منگنی دو سال رہی بات بھی ہوئی ملاقات بھی وہ جب بھی چھٹی پر آتے ضرور ملنے آتے۔ دو تین دن رہتے بھی تھے۔ خوب کھیلی لڈو وغیرہ۔ کرکٹ وغیرہ۔ دراصل وہ شروع سے رہے ہی ہمارے گھر تھے۔ یہیں پھوپھو کے پاس پڑھا لکھا۔ فوج میں گئے ہاں چاچو کہنا بہت مشکل سے چھوٹا۔

س : شادی کے لیے آپ کو تعلیم چھوڑنا پڑی یا قربانی دینی پڑی؟

ج : جی نہیں میں تھرڈ ایئر میں تھی قربانی دینی پڑ ہی جاتی اگر میاں ساتھ نہ دیتے۔ میاں جی نے بہت ساتھ دیا۔ شکریہ م۔ سسرال والوں نے ایک ہفتہ بھی نہ رہنے دیا۔ انہوں نے جب حالات دیکھے مجھے امی کے گھر چھوڑا اور خود ملتان جا کر کوارٹر کی درخواست دے دی۔ م کی امی نے کہا کوارٹر اتنی جلدی نہیں ملتے۔ خیر اللہ نے ساتھ دیا۔ ہم ملتان چلے گئے میں بی اے کا امتحان دینے ملتان سے آئی میں م کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جن کی وجہ سے میں آج ایم ایس سی بی ایڈ ایم ایڈ کر چکی ہوں۔

س : شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین میں کوئی بدمزگی ہوئی؟

ج : جی نہیں کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔ دراصل ہمارے ہاں شادی کی رسموں پر لین دین مقرر ہے۔ اس سے نہ زیادہ لیا جاتا ہے نہ کم اگر کوئی خوشی سے پچاس ہزار بھی دے تو وہی مخصوص رقم رکھ لی جاتی ہے اور باقی واپس۔

س : شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج : شادی کے دن ہی کہہ دیا ساتھ بیٹھ کر کہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ رخصتی کے وقت گاؤں جاتے وقت میں نے چوال بیکری کے پاس گاڑی رکوائی۔ کہنے لگے "کیا ہوا۔" میں نے کہا پانی پینا ہے۔" وہ اترے پانی لے آئے۔

میں نے کہا "یہ نہیں فانٹا پینی ہے۔" پوچھا اور کچھ۔ "میں نے کہا ہاں چاکلیٹ کھانی ہے" وہ خاموشی سے لے کر آ گئے۔ میں منہ چھپا کر کھانے لگی کیونکہ چچی اور خالہ کینہ توز نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ خیر گھر پہنچ گئے (ڈولی میں بٹھایا) کیسے پہنچے وہ ایک الگ ہی قصہ ہے۔ بہت دلچسپ اور منفرد پھر بھی سہی۔

س : شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج : بہت سی "آٹھ سال رویوں کو پہچاننے میں لگے۔ دل دکھ کے سمندر میں ٹوٹ کر ابھرتا" "اور پھر ڈوب جاتا

کہ بھائی دوبارہ ابھرنے کا کوئی فائدہ۔ اپنوں کے بہت سے چہرے دیکھے۔ میں شادی کا ایک ہفتہ رہی پھر کبھی میاں آتے تو ان کے ساتھ آتی سسر نے منع کر دیا کہ بیٹا ہمارے گھر آئے گا بہو نہیں۔ بس جی پھر میں بھی آٹھ سال سسرال کی دہلیز پار نہ کر سکی۔ دل ٹوٹ گیا اور پھر اسے جڑنے میں آٹھ سال لگے مگر جناب دل جڑ تو گیا ہے۔ مگر دراڑیں اب بھی باقی ہیں کوئی سی پلاسٹ کام نہ آیا۔ کوئی گلو کوئی ایلفی کام نہ آئے ہاں اب غصہ بہت آتا ہے۔ کنٹرول نہیں ہوتا۔

س : میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟

ج : پتا نہیں سسرال میں پانچ یا چھ دن رہی۔ ولیمہ کے اگلے دن ہم کے آرڈر آگئے تو وہ نوکری پر بھاگے۔ میں امی کے گھر کیونکہ کالج جانا شروع کرنا تھا۔ ہاں امی کے گھر یہ روٹین ہے کہ ابو ہم سے پوچھتے "بچو بتاؤ کیا پکائیں؟" جو ہمارے مرضی ہوتی پکواتے امی کے ہاتھ میں ذائقہ بھی خوب ہاں البتہ مشن جا کر ہاتھ ہلانے ہی پڑے مجھے کھانا پکانا بالکل نہیں آتا تھا۔

جب پہلے دن روٹی پکاتی تو پتا نہیں کیا پکی خیر چھپالی کہ یہ میں کھالوں گی۔ اگلی اس سے بھی خوب صورت اور اس سے اگلی ماشاءاللہ بے اختیار دکھ سے ہاتھ ہی کاٹ لینے کو جی چاہا۔ آہ دل کرلاتا۔
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

س : میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟

ج : امی کا گھر الگ تھلگ تھا سکون کی ندیاں ہر طرف بہتی تھیں اور ان لہروں پر چلبلی مچھلیوں کی مانند پھڑکتی رہتی۔ مگر سسرال میں تین چار گھر ایک ہی حویلی میں مقیدیات کا جنگل بنا۔ رائی کا پہاڑ ہر کوئی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھتا بہت فرق تھا۔ ابو کا گھر کھلا ڈھلا سسرال تنگ گھر ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر دل تنگ ہو گئے تھے۔ وٹہ سٹہ کہہ کر بات بدمزگی کے پیراہن میں اوڑھائی گئی حالانکہ یہ ممکن نہ تھا۔ میرے میاں مجھ سے پندرہ برس بڑے ہیں ان کا سب سے چھوٹا بھائی مجھ

سے تین برس بڑا میرا بھائی مجھ سے بھی دو برس چھوٹا ہے۔ پیاری قارئین فرق ماحول میں نہیں رویوں میں ہوتا ہے۔ چھوٹے دیور کی شادی کی بڑے بھائی کو آنے کی اجازت نہ دی۔ اس کے ساتھ برے رویے کی انتہا کی۔ وہ ایک سال بھی برداشت نہ کر پایا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تین ماہ کی ننھی پری کو دنیا میں رونے کرلانے کے لیے چھوڑ گیا۔ یہ دیور ہم سے چار ماہ پہلے راضی ہوا بھائی سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی بچوں کو ددھیال کا واحد رشتہ دکھایا اور یہ چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ آج ان رویوں کو روتی ہیں۔ اپنے برے سلوک پر دھاڑیں مارتی ہیں مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئی کھیت۔

س : سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی، کن پر تعریف؟

ج : باہ تنقید ہی تنقید تھی اٹھنے پر بیٹھنے پر سونے پر۔ آٹھ سال میں روئی ہوں اور ایسا دھاڑیں مار کر روتی۔ جب دل پر باندھے بند ٹوٹتے تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا اور ایسے میں وہ واحد ہستی جو ماں باپ کے بعد عزیز ہے۔ وہ میاں جی کی ہے۔ ہاں اک بات میں کل بھی جان مخل تھی آج بھی ہوں۔

س : سسرال والوں نے وہ مقام دیا جس کا حق تھا۔ سسرال میں گھریلو امور اور خاندانی معاملات میں کتنی

اہمیت دی جاتی ہے؟

ج : شاید وہ مقام جو ہر بہو کا حق ہوتا ہے۔ وہ مجھے تب نہیں ملا جب ملنے کی آس تھی۔ دیور کی وفات کے بعد ہمیں واپس بلایا گیا ول کرلایا۔ مگر اس شخص کو میں نے دل سے معاف کیا تھا۔ اس کی ناگہانی موت نے وہ طنطنہ توڑا ہے۔ اب بلایا جاتا ہے۔ مشورے مانگے جاتے ہیں مگر اب دل نہیں کرتا کسی معاملے میں آنے کو ہاں کہہ دیا ہے آپ گھر کے بڑے ہیں اپنے بچوں کے متعلق فیصلے خود کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

س : سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج : توقعات ان سے وابستہ کی جاتی ہیں جو آپ کو اپنا سمجھیں۔ چھوڑیں اپنی زندگی خود جئیں۔ ساتھیو! توقعات تو کبھی کبھی اولاد سے بھی پوری نہیں ہوتیں ہیں۔ جن کو ہم اپنے خون سے سینچتے ہیں۔ پھر دوسروں سے کیوں؟ میاں جی نے کہا تھا تم مجھے شرارتی اچھی لگتی ہو ایسے ہی رہنا سو میں تو توقع پر پوری اتری اور ہو سکتا ہے۔ میں بھی سسرال کی توقعات پر پورا نہ اتری ہوں۔ بہرحال میں یہ جانتی ہوں کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ کیاں دونوں طرف ہوتی ہیں۔ "ہاں لیکن ساس واحد رشتہ ہے جو تالی ایک ہاتھ سے بھی بجانا جانتی ہے۔ جی ہاں تھپڑ مار کر۔" دراصل قارئین زیادہ دیر سنجیدہ رہوں تو پیٹ میں اتنے شدید موڑ اٹھتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑیں 'حالات خود آپ کو جینا سکھا دیں گے "ایک اور بات کہوں" ساس اور سانپ کتنی مطابقت رکھتے ہیں۔ س 'سانپ کو زہریلا بنا تا ہے حالانکہ ایک س ہے تو پھر ساس میں تو دو ہیں۔ (بی بی! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں' یہ نہ بھولیں آپ نے بھی کل ساس بننا ہے اور آپ کی والدہ بھی کسی کی ساس ہیں۔ مدیرہ)

س : بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بڑا امتحان بن کر آتی ہے 'مثلاً "پہلا بچہ؟

ج : بالکل لیکن میں یہاں بھی سرخرو ہی رہی پیارے ساتھیو! ہمت و استقلال کا دامن تھامے رکھو۔ یقین رکھو خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ میری ساس نے کہا کہ بچہ پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ نند نے وہ نازیبا الفاظ بیان کیے کہ اللہ کی پناہ تو جناب 12 اپریل 2008ء کو چاند سی بیٹی کی پیدائش نے انہیں بتا دیا کہ اولاد دینا یا نہ دینا اللہ باری تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ دکھ سے جب دل ڈگمگاتا تو دعا کرتی اللہ کبھی بیٹی نہ دینا۔ بیٹیوں کے دکھ ماں باپ کو زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ مگر پہلی اولاد بیٹی ہوئی۔ شکر الحمدللہ امی دوسری صبح پہنچیں۔ دراصل بہت ایمرجنسی میں آپریشن کرنا پڑ گیا۔ میاں جی نے خوشی سے گھر فون کر کے بتایا۔ کسی نے مبارک باد نہیں دی۔

میری بیٹی آٹھ سال کی ہو رہی ہے۔ سگے چچا نے فوت ہونے سے چار ماہ پہلے دیکھا۔ پہچان نہیں پایا۔ پوچھا یہ اتنی پیاری لڑکی کون ہے۔ بتانے والے نے افسوس اور حیرت سے دیکھا اور بتایا تمہاری بھتیجی ہے۔

بولے "یہ تو ہمارے جنتی ہو گئی ہے۔ ماشاءاللہ۔"

بیٹے کی ولادت ہوئی تو تب حالات بہت برے۔ میاں جی جو ہر قدم پر ساتھ تھے۔ پیچھے ہٹ گئے وہ قدم جو بھی میرے ساتھ تھے۔ اب اپنے والدین کے ساتھ۔ جن کے ساتھ میں دو دو دن بھوکی رہتی۔ جن کے گھر سے نکلتے پر ماں نے کہا یہ تمہارے ساتھ نہیں رہے گی 'ساتھ چھوڑ دے گی اس نے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ قدم ہٹائے تو خود میاں جی نے انہوں نے اس مشکل وقت میں تنہا چھوڑ دیا۔

تب اک فیصلہ کیا کہ مجھے اس رشتے کو ختم ہی کر دینا چاہیے جو سوائے دکھ کے کچھ بھی نہ دے۔ بیٹا ہوا جس انسان کو سب سے نزدیک ہونا چاہیے تھا وہی سب سے دور۔ یقین مانیے بہت کٹھن وقت تھا۔ اتنی دکھی تو بیٹی کی دفعہ بھی نہ تھی۔ کیونکہ آخری ماہ میں بھی

سب کہتے طلاق دے دو۔ مگر حالات کا دھارا پلٹا ایک بار پھر میری ایک بہت اچھی دوست غزالہ صدف نے بہت ساتھ دیا۔ میاں جی کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھی۔ اسی کی پُراثر تقریروں نے میاں جی کی سوچ بدلی اور وہ ایک رات گیارہ بجے گھر کے دروازے پر آموجود ہوئے۔

بیٹے کی مبارک باد پر آنسو اور بیٹے کو دیکھنے سے انکار کردیا۔ ابو امی اور پھوپھو سے کہنے لگے "جب تک آپ معاف نہیں کریں گے میں بیٹے کی شکل نہیں دیکھوں گا۔"

بیٹی جو نو ماہ بعد باپ کی شکل دیکھ رہی تھی لپٹ گئی۔ آہ! بہت بہت مشکل دور تھا پر گزر گیا۔ پیارے قارئین! یقین مانیے بیٹیاں بہت بڑی رحمت ہوتی ہیں۔

دیور کی وفات پر جب بارڈر سے دو دن بعد رات کے 1 بجے گھر پہنچے۔ ساس بہن باپ بھائی کی دلجوئی کرنے اپنے دکھ کو اپنوں سے ہلکا کرنے میں ان کے شانہ بشانہ۔ تب آٹھ سال بعد وہ دلہن پار کرلی گریہ کیا! دو دن بعد چوتھے پر فون آیا۔

"بیٹا آسکتا ہے بہو نہیں۔"

میاں جی تب ساتھ کھڑے ہوگئے کہ میں بھی نہیں آؤں گا۔" ان آٹھ سالوں میں وہ جاتے تھے عید کے عید۔ جب جب چھٹی پر آتے والدین کی خدمت میں جاتے۔

ہر ہر قدم پر مدد کی۔ مالی بھی جسمانی بھی تب باپ جب بھائی کی ناگہانی موت پر روتا چمٹ چمٹ کر روتی باپ کے سینے سے لگ جاتی اور تڑپ تڑپ کر روتی۔ چاچو چاچو پکارتی۔

س : آپ جوائنٹ سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند کرتی ہیں؟

ج : علیحدہ بالکل علیحدہ کیونکہ میرا ماننا ہے کہ انسان ماحول خود بناتا ہے اور اسی طریقے سے بچوں کی پرورش کرسکتا ہے۔ جب کسی معاملے پر اپنوں سے زیادہ دوسروں کا دخل ہوجائے تو بدمزگیوں کے دھوئیں حلق تک میں پھنس کر سانس لینا دوبھر کردیتے ہیں اور گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے ایک بار مرا جائے۔

گیدڑ کی طرح گھٹ گھٹ کر سو سال جینے سے بہتر ہے ایک دن جی لیا جائے اور خوب جیا جائے۔ کیونکہ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ بس سب سے گزارش ہے کہ خود جئیں اور خوب جئیں۔

س : آپ نے سسرال کا ماحول بہتر بنانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں؟

ج : اگر سسرال میں رہتی تو ضرور بہتر بنانے کی کوشش کرتی۔ شاید پھر دیور زندگی کی بازی بھی نہ ہارتا۔ اپنوں کے ہاتھوں ماحول بھی تب بدلتے ہیں جب رویے بدلتے ہیں اور انسان دوسروں کو بھی ترجیح دے۔ جہاں اپنے ہی بیٹوں کی ناقدری ہو وہاں بہوؤں کو کون پوچھے۔ آٹھ سال بعد وہاں اب عزت ملتی ہے۔ وقار ملتا ہے۔ بچوں کو پیار ملتا ہے۔ کیونکہ وہ اب پچھتاووں کی آگ میں لحہ لحہ جل رہے ہیں۔ آٹھ سال بعد میرے بچے اپنے ددھیال گئے۔ سسر جی نے پوتی کو پہچانا ہی نہیں۔ کزن کی بیٹی کو سینے سے لگائے چومے جا رہے ہیں اور روئے جا رہے ہیں۔ ہم حیران۔ ممانی نے کہا "یہ کون ہے؟" تو کہنے لگے پوتی۔

ممانی شدت غم سے تڑپ اٹھیں اور دل کو آگے کر کے کہا۔ "یہ میری بھتیجی ہے۔ آپ کی پوتی یہ ہے۔"

جی ہاں آٹھ سال کی بچی کو دادا نے نہیں دیکھ رکھا تھا نہ ہی چاہا تھی۔ اب ان بچوں میں ان کی جان بستی ہے۔ شاید ازالہ کرنا چاہ رہے ہیں۔

دیورانی جا چکی ہے۔ بمشکل عدت پوری کی شادی کر چکی ہے۔ دادا تڑپتا ہے۔ اب مرے بیٹے کی بیٹی کو پانے کے لیے مگر وہ اپنے ساتھ لے کر جا چکی ہے اور ننھی پری ایک سال کی ہوگئی ہے مگر ذہن کے پردوں سے اس کی تصویر ہر گزرتے دن مٹ رہی ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہے۔

میری التجا ہے ان تمام والدین سے کہ خدارا اپنی عزتوں کو سنبھالیں۔ بہوئیں آپ کے گھر کی عزت ہوتی ہیں۔ نسلوں کی امین ہیں ان کے ساتھ برے رویے آپ سے آپ کے اپنے بیٹوں کو دور لے جاتے ہیں اور پھر جہنم خرید لیتے ہیں۔ وہ حادثہ جو میرے سسرال میں پیش آیا۔ پچھتاووں کے ناگ ہر وقت ڈستے ہیں۔ پرائی بیٹی چلی گئی مگر اب وہ درد کی یادیں کیسے جائیں۔ ☆☆

بندھن

عامر قریشی ہمراہ مہوش عامر

شاہین رشید

مصطفیٰ قریشی فلموں کے بادشاہ تھے اپنے وقت کے۔ اور ان کے برخوردار عامر قریشی ڈراموں کے بادشاہ ہیں۔ آج کل چھوٹی اسکرین پہ ان کا راج ہے۔ بیک وقت ان کے کئی ڈرامے چھوٹی اسکرین پہ آن ایر ہیں۔ اور بہت کامیابی سے جاری ہیں۔

"کیا حال ہیں عامر قریشی صاحب؟"

"اللہ کا شکر۔"

"اور بیگم کیسی ہیں؟"

"وہ بھی بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"اداکاری آپ کو ورثے میں ملی۔ مگر تواتر کے ساتھ اب کام کررہے ہیں وجہ؟"

"جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ کام تو خیر میں کافی دیر سے کررہا ہوں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ تواتر کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ کچھ دوسرے کاموں میں مصروف تھا۔"

"اور اب؟"

"اب بھی مصروف ہوں۔ مگر اب ٹی وی ڈراموں میں زیادہ مصروف ہوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اب مجھے زیادہ اچھے کردار آفر ہورہے ہیں۔ اور پھر جب سب کام کررہے ہیں تو ہم کیوں نہ کریں۔"

"گڈ۔ اور گھریلو لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمدللہ۔ بہت اچھی۔"

"کچھ باتیں مہوش صاحبہ سے ہوجائیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل۔"

"کیسی ہیں مہوش؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟"

"جی ہمارا تعلق سندھ سے ہے۔ تعلیمی لحاظ سے

میں ڈاکٹر ہوں۔۔۔ اور ریڈیالوجسٹ ہوں اور 13 جون 2009ء کو ہماری شادی ہوئی الحمدللہ۔۔۔ اور بہت اچھی اور خوش حال ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں ہم دونوں۔"

"دونوں مصروف رہتے ہیں۔۔۔ گھریلو زندگی الجھن کا شکار ہوتی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور میں اپنے۔۔۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ مصروفیات کی وجہ سے ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

"اب تو خیر' ماشاء اللہ سے کافی سال ہو گئے ہیں شادی کو۔۔۔ لیکن کیا اب بھی میکہ پہلے دن کی طرح یاد آتا ہے؟"

"میکہ۔۔۔ میکہ ہی ہوتا ہے۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میکے کی یاد میں اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاؤں۔۔۔ مجھے سسرال میں بھی میکے جیسا ہی پیار ملا ہے اور میری سسرالی فیملی تو ویسے ہی بہت مختصر سی ہے۔ میرے ساس سسر مجھے میرے والدین سے بڑھ کر پیار دیتے ہیں اور یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"لڑائی ہو تو صلح کون کراتا ہے؟"

"اول تو لڑائی ہوتی ہی نہیں ہے۔۔۔ پھر بھی کبھی کبھار چھوٹی موٹی بات پہ ہو بھی جائے تو میرے امی ابو (ساس سسر) اتنے اچھے ہیں کہ مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا' بلکہ سب عامر کو ہی ڈانٹ رہے ہوتے ہیں کہ یقیناً "تم نے ہماری بہو سے کچھ کہا ہوگا۔"

"لڑکیوں کو شادی کے بعد بھی جاب کرنی چاہیے؟"

"اگر آپ کے پاس تعلیم ہے اور کوئی پروفیشنل ڈگری ہے۔ کوئی ہنر بھی ہے تو آپ کو ضرور جاب کرنی چاہیے۔ شادی سے پہلے بھی اور ضرورت پڑے تو شادی کے بعد بھی۔۔۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ جاب کرنے سے لڑکیوں میں خود اعتمادی آتی ہے اور پھر اپنے ہاتھ کی کمائی کی بات اور اطمینان ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"شادی کی رسمیں ہوئی تھیں۔۔۔ اور عروسی اور ولیمہ کے جوڑے کیسے تھے؟"

"جی۔۔۔ بالکل ہوئی تھیں ماشاء اللہ سے۔۔۔ اور ہم سب نے بہت انجوائے کیا تھا۔۔۔ اور ساری رسمیں ہوئی تھیں اور دونوں دنوں کے جوڑے بہت خوب صورت اور بھاری تھے۔"

"رخصتی کے وقت رونا آیا تھا؟"

"ایسا ویسا۔۔۔ میں نے تو میک اپ کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ ان دنوں میرے والد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ایک ان کی طبیعت کی فکر اور دوسری ان کو چھوڑنے کا غم۔۔۔ تو بس بات بات پہ رونا آجاتا تھا۔۔۔ بہت مشکل وقت تھا۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

"پرل اور ڈائمنڈ۔۔۔" کالاکٹ۔۔۔ جو عامر نے خود ڈیزائن کیا تھا اور بہت خوب صورت تھا۔۔۔ اور عامر کی ایک بات بہت خوب صورت ہے' یہ لفظوں سے اظہار محبت نہیں کرتے' بلکہ پریکٹیکل کرتے ہیں۔ کوئی پیارا سا گفٹ دے کر' کہیں ڈنر پہ لے جا کر۔۔۔ جیسے جب کمرہ سجا تو بہت خوب صورت انداز میں "A اور M" لکھوایا۔۔۔ اور مجھے ان کا یہ انداز بہت اچھا لگتا ہے۔"

"ان کے ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

"شادی سے پہلے تو نہیں دیکھتی تھی۔۔۔ ہاں مجھے معلوم ضرور تھا کہ یہ ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔ مگر چونکہ پڑھائی میں مصروف رہتی تھی تو اتنا ٹائم نہیں ملتا تھا۔ مگر اب دیکھتی ہوں ان کے ڈرامے۔"

"تو کیا آپ کی ارینج میرج تھی؟"

"جی بالکل۔۔۔ سو فیصد ارینج تھی اور میں سمجھتی ہوں کہ ارینج ہی ہونی چاہیے۔۔۔ والدین اپنے بچوں کے لیے جو سوچتے ہیں بہتر ہی سوچتے ہیں۔"

"عامر قریشی صاحب کی کوئی خاص بات؟"

"ماشاء اللہ سے بہت اسٹرونگ پرسنالٹی کے مالک

ہیں۔ مزاج میں غصہ نہیں ہے۔ مگر شخصیت میں رعب بہت ہے۔"

"عامر کے لیے کھانا خود پکاتی ہیں؟ اور کیا عامر کھانے کے شوقین ہیں؟"

"جی۔۔۔ کوشش کرتی ہوں کہ خود پکاؤں۔۔۔ شروع شروع میں پکانا نہیں آتا تھا۔ مگر اب اچھا خاصا پکا لیتی ہوں۔۔۔ کچھ شوق کی وجہ سے آگیا تو کچھ کوکنگ چینلز سے مدد لی۔۔۔ عامر کو کھانے میں میٹھا بہت پسند ہے' تو کچھ نہ کچھ میٹھا بھی بنالیتی ہوں۔"

"جی۔۔۔ عامر صاحب۔۔۔ آپ سے ہو جائیں کچھ سوال و جواب؟"

"جی۔۔۔ ضرور۔۔۔"

"معموش بتارہی ہیں کہ آپ کی ارینج میرج ہے۔ تو اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"اپنے والد کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ ایک بہن ہے۔۔۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی پسند سے بہو لائیں تو میں نے اجازت دے دی۔۔۔ کیونکہ بڑوں کا فیصلہ ہی اولاد کے لیے بہتر ہوتا ہے۔"

"آپ تو اتنے سوشل نہیں ہیں۔ اپنی شادی میں ہلا گلا برداشت کرلیا تھا؟"

"کرنا پڑا۔۔۔ کیونکہ بہن کی' پھر والدین کی خواہش تھی کہ تمام رسمیں ہوں۔۔۔ تو بس۔۔۔ اللہ کا شکر کہ سب کچھ اچھا ہو گیا۔۔۔ اب تو ماشاء اللہ کافی سال ہو گئے ہیں اور یہ بتاؤں کہ ہماری شادی حیدر آباد میں ہوئی تھی' جبکہ ولیمہ کراچی میں ہوا تھا۔"

"ہنی مون منایا تھا؟"

"نہیں فضول خرچی کا قائل نہیں ہوں۔۔۔ اس لیے اسپیشل طور پر ہنی مون منانے کہیں نہیں گئے' بلکہ دبئی میں شوٹنگ کے سلسلے میں جانا ہوا تو بیگم کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔"

"ویسے منانا چاہیے؟ مطلب ہنی مون پہ جانا چاہیے؟"

"مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہنی مون کیوں مناتے ہیں۔۔۔ عجیب سی رسم لگتی ہے۔"

"ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے شاید؟"

"جو لو میرج کرتے ہیں ان کے لیے تو ہنی مون بے معنی ہے' کیونکہ وہ تو پہلے ہی ایک دوسرے کو سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ ہاں ارینج میرج والوں کے لیے ضروری ہے کہ انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے دس پندرہ دن اکیلے رہنا چاہیے۔"

"بیگم کی خوبیاں بتائیں؟"

"بیگم میں ماشاء اللہ بہت خوبیاں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ہماری بیگم کو غصہ نہیں آتا۔۔۔ مزاج کی بہت ٹھنڈی ہیں۔ سمجھ دار اور سگھڑ ہیں' اللہ تعالیٰ نے ہر خوبی سے نوازا ہے۔"

"لڑائی جھگڑا ہوتا ہے آپ دونوں میں؟"

"معموش نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں بھی غصے کا تیز نہیں ہوں۔۔۔ تو جب دونوں طرف کے مزاج ٹھنڈے ہوں تو لڑائی جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ تو بیگم نے ویسے بھی کبھی لڑائی کا یا شکوہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تو پھر کیسا لڑنا جھگڑنا۔"

"تو۔۔۔ آپ نے تو ہنی مون کا پیسہ بچایا اور شوٹ کے لیے گئے تو بیگم کو لے گئے۔۔۔ کیا بیگم بھی اتنی ہی کفایت شعار ہیں؟"

"بیگم میرے جیسی کفایت شعار نہیں ہیں' لیکن میں انہیں فضول خرچ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھ سے تھوڑا زیادہ خرچ کرتی ہیں' مگر بہت زیادہ نہیں۔"

"شاپنگ کرنے مل کر جاتے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ میں پاکستان میں زیادہ شاپنگ نہیں کرتا۔۔۔ سال میں ایک بار ملک سے باہر جاؤں یا دوبار اپنی ساری شاپنگ کر کے آتا ہوں۔ پاکستان میں فیملی کے ساتھ شاپنگ کرنا ذرا مشکل کام ہے۔"

"خوش لباس ہیں؟"

"گھر سے باہر بہت خوش لباس ہوں۔۔۔ گھر میں ملنگ بندہ ہوں۔۔۔ گھر میں تو بس نیکر بنیان میں ہی رہتا ہوں۔"

"شادی کے بعد زندگی کس حد تک تبدیل ہو جاتی ہے؟"

"پتا نہیں... لوگوں کی لائف چینج ہوتی ہوگی' میری تو نہیں ہوئی ہے۔ میں تو پہلے جیسا ہی ہوں... روٹین لائف میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔"

"عموماً... بیویاں' شوہروں کو بدل دیتی ہیں... آپ تو ان کے رنگ میں نہیں رنگے... انہیں اپنے رنگ میں رنگا...؟"

"میری بیگم میرے رنگ میں رنگ گئی ہے۔ میری اپنی روٹین' جو پندرہ سولہ سال سے چلی آرہی ہے وہی ہے... آئندہ کے لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"سسرال کے قریب ہیں یا داماد بنے رہتے ہیں؟"

"بالکل بھی داماد نہیں بنا رہتا۔ بہت اچھے تعلقات ہیں سسرال والوں سے... ہاں' چونکہ زیادہ سوشل نہیں ہوں تو اس لیے آنا جانا زیادہ نہیں رہتا... اور چونکہ سسرال والے میری نیچر کو سمجھتے ہیں اس لیے وہ مجھے کچھ نہیں کہتے اور نہ ہی میری کسی بات کو مائنڈ کرتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پہ لکھے ہوتے ہیں' جو ہونی ہوگی ہو جائے گی۔ آپ کیا کہتے ہیں' انسان کا اپنا عمل دخل ہوتا ہے؟"

"اللہ کے کاموں میں کس کا عمل دخل ہے... سب کام اللہ ہی کراتا ہے... لیکن میرے خیال میں لڑکا جب تک سیٹل ڈاؤن نہ ہو جائے اُسے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ شادی کے بعد ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور پھر بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے کہ کاش ہم شادی نہ کرتے... تو بعد کے پچھتانے سے بہتر پہلے کا پچھتانا ہے... ویسے جو لڑکے شادی میں جلدی کرتے ہیں میں ان پر حیران ہوتا ہوں کہ شادی تو ساری زندگی رہنی ہوتی ہے... بہتر نہیں کہ اپنی لائف کو کچھ عرصہ انجوائے کرلو۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ کی صحت، عافیت اور سلامتی کے لیے دعائیں۔
اللہ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

پہلا خط ملتان سے ثوبیہ شاہین کا ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل معذرت کے ساتھ بالکل پسند نہیں آیا۔
سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھا۔ ایک اچھی کہانی۔
عفت آپی کا مخصوص پیارا سا طرز تحریر "خواب شیشے کا" اتنے سارے کزنز کے ساتھ اچھا لگ رہا ہے۔ مکمل ناول میں صدف آصف کا نام پڑھا تو فوراً پڑھنے بیٹھ گئی، ناول کچھ ہلکی پھلکی اور کچھ سنجیدگی لیے ہوئے تھا، مصنفہ بازی لے گئی تعریف پہنچادیں۔
نفیسہ سعید آپی نے بھی کمال کا لکھا، حرا بتول کا بس ٹھیک تھا۔ افسانوں میں سب ہی زبردست تھے۔ لیکن حاجرہ ریحان اور فرح بخاری یہاں بازی لے گئیں۔
ج۔ پیاری ثوبیہ! آپ کو ٹائٹل پسند نہیں آیا تو اس میں معذرت کی کیا بات۔ بھئی آپ لوگوں کا "شعاع" ہے۔ دل کھول کر خیالات کا اظہار کریں۔ ہم بالکل برا نہیں مانتے۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی آراء اور تجاویز کی روشنی میں ہم پرچے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگلی دفعہ کوشش کریں گے کہ ایسا ٹائٹل منتخب کریں جو ہماری پیاری قارئین دل کو بھا جائے۔
ہمیں خوشی ہے کہ ٹائٹل کے علاوہ پورا "شعاع" آپ کو پسند آیا۔

ناہید نقوی نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

یہ میرا دوسرا خط ہے جو کہ یقیناً "پہلے خط کی طرح ردی کی ٹوکری کی ہی زینت بنے گا۔ پرانے قارئین کو آپ زیادہ جگہ دیتی ہیں یہ اچھی بات ہے مگر نئی قارئین اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے۔ بہت مایوس ہوجاتے ہیں اور الٹے سیدھے خیالات آتے ہیں امید ہے اس جانب توجہ دیں گی۔
ج۔ پیاری ناہید! قارئین پرانی ہوں یا نئی، خط شامل اشاعت نہ ہو تو دونوں کو ہی الٹے سیدھے خیالات آتے ہیں۔ پھر وہ ہمیں ایک لمبا سا خط لکھ بھیجتی ہیں نتیجتاً "ہمیں الٹے سیدھے خواب آتے ہیں۔ یہ راز کی بات آپ کو اپنا سمجھ کر بتائی ہے۔
اور آپ کا یقین بھی غلط ثابت ہوا، خط شامل اشاعت ہے۔ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں ہیں۔

تسنیم کوثر کراچی سے لکھتی ہیں

مئی کا "شعاع" بہترین ناولز دلکش افسانوں سے سجا ہوا تھا۔ لیکن تبصرے سے پہلے عرض کروں کہ "خط آپ کے" ہمیں سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اور اب یہ نہیں ہوسکتا کہ تھوڑے سے صفحات بڑھادیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ "شعاع" کی قیمت کم از کم 100 روپے ضرور کرادیں "شعاع" سے محبت کرنے والوں کو یہ بالکل گراں نہیں گزرے گی۔ نفیسہ سعید کا محبت "خوشبو کی مانند" واہ کیا سحر انگیز دل کو چھونے والا ناول تھا۔ حرا بتول کا راستے اور منزلیں بہت دل سے لکھا ہے اور ہمیں دل سے پسند آیا۔ صدف آصف نے "یوں ملے ہو"

بھئی کیا دلربا انداز ہے غضب کا لکھا ہے" فرحت جبیں کا خوشبو بھری ساعتیں بالکل عام سی اسٹوری تھی۔ اس افسانے نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔

فرح بخاری کا "ضرورت" بہت معصوم سا محبت بھرا پر اثر جو دل کو چھو گیا۔ حاجرہ ریحان نے خوشبو ماشاءاللہ بہت اچھا لکھا ہے۔ سیاہ حاشیہ تو لاجواب ہے۔ "خواب شیشے کا" نیا ناول اچھا لگ رہا ہے۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں سب سے اچھا ہے۔

ج۔ پیاری کوثر! چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں کہ صفحات بڑھا دیے جائیں لیکن قیمت بڑھانے والی بات ہمیں ٹھیک نہیں لگتی۔ ہم اپنی قارئین پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے ہماری بہت سی قارئین اپنی بہت سی ضرورتوں سے صرف نظر کرکے اپنے محدود سے جیب خرچ سے پیسے بچا کر اپنا شوق پورا کرتی ہیں۔ قیمت میں اضافہ ان پر ظلم ہوگا۔ پرچہ کی قیمت میں اضافہ تب ہی کیا جاتا ہے جب ناگزیر ہو جائے۔

شعاع سے آپ کی محبت کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

پارس حسین گ۔ ش۔ ی لکھتی ہیں

عفت سحر طاہر کی کہانی بہت پسند آئی مگر یہ کیا؟ اتنے کم صفحات۔ "رقص بسمل" کی کمی بہت محسوس ہوئی "سیاہ حاشیہ" بھی بہت زبردست جا رہی ہے پلیز زاوید اور عاصم جدا نہ ہوں۔ مکمل ناول دونوں اچھے تھے۔

ج۔ پیاری پارس! "شعاع" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کے مشورے صائمہ تک پہنچا دیے ہیں۔

ممتاز یوسف نے اورنگی ٹاؤن کراچی سے لکھا ہے

سب سے پہلے میں ناظمہ سے کچھ کہنا چاہوں گی۔

ناظمہ میری بات کا مطلب ہرگز ہرگز آپ کا یا آپ کی امی کا دل دکھانا نہ تھا۔ مجھے تو آپ کی امی کی زندگی گزارنے کے سلیقے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ کس طرح انہوں نے صبر اور شکر سے کام لے کر اپنے بچوں کی خاطر قربانیاں دے کر اپنے بچوں کو اعلا مقام پر پہنچا دیا۔ میری بات سے آپ کی اور آپ کی امی کی دل آزاری ہوئی اس کے لیے بہت بہت معذرت۔

تجھ سے ناتا جوڑا ہے بہت اچھا سلسلہ ہے لیکن کبھی کبھار بہت چھوٹی بات کو بڑا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے مثلاً "ہمارے ہاں تو روز گوشت پکتا تھا اور یہاں صرف ہفتے میں دوبار۔ روز گوشت نہ پکنا اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں۔ بلکہ اس بات کو مسئلہ نہیں اپنی زندگی کا بڑا دکھ بتایا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایک ایسا کڑا وقت گزارا ہے کہ جب زندگی سے بہتر موت لگنے لگی تھی۔ کچھ بہنوں کی تکلیفیں پڑھ کر تو میری آنکھوں میں نمی اتر آتی ہے لیکن کچھ بہنیں بس یونہی برائیاں کرتی ہیں تو اچھا نہیں لگتا۔ اگر ہم اپنا دل اور ظرف تھوڑا بڑا کرلیں تو شاید زندگی میں کچھ بہتری محسوس ہو۔ میں نے بہت کم خواتین ایسی دیکھی ہیں جو کہ اپنے سسرال والوں کی تعریف کرتی ہوں اور بہت کم ایسی ساس نندیں دیکھی ہیں جنہیں اپنی بہو میں اچھائیاں دکھائی دیں۔ جب ایک ہی گھر میں رہنا ہے تو اپنے دلوں میں گنجائش کیوں نہیں نکالتے ہم۔ دوسروں سے حسد کرکے ہم اپنی اور دوسروں کی زندگی کیوں عذاب بناتے ہیں۔ بنت سحر کو خط آپ کے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ عائشہ رباب نے سمیرا حمید کے بارے میں یہ صحیح لکھا کہ وہ پاکستان کی کہانیاں کم لکھتی ہیں۔ ویسے آج کل باہر ممالک میں رہنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کے بارے میں لکھ کر شاید اپنے زیادہ ذہین ہونے کا تاثر دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ سمیرا کی کہانیوں میں کچھ الگ لک دکھائی دیتی ہے۔ ویسے سمیرا کچھ کچھ اپنے ملک سے ناراض دکھائی دیتی ہیں۔ یارم میں بھی دوسرے ملک اور اس کے کلچر کی تعریفوں کی بھرمار تھی۔ لڑکیوں کے محنت کرنے کی تعریفیں تھیں۔ پچھلے ماہ کی "رب البشر" سمیرا حمید کی شاہکار تحریر بلکہ ایک اور شاہکار تحریر۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے لفظوں نے جیسے مجھے جکڑ لیا تھا۔ زبردست۔

"محبت خوشبو کی مانند" نفیسہ سعید کا بہترین ناول۔

"ضرورت" فرح بخاری کی بہت اچھی کاوش۔ فرح بخاری بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ بزرگوں کو گھر کے ایک کونے میں ڈالتے وقت ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کبھی ہم پر بھی یہ وقت آئے گا۔ "سیاہ حاشیہ" میں کہانی تھم سی گئی ہے۔ صحیح وقت پر اختتام کر دیا جائے تو بہتر ہوتا ہے جیسے کہ امت العزیز شہزاد نے "محشر آشوب" کا کیا تھا۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" مجھے بہت پسند ہے۔

ج۔ پیاری ممتاز! رائٹنگ کی تو خیر ہے، مگر خط آپ کا

ماشاء اللہ اور سبحان اللہ ہے۔ بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے آپ نے۔ ہم آپ سے سو فیصد متفق ہیں۔ سمیرا حمید کے بارے میں آپ کے خیالات پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ انہوں نے غیر ملکی پس منظر میں تو چند ہی کہانیاں لکھی ہیں' زیادہ تر کہانیاں ہمارے معاشرے کے پس منظر میں ہی لکھی ہیں۔ دراصل کہانی خود کو لکھواتی ہے۔ اب آپ ہی بتایئے ولی اور رب البشیر جیسی کہانی ہمارے معاشرتی پس منظر میں لکھی جا سکتی تھی؟ اور یارم میں ہمیں تو کہیں دوسرے ملک کے کلچر کی تعریفوں کی بھرمار نظر نہیں آئی پھر کسی میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کی تعریف تو بنتی ہے نا۔

وہاڑی سے حرا ملک نے لکھا ہے

پورے کا پورا "شعاع" اپنی تمام تر شعاعوں کے ساتھ رسالے کو منور کر رہا تھا۔ سلسلے وار ناولز میں آغاز تو عفت سحر کے ناول کا دلچسپ ہے اور امید ہے آگے بھی اچھا ہو گا۔ تمام مکمل ناول' ناولٹ اور افسانے بھی اچھے تھے البتہ "سیاہ حاشیہ" بہت زبردست ہے۔ اور ایک گلہ کہ میرے خطوط چاہے جتنی جلدی پوسٹ کروں آپ نے تو شائع کرنا ہی نہیں ہوتا نہ میرا خط اور نہ ہی کوئی میرا شعر یا جو بھی پوسٹ کروں۔

ج۔ پیاری حرا! جہاں تک ہماری یادداشت کام کر رہی ہے تو آپ کے خطوط اور اشعار کئی دفعہ ہم لگا چکے ہیں' لیکن آپ کا گلہ پڑھ کر سوچ میں پڑ گئے ہیں' ہماری اکثر قارئین خطوط میں شمارے پر تبصرے کے بجائے "شعاع" سے اپنی محبت کا احوال لکھ بھیجتی ہیں' ان کی محبت سر آنکھوں پر۔ ایسے خطوط دل میں جگہ پاتے ہیں۔ شمارے میں جگہ پانے کے لیے صرف جلد پوسٹ کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کا شمارے سے متعلق اور معیاری ہونا بھی ضروری ہے۔ "خوب صورت ہے" میں ہم ناخنوں اور بالوں کے بارے میں مضامین کئی بار دے چکے ہیں۔ چلیں آپ کی فرمائش پر ایک بار پھر سہی۔

افشین نعیم اسلام آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

کافی عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو خط لکھنا ہے۔ (کافی عرصہ یعنی کہ کوئی دس بارہ سال) سو آج ہمت کر ہی لی۔ چوہدری سردار محمود صاحب کی وفات کا پڑھا' بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ "شعاع" کے ذریعے پتا چلا کہ وہ نہ صرف ماہنامہ "حنا" کے بانی تھے بلکہ انشاء جی' محمود ریاض اور سردار محمود مرحوم آپس میں بھائی تھے۔ اتنی بڑی بات اور ہمیں معلوم ہی نہ تھی۔ "میرا بھائی' میرا دوست" پڑھا۔ بہت بہترین مضمون تھا۔ حاجرہ ریحان کا یہ افسانہ بھی خاصا منفرد تھا مگر متاثر نہ کر سکا۔ فرح بخاری نے بہت اچھا لکھا۔ اتنی بڑی بات اتنے آسان الفاظ میں سمجھا دی۔ بہت پسند آیا۔ "سمیعہ عمیر" کا افسانہ "چندیل بانٹ لو" بڑا متوازن افسانہ تھا۔ نہ خوامخواہ کا سسپنس پھیلایا نہ ہی الفاظ کے ہیر پھیر میں الجھایا۔ نہ کوئی کمی نہ کہیں زیادتی۔ سوچ سمجھ کر بڑی تسلی کے ساتھ لکھا ہوا افسانہ لگا۔ اگلا افسانہ "خوشبو بھری ساعتیں" مصنفہ کا نام دیکھا' اتنا افسوس ہوا' کیوں ہمیں افسانے پر ٹرخا دیا۔ ناول لے کر آئیں نا اچھا سا... اب آیئے مکمل ناول کی طرف "محبت خوشبو کی مانند" بڑا اچھا موضوع منتخب کیا۔ سارا ناول سانس روک کر پڑھتے رہے۔ شروع سے آخر تک کیا زبردست گرپ رکھی نفیسہ نے۔ ڈائیلاگ کمال' ماضی اور حال کا سفر بہت بہترین۔ شاباش بہت اچھا لکھا۔ ویل ڈن۔ اس کے بعد صدف آصف کا ناول "یوں ملے ہو" اچھا موضوع تھا۔ اتنی اچھی اٹھان والا ناول۔ پر درمیان تک پہنچتے پہنچتے ناول کی اچھی خاصی فلم بن چکی تھی۔ لگتا تھا اثر حقیقت کی دنیا چھوڑ کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی ہوں۔ اب ایک مڈل کلاس سفید پوش گھرانے کی خوب صورت لڑکی ہے۔

گھریلو ضروریات سے مجبور ہو کر نوکری کے لیے نکلی ہے بالکل ٹھیک۔ پھر جی ہیروئن کا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ باس اسپتال میں موجود ہیں۔ ہیروئن کا بھائی باس سے کہہ رہا ہے کہ آپ گھر چلے جائیں پر ناجی۔ باس کی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے' وہ ہیروئن کو اس حالت میں چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اب چلو باس علاج کروا رہا ہے۔ بہن کا' تو وہ منہ سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا پر دل میں تو اسے باس کے بارے میں مشکوک ہونا چاہیے تاکہ وہ اس کے خلوص کے سامنے ہارنے لگے۔ کون سا خلوص بھلا... ؟ اتنا اچھا ناول' اتنا اچھا اختتام پر کہیں کہیں غیر حقیقی مناظر کے پیوند۔

"راستے اور منزلیں" حرا نے بہت اچھا ناول لکھا۔ ناول کے درمیان میں بہت سی جگہوں پر ایسے مناظر ڈالے

جا سکتے تھے جو کہ اخلاق سے گرے ہوئے ہوتے مگر حرا نے بہت سنبھال سنبھال کر ناول لکھا۔ حرا کو بہت شاباش۔

صائمہ کے "سیاہ حاشیہ" کی قسط فٹ رہی۔ مزہ آیا پڑھ کے۔ عفت سحر کے سلسلے وار ناول پر تبصرہ محفوظ رکھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اگلے دس بارہ سال میں پھر خط لکھنے کا موقع مل جائے (بشرط زندگی)۔ مستقل سلسلے سب ہی ہمارے گھر میں بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ آپ کا نیا سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس کو جاری رہنا چاہیے۔

"خواتین" اور "شعاع" تب پڑھنا شروع کیا جب میں کلاس ہشتم، نہم کی طالبہ تھی۔ اب خیر سے پڑھاتے ہوئے بھی سولہ سال ہونے کو آئے۔ ایک عمر کا ساتھ ہے۔ آپ کے رسالوں کا اور ہمارا۔ اب وہ بات، جس کی خاطر میں نے خاص طور پر خط لکھا ہے۔ آپ تمام لوگوں کی محنت قابل داد ہے۔ یہ جتنی بڑی رائٹرز جن کو آج ایک دنیا جانتی ہے آپ کی محنت کی وجہ سے منظر عام پر ہیں۔

ج۔ پیاری افشین! بہت اچھا، مدلل اور مفصل تبصرہ کیا ہے پڑھ کر خوشی ہوئی اور ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کہ آپ نے سوچنے میں دس بارہ سال لگا دیے۔ آپ نے ' خط لکھنے میں دس سال لگائے۔ اب آئندہ بھی بارہ سال کا ارادہ ہے۔

اقرا فیاض نے چاچڑاں شریف ضلع رحیم یار خان سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

میری زندگی "شعاع" سے شروع ہو کر "شعاع" پر ختم ہوتی ہے۔ "شعاع" نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ خود میں کیسی تبدیلیاں لانی چاہئیں۔ ہمارے ہاں غیر شادی شدہ لڑکیوں کو باہر گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن ہم نے "شعاع" کے ذریعے دنیا دیکھی ہے اور اچھے برے لوگوں کی پہچان بھی "شعاع" کے ذریعے معلوم ہوئی ہے۔ میری چھ بہنیں ہیں اور دو بھائی ہیں۔ میں چوتھے نمبر پر ہوں۔ میں بی اے کر رہی ہوں۔ میرے اور "شعاع" کے درمیان دو ولن ہیں سب سے بڑا میرا بھائی ہے۔ جو ہر وقت کہتا ہے فضول چیزوں میں لگی رہتی ہو کوئی اور کام کر لیا کرو اور اگر میں نے اب تمہارے ہاتھوں میں ڈائجسٹ دیکھا تو انہیں جلا دوں گا۔ اور میں بھاگ بھاگ کر بھائی کے کام کرتی رہتی ہوں تاکہ میرے "شعاع" کو برا بھلا نہ کہے۔ ولن نمبر ٹو میری ماں ہیں جو ڈائجسٹ کو وقت کا ضیاع سمجھتی ہیں۔

ج۔ پیاری اقرا! جب ہمیں اس قسم کے خط ملتے ہیں تو اپنے معاشرے کی سوچ پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی تربیت انہیں دین و دنیا کا شعور دینا والدین خصوصاً" ماؤں کا فرض ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں ماں بیٹی کے درمیان اتنے فاصلے ہوتے ہیں کہ بیٹی ماں سے ہر بات نہیں کہہ پاتی۔ "شعاع" میں زیادہ تر خواتین کے مسائل پر مبنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ لڑکیوں میں اچھائی برائی کو سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ کو چاہیے کہ وہ یہ رسالے خود پڑھیں تاکہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ "شعاع" میں کس قسم کی تحریریں شائع ہوتی ہیں یا آپ انہیں پڑھ کر سنائیں پھر وہ آپ کو منع نہیں کریں گی۔

آپ کی والدہ کو بھائی کو منع کرنا چاہیے کہ وہ بہنوں کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ آپ کے والدین موجود ہیں اور وہ آپ کے برے بھلے کے ذمہ دار ہیں۔

کبریٰ عباسی نے ہری پور ڈاک خانہ سے لکھا ہے

"شعاع" کے سب ہی سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں نویں کلاس سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں اور اب میں ماشاء اللہ (M.A) ایم اے کی طالبہ ہوں۔ "سیاہ حاشیہ" حسب معمول بہترین ہے۔ نیا ناول "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر کے قلم کا عظیم شاہکار ہے۔ افسانے تمام اچھے تھے بنت سحر کا افسانہ "میں ہوں نا" بہت اچھا افسانہ تھا۔

ج۔ پیاری کبریٰ! آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ اب خوش ہیں نا آپ؟

سرور فاطمہ ہنی صوابی کے پی کے سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

میں آپ کے تینوں رسالوں کی ادنیٰ سی قاری ہوں۔ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے رسالہ حاصل کرنے میں جتنی دشواری ہم معصوموں کو ہوتی ہے شاید ہی کسی کو ہو، لیکن جو بھی ہو (خواہ جان ہی کیوں نہ لڑانا پڑے) ہم انہیں حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ رسالے تو ہمارے لیے

گرمیوں کے چڑچڑے دنوں میں ٹھنڈی چھاؤں کی طرح سردیوں کی اداس شاموں میں پر خلوص ساتھی کی طرح ہوتے ہیں۔ رسالے کے سارے ہی سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

ج۔ پیاری سرور! آپ کا خط بھی ہمارے لیے گرمی میں روح افزا کی طرح فرحت بخش ہے۔

امید ہے۔ آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔

صائمہ عدنان نور نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

گزشتہ سالوں میں کتنے ہی ناول افسانے ایسے آئے کہ لکھنے کے لیے بے اختیار دل مچل اٹھا۔ ایک بات برسوں سے کہنے کی متمنی ہوں کہ "شعاع، خواتین، کرن" آپ کا پورا ادارہ محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ اکیڈمی کی صورت ہے، نئے لکھنے والوں کی جیسے راہ نمائی اور پذیرائی آپ کا ادارہ کررہا ہے کیا کوئی اکیڈمی بھی کرپائے گی۔

ج۔ پیاری صائمہ! آپ کا طویل خط پڑھا بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے اپریل کے شمارے پر۔ تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر اپریل میں شامل نہ کرسکے۔

حوصلہ افزائی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

طہ گل نے فاروق آباد سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

قلم میرا شوق ہے اور لکھنا جنون اور مجبوری کیوں کہ میرا قلم دوست اور ہم راز ہے۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم مبارک باد اتنے اچھے ناول کے لیے "رب البشر" سمیرا حمید نے خوب رلایا۔ بہت اصلاحی ناول تھا۔ "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر صاحبہ آپ کی انٹری تو زبردست ہے۔

دراصل اتنی مصروف روٹین ہے کہ اب بھی اسکول جانے سے پہلے فائنٹ لکھ رہی ہوں کیونکہ سارا دن مصروف۔ اسکول پڑھنے نہیں پڑھانے۔ ساتھ خود بھی پڑھ رہی ہوں نا تو حساب لگائیں پھر بھی "شعاع" سے ملنے کے عزم نے اسکول سے لیٹ ہونے پر مجبور کیا۔ جناب پتا نہیں کیسے اور کس میں لکھنا تھا جو ملا صفحہ لکھ دیا۔ بھئی محبت کے اظہار کے لیے چیزوں کی ترتیب ضروری نہیں ہے۔ آپ کا ڈائجسٹ بہت جارہا ہے۔

ج۔ پیاری طہ! آپ کی پسندیدگی کے اظہار نے دل خوش کردیا۔ ضروری نہیں کہ پسندیدگی کے اظہار کے لیے بڑے بڑے بھاری الفاظ استعمال کیے جائیں بہت سادہ سے لفظوں میں بھی اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اور محبت تو ویسے بھی دل کا معاملہ ہوتی ہے۔ کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اظہار کیا جائے دل تک پہنچ جاتی ہے۔ "شعاع" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم آرزو اور شفق ارشاد نے لکھا ہے

یہ خط میں اور میری کولیگ مل کر لکھ رہے ہیں، ہم دونوں گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتے ہیں، میں آئی ٹی ٹیچر ہوں۔ جس تحریر نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم نے اسے بہت زبردست لکھا ہے۔ اس ماہ ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ جھکی پلکوں خوب صورت میک اپ اور جیولری نے دل کو چھولیا۔ سب سے پہلے پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیض یاب ہوئے۔ محمود ریاض صاحب سے ملاقات اچھی لگی۔ عفت سحر طاہر کے ناول کو سمجھنے کے مراحل میں ہیں۔ افسانوں میں "خوشبو" حاجرہ ریحان کا پسند آیا۔

ج۔ ارم اور شفق! آپ دس سال سے "شعاع" کی قاری ہیں تو خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں؟ "شعاع" آپ کو پسند ہے جان کر خوشی ہوئی۔ ٹائٹل آپ کو اچھا لگا بہت شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

فرحانہ نے گوجرہ سے لکھا ہے

اتنی گرمی میں ٹائٹل ہاتھ میں آتے ہی دل چاہا کہ محترمہ کی جیولری اپنے ہاتھ سے اتار دوں۔ (بھئی گرمی جو اتنی تھی) اب آتے ہیں ناول کی طرف "خواب شیشے کا" عفت سحر کی کہانی بہت اچھے سے آگے بڑھی۔ اینڈ پہ تو میں بھی موحد کی طرح ششدر رہ گئی۔ "راستے اور منزلیں" حرا بتول جی بہت دلچسپ اسٹوری۔ "یوں ملے ہو" صدف آصف کی کاوش بھی اچھی تھی خاص کر سارہ کی خوب صورتی اور تیاری کا انداز مجھے اپنی کالج لائف یاد آگئی (بھئی ہماری بھی بڑی تعریف ہوتی تھی) "سیاہ حاشیہ" میں تجسس اس بات کا ہے کہ ماہیر کس کا ہیرو بنے گا۔ آج کل قانتہ رابعہ اب بہت کم لکھ رہی ہیں یوں تو ہمارے شہر میں ہیں ایک دفعہ درس قرآن پر ان سے مل بھی چکی ہوں بہت ملنسار خاتون ہیں۔

- "حمل" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "انصاف" فرح الدین کا مکمل ناول،
- "من دیپک اور راگ محبت" امتہ العزیز شہزاد کا مکمل ناول،
- آمنہ ریاض اور عمیرا احمد کے ناول،
- سائرہ رضا، ثمینہ عظمت علی اور حیا بخاری کے ناولٹ،
- رمشا ناز، بنت سحر، ایمل رضا، سویرا ملک اور قانتہ رابعہ کے افسانے،
- "میری اماں" نعیمہ ناز کا مضمون،
- فلم اور ٹی وی کی اداکارہ "امنہ الیاس" سے ملاقات،
- معروف فنکار "اسد محمود" سے باتیں،
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ"،
- "کرن کرن روشنی" احادیث کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جون 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

ج۔ پیاری فرحانہ! آپ کی طرح ہمارا بھی دل چاہ رہا تھا کہ ماڈل کو جیولری کے بوجھ سے آزاد کردیں، مگر خواتین کی زیورات سے محبت کوئی راز تو ہے نہیں۔ بجنے سنورنے کا موقع ملے تو خواتین کہاں موسم کو خاطر میں لاتی ہیں بلکہ ان کی تیاری تو موسم کا رنگ ہی بدل دیتی ہے۔ ہے نا؟
قانتہ واقعی بہت اچھے اخلاق کی مالک اور بہت نفیس خاتون ہیں۔ اس بار ان کی کہانی شامل ہے۔

روبینہ شوکت نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اب "شعاع" نہ صرف میں خود پڑھتی ہوں بلکہ اپنی بیٹیوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتی ہوں اور یہ بات فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ میری بیٹیوں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔

ج۔ محترمہ روبینہ شوکت! آپ کو محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ خصوصا" یہ بات کہ آپ اپنی بیٹیوں کو خود پڑھنے کے لیے دیتی ہیں۔ اب آتی جاتی رہیے گا۔

نسرین علی لکانوالہ، میاں چنوں سے شرکت کررہی ہیں، لکھا ہے

پہلی "شعاع" پڑھ کر بہت دکھ ہوا اس کے بعد "میرا بھائی، میرا دوست" دکھ کے ساتھ مزا۔ ملی جلی کیفیت تھی، حمد و نعت، پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح — ایمان افروز تھیں۔ ناولوں میں سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھا۔ برجستہ مکالمے، مزے کے کردار بہت مزا آیا۔ "خواب شیشے کا" آغاز تو بسم اللہ ہے باقی چلتا رنگ دکھائے گا۔ "محبت خوشبو کی مانند" بور تھا، مگر اچھا تھا۔ "راستے اور منزلیں" وہی گھسا پٹا موضوع ناقص اتار چڑھاؤ ذرا اچھا نہیں لگا۔ صدف آصف صاحبہ نے بڑی روانی سے ناول کو مکمل کیا۔ ہاں ایک گلہ ہے ان سے بھی کہ ایسے ہی ساروی کی تعریف کے لیے الفاظ ضائع کردیے۔ سیدھی سی بات تھی لکھتیں نسرین جیسی ہے۔ اس کے بعد چلتے ہیں افسانوں کی جانب "چندریل" منیبہ عمیر کے افسانے نے خاصا متاثر کیا۔ "خوشبو بھری ساعتیں" فرحت جبیں نے بھی اچھی جان چھڑائی۔ "ضرورت" فرح صاحبہ نے حقیقت کو افسانے میں قید کیا اچھا تھا۔ "خوشبو" حاجرہ صاحبہ یہ افسانہ تھا؟ اس کے بعد مستقل سلسلے "باتوں سے خوشبو آئے" اور "تاریخ کے جھروکے" سب رٹ لیا، بہت شکریہ ایسی معلومات کا۔ خط آپ کے بہت دلچسپ رہا "خوب صورت کیا بنا" پہلے ہی سے ماشاء اللہ۔ اوہ جاتے جاتے یاد آیا۔ پچھلی دفعہ بنت سحر کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا کوئی ان سے سیکھے۔

ج۔ پیاری نسرین! "خوب صورت بنیے" کا سلسلہ خوب صورت بنانے کا سلسلہ نہیں ہے۔ اللہ نے تو جو چیز بھی بنائی ہے۔ بہت خوب بنائی ہے اور پھر انسان تو اس کی سب سے بہترین تخلیق ہے۔ ماہ و سال کی گردش جس طرح انسان پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے خدوخال کو بدل کر رکھ دیتی ہے تو جناب یہ سلسلہ اس تبدیلی کے اثرات کو تھوڑا کم کرنے کی کوشش ہے۔
محبت خوشبو کی مانند بور تھا، مگر اچھا تھا۔ اس جملے کا مطلب — ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔

نشرح خان نے چنوکی سے لکھا ہے

مئی کے گرم مہینے میں اتنا بھوی سوٹ اور جیولری پہنے ماڈل گرل کچھ خاص متاثر نہ کرسکی۔ پہلی "شعاع" پڑھ کر دل اداس ہوگیا۔ "شعاع" کے سب سلسلے میرے فیورٹ ہیں۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" میرا موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے۔ عفت سحر طاہر کا ناول "خواب شیشے کا" آغاز اتنا زبردست ہے تو اختتام تک ناول شاندار رہے گا۔ نفیسہ سعید کا مکمل ناول "محبت خوشبو کی مانند" نے بہت متاثر کیا۔ صدف آصف کی چند تحریریں پڑھی ہیں۔ سب ہی بہت اچھی لگیں۔ نازیہ جمال کا ناول بھی اچھا لگا۔ شاہ ویز پر تو پہلے بہت غصہ آیا، لیکن آخر کار حبیبا کو شاہ ویز کی محبت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔ صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" بہت اہم موڑ پر ہے۔ افسانے سب ہی بہت اچھے تھے۔

ج: حراجتول کے ناول کو آپ نے نازیہ جمال کے نام کردیا۔ نازیہ جمال کی تحریر تو اس بار شامل ہی نہ تھی۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

میں ثمینہ جی کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ انہیں اتنی صحت دے۔ ناظمہ جی کی ای سے مل کر بے حد خوشی

ہوئی۔ خوابوں میں ہی آکر مل لیجیے نا... ویسے اس بار لطیفے جلدی سمجھ میں آگئے۔ "تاریخ کے جھروکے" بھی اس بار منفرد رہا اور سبق آموز بھی۔

"باتوں سے خوشبو" تو اتنی آئی کہ آنسو بن بن کر آنکھوں سے نکلی۔ جب میرے بڑے بیٹے ثمر (جو لاہور پھپھو پاس رہتا ہے) کی موٹر سائیکل نئی خرید کر لاتے ہی دروازے سے چوری ہوگئی تو ہم نے سنتے ہی الحمدللہ پڑھ لی۔ ظاہر ہے یہ سوچ کر کہ اللہ نے جو کیا اچھا کیا ہوگا۔ باقی اس کی بیوی پھپھو دادی پریشان یا رونے لگے تو ہم انہیں منع کررہے تھے مگر بہو کے کہنے پر میں نے استخارہ یوں کیا... یااللہ... اگر موٹر سائیکل ملنی ہے تو خواب میں مجھے پھل دکھا دو... اور میں نے دیکھا۔ پھلوں کا باغ اور پولیس... یقین کریں... موٹر سائیکل پولیس نے نہر سے نکالی... وہ الگ بات کہ آدھی رہ چکی تھی۔ الحمدللہ۔ ہماری صحت کا راز یہی ہے کہ جو مرضی ہوجائے ہم پریشان نہیں ہوتے۔ اور ہم "سیاہ حاشیہ" سے بھی بچے رہتے ہیں۔ ویسے اس کی کافی گرہیں کھل چکی ہیں... ایک گرہ کھلنے کا انتظار ہے بس... آخر میں ہماری ذاتی شاعری ملاحظہ کرلیں کیونکہ یہ "غزل صفحہ" پر آنے کے قابل تو ہو نہیں سکتی۔

کوئی خدا سے محبت کرتا ہے، کوئی اس کی مخلوق سے
دو ہی طریقے ہیں بس خدا کو پانے کے
میں تیری مخلوق سے محبت کرنا چاہتی ہوں خدایا
بتادو "مگر" مجھے سب سے محبت نبھانے کے

ج۔ پیاری کوثر! آپ نے ہماری اتنی تعریفیں کردیں کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ تبھی اتنا تعریفیں نہ کیا کریں، خوامخواہ پورا ٹشو پیپر کا ڈبہ وقت سے پہلے خرچ ہوجاتا ہے۔ اللہ پاک آپ کی تمام خواہشات کو پورا فرمائے اور یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ صاحب کتاب ہونے والی ہیں۔ مبارک ہو۔ باقی ہماری صحت کا راز بھی یہی ہے کہ ملاوٹ والا دودھ پیتے ہیں پریشر والا گوشت کھاتے ہیں، آلودہ ہوا میں سانس لیتے ہیں اور خوش رہتے ہیں اور اللہ کی نرالی حکمتوں کا نظارہ کرتے رہتے ہیں۔

آپ کی غزل کے اشعار شائع کررہے ہیں تاکہ قارئین بھی جان لیں کہ غزل صفحات پر آنے کے قابل کیوں نہیں ہو سکتی۔

ماہ رخ طارق نے بڈھ بیر پشاور سے لکھا ہے

"شعاع" میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ "ایک تھی مثال" میرا پسندیدہ ناول تھا، شروع میں ناول میں ایک بے نام کردار کا ذکر تھا جو گھر میں آتا ہے، یہ بھی معلوم نہیں کس کا گھر تھا اور پھر پرس میں سے کچھ پیسے نکال لیتا ہے۔ ایک دو قسطوں میں اس کا حوالہ تھا اور پھر اس کا ذکر ایک دم سے غائب ہوگیا۔

ج: ماہ رخ! وہ کردار مثال تھی جو شروع میں پندرہ دن بشریٰ کے پاس، پندرہ دن عدیل کے پاس رہتی تھی۔

ورشا عنبر خان نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

قسط وار ناول بہت زبردست جارہے ہیں۔ "رقص بسمل" تو بالکل فرسٹ کلاس جارہا ہے اور سب لکھاری بہت خوب صورت اور عمدہ لکھ رہی ہیں۔ میں صرف سکول پانچ کلاس پڑھی ہوئی ہوں۔ پھر حفظ کیا ہوا ہے۔ شاید میری لکھائی پسند نہ آئے آپ کو۔ رب البشر ناول نے دل کو تڑپ دیا۔ اس رسالے میں نازیہ کنول نازی کے ناول کیوں نہیں شائع ہوتے؟

ج۔ ورشا! آپ کی لکھائی بہت اچھی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت عطا کی ہے۔ اس سے بڑی کیا بات ہو سکتی ہے۔

نازیہ کنول نازی نے ہمارے لیے لکھا تو ہم ضرور شائع کریں گے۔

عالیہ اشفاق اور راحیلہ خالد بڑکواڑہ (چوبارہ) سے لکھتی ہیں

ہم "شعاع" "خواتین" اور "کرن" تینوں رسالے پڑھتے ہیں۔ ہم طالب علموں کی اس قسم میں سے ہیں جو آدھی رات تک جاگ کر ناول کو کتاب میں رکھ کر پڑھتی ہے کیونکہ... جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں رسالے پڑھنا برا سمجھا جاتا ہے ہم فرسٹ ایئر کی طالبات ہیں۔ پیپرز ہونے والے ہیں ہمارے لیے دعا کیجئے گا۔ لکھائی کسی کام کی نہیں ہے دل بڑا کرکے پڑھ لیجیے گا۔

سب سے پہلے بات ہوجائے ہمارے پسندیدہ ناولٹ "سیاہ حاشیہ" کی۔ یہ تو پہلے دن ہی پتا چل گیا تھا کہ صالحہ بختاور اور ڈوبزی ایک ہی ہے۔ شانزے ابراہیم صالحہ آپا اور ہاشم ابراہیم کی بیٹی ہے۔ باقی صائمہ اکرم پر منحصر ہے کہ وہ کیا کرتی ہیں۔ "خواب شیشے کا" ہمیں لگتا ہے کہ موحد ہی

مہر ماہ کا ہیرو ہو گا۔ نمرہ احمد، نایاب جیلانی، عفت سحر طاہر اور سائرہ رضا ہماری پسندیدہ ترین رائٹرز ہیں۔ آپی اگر ہمارا خط شائع نہ ہوا تو ہم نے "داسو نہر" میں چھلانگ لگا دینی ہے (جس میں پانی بھی کبھار ہی بہتا ہے) ہاہاہا۔ اور ہم طلق پھاڑ کر روئیں گے اور ہمارے آنسوؤں سے چوک اعظم اور اس کے گرد و نواح میں سیلاب آنے کی خبر متوقع ہے۔ ہاہاہا۔ ہم گورنمنٹ ڈگری کالج چوک اعظم میں زیر تعلیم ہیں۔ ماڈل کچھ اوور لگ رہی تھی۔ آپی احادیث بہت اچھی تھیں۔ ہماری بونگیوں کی وجہ سے آپ کو غصہ آرہا ہے اس لیے "رب راکھا" آپی ہم پکے پینڈو ہیں۔ ہمیں لگتا ہے ہمارے بن "شعاع" ادھورا ہے۔ اللہ حافظ۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

ج۔ عالیہ اور راحیلہ! آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی رائٹنگ اچھی نہیں ہے۔ بہت خوش خط ہیں آپ۔ اطمینان رکھیں اور ہمارا دل بہت بڑا ہے۔ ہم اپنی قارئین کے محبت نامے دل سے پڑھتے ہیں خواہ کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں لکھے ہوں۔ مفہوم ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اپنی قارئین پر ہمیں غصہ نہیں پیار آتا ہے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ان شاء اللہ بہت اچھے نمبروں میں کامیاب ہوں گی آپ۔

پینڈو ہونا تو فخر کی بات ہے۔ یہ ہمارے جفاکش کسان ہی تو ہیں جن کی محنت و مشقت سے پورا ملک فیض یاب ہوتا ہے۔ اناج، پھل اور سبزیاں مہیا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پنڈ کو آباد رکھے۔ ہمارے محنت کش کسان خوش حال ہوں۔

آپ کو ٹھیک لگتا ہے "شعاع" واقعی آپ کے بن ادھورا ہے اور داسو نہر جس میں کبھی کبھار پانی آتا ہے اس میں چھلانگ لگانے کا ارادہ ترک کردیں۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔

ثنا خان نے جمبو خورد سے لکھا ہے

فہرست میں صدف آصف کا مکمل ناول دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے صدف آصف سے ناول لکھوا کر میری فرمائش پوری کردی۔ اس بار تینوں مکمل ناول ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ "محبت خوشبو کی مانند" نفیسہ سعید کی بہترین تحریر۔ صدف آصف کا "یوں ملے ہو" بہت عمدہ ناول۔

واقعی عورت کے لیے محبت سے زیادہ عزت اور احترام اہم ہوتا ہے۔ سارہ نے درست فیصلہ کیا۔ حراجبیں کا "راستے اور منزلیں" تھیم تو پرانا تھا، لیکن انداز بیان زبردست تھا۔ مجموعی طور پر ناول اچھا تھا۔ افسانوں میں فرح بخاری کے افسانے "ضرورت" نے بہت افسردہ کردیا۔

ج۔ پیاری ثنا! آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔ "شعاع" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے' یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں سبین آفندی اور سہیل آفندی' ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زر نگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زر نگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہپاره یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہپاره کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

سبین آفندی' آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں' تائی جان سبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زر نگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آفندی ہاؤس میں بے چینی سے فاران کا انتظار ہو رہا ہوتا ہے لیکن وہ نہیں پہنچ پاتے ان کا فون بھی بند ہوتا ہے۔ تیسرے دن سبین آفندی کا فاران آفندی کے فون پر رابطہ ہوتا ہے تو وہ آغا جان کو بتاتے ہیں کہ فاران آفندی اب اس دنیا

میں نہیں رہا ہے۔

آغا جان یہ خبر سن کر ٹوٹ گئے۔ قاران آفندی کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔ ان کی بیوی ثمو اور بیٹا موحد پاکستان آگئے۔ مہ ماہ کی منگنی طلال سے طے ہو چکی ہے' جس پر تزئین حسد کرتی ہے۔ موحد اور ثمو آفندی ہاؤس آجاتے ہیں۔ موحد بہت ہینڈسم اور خوبرو ہے۔ آغا جان اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں' لیکن موحد کو ان سب سے نفرت ہے۔ زر گل بائی کو قیمت دے کر وقار آفندی نے زرنگار سے شادی کرلی تھی' لیکن اس شادی کو آغا جان نے قبول نہیں کیا۔ یاں نے کہا کہ وہ زرنگار کو طلاق دے دے۔ انہوں نے دوپٹا قدموں میں رکھ دیا۔ گھر کے دیگر افراد بھی مخالف تھے۔ صرف ثمو بھابھی جو قاران آفندی کی بیوی تھیں۔ وہ وقار کے ساتھ تھیں۔ وقار آفندی کا بیٹا نمیر آفندی سومیہ کا دوست ہے۔ سومیہ اسے پسند کرتی ہے۔ ثمو اچانک یہ کہہ کر دھماکا کر دیتی ہیں کہ مہ ماہ اور موحد کا رشتہ آغا جان نے بچپن میں طے کر دیا تھا۔

تیسویں قسط

کھانے کی میز پر یکبارگی سناٹا پھیل گیا۔

ثمو کے چبھتے ہوئے سوال کے جواب میں آغا جان ساکت سے اسے دیکھ رہے تھے جبکہ صدیقہ بھابی بھی ہکا بکا سی تھیں۔ مگر فوراً ہی ہڑبڑا کر حواس میں لوٹیں۔

"ارے... واہ..." انہوں نے زبردستی کی ہنسی میں ان کی بات اڑانی چاہی۔ "تمہیں یاد ہے وہ بچپنے کی بات..."

"اللہ نے بڑی اچھی یادداشت دی ہے بھابی۔ ماضی کی ساری ہی باتیں یاد ہیں الحمدللہ۔" نگاہ غلط انداز ان پر ڈالی۔

"اب تو بہت وقت گزر گیا ثمو! بچے بڑے ہو گئے۔ بچپن کی باتیں تو بچپن کے ساتھ ہی رہ جاتی ہیں۔"

مبین صاحب نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے موضوع کو لپیٹا۔ جانتے تھے کہ طلال کے ساتھ رشتے میں بیٹی کی ضد بھی شامل تھی۔ موحد اول و چونکنے کے بعد سر جھٹکتا اپنے کھانے میں مگن تھا۔ البتہ لڑکیاں منہ اٹھائے کبھی ایک فریق اور کبھی دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ کیسا دھماکا ہوا تھا اچانک۔

مگر مہ ماہ ابھی تک سن کیفیت میں تھی۔ ساکت و جامد۔

صدیقہ دل ہی دل میں جتنا بھی تلملاتیں وہ کم تھا۔ ماضی میں بھلا اس چھپکلی کی اتنی ہمت کہاں ہوتی تھی کہ آغا جان کے سامنے ذرا سی اونچی آواز میں بات کرتی... کجا یوں طنزیہ گفتگو کرنا... ؟ انہوں نے شکایتی نظروں سے آغا جان کی طرف دیکھا۔

اور یہ دیکھ کر ان کا دل دھک سے رہ گیا کہ آغا جان اب اطمینان سے کھانا کھا رہے تھے۔ یعنی ان کا ثمو کو گھر کنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مہ ماہ کرسی گھسیٹ کر اٹھی تو ماحول میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔

"کہاں... ؟ کھانا تو کھالو..." صدیقہ نے جزبز ہو کر بیٹی کو تنبیہی نظروں سے دیکھا مگر لہجہ نرم ہی رکھا۔

لیکن لہجے کی نرمی والی پابندی مہ ماہ پر تو نہیں تھی نا...

"کھا لیا امی... ضرورت سے زیادہ ہی پیٹ بھر گیا آج تو..." بہت تلخی اور طنز سے کہتی وہ کھٹ کھٹ کرتی یہ جا وہ جا۔

"جب پرانی سب باتوں اور رشتہ داریوں پر دھول پڑ چکی ہے تو اب ہمیں یہاں روک کے کون سا نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں آپ لوگ..." ڈونگا اٹھا کے اپنی پلیٹ میں سالن نکالتی ثمو کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

صدیقہ بھابی کی مانو کرسی پر جیسے کانٹے اگ آئے یوں پہلو بدلتی تھیں۔ کل کی دبی دبائی ثمو آج ایک جوان بیٹے کا مان لیے ہوئے سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھیں۔

"تم جو چاہو گی وہی ہو گا ثمو۔ مگر تم دونوں کہیں نہیں جاؤ گے۔" اچانک آغا جان بولے تو گویا مبین صاحب کی فیملی کے سر پر چھت ہی آن گری تھی۔

ثمو نے بڑی جتاتی ہوئی تیکھی مسکراہٹ صدیقہ بھابی کی طرف اچھالی اور کھانا کھانے لگیں۔

"کیا مطلب ہے آغا جان... کیا ہو گا...؟" صدیقہ بوکھلا کر متوحش سی پوچھنے لگیں۔

"ابھی کھانا کھاؤ سب لوگ خاموشی سے 'مرنے والا نہیں ہوں ابھی میں۔ بعد میں بھی بات ہو سکتی ہے اس موضوع پر۔" آغا جان نے جس طرح جھڑکنے والے انداز میں بات کی اس سے صدیقہ کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ کتنی آسانی سے وہ باور کروا دیا کرتے تھے کہ وہ بیٹیوں کی ماں ہیں۔ چچی جان نے آنکھ کے ہلکے سے اشارے سے انہیں چپ رہنے کو کہا تو وہ بدقت خود پر ضبط کرتیں کھانا زہر مار کرنے لگیں۔ شکر بھی ادا کیا کہ مہپارہ اٹھ کے جا چکی تھی۔ سہیل آفندی کا کردار یوں بھی ہر موقع پر غیر جانب دارانہ ہوتا تھا... نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ اس کے بعد ثمو اطمینان سے کھانا کھاتی رہیں۔ صدیقہ کو انتظار ہی رہا کہ اب وہ دوبارہ اپنا دوبئی واپسی کا مطالبہ دہرائیں گی۔ مگر یہ انتظار، انتظار ہی رہا۔ وہ اندر ہی اندر کھولتی رہیں۔ اور یہ کھولتا لاوا کمرے میں آکر شوہر کے سامنے نکلا۔

"دیکھ لیا... بڑا شوق تھا آپ کو بھائی بھاوج کو واپس لانے کا۔ کیسی ناگن بن کے لوٹی ہے زہر سے بھری۔" وہ خود بھی کسی ناگن ہی کی طرح پھنکار رہی تھیں۔

"اوفوہ... کیا ہو گیا صدیقہ! ایسے ہی ہر سبیل تذکرہ بات کر دی ثمو نے... وہ کون سا رشتہ مانگ رہی ہے۔"

مبین صاحب کو آغا جان کے جواب نے اندر سے پریشان تو کر دیا تھا مگر صدیقہ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے کا مطلب تھا ایک لمبی جنگ اور ان سے جیتنے کی طاقت مبین صاحب میں نہ تھی۔

"وہ گڑے مردے اکھاڑنے آئی ہے یہاں مبین صاحب! جانے دیں اسے دوبئی واپس' یہاں رہی تو بہت سی زندگیاں تباہ کرے گی۔" صدیقہ تلملا کر بولیں۔

"ایک تو تم عورتوں کو بڑی بری بیماری ہوتی ہے۔ فوراً" ہی انتہا پر اتر آتی ہو۔ مہپارہ کی منگنی طے ہے اور خود آغا جان نے طے کی ہے' وہ ایسا کچھ نہیں کریں گے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔" مبین صاحب کو آس تھی۔

"ابھی اور دل آزاری کرنی باقی ہے۔ دیکھا نہیں' کس طرح بولے ہیں میرے ساتھ بچوں کے سامنے۔" ان کا غصہ کسی طور ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو وہ تھم سی گئیں۔

"آجاؤ..." اونچی آواز میں کہا اور پھر دروازہ کھول کر مہپارہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے زور سے ہاتھ میں پکڑی سفید چادر جھاڑی اور جل کر شوہر سے بولیں۔

"اب جواب دیجیے گا اس کے سوالوں کا۔ جو فضولیات بکی ہیں آپ کی بھاوج نے۔"

"صدیقہ..." مبین صاحب سختی سے بولے۔ دھیما مگر غصیلا لہجہ۔ وہ "ہونہہ" والے انداز میں سر جھٹک کر تکیے کا غلاف ٹھیک کرنے لگیں۔

"یہ کیا مسئلہ کھڑا کر رہی ہیں چچی... مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا یوں سب کے درمیان مجھے ڈسکس کرنا۔" مہپارہ اندر سے بے چین تھی' ناراضی سے بولی۔

"چودہ سالوں کے بعد بی بی رانی کو یاد آیا کہ بچپن میں بیٹے کا رشتہ طے ہوا تھا۔ ہونہہ۔" صدیقہ رعونت سے کہہ رہی تھیں۔

تنگ کرو لیں۔

"میں آغا جان سے بات کروں گا مہو۔ تم ٹینشن مت لو۔ وہ ثمو کو بھی سمجھائیں گے۔ ابھی یوں بھی وہ صدمے میں ہے۔"

"صدمے سے بہتر تھا وہ عدت میں ہوتی۔ کم از کم منہ پھاڑ کے جیٹھوں کے سامنے تو نہ بولتی پھرتی۔" صدیقہ تلملائیں۔

"ٹینشن کی مریضہ ہے وہ۔ ڈاکٹر نے کیس ہسٹری دیکھی ہے اس کی دوبار کومے میں جا چکی ہے ماضی میں وہ۔ ابھی بھی اس کا علاج چل رہا ہے۔ عدت میں اسی لیے نہیں بیٹھ سکی۔" مبین صاحب نے انہیں یاد دلایا۔

"ہنہ بہانے سارے۔" انہوں نے متاثر نہ ہونے والے انداز میں سر جھٹکا تھا۔ مہواہ بور ہونے لگی۔ کمال ہے اسے کوئی سیریس ہی نہیں لے رہا تھا جس کا مسئلہ تھا۔

"بہرحال آپ اچھی طرح ان کے کان کھول دیں۔ آئندہ سے میرا نام اپنے اس مغرور اور خود پسند بیٹے کے ساتھ ہرگز نہ لیں۔ ورنہ میں خود ان کو جواب دے دوں گی نیکسٹ ٹائم۔" مہواہ نے قطعیت سے کہا۔

وہ ایسی ہی تھی۔ قطعی اور دو ٹوک۔

"ڈونٹ وری بیٹا جی۔ سب ٹھیک ہو گا۔ وہ تو یونہی تمہاری چچی نے بر سبیل تذکرہ بات کر دی۔ ورنہ ان چودہ سالوں میں انہوں نے کون سا کبھی پلٹ کر دیکھا بھی تھا۔" مبین صاحب نے اسے مطمئن کر دیا۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو ملائکہ یوشع کو سلا چکی تھی۔ ملادہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔

"اف۔" مہواہ نے کیچر اتار کر بالوں میں دونوں ہاتھ چلا کر اے سی کی کولنگ کو محسوس کیا۔

"کیا ہوا۔؟ کچھ بات بنی؟" ملائکہ نے پوچھا۔ وہ بھی شدید حیرت کی زد میں تھی۔ بھلا ایک اتنی اہم بات ان سب سے کیوں چھپائی گئی تھی۔

"بات کچھ تھی ہی نہیں۔ ابو کہہ رہے تھے بات کریں گے آغا جان سے۔ ایسے ہی کچھ لوگوں کو عادت ہوتی ہے سب کی نظروں میں آنے کی۔" وہ کہنی کے بل اس کے بیڈ پہ یوشع کے پاس لیٹتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ پھر نرمی سے سوئے ہوئے گبلو سے بھانجے کا گال چوما اور ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"سیاسی بیان سمجھتی ہیں ناں آپ۔ یہ وہی ہے۔"

ملائکہ نے پرسوچ انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"جب تک معاملہ کلیئر نہیں ہو جاتا تب تک اس معاملے کی سنجیدگی سے نظر نہیں چرائی جا سکتی مہو۔ تمہیں پتا ہے آغا جان نے چچی سے کہا کہ جو وہ چاہیں گی وہی ہو گا۔"

ملائکہ نے اسے وہ بات بتائی جو ابھی تک اس سے چھپا رکھی تھی۔ مہواہ سیدھی ہو بیٹھی۔ بے یقینی سے خود سے چار سال بڑی بہن کو دیکھا۔

"تم اٹھ کے چلی گئی تھیں تب۔" ملائکہ نے گہری سانس بھری۔

"آپ دیکھنا آپی۔ ان چچی کا دماغ تو میں سیٹ کروں گی۔ وہ بھی بہت اچھے سے۔"

مہواہ نے دانت پیستے ہوئے ملائکہ سے نہیں خود سے بھی گویا عہد کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ثمو نے چودہ سال پرانا رشتہ یاد کروا کے سائرہ چچی کے بھی گویا کلیجے پر ہاتھ ڈال دیا۔

"دیکھ رہے ہیں صدیقہ بھابی کی قسمت گھر بیٹھے رشتے پہ رشتہ مل رہا ہے بیٹیوں کو۔" وہ شوہر کے سامنے کلس رہی تھیں۔ سارا دن صدیقہ بھابی کی جی حضوری میں گزارنے کے بعد چچی کو سہیل آفندی ہی غنیمت لگتے جن کو سب کچھ سنا کر وہ دل کا بوجھ ہلکا کرلیا کرتیں۔

"بھئی۔ ان کی بیٹیوں کی قسمت۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عینک لگائی اور قصص القرآن اٹھائی۔ چچی جان تلملائیں۔

"آپ ہی کی وجہ سے نا۔۔۔ ورنہ ایک ہی عمر کی تھیں تزئین اور مہپارہ۔ آغا جان نے بھی ان ہی کا سوچا۔"

"تب تو تم نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اس طرح کا کوئی بچکانہ فیصلہ تمہاری بچیوں کے لیے نہیں کیا آغا جان نے۔" سہیل آفندی نے سادگی سے انہیں یاد دلاتے ہوئے مطلوبہ باب نکالا اور تکیے سے ٹیک لگالی۔ چچی جان جز بز ہو کر شوہر کو دیکھنے لگیں۔

"بس۔۔۔ آپ تو ہر بات کا الزام مجھ پہ ڈال دیا کریں۔ کبھی کوئی فیصلہ اپنی عقل مندی سے بھی کرلیا کریں۔" جل کر بولیں۔

"بھئی 'یہ فیصلے کرنے اور بچوں کے بارے میں سوچنے کا ڈیپارٹمنٹ تمہارا ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے جان چھڑاتے ہوئے اپنی پوری توجہ کتاب کی طرف کرلی تو چچی جان بیٹھ کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

وقار نے ماں جی کا دوپٹہ اٹھا کر ان کے سر پر رکھا تو انہوں نے جوان جہان بیٹے کو اپنے ناتواں بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور رونے لگیں۔

بیٹا ان ہی کا تھا۔ ان کا طریقہ کار کامیاب ہو گیا۔ وہ انہیں چھوڑ کے کہیں نہیں جانے والا تھا۔

صدیقہ بھابی نے بڑی حقارت بھری نگاہ اس خوب صورت اور حسین جادوگرنی پر ڈالی جو اس "فیملی" میں واحد پرائی تھی۔

اور زر نگار۔۔۔ اسے لگا اگلا لمحہ اس کی موت ہے۔ ابھی کے ابھی جو وقار کے منہ سے کچھ نکلے گا اور وہ آر۔۔۔ یا پار۔

"کیا کرتی ہیں ماں جی۔ کیوں گناہ گار کرتی ہیں مجھے۔" وہ ان کے سر کو چومتے ہوئے بڑی محبت سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر کیوں شادی کی مجھے بتائے بنا۔۔۔ ماں مر گئی تھی کیا۔"

وہ اس کے گرد اپنی جذباتیت بھری محبت کا گھیرا تنگ کردینا چاہتی تھیں۔ وہ شرمندہ ہو۔ اسے اپنی غلطی کا اس شدت سے احساس ہو کہ وہ کھڑے کھڑے اس بے گانی عورت کو طلاق دے کر فارغ کرے اور پھر سے پہلے والا وقار آفندی بن جائے "آفندی ہاؤس کا لاڈلا اور چلبلا وقار آفندی۔ جس کے دم سے یہاں کی ساری رونقیں تھیں۔

"اللہ نہ کرے ماں جی۔۔۔ کیسی باتیں کرتی ہیں۔" وقار نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لیا۔

زرنگار کی سانسیں رکنے لگیں۔ قدموں سے جان آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ وقار آفندی اور وہ سب ایک مکمل تصویر تھے۔ اور وہ۔۔۔؟؟؟

اس کا فیصلہ ہونے میں پل بھر ہی باقی تھا یا شاید فیصلہ ہو چکا تھا۔ صرف سنانا باقی تھا۔

وہ ساکت کھڑی مجسمہ لگتی تھی۔۔۔ بے چارگی کی تصویر۔

"تو اس عورت سے کہہ۔ اپنے گھر چلی جائے۔ اسے دیکھ کے میرا دل بہت دکھا ہے۔" ماں جی نے پیچھے سے زرنگار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وقار نے نرمی سے انہیں الگ کرتے ہوئے تسلی دی۔

"چلی جائے گی ماں جی۔۔۔ آپ فکر مت کریں۔" آغا جان ہنکارا بھرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اندر سے بیوی کے

معترف بھی ہوئے' یہ ماؤں کو بھی نا۔ بڑے طریقے آتے ہیں بچوں کو بہلانے اور ان سے اپنی بات منوانے کے۔
"بہت بڑی غلطی کی ہے تم نے وقار۔۔۔! سر جھکا دیا ہے تم نے میرا۔ نجانے کس کس کو پتا چل چکا ہو گا' وہ تو میرے آگے کسی کو بولنے کی ہمت نہیں' اس لیے جتایا نہیں کسی نے۔" بڑے ڈھنگ لب و لہجے میں وہ اسے جتا رہے تھے۔
"جس طرح تم نے اپنا پیسہ اور ذہن اس لڑکی کے لیے لٹائے ہیں اس سے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے مجھے کہ اس کا تعلق کہاں سے ہے۔"
زرنگار وہیں کھڑے کھڑے مرنے لگی۔ اسے خود پر حیرت بھی ہوئی' چار دن عزت کی زندگی کیا جی تھی۔۔۔ ایک طوائف کی بیٹی کے دل کو بے عزتی کے چند حروف سے ٹھیس پہنچنے لگی؟؟؟
"جی بابا جان۔۔۔" وقار آفندی نے گہری سانس اندر کھینچی اور شکستگی سے کہا۔ زرنگار کے حلق میں کانٹے سے اگنے لگے۔ گھر سے وہ کیا کیا وعدے نہیں کر کے لایا تھا۔
(تو اس کی ترجیحات والا پلڑا وزنی نکلا؟)
وقار پلٹ کر زرنگار کے پاس آیا۔
"بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔" اس نے زرنگار کے حسین مگر سفید پڑتے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے عجیب سے انداز میں کہا تو زرنگار کا دل چاہا دھاڑیں مار کے رونا شروع کر دے۔ مگر دفعتاً اس کا ہاتھ وقار کے مضبوط ہاتھ کی ملائم سی گرفت میں آ گیا۔ زرنگار نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ آغا جان کی طرف متوجہ تھا بڑے آرام سے بولا۔
"مگر اب تو ہو گئی نا۔۔۔ اب کیا کریں؟"
ماحول ایک دم سے رنگ بدل گیا۔ قاران آفندی نے کب کی روکی سانس بے اختیار خارج کی اور زرنگار پھر سے جی اٹھی۔
"وقار۔۔۔" آغا جان گرجے' اپنی دھمکی کا اثر ختم ہوتا دیکھ ماں جی آگے بڑھیں۔
"وقار پتر۔۔۔ نہ مذاق کر بوڑھے ماں باپ کے ساتھ۔"
"ماں جی۔۔۔ مذاق تو آپ لوگ بنا رہے ہیں۔ میرے فیصلے کا۔ میں اپنی بیوی اور اس گھر کی بہو کو اس گھر میں لایا ہوں تو یقیناً کوئی قول دیا ہو گا اسے اور آپ لوگ کیا سلوک کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔"
وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا اور اس کا ہاتھ تھامے زرنگار تو جیسے سبک سی ہو کر ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔
"بکواس مت کرو وقار! ابھی فارغ کرو اسے۔ چلتا کرو اس سے پہلے کہ یہ تمہیں چلتا کر دے۔" آغا جان تنفر اور حقارت سے بولے۔
"بابا جان پلیز۔ بیوی ہے میری" آپ اپنی بہو سمجھ کر عزت نہ کریں۔ مگر میں اپنی بیوی کی بے عزتی نہیں کرنے دوں گا کسی کو۔"
وہ اس قدر قطعی انداز میں بولا کہ غم و غصے سے بھرے آغا ذوالفقار آفندی کا ہاتھ اس پر اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ قاران آفندی بہت پھرتی سے ان کے بیچ آئے تھے۔
"آغا جان پلیز۔ موقع کی نزاکت کو سمجھ کے فیصلہ کریں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ خوش اسلوبی سے بھی نمٹ سکتا ہے یہ معاملہ۔"
"چاہے خوش اسلوبی سے ہو یا بد تہذیبی سے۔۔۔ مگر اس گھر کو وقار آفندی اس عورت کے ساتھ قبول نہیں ہے"

ہمارے ہاں وارث خاندانی عورتوں سے پیدا ہوتے ہیں فاران۔" آغا جان گرجے تھے۔
"یہ میری بیوی ہے بابا جان اور وہیں رہے گی جہاں میں رہوں گا۔" وقار کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔
"اس غیر عورت کی خاطر ہاں کو چھوڑ دے گا وقار۔" ماں جی رونے لگیں۔ تو وقار نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"نہیں نہیں ماں جی۔ اس غیر عورت کی وجہ سے آج آپ لوگ مجھے چھوڑ دیں گے۔" وہ دکھ سے بولا۔
"اس گھر میں دوبارہ قدم تب رکھنا وقار! جب اس "موذی مرض" سے پیچھا چھڑالو۔"
آغا جان نے فیصلے پر گویا مہر ثبت کر دی تھی۔
"آغا جان۔ اس نے ایک غلط فیصلہ کیا ہے' آپ تو نہ کریں۔" فاران کو پریشانی نے گھیر لیا۔
گھر منتوں سے بنتا تو نہیں کرتے مگر ٹوٹ ضرور جایا کرتے ہیں اور یہ بات فاران اچھی طرح جانتے تھے۔
"بکواس مت کرو اور جانے دو اسے! اگر اسے شوق ہے اس عورت کے ساتھ رہنے کا۔ دیکھتا ہوں غریبی میں کتنا ساتھ دیتی ہے اس کا۔ جس نے لاکھوں کا بینک اکاؤنٹ اڑا دیا۔ پلاٹ بکوا دیا۔ وہ اس سے بھی بھیک منگوائے گی۔"
آغا جان تو گویا نفرت کا طوفان بنے ہوئے تھے اور ادھر وقار آفندی بھی ان ہی کا خون تھا۔ تیجنے پہ آتا تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتا۔
اور پھر لاکھ ماں جی نے منتیں ترلے کیے فاران پیچھے بھاگے مگر وہ زرنگار کا ہاتھ تھامے ہمیشہ کے لیے "آفندی ہاؤس" سے نکل گیا۔ جہاں واپسی کی قیمت زرنگار کی جدائی تھی۔
اور یہ قیمت وقار آفندی کی زندگی کے اکاؤنٹ میں موجود نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آکے اس سے لپٹ کے کتنی ہی دیر روتی رہی' لرزتی کپکپاتی' خوف زدہ۔
"اب بس کرو زری۔ بے وقوفوں کی طرح روئے جا رہی ہو۔" وقار نے تنگ آکر اسے ڈپٹا تو آنسو پونچھتی زرنگار کی ہنسی نکل گئی۔
"اچھا۔ عقل مند کسی اور طرح سے روتے ہیں کیا؟" اور روتے میں ہنس دینے کا منظر دھوپ میں اچانک چھاؤں آجانے کے احساس کا سا تھا۔ وقار آفندی مسحور ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ رونے سے پسیجا ہوا چہرہ۔ نم سرخ مرطوب ہونٹ اور ہموار دانتوں کی قطار۔
اس نے ہاتھ کھینچ کر زرنگار کو خود سے قریب کیا۔
"اب کیوں رو رہی ہو؟"
اس نے اب بر زور دیتے ہوئے باری باری اس کی رونے سے تپتی آنکھوں پہ لب رکھے۔
"یونہی۔ خیال آرہا ہے اگر تم مجھے چھوڑ دیتے تو۔" اس کی آواز میں پھر سے نمی اتر آئی معصومیت سے بولی تو وقار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔
"ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی ہے تم نے وقار آفندی کی۔ تمہیں تو اب تب ہی چھوڑے گا جب اس دنیا کو۔"
"ہش۔" اس کی ادھوری بات ہی سے لرز کر زرنگار نے نرم ہتھیلی اس کے ہونٹوں پر جمادی۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔
"آئی ہیٹ یو وقار آفندی۔"
"آئی ہیٹ یو زرنگار آفندی۔"

وہ اس کے کان میں گنگنایا تو زرنگار اس کی بانہوں میں سمٹی مسکرا دی۔ انہوں نے محبت کے لیے "دنیا" ٹھکرا دی تھی اور اپنی نئی دنیا بسانے جا رہے تھے۔ مگر ٹھکرائے جانے والی دنیا بہت ظالمانہ انداز میں بدلہ لیا کرتی ہے۔ بدنصیبی ان کی تاک میں تھی۔

☆ ☆ ☆

صدیقہ بھابی کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ اگلے روز جب لڑکیاں اپنے تعلیمی مراکز میں جا چکیں تب آغا جان نے صدیقہ بھابی اور مبین صاحب کو اسٹڈی میں بلایا۔

"صاف لفظوں میں کہہ دیجیے گا مبین صاحب! مہاد کی شادی طلال سے ہی ہو گی۔ ثمو میری بیٹی کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔" راستے میں وہ شوہر کو "پکا" کرتی آئی تھیں۔ اسٹڈی میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں میاں بیوی ٹھٹکے۔ ثمو بھی وہاں پہلے سے موجود تھیں۔

"بیٹھو۔" آغا جان نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ صدیقہ بھابی کے دل کو تو ہاتھ پڑنے لگ گئے تھے۔ ایک کڑی نگاہ ثمو پر ڈالتے ہوئے وہ بیٹھی تھیں۔ مگر بڑی غیر آرام دہ کیفیت میں۔ ان کے برعکس ثمو بہت پرسکون تھیں۔ بس ان کی آنکھوں سے ایک عجیب سی بے چینی اور ناسمجھ میں آنے والی کیفیت جھلکتی رہتی تھی۔ جس سے بہت سرد مہری اور بیگانے پن کا تاثر ملتا تھا۔

"میں نے تم دونوں کو اس لیے اکٹھے بلایا ہے کہ باہمی سوچ بچار کے بعد کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔" کھنکھارتے ہوئے آغا جان نے بات شروع کی تھی۔

"کیسا فیصلہ آغا جان....؟" مبین صاحب نے بے ساختہ پوچھا۔ اندر سے بے چینی تو انہیں بھی تھی۔

"بچوں کی شادی کا مبین۔" آغا جان اتنے سکون سے بولے کہ تائی جان کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ فوراً "شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ "دیکھا۔"

"جی آغا جان۔ بس مہاد کی منگنی نمٹ جائے اس کے بعد باقی بچوں کی بھی بسم اللہ کریں۔" مبین صاحب کا انداز بہت محتاط سا تھا۔ تائی جان کو شوہر کی پہلے سے پیش بندی کرنے والی بات پسند آئی۔

"ہوں۔" آغا جان کھنکھارے۔

"لیکن میں چاہ رہا تھا صدیقہ اور مبین! کہ اب ثمو آ گئی ہے۔ تم تینوں مل کے بچوں کے مستقبل کا فیصلہ کرو۔" آغا جان سنجیدہ تھے۔

"آغا جان آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن مہاد کی بات تو طے ہو چکی۔ صرف منگنی کی تاریخ باقی ہے۔" مبین صاحب ادب سے بولے۔

"غیروں کی خاطر اپنوں کے دل نہیں توڑا کرتے مبین۔" آغا جان نے یوں کہا جیسے کوئی بہت عام سی بات ہو۔

صدیقہ نے ثمو کو کچا چبانے والے انداز میں گھورا۔ وہ مستقل ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے بیٹھی اپنے ہاتھوں میں تھامی خوب صورت سی کی چین سے کھیل رہی تھیں جیسے اس ماحول میں صرف مزا لینے کی خاطر بیٹھی ہوئی ہوں۔

"مگر ہم بچوں کا بھی دل نہیں توڑ سکتے آغا جان....! اگر آپ موحد کے لیے کہہ رہے ہیں تو تزئین سے بھی اس کا رشتہ طے کیا جا سکتا ہے۔"

صدیقہ نے پہلو بدلتے ہوئے بظاہر ادب سے کہا' ورنہ اندر سے ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ خوب ٹکا کے جواب دیں۔ وہ بھی ڈائریکٹ ثمو کو۔ مگر یہ آغا جان کا رعب و دبدبہ ہی تھا جو ان جیسی منہ پھٹ عورت کو بھی زبان بندی پر

مجبور کر دیتا تھا۔

"ہوں۔۔۔" چند لمحے چپ رہنے کے بعد آغا جان نے ہنکارا بھرا اور ثمو کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم کیا کہتی ہو ثمو۔۔۔؟"

اور ثمو نے یوں چونکنے کی اداکاری کی جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ وہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

"جی۔۔۔ مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟"

صدیقہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئیں۔

"گھر میں اور بھی بچیاں ہیں ثمو! اگر تم کوئی فیصلہ کر لو تو مہاہ کی منگنی والے روز موحد کی منگنی بھی رکھ لیں گے۔"

آغا جان کی نرمی ثمو کے لیے بے مثال تھی۔ ان کی بات سن کر ثمو نے عجیب سی مسکراہٹ تائی جان کی طرف اچھالی اور ان ہی پر نگاہیں جمائے ہوئے مخاطب آغا جان سے ہوئیں۔

"ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی آغا جان! یہ فیصلہ موحد خود کرے گا اور پھر آپ خوامخواہ کسی کو ہمارے لیے باؤنڈ نہ کریں۔ موحد اس گھر کا واحد جانشین ہے۔ آپ کا وارث ہے۔ اسے بھلا رشتوں کی کیا کمی ہوگی۔ جہاں وہ چاہے گا وہیں کریں گے۔"

تائی جان کی کرسی پر تو جیسے کیلیں اگ آئیں۔ چہرے سے آگ کی لپٹیں نکلیں۔

کتنے آرام سے وہ بیٹے کی ماں ہونے کا تفاخر جتا رہی تھی۔ آغا جان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ میرا پوتا۔ میرا وارث۔" وہ بھی تفاخر سے بولے تو تائی جان جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں پھر کل فون کر کے طلال کی ماما سے منگنی کی تاریخ طے کر لوں گی آغا جان۔ کیونکہ اس کے بعد ان کی فیملی میں ایک دو شادی کے فنکشنز آ رہے ہیں۔ پھر مزید لیٹ ہو گی منگنی۔"

انہوں نے اکھڑے اکھڑے انداز میں پتا نہیں اجازت مانگی یا انہیں مطلع کیا۔ بہرحال آغا جان نے محض اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی خاموشی سے باہر نکل گئے۔

گہری سانس بھرتی ثمو بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر گویا تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

"بھائی کا موڈ کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اب اللہ کی مرضی کہ اس نے آپ کو بیٹا نہیں دیا۔ مگر حد ہوتی ہے جیلسی کی بھی، صبح ہی موحد کا صدقہ دوں گی۔"

"میں خود کالا بکرا منگواؤں گا ثمو۔ تم بے فکر رہو۔" آغا جان نے انہیں تسلی دی ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی ان کی بات سے متفق ہیں۔

وہ ان سے جانے کی اجازت لے کر باہر جاتے جاتے مڑیں۔

"میں سوچ رہی تھی کہ موحد اب فیکٹری جایا کرے۔ فاران کا آفس تو تھا نا وہاں۔۔۔؟"

وہ بڑے جتانے والے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

آغا جان کے سینے میں ٹیس سی اٹھی۔ انہوں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ثمو کے دل کی کیفیت بدلی، تو وہ فوراً باہر نکل گئیں۔

"ہنہ۔۔۔ یہ انوکھا پیار ہے۔ چودہ سال کا بن باس دے دیا بیٹے کو اور اس کا آفس ختم نہیں کیا۔"

☆ ☆ ☆

ثمو کے والدین چند سال ہوئے وفات پا چکے تھے۔ ان کا ایک ہی بھائی جو شارجہ میں ہی مقیم تھا۔ ثمو کی بہت بڑی سپورٹ تھا۔

"ثریا آئی ہے پاکستان اور ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آئی۔" انہوں نے شکوہ کیا تو روحیل ہنس دیے۔
"اس کے اپنے ہی مسئلے مسائل ہوئے تھے۔ ہاسٹل میں رہنے کی ضد کر رہی تھی۔ بس اسی ایڈجسٹمنٹ میں بزی تھی۔"
"تو میرے پاس آکے رہتی۔ پھپھو کا گھر ہے اس کی۔" ثمو نے خفگی سے کہا۔ موحد کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے ثمو۔ مگر تمہارے اپنے مسائل ہیں ابھی تم خود تو ٹھیک سے ایڈجسٹ ہو جاؤ۔ پھر اسے کہوں گا تمہارے پاس آجائے گی۔ موحد سے تو ویسے بھی بہت دوستی ہے اس کی۔" وہ بشاشت سے کہہ رہے تھے۔ ثمو نے ادھر ادھر کی چند ایک باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔
موحد بے چینی سے ان کی گفتگو ختم ہونے کے انتظار میں تھا چھوٹتے ہی پوچھنے لگا۔
"یہ کیا شوشا چھوڑا ہے آپ نے ماما! وہ منہ پھٹ لڑکی اور موحد آفندی؟" اس نے بے یقینی سے اپنے سینے پر انگوٹھا رکھا تھا۔
"میں تو یونہی ان لوگوں کے مکرو فریب یاد دلا رہی تھی ان لوگوں کو۔ ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں تمہیں اس دیگار میں پھنسانے کا۔" ثمو نے اس کے بالوں کو پیار سے سنوارتے ہوئے توجیہہ پیش کی۔
"سہواء سے رشتہ جوڑنے کا مطلب ہے صدیقہ بھابی سے پھر سے رشتہ جوڑنا جو کہ میں بالکل بھی نہیں چاہتی۔"
"آپ نے اس روز کی تقریر نہیں سنی محترمہ سہواء آفندی کی کہ اس دنیا کا آخری بندہ بھی ہوا موحد آفندی تو اسے قبول نہیں ہوگا۔" موحد کو یاد آیا۔
ثمو کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔
"وہ صدیقہ بھابی کی بیٹی ہے۔ ان ہی کی طرح دلوں کو توڑنے اور زبان کے خنجر چلانے میں ماہر ہو گی نا۔"
"پھر آپ نے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ میرا مستقبل کیا ہو گا۔ اتنی اچھی جاب چھوڑ کے آیا ہوں میں۔" موحد نے سر جھٹکا۔ دو دفعہ سہواء آفندی سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ اور دونوں بار اسی نے اپنی زبان کے جوہر دکھائے تھے۔
ثمو کے لبوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔
"کل سے فیکٹری جاؤ گے تم۔ تایا جان اور چچا جان کے ساتھ اور فاران کے آفس میں بیٹھو گے۔"
موحد کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
"بعض اوقات ایک لمبے عرصے تک زندگی انسان سے خراج وصول کرتی ہے اور جب صلہ ملنے کی باری آتی ہے تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔" اس کی بات سن کر ثمو زور دے کر بولیں۔
"اب یہ خراج تم وصول کرو گے موحد! اور صلہ بھی تم ہی نے لینا ہے۔ وہ سب جو ہمارا ہے اور ان لوگوں کے پاس ہے۔"
موحد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ثمو نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اس گھر میں سب سے اہم حیثیت تمہاری ہے۔ آغا جان کی نسل کے امین اور اس جائیداد کے وارث ہو تم اور تم یہاں اسی احساس کے ساتھ رہو موحد۔ کسی سے ڈرنے یا جھکنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔"
موحد نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے شرارت سے سر جھکایا تو وہ بھی ہنس دیں۔

☆ ☆ ☆

وہ مبین صاحب کے ساتھ فیکٹری پہنچا۔ لیدر گارمنٹس کی یہ شہر کی سب سے بڑی فیکٹری تھی۔

"اب تو کئی برسوں سے ہم بیرون ممالک مال ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔" انہوں نے موحد کو فیکٹری کے معائنے کے دوران بتایا۔ تمام اسٹاف اور ورکرز سے موحد کا تعارف کرایا گیا۔ پھر وہ اسے لیے اس کے لیے مختص آفس کی طرف بڑھے۔

"یہ آفس وقار کا تھا۔" دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ موحد کو بتایا۔ تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا تو وہ مزید بولے۔

"جب وقار یہاں سے گیا تب فاران اس کے آفس میں آ گیا۔ وہ بہت مس کرتا تھا وقار کو۔"

انہوں نے دروازہ دھکیلا اور اسے ساتھ اندر لے آئے۔ شاندار وال پینٹنگز عمدہ فرنیچر اور دبیز کارپٹ۔

"اس کے بعد جب فاران بھی چلا گیا تو بھی یہ آفس بند نہیں کیا گیا روزانہ اس کی صفائی ہوتی ہے اور دو چار سال بعد فرنیچر تبدیل ہوتا ہے۔" وہ مسلسل اسے بتا رہے تھے۔

موحد کچھ عجیب تکلیف دہ اور بے چین سے احساسات کے زیر اثر ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ تایا جان نجانے کیا کیا تفصیلات بتا رہے تھے۔

"میں مکرم کو بھیجتا ہوں ابھی ٹھہر کے۔ وہ تمہیں چیدہ چیدہ معاملات سمجھا دے گا۔ باقی اب روزانہ آؤ گے تو دلچسپی بھی پیدا ہو گی اور سمجھ میں بھی آ جائے گا۔" وہ مسکرا کر بولے پھر اس کا شانہ تھپک کر اسے وسیع میز کے پار رکھی ریوالونگ چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں چلتا اس کرسی تک آیا۔

"بس یہ کرسی کبھی نہیں بدلی گئی اور یہ میز۔ یہ وقار کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔ اور فاران نے اسے گفٹ کی تھیں۔" وہ میز کی سطح پر دونوں ہتھیلیاں جمائے کھڑے تھے۔ موحد اس کرسی پر بیٹھ گیا۔

مبین صاحب کی آنکھوں میں خفیف سی نمی اتر آئی۔

"آج اس کرسی کو اس کا صحیح حق وارمل گیا ہے۔" مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔ وہ میز پر پڑی فاران اور وقار آفندی کی فریم شدہ تصویر اٹھا کے دیکھ رہا تھا۔

اور آج بڑے عرصے کے بعد وہ شدید جذباتیت کا شکار ہونے لگا۔ وہ تو صد شکر تایا جان اسے مستقبل کی دعاؤں سے نوازتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ورنہ شاید اس کے تاثرات سے وہ آنے والے وقت کا تھوڑا سا اندازہ لگا ہی لیتے۔

☆ ☆ ☆

اس نے کرسی گھسیٹی دھپ سے اپنا بیگ ٹیبل پر پھینکا اور کرسی میں دھنس گئی۔

سن گلاسز اور کی چین ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے سومیہ کو گھور کر دیکھا۔

"اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" وہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ سومیہ نے کھا جانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں نمیر آفندی۔ کسی خوب صورت لڑکی سے منتیں کروا کروا کے لنچ کے لیے راضی ہو جانا کوئی کارنامہ ہرگز نہیں ہے۔"

"خوب صورت۔۔۔؟" اپنی آنکھوں کو خفیف سی جنبش دے کر اس نے ریسٹورنٹ میں ادھر ادھر گویا کسی خوب صورت لڑکی کو ڈھونڈا۔

"اف۔" سومیہ کا جی چاہا اسے کچا چبا جائے۔
"تمہیں میں نظر نہیں آرہی؟"
"آرہی ہو۔ مگر تم نے تو "خوب صورت" کہا تھا۔" وہ سادگی سے بولا سومیہ نے ٹیبل پر پڑا کانٹا اٹھا کر اس پر تان لیا۔
"واجب القتل ہوتے ہیں ایسے بندے، جو لڑکیوں کا دل توڑتے ہیں۔"
"اوکے۔ اوکے۔" نمیر نے ہنستے ہوئے دونوں ہاتھ ہار ماننے والے انداز میں اٹھا دیے۔
"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ خوب صورت لڑکی۔" سومیہ کے دلکش نقوش میں سرخی دوڑ گئی۔ مصنوعی غصے سے اسے گھور کر بولی۔
"ہاں۔ خود سے تو کبھی نہیں مانو گے۔"
"آرڈر کرو لنچ کا۔ پھر مجھے ایک میٹنگ میں بھی جانا ہے۔" نمیر نے جلدی مچائی۔ ویٹر کو اشارے سے بلایا تو سومیہ جلدی سے مینو کارڈ اٹھا کر ڈشز دیکھنے لگی۔
"اب بتاؤ جلدی سے۔ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"
کہنی میز کی سطح پر ٹکائے ہتھیلی پر چہرہ جماتے ہوئے وہ چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"زندگی کا تو کام ہی ہے گزرنا' سو گزر رہی ہے۔"

کرسی سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے آرام دہ حالت میں بیم دراز۔ وہ ایسا ہی تھا۔ اوپر سے ٹھنڈا میٹھا چشمہ دکھائی دیتا اور اندر کھولتا ہوا لاوا۔

ہر اک دن اداس دن' تمام شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

وہ افسردہ سے انداز میں کہہ کر چپ ہو گیا تو سومیہ کو خلجان ہونے لگا۔
"خدا کے لیے نمیر! اتنے ڈراؤنے شعر مت سنایا کرو مجھے۔ زندگی بہت حسین ہے۔ اسے اس کی خوب صورتی کے ساتھ محسوس کرو۔" سومیہ یوں بولی جیسے محض ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی ہو۔ اس میں بچپنا تھا۔ کیونکہ اس نے زندگی کے تلخ حقائق کو ابھی تک نہیں چکھا تھا۔
"جن کو زندگی نے ہمیشہ ٹھوکروں پر رکھا ہو انہیں یہ زندگی کیسے خوب صورت لگے سومیہ ڈیر۔" گہری سانس بھرتے ہوئے گویا اندر کی کثافت کو کم کیا۔
"اگر بندے کی نظر ٹھیک ہو اور وہ اپنے آس پاس خوب صورت چیزوں کو آبزرو کرے تو زندگی واقعی حسین لگنے لگتی ہے۔" سومیہ نے جتانے والے انداز میں کہا تو نمیر نے ادھر ادھر تانک جھانک کر کے کارنر والی ٹیبل پر بیٹھی ایک آنٹی نما میک اپ زدہ عورت دریافت کر ہی لی۔
"واقعی۔ وہ دیکھو ذرا۔ کافی خوب صورت ہیں آنٹی۔ انہیں دیکھ کے تو واقعی زندگی حسین لگتی ہے۔"
"ہاں۔" سومیہ نے مایوس ہو کر کرسی سے پشت ٹکائی اور بازو سینے پر لپیٹ کر حسرت سے بولی۔
"کاش! تمہاری نزدیک کی نظر بھی اتنی ہی اچھی ہوتی۔" ویٹر کھانا سرو کرنے لگا تھا۔
"یہ تمہارے روز روز کے آرڈرز نہیں مانا کروں گا میں۔ آج ملاقات ہو گئی اینڈ دیٹس آل۔ مجھے ڈسٹرب مت کیا کرو۔" کھانے کے دوران وہ قطعی انداز میں اسے سمجھا رہا تھا۔ سومیہ نے چکن کے پیس میں کانٹا پھنساتے ہوئے دانت نکوسے۔
"اف۔ یعنی میں تمہیں "ڈسٹرب" کرنے لگی ہوں؟" بڑے انداز سے پلکیں بھی جھپکائیں۔ ہونٹوں کا پاؤچ

بھی بنایا۔ نمیر ضبط کرتے ہوئے بھی ہنس دیا۔
"بالکل ڈک (بطخ) لگ رہی ہو ڈفر۔" وہ برا سا منہ بنا کر کھانا کھانے لگی پھر اسے جتایا۔
"میں تمہیں کبھی بھی ڈسٹرب کر سکتی ہوں نمیر آفندی۔ کیونکہ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔"
"بالکل۔ لیکن میرے راستے اور منزل الگ ہے سومی۔ یہ بات مجھ سے ملتے ہوئے یاد رکھا کرو۔" نمیر نے فی الفور جواب دیا۔ بلکہ وارننگ۔
وہ مارے دکھ کے ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگی۔
"کتنے بدتمیز لگتے ہو اس طرح میرا دل توڑتے ہوئے۔" افسوس سے کہہ کر وہ پھر سے کھانا کھانے لگی۔ اسے بھوک بہت لگتی تھی۔ اب دکھ کی باتیں اپنی جگہ اور کھانا اپنی جگہ۔
"میرے دل پہ قفل پڑا ہے سومیہ! جس پر سارے اسم بے کار ہیں تم اپنی توانائیاں غلط جگہ پر ضائع مت کرو۔" وہ سنجیدہ تھا۔ بے حد سنجیدہ۔
"تو کیوں گھٹ رہے ہو اندر ہی اندر۔ جاؤ اور اپنے دادا کے سامنے کھڑے ہو جاؤ اور بتاؤ کہ تم بھی ان کے وارث ہو۔ نمیر آفندی سن آف وقار آفندی۔ مجھے ایک سائیڈ پہ رہنے دو میرے جذبوں سمیت۔ جب ان سے نمٹ کے آجاؤ گے تو میں تمہیں محو انتظار ملوں گی۔"
وہ ایسی ہی تھی۔ ہر بات کو اتنا ہلکا لیتی تھی کہ مخالف بھی اس کی طمانیت کی داد دیے بنا نہیں رہتا تھا۔ لمحہ بھر کو

نمیر بھی چپ رہ گیا۔ پھر نگاہ میں خفگی بھر کے اسے دیکھنے لگا۔
چند لمحے وہ یونہی مگن سی کھانا کھاتی رہی پھر چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے نمیر کو دیکھا۔
"ارے۔ تم بھی بتا سا تاکہ آج میں کچھ زیادہ ہی پیاری لگ رہی ہوں مگر کھانا تو کھالو۔ مجھے بعد میں دیکھ لینا۔"
"بہت ڈھیٹ ہو تم سومی۔" وہ تھک کر کھانا کھانے لگا۔

کسی سے کوئی ناتا ہم کبھی جوڑا نہیں کرتے
ملا لیں ہاتھ تو پھر عمر بھر چھوڑا نہیں کرتے
ہمیں معلوم ہے کہ جیت بالآخر ہماری ہے
سو ہم وقتی شکستوں پہ دل تھوڑا نہیں کرتے

وہ بڑے انداز سے بولی تھی۔
نمیر آفندی اس کی حالت پر جیسے تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

ایف اے کر کے فیکٹری سنبھالنے والا وقار آفندی جب نوکری کی تلاش میں نکلا تو صحیح معنوں میں چکرا گیا۔
نہ ہاتھ میں کوئی ہنر نہ کوئی شاندار ڈگریاں۔ نوکری ملتی بھی تو کس بنیاد پر۔ فیکٹری میں تو آغا جان نے داخلہ بند کر دیا تھا۔
"فکر مت کرو وقار! میں خرچا بھیجا کروں گا۔" قاران کا اس سے مسلسل رابطہ تھا۔
"اپنے پاس ہی رکھیں وہ اپنی کمائی۔ ایک دھیلے کا بھی روادار نہیں ہوں میں۔" ہٹیلا اور ضدی تو وہ بھی بہت تھا۔ زرنگار نے سمجھایا۔
"تمہارا حق ہے وقار۔"
"آفندی ہاؤس کی کسی بھی چیز پر میرا کوئی حق نہیں رہا زری۔ وہاں سے نکالا گیا ہوں میں خالی ہاتھ۔ کسی نے زبانی

کلامی دعا تک ہوئے کر نہیں بھیجا۔" اس کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔
"زندگی بہت مشکل ہو جائے گی وقار۔" وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ وقار نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔
"پیسے کے بغیر۔۔۔؟ اور میرے ساتھ؟" بوے سلگتے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ نرمی سے مسکرادی۔
"تمہارے لیے ہی کہہ رہی ہوں وقار! میری تو زندگی ہی تم بن گئے ہو۔ میں تو اس طوفان میں اپنی ساری کشتیاں جلا کے اتری ہوں۔ واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"بس۔۔۔ تم اپنی ان ہی پیاری پیاری باتوں سے میرا حوصلہ بڑھاتی رہو۔ پھر دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
مگر زرنگار نے اس سے زیادہ زندگی کی تلخیوں کو چکھا تھا۔ زندگی کی ہر ٹھوکر ایک سبق سکھایا کرتی ہے۔ اور زرنگار کے پاس تو ان اسباق کی ایک پوری کتاب تھی۔
تمرفی الوقت وہ وقار آفندی کی آنکھوں میں اترے خوابوں کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو اثبات میں سر ہلا دیا۔
اور اگلے کئی دن محض بھاگم دوڑ تھی اور نوکری کی تلاش۔ ناکامی۔۔۔ ناکامی۔۔۔ فقط ناکامی۔

٭ ٭ ٭

بازار میں زرگل بائی نے بیٹی کو دیکھ لیا تو آب دیدہ سی گلے لگ گئی۔ بیٹی کا حلیہ ہی اس کے حالات کی داستان سنا رہا تھا۔ واپسی پر اس کے ساتھ ہی آ گئی۔۔۔ زرگل بائی۔

طوائف مردوں کے لیے طوائف ہوتی ہے۔۔۔ اپنی اولاد کے لیے وہ ایک ماں ہوتی ہے۔ زرگل بائی نے چاہے زرنگار کو بھی کمائی کا ذریعہ ہی سمجھا ہو۔ مگر اس کے لیے وہ فقط ایک ماں کی صورت تھی۔ طوائفیں اپنی بیٹیوں کو بھی طوائف ہی بنایا کرتی ہیں۔ ان کے پاس اور کوئی "آپشن" نہیں ہوتا۔
"گھر تو اچھا ہے۔۔۔ کماتا نہیں ہے کیا؟ پہلے تو بڑی دولت لٹائی اس نے تیرے اوپر۔" وہ پورے فلیٹ کا جائزہ لیتے ہوئے تنقیدی انداز میں کہہ رہی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے اماں! بس نوکری مل جائے تو جو مسئلے ہیں وہ بھی حل ہو جائیں گے۔" وہ جوس کا گلاس ماں کو تھماتے ہوئے بولی۔
"بڑی بے وقوف نکلی تو زری۔ لاکھوں کا وجود مٹی میں رول دیا تو نے۔ "اس" کی خاطر۔"
زرگل بائی نے تاسف اور تحقیر بھرے انداز میں سونے کی انگوٹھیوں بھرے ہاتھ سے فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔
زرنگار کو ماں کی بات پر غصہ نہیں آیا۔
"عزت کی خاطر اماں۔ سو ابرا میں نے بھی نہیں کیا۔" وہ مسکرائی تو چہرے پر ذرہ بھر بھی ندامت نہ تھی۔
"ہنہ۔۔۔ عزت کو کتنے دن چاٹے گی بیٹھ کر زری۔ اپنے میاں سے بات کر۔ کون سا دھندا کرتی تھی تو۔ گانا گا کے تو شریف گھرانوں کی لڑکیاں بھی کماتی ہیں۔"
"مگر طوائف کے گھر یہ سب "دھندا" کہلاتا ہے اماں۔" وہ آزردہ ہوئی۔
"اپنے شوہر سے کہہ۔ اگر مان جائے تو میں کام دلوا دوں گی تجھے۔ ٹی وی کا ایک ڈائریکٹر واقف ہے میرا۔"
شیطان کا ایک روپ نہیں ہوا کرتا۔ آج وہ زرگل بائی بن کے آیا تھا۔
زرنگار ہنسنے لگی۔
"جوس پیو اماں! ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
زرگل بائی برا مان گئی۔

"دل کٹ رہا ہے میرا تجھے ان برے حالوں میں دیکھ کر۔ فلیٹ بھی یقیناً "کرائے کا ہوگا۔ کل کو فاقوں پہ نوبت آجائے گی۔"

"اماں۔ تم تو ایسے ہی جذباتی ہو رہی ہو۔ میں بہت خوش ہوں وقار کے ساتھ۔ عزت کے ساتھ محبت ملے تو لڑکی پھول کی طرح کھل اٹھتی ہے۔" زرنگار نے اسے یقین دلایا۔

"ہونہہ۔ کل تو اسی عزت کی چٹنی کے ساتھ روٹی لگا کے کھانا۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے جوس کے گھونٹ بھرنے لگی۔ دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وقار آفندی سے بھی بازپرس ضرور کرنی ہے۔ بھئی خرید لیا تو کیا ہوا۔ اچھے حالوں میں تو رکھے زرگل بائی کی بیٹی کو۔

"مائیں اپنی اولاد کو بد دعا نہیں دیا کرتیں اماں! دعا کرو میرے لیے۔ اپنے داماد کے لیے۔" زرنگار نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"میں نے تو سمجھایا تھا تجھے زری! عیش کر رہی تھی کوٹھے پر۔ یہ عشق و عاشقی طوائفوں کو راس نہیں آتی۔" وہ ابھی بھی متاسف تھی۔

زرنگار نے اسے ٹوکا "میں طوائف نہیں تھی ماں! بس ایک طوائف کے گھر پیدا ہونا میرا گناہ بن گیا۔"

"تو میں نے بھی تیری لاج رکھی۔ کبھی کام دھندے کا نہیں کہا تجھے۔ پتا ہے لوگ.... کتنا دیتے تھے تیرا؟ مگر میں نے کہہ دیا۔ بچی صرف نواز بیچے گی اور بس۔"

زرگل بائی اپنا احسان جتا رہی تھی۔ زرنگار نے گہری سانس بھری۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ وقار کے آنے سے پہلے ہی ماں چلی جائے۔

مگر ہر دعا کی قسمت میں قبولیت نہیں لکھی ہوتی۔

تھکا ماندہ وقار اسی وقت گھر آیا تو زرگل بائی کو وہاں پا کر اسے جھٹکا سا لگا۔ فی الفور زرنگار کو دیکھا۔

"وہ..." وہ بھی گڑبڑا گئی۔

"اماں آج بازار میں مل گئی تھیں تو... گھر دیکھنے چلی آئیں۔"

"ہوں... دیکھ لیا گھر...؟" گھر آئے مہمان کو اب کیا کہتا۔ پھول نواز بیوی کی ماں۔

"ہاں دیکھ لیا۔" زرگل بائی گلاس رکھتے اٹھ کھڑی ہوئی اور وقار کے بالمقابل آکر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چھوٹا پڑا نا حال اپنی نازوں پلی بیٹی کا۔ اس سے اچھے حالوں میں تو یہ طوائف کے کوٹھے پر تھی وقار آفندی! تم تو ایک طوائف جتنا بھی نہیں کما سکے۔"

"اف...!" زرنگار کا دماغ چکرا سا گیا۔ ادھر وقار آفندی ایک دم سے غیض و غضب کی لپیٹ میں آیا تھا۔

مہپاہ سب سے پہلے آکر گاڑی میں بیٹھی اور فائل کھول کر نوٹس چیک کرنے لگی۔ باقی تینوں بھی بس آنے ہی لگی تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا تو مہپاہ نے بے دھیانی سے ڈرائیور کو دیکھا اور پھر اپنے نوٹس دیکھنے لگی۔ مگر پھر ایک جھٹکا کھا کر اس نے دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر موحد آفندی پورے کروفر کے ساتھ براجمان تھا۔

"ایکسکیوزمی مسٹر۔ اس گاڑی میں ہم جاتے ہیں۔" تیوری چڑھاتے ہوئے اطلاع دی۔

"نہیں مرضی تو نہ جاؤ۔ پتا تو ہوگا تمہیں یہ بابا جان کی گاڑی ہوا کرتی تھی۔ آج سے یہ میں استعمال کیا کروں گا۔"

موحد آفندی نے بے حد اطمینان سے کہتے ہوئے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حیا بخاری

دنیا میں ہر بچی کو خواہ اس کا تعلق کسی قبیلے، قوم یا مذہب سے ہو' اپنی گڑیا بہت عزیز ہوتی ہے۔۔۔ بے نام بچپن سے ہی اس کی ممتا بھری فطرت کا اظہار' ہر لڑکی کو ہی گھر گھر کھیلنے کا شوق۔۔۔ اپنے گھر کی خواہش کا اظہار' ہر لڑکی بچپن سے ہی رشتوں کے معاملے میں حساس۔۔۔ عزت' محبت' خدمت کے جذبے سے سرشار۔۔۔

پتا ہی نہیں چلتا' کھیل کھیل میں بچیاں کب بڑی ہو جاتی ہیں۔

اور اللہ بخشے میری دادی کو جو کہتی تھیں، مائیں نمانیاں بھی بڑی بھولی ہوتی ہیں۔ بیٹیوں کو ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتی ہیں یا تو شادی کے بارے میں اتنے اونچے خواب دکھاتی ہیں کہ ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے۔ تھلہ کر کے سارے خواب کرچیاں بن کر آنکھوں میں چبھنے لگتے ہیں۔ یا پھر اتنا ڈراتی ہیں کہ بیچاری خوشی کو پیچھے دھکیل ساری عمر اس خوف میں جینے لگتی ہیں کہ ابھی کوئی غلطی ہوئی۔ ٹرک بلوایا' سامان لدوایا اور گھر سے باہر۔۔۔

اور اب میں کہتی ہوں۔ دادی بالکل سچ کہتی تھیں۔ ماؤں کو نا صرف بیٹیوں کو تصویر کے دونوں رخ سے آگاہ کرنا چاہیے بلکہ ان کو یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ شادی شدہ بچیوں کی زندگی پر خطر بل کھاتے راستوں اور خوب صورت ہری بھری راہ گزر' دونوں جیسی ہوتی ہے۔ اب یہ ان پہ منحصر ہے کہ وہ کس استقامت اور سمجھ بوجھ کے ساتھ یہ راستہ کاٹتی ہیں۔ بد گمانی اور غلط فہمیوں کے پتھروں سے ٹھوکر کھا کر گر گر کر' یا سنبھل کر۔۔۔ یا معافی اور خلوص کے پھول سنبھالے عزت سے سر اٹھائیے۔۔۔

اور یقین کیجیے دوسری راہ آسان ہے۔ کیونکہ ٹھوکر کھا کر سنبھلنا ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتا۔

☼ ☼ ☼

شادی کی پہلی رات ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میری ساس کس قدر سخت اور حاکمانہ مزاج کی مالک ہیں۔

ان کی دو عدد بھاوجیں' دو عدد چھوٹی بہنیں اور میری دو دیورانیوں کی دبی دبی سرگوشیاں میں نے ڈیڑھ فٹ کے گھونگھٹ کے اندر بھی واضح طور پر سن لی تھیں۔ وہ بھی اپنے اپنے شوہروں اور میری ساس امی سے کافی ناراض نظر آرہی تھیں۔

"لگتا ہے باجی کی طرح میکے کے ہر چکر پر امی کے لیے میرے پاس بھی کافی چٹ پٹی باتیں ہوا کریں گی۔" میں نے اپنے ننھے ننھے کان ذرا مزید کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے خوشی سے سوچا تھا۔

باجی کی شادی بھی ایک بڑی فیملی میں ہوئی تھی اور ہر دفعہ گھر آنے پر وہ سسرال کے قصے اور شکایات یوں مزے لے کر بیان کرتیں کہ مجھے بھی حسرت رہنے لگی۔

"اماں۔ میں تو کہتی ہوں اپنی قرۃ العین کی شادی مت کرنا۔ نوکری کروا لینا بس۔ ارے کسی ارے غیرے کی نوکری سے تو بہتر ہے اپنی حکومت کی نوکری کرلے۔" باجی جی بھر کے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے بعد میرے بارے میں مشورہ دیتیں۔ اور میں بھلے ہی اماں کے سامنے چپ رہتی۔ مگر دل میں خوب سنا دیتی۔

"خود تو مزے سے خاوند کا پیسہ اڑا رہی ہیں اور میرے لیے نوکری۔ ہونہہ۔" میں دل ہی دل میں غصہ نکالتی۔

"ہائے اللہ نہ کرے کہ میری عینی بیٹھی رہ جائے۔ میرے بعد بھابھیاں برداشت کریں گی اسے۔ شوہر تو پھر بھی شوہر ہوتا ہے۔ بھائی تو شادی کے بعد پرایا ہی ہو جاتا ہے۔" اماں شکر ہے ان کی باتوں میں کبھی نہ آتی تھیں۔ البتہ ان کی باتوں سے بھائی مجھے ابھی سے پرائے لگنے لگے تھے۔ اور پھر باجی کے خوب منع کرنے کے باوجود میری بھی لاٹری لے لی اماں نے۔ میرا مطلب رشتہ قبول کر لیا۔ قسمت نے کیا روشن باب لکھا تھا۔

میاں پڑھا لکھا، ہینڈسم، اچھے عہدے پہ فائز، بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا، رشتہ کیا طے ہوا۔

خاندان بھر کی لڑکیوں کو آگ لگ گئی (جلنے کی بو ہمارے گھر تک آتی رہی کم از کم مجھے تو یہی لگا) اور پھر سب کی پروا کیے بغیر میں پیا دیس سدھار گئی۔ اور اب اپنے بیڈ پہ بیٹھی ان خواتین کی گفتگو نے میرے اندر ہلچل مچا دی تھی۔ وہ جا چکی تھیں۔ لیکن میں صرف ساس کی سازشوں اور ان کے توڑ کے متعلق سوچتی رہی اور

شاید سوچتی ہی رہتی۔ اگر وائو کمرے میں نہ آتے۔

ان کی خوب صورت اور دوستانہ گفتگو نے چند ہی لمحوں میں مجھے سسرال کا سازشی پہلو بھلا دیا اور میں نئی زندگی کے بہار بھرے پہلوؤں سے روشناس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

میرا سسرال ایک بڑا گھرانہ تھا اور سب کام سب لوگوں کے درمیان تقسیم کیے ہوئے تھے۔ اسی لیے کافی حسرت کے باوجود مجھے یہاں کوئی انڈین سوپ (لڑائی جھگڑا) دیکھنے کو نہ ملا تھا اور اس کا مجھے بے حد افسوس بھی تھا۔ میرے ست روزہ (سات دن میکے رہنا) قریب آتے جا رہے تھے اور میں ہر حال میں کوئی نہ کوئی خبر لے کر جانا چاہتی تھی۔

یہ میری شادی کا تیسرا روز تھا۔ آج شام کو ہی مجھے میکے سے بھائی اور بھابی نے لینے آنا تھا اور کوئی بھی خبر نہ ملنے پہ میں مایوس تھی۔ یہ کیسا سسرال تھا۔ جہاں سب خوش تھے۔ میں دوپہر میں یونہی ٹہلتی ٹہلتی پچھلے صحن کی طرف آگئی۔ کہ ایک آواز سنائی دی۔

"زیور، پیسہ سب اپنے قبضے میں کر رکھا ہے اس بڑھیا نے" میرے ننھے منے کان خرگوش کے لمبے کانوں کی طرح الرٹ ہوئے تھے۔

"کہیں جاؤ تو اپنا زیور بھی مانگ کے جاؤ، کسی چیز کی ضرورت ہے تو بھکاری کی طرح مانگتے پھرو۔" یہ بڑی جٹھانی تھیں۔ جنہیں ان تین دنوں میں میں نے کبھی زیور کے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی مجھے ہمدردی ہوئی ان کے ساتھ۔

"اوپر سے شوہر بھی اللہ نے گونگا بہرہ دے دیا۔" چھوٹی جٹھانی نے منہ بسورا۔

"ارے بس کرو۔ کوئی گونگے بہرے نہیں گھنے ہیں میسنے ہیں۔ اپنی ماں کے بارے میں ہماری بات سن کر فوراً "لیکچر شروع کر دیتے ہیں۔" بڑی جٹھانی نے دانت کچکچائے۔

"بس ان کا یہی رویہ ہے۔ سچ کہوں تو میرے اماں ابا تو بالکل بھی عزت نہیں کرتے ان کی۔ دروازے سے ہی واپس کر دیتے ہیں۔" چھوٹی جٹھانی کو اپنے شوہر سے ذرا ہمدردی تھی۔

مجھے یاد آیا۔ میرے بھائی بھی باجی کے شوہر کو ایسے ہی دروازے سے واپس کر دیتے تھے اور بالکل ٹھیک ہی کرتے تھے۔ میں نے کڑھتے ہوئے سوچا تھا۔

ان کی باتیں جاری تھیں۔ لیکن میں اپنے شوہر کے بارے میں سوچنے لگی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے بھی بدل جانا تھا۔ یہ سوچ کے میں بوجھل دل سے وہاں سے مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

میکے میں سات دن تک رہی تو باجی بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہیں مجھ سے ملنے سے زیادہ کچھ چٹ پٹا سننے کا شوق تھا۔ میں نے بھی جی بھر کے باتیں بنائیں۔ اپنی ساس کو باجی کی ساس سے زیادہ خوفناک بنا کر بتایا۔ (باجی کی اتنے سالوں کی ہمدردی جو امی کی طرف سے ان کو ملتی تھی، جلد از جلد مجھے اپنی طرف موڑنی تھی)۔۔۔ اماں تو دہل دہل جاتیں۔ باجی البتہ بڑی کمینی سی ہنسی ہنستیں۔

"اچھا شوہر کا تو بتا۔ وہ کیسا ہے تیرے ساتھ؟" کوئی تیسرے دن اماں کو سسرال میں میرے میاں کا خیال آیا تھا۔ میں تو شرما ہی گئی۔

"ارے کیسا ہو گا؟ پہلے دن ہی نصیحت کر دی ہو گی، میری ماں، میری جنت۔ خبردار جو میری جنت برباد کرنے کی کوشش کی۔" باجی نے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اماں کی کم عقلی کا افسوس بھی کیا اور میرے "ان" کے بارے میں اندازہ بھی لگایا۔

"نہ باجی نہ۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے صاف کہا کہ میری امی غصے کی بہت تیز ہیں۔ اگر کچھ کہیں تو برا مت منانا۔ بلکہ ان کے بدلے مجھ سے لے لینا۔" اماں تو میری شرمگیں گلابی مسکان پہ صدقے واری ہو گئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میں نے باجی کا چہرہ لٹکا دیکھا تھا۔

پورے سات دن بعد میرے "وہ" بڑی بھابی کے ساتھ مجھے لینے آئے تھے اور میں حیران رہ گئی تھی۔

بھائی پوری عزت سے میرے "ان" کو اندر لے آئے تھے۔ تب میں نے خوشی سے باجی کو جپھی (گلے لگنا) پالی تھی۔ جن کا چہرہ نہ جانے کیوں مجھے تاریک ہوتا محسوس ہوا۔

دن گزرتے رہے۔ میرا اور داؤد کا تعلق گہرا ہوتا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔

"مان' دھیان اور عزت کسی بھی رشتے کا فخر ہوتے ہیں۔" داؤد نے مجھے یہ فخر عطا کیا تھا۔

ساس امی مزاج کی واقعی سخت تھیں۔ ان کے میکے سے لے کر سسرال تک بس ان کی ہی چلتی تھی۔ انہیں ہر بات پہ ٹوکنے کی عادت تھی۔ تنقید کی عادت تھی۔ نہ جانے کیوں کبھی کسی کی کوئی چیز یا کام انہیں پسند نہیں آتا تھا۔ یا پھر شاید "تعریف" کا لفظ ان کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔

جوں جوں دن گزرتے جارہے تھے مجھ پہ سسرال کا ہر پہلو عیاں ہوتا جارہا تھا۔ میں نے واضح طور پہ محسوس کیا تھا کہ اماں نہ صرف کافی سخت مزاج ہیں۔ بلکہ اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کے لیے اپنی سلطنت (گھر) کے مختلف حصوں (بہوؤں) کو ایک دوسرے کے خلاف اکثر بھڑکاتی بھی تھیں تاکہ ان کے زیادہ اتفاق کی صورت میں کسی انقلاب کا خطرہ نہ رہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی میں نے دیکھا تھا۔ ہم تینوں دیورانیوں' جٹھانیوں میں بہترین دوستی تھی۔ اور اس کی وجہ صرف ایک دوسرے سے ہمدردی تھی۔ مجھے البتہ یہ ہمدردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کیونکہ ان کی نسبت میرے حالات کچھ بہتر تھے۔ میرے "وہ" میرے ہمدرد اور غم گسار تھے۔ اماں اپنے الفاظ کے نشتر چلاتیں۔ تو داؤد محبت اور خلوص کے وہ مرہم رکھتے کہ روح تک شانت ہو جاتی۔

اماں بات بات پہ ٹوکتیں۔ تنقید کرتیں۔ بہت تنگ کرتیں کبھی کبھی اتنا کہ میں پھٹ پڑوں اور ان کو داؤد سے میرا گلہ کرنے کا موقع ملے۔ مگر میں نے داؤد کی بات رکھ لی۔ اور کبھی بھی ان کو اف تک نہ کیا۔ داؤد کے سامنے البتہ شام کو کمرے میں خوب دل ہلکا کرتی اور وہ پیار سے سمجھا دیتے۔ میں سمجھ جاتی۔ میری دیکھا دیکھی اب بڑی دو جٹھانیوں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

لیکن اماں مزید بے چین رہنے لگی تھیں۔ نہ جانے کیوں؟

آٹھ ماہ کیسے گزر گئے۔ پل جھپکتے میں' داؤد میری سالگرہ پہ میرے لیے شیفون کا ایک بہترین سوٹ لائے تھے۔ ان کے آفس سے آنے میں کافی وقت تھا۔ میں اپنے حصے کا کام نبٹا کر بہت دل سے تیار ہوئی۔

میرے انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ شہر کے مشہور گول گپے کھلانے کے بعد دریا کنارے سیر کو بھی لے جائیں گے۔ اور پھر امی کے گھر بھی۔ میں بے حد خوش تھی۔ ہلکا سا کاسنی سوٹ پہنے ہلکی سی جیولری پہنی اور لبوں پہ لائٹ سی لپ اسٹک۔ خود میں مگن میں گلے میں دوپٹہ ڈالے یونہی باہر نکل آئی۔ سامنے ہی اماں تخت پہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں مسکراتے ہوئے ان کے قریب جا ٹھہری۔

"آج تو اماں ضرور میری تعریف کریں گی۔" مجھے یقین تھا۔ اماں نے سلام پھیرا۔

اور مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کا منہ واقعی کھل گیا۔ لیکن میری تعریف میں نہیں میری کردار کشی میں' انہوں نے میری روح کے وہ بخیے ادھیڑے کہ میں رو بھی نہ سکی۔ بس پتھری ہو گئی۔

"اچھی طرح جانتی ہوں میں تیرے چونچلے۔ ایک تو بیٹے کو ہاتھ میں کر لیا۔ دوسرے آوارہ عورتوں کی طرح تیار ہو کر آ گئی۔" اماں تو ہذیانی انداز میں چیخنے لگی تھیں۔

"کاش۔ کاش اماں تیری ایک بیٹی ہوتی۔" میں بھی چلا اٹھی تھی۔ اور روتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اور اسی وقت داؤد بھی گھر آ گئے۔

اماں جائے نماز پہ بیٹھی تھیں۔ فوراً" رونے لگیں۔ سینہ کوبی کرنے لگیں۔ میرے "وہ" حیران پریشان۔ پھر صرف پندرہ منٹ بعد وہ اپنے کمرے میں آ ٹھہرے۔

"تم نے اماں سے کیا کہا ہے؟" ان کا لہجہ سخت۔۔۔ اور میں پہلے سے چوٹ کھائے ہوئے تھی۔ بس پھر تو جو ہماری تو تو۔۔۔ میں میں ہوئی۔ نہ وہ اس بار محبت بھرا مرہم رکھ رہے تھے۔ نہ میں آج اتنے ماہ میں پہلی بار' ہاں پہلی بار ان کی تسلی کے بنا اپنا دکھ بھولنے والی تھی۔

اور پھر انہوں نے کہا چلی جاؤ یہاں سے۔۔۔

اور میں فوراً" چادر لپیٹ کر خالی ہاتھ وہاں سے اماں کے گھر (میکے) آ گئی۔

☼ ☼ ☼

مجھے روتا بلکتا دیکھ کر میرے گھر والے شدید سکتے میں تھے۔ اتنا اچھا' سوبر اور شاندار بندہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ کوئی بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ باجی کچھ دیر تو مجھے یونہی دیکھتی رہیں۔ پھر بے اختیار رونے لگیں۔ میں تھی میرا درد' میرا دکھ ان کی زندگی سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ شاید تب ہی میں اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"عینی۔" باجی نے اچانک میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا میں فکر فکر دیکھنے لگی۔ "ان آٹھ ماہ میں تیری باتیں کون سہتا رہا وہاں؟" سوال نے مجھے حیران کر دیا۔

"وہ۔" صاف جواب تھا۔ ایک پل بھی نہیں لگا تھا کہنے میں۔

"تو ایک دن تم سہ لیتیں۔" باجی نے میرے منہ پہ طمانچہ دے مارا تھا۔

"وہ روز تمہیں مان دیتا رہا۔ ایک دن تم بھی اسے دے دیتیں۔ پھر دیکھتیں۔ کتنا فخر کرتا وہ بھی تم پر۔ جس طرح اب تک تم اس پہ کرتی آئی ہو۔" کتنا بڑا سبق بھلا بیٹھی تھی وہ۔

"ماں تو ماں ہے۔ وہ اسے غلط کیسے کہہ سکتا ہے۔ لیکن غلط ہو ضرور سکتا ہے عینی! تم بھی سوچ کر معاف کر دیتیں اسے تو وہ وہیں ٹھہر جاتا۔" اماں نے زندگی میں پہلی بار باجی کی بلائیں لی تھیں۔

"ایک بات یاد رکھنا عینی۔ میکے آکر کبھی اپنے "ان" کی برائی کر کے ان کو ہلکا مت کرنا۔ ورنہ میرے "ان"، کی طرح تیرے داؤد کو بھی گلی سے ہی واپس جانا ہو گا۔ میں نے تو تجھے دیکھ دیکھ کر اپنے "ان" کو عزت دینا اور ان کی عزت کرنا سیکھا ہے۔ پھر تو خود کیوں اتنی آسان راہ چھوڑ رہی ہے عینی۔"

اور بس۔ میرے لیے اتنا سبق کافی تھا۔ میں بھائی کے پیچھے بائیک پہ بیٹھی ساری انا کو ایک طرف رکھ کے اپنے گھر جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پانی پی لو داؤد۔" بڑی بھابی کمرے میں آئیں تو اس نے سختی سے اپنی نم آنکھیں صاف کیں اور گلاس تھام لیا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم بھی اپنے بھائیوں کی طرح کچے کانوں کے نکلو گے۔" وہ مایوس تھیں۔ وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ اماں نے بہت مشکل حالات میں تمہیں پالا۔ سب کی پرورش کی۔ بہت سختیاں جھیلیں۔ اور ان کا تم پہ' ہم سب پہ بڑا حق ہے۔ اور ہم سب ہی یہ حق پوری محبت اور عقیدت سے نبھا رہے ہیں۔ اماں کو سب آرام سے رکھتے ہیں۔ ہر چیز ان کو وقت پہ اور ہاتھ میں مل جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ خوش نہیں ہیں۔ پتا ہے کیوں؟" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"کیوں کہ تم سب ہمیں ان کی اہمیت سمجھا دیتے ہو۔ لیکن انہیں یہ نہیں سمجھاتے کہ ان کی زندگی کی سختیوں کا ذمہ دار ہم میں سے کوئی نہیں۔ یہ تو اللہ کی منشا ہے۔ جسے جیسے آزمائے' جسے جیسے نوازے۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"اور اگر اتنی بھی ہمت نہیں ہے تو تحمل سے ان کی بات سنو ضرور۔ لیکن اس پہ یقین یوں اندھا دھند نہ کرو۔ تحقیق تو کر سکتے ہو نا۔" داؤد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"اماں جائے نماز پہ بیٹھی تھیں۔" دلیل آئی۔

"یہی بات اماں بھول گئی تھیں داؤد۔" بڑی بھابی

نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "اماں نے جتنی بھی باتیں عینی کو سنائیں۔ اس کے کردار کو اچھالا۔ عینی نے فقط یہی کہا کہ کاش آپ کی بیٹی ہوتی۔ یقین کرو داؤد۔ یہ کاش، ہم دونوں بڑی جٹھانیاں سینکڑوں بار کر چکے ہیں۔ لیکن دل میں کیونکہ ہمیں وہ مان وہ عزت نہیں دی گئی۔ جو تم نے عینی کو دی تھی۔ تب ہی اس نے دھڑلے سے کہہ دیا اور دیکھو تم ہی نے وہ مان ایک پل میں چھین لیا۔"

بڑی بھابی گلاس لے کر چلی گئی تھیں۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☆ ☆ ☆

میں گھر آکر سیدھا اماں کے کمرے کی طرف گئی تھی۔ تاکہ معافی مانگ سکوں۔ اپنا مان، عزت اور فخر بچانے کے لیے ناکردہ گناہ کی معافی مجھے دل و جان سے قبول تھی۔ میں اندر جانے لگی تھی جب میرے "ان" کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔

"کیا مطلب اماں؟" ان کی آواز میں حیرانی تھی۔

"دیکھ بیٹا۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔" اماں کی آواز میں تاسف اور ہمدردی تھی، میں کھڑی رہی۔ "جس طرح کی حرکت اور بدزبانی عینی کر کے گئی ہے۔ تم اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے اور میں تو بالکل بھی نہیں۔ سو اب دل مضبوط کرنا اور کچھ دن اسے وہیں رہنے دینا۔ اچھی طرح سبق مل جائے۔ تب ہی واپس لے کر آنا اور اگر نہ آئے تو سمجھو ایک بلا سے جان چھوٹی۔ تجھے کیا رشتوں کی کمی ہے۔ ابھی بھی لائن لگی ہے رشتوں کی۔ ویسے بھی اس بالشت بھر کی چھوکری میں تھا کیا۔"

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ چکر سے آنے لگے تھے۔

"میرا تو سب ہی کچھ اس میں ہے اب اماں۔ خوشی، دل کا سکون، اعتماد۔ یہ سب کچھ اسی بالشت بھر کی چھوکری نے دیا ہے مجھے امی۔" کسی نے میرے کانوں میں امرت گھولا تھا اور کسی نے کیوں بھئی۔ میرے "ان" نے میں پورے قد سے کھڑی ہو گئی۔

"یاد رکھیے اماں۔ میاں بیوی میں پھوٹ ڈلوانے والے کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی وعید ہے۔ تو جو بنا کسی قصور کے بیوی کا دل توڑ دے اس کا تو ٹھکانہ شاید جہنم ہی ہے۔ مجھے وہ بے حد عزیز ہے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں اس کی تلافی بھی ضرور کروں گا۔ میں عینی کو لینے جا رہا ہوں۔" اور میری روح کرب سے آزاد ہو گئی۔

انا جو ابھی بھی مجھے کچھ کچھ لگا رہی تھی۔ کرلا کے دم توڑ گئی۔

"السلام علیکم۔" ذرا سا اندر جا کر سلام کر کے میں پلٹ آئی اور اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اپنے "ان" کے چہرے پہ کھلتی مسکراہٹ اور اماں کے چہرے پہ مایوسی پھیلتی صاف دیکھی تھی۔

اس بار میں طے کر کے آئی تھی۔ مجھے ٹھوکر نہیں کھانی تھی۔ بلکہ خلوص اور محبت سے اماں کی بدگمانیاں اور خوف دور کرنے تھے۔ محبت کو ہمنوا کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہم نے ایک دوسرے سے گلہ نہ کیا کہ کس نے کیا کہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا بس شکریہ ادا کیا تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے پہ اپنا مان ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔

رات کے تین بجے ہیں۔ میری آنکھوں میں اشک ندامت بھی ہیں کہ اللہ پر توکل کرنے کے بجائے دل چھوڑ بیٹھی تھی اور میری آنکھوں میں اشک تشکر بھی ہیں، کہ اسی پاک ذات نے مجھے پہلی ٹھوکر پہ ہی زمین بوس ہونے سے بچا لیا تھا۔ میں سنبھل گئی۔ اور میرے "ان سے ناتا جوڑا تھا" تو سوچا آپ سب سے بھی شیئر کر لوں۔ اب مجھے خط لکھنا مت بھولیے گا۔ بھئی اسی اپنے ڈائجسٹ کے پتے پر۔

مجھے انتظار رہے گا۔ خوشیوں کی دعا...

☆

عطیہ خالد

محبت ہم سفر میری یہ لمحوں کی نہیں ہے !!
یہ تو صدیوں کی مسافت ہے جس کی یاد کا صحرا محبت ہم سفر میری

دور افق میں نیلگوں رنگ تیرگی میں بدلنا شروع ہو چکا تھا۔ موسم سرد تھا اور شدید تر۔ ہمیشہ کی طرح ایک نرم گوشہ اس پہر بے دار ہونے لگتا تھا' شاید اس لیے کہ رات اپنے پہلو میں کچھ نرمیاں لیے اترتی ہے یا اس کی وجہ یہ ہو کہ رات کا تعلق جذبات سے زیادہ ہے۔ لیکن نہ ابھی رات پوری طرح اتری تھی' نہ نرمی۔ ابھی تو آغاز تھا۔ بارش شروع ہوئی تھی۔ نسبتاً" فراغت کے دنوں میں ایک عجیب سی بے کلی مجھے گھیر لیتی ہے۔ میں بے رحمی سے اپنا تجزیہ کرتا ہوں۔ یہ خواب بننے کی عمر نہیں ہے میری۔ زندگی اب ایک ڈگر پر رواں سی لگتی ہے۔ بظاہر لگتی ہے۔ جو چیزیں بظاہر دکھتی ہیں وہ اصل سے دور کیوں ہوتی ہیں۔۔۔ وہ ہم کو مطمئن کیوں نہیں کرتیں۔

خواب بننے کی عمر میں جب خواب بننے والوں پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ عمدہ اور تعمیری خواب بنیں تو تعبیر وضع کرنے والے قانون کے پابند کیوں ٹھہریں۔

لگتا ہے میں زیادہ ہی قنوطی ہو رہا ہوں۔ یا نہیں۔ شاید تھک زیادہ گیا ہوں۔ لہذا کل چھٹی کرکے آرام۔ ہم۔ گڈ۔ اپنی تمام تر سوچوں کو کنارے رکھ کر میں نے بیڈ روم کی کھڑکی کھولی اور باہر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ رات کھانے کے لیے جب ملازم مجھے بلانے کے لیے آیا تو میں اس کے پیچھے اس طرح لپکا گویا اسی پکار کا منتظر تھا۔

نیچے میز پر میرا انتظار کیے بغیر کھانا شروع ہو چکا تھا۔ کوفتے اور انڈوں کا سالن اور خوش رنگ سلاد اور مٹر پلاؤ۔۔۔ تارہ تیزی سے تازہ پھلکے لا رہی تھی۔ اس کے دونوں بچوں کو اماں پلنگ پر بیٹھی کھانا کھلا رہی تھیں۔ میں نے بھی خاموشی سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا اور سالن کے ڈونگے کی طرف دیکھنے لگا جو کہ علی اور اسامہ کے درمیان وجۂ تنازعہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اسامہ کی طرف گھور کر دیکھا۔ ڈونگا فوراً" میری طرف آیا۔

سالن نکال کر میں نے ہاٹ پاٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ماں جی کی آواز آئی۔

"پتر۔۔۔ وہ ہٹی لا رہی ہے روٹی۔"

میرے حسب سابق ناراض ہو کر میز چھوڑنے کے ڈر سے تارہ تازہ پھلکوں کی پلیٹ لیے بھاگ کر آ پہنچی۔ لذیذ سالن نے میرے دہن کی کڑواہٹ کو کچھ وقت کے لیے کم کر دیا تھا۔

وہی بے سمت سا رستہ' محبت ہم سفر میری
سرابوں کا وہی دھوکا' محبت ہم سفر میری

ان الفاظ نے ایک خوب صورت لے کی شکل میں میرے کانوں تک سفر طے کیا۔ نظریں بے ساختہ سامنے موجود ٹی وی کی طرف اٹھ گئیں' جہاں کسی ڈرامے کے ٹائٹل سونگ کے طور پر یہ نغمہ گایا جا رہا تھا۔ ابھی جب میں اوپر اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ تب یہی نغمہ میرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ تب شاید ڈراما شروع ہو رہا تھا۔ اور اسی نغمے نے جیسے میرے اندر وہی جنگ دوبارہ چھیڑ دی' جس سے بھاگ کر میں نیچے چلا آیا تھا۔ اس سے قبل کہ میں مزید سوچتا کہ اسکرین پر ڈرامے کی کاسٹ اور تکنیکی عملے کے نام آنا شروع ہو گئے۔

"تحریر: باطن عمر

میں کچھ دیر اسکرین کو گھورتا رہا کہ اتنے میں میری جیب میں رکھا ہوا موبائل بجا اور میں اپنے آپ میں واپس آگیا اور فون کان سے لگائے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا میں واپس اپنی دنیا میں چلا آیا۔ بڑی بددلی سے اپنی سیکرٹری کا فون سنتے اور لے کل کے آف کا بتاتے ہوئے میں نے لیپ ٹاپ کھول لیا۔

نیٹ نے چند لمحوں میں میرے سامنے مطلوبہ

معلومات رکھ دیں۔

باطن عمر۔ اردو فکشن رائٹر اور ڈراما رائٹر۔۔۔ عمر ستائیس سال۔۔۔ اور دیگر چند تفصیلات دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ یہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ باطن میرے ہی شہر میں موجود ہے' تو باطن عمر تم بھی 'باطن جلیل' نہیں رہیں۔

٭ ٭ ٭
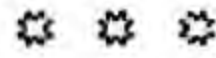
ہماری ایم بی اے کی کلاسز شروع ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے کہ سر زاہد کی کلاس میں ایک نئی لڑکی نے اپنا تعارف کرایا۔ باطن جلیل' بڑا نیا سا نام تھا۔ اس نام کا حامل وجود بڑا کم سنی سا مگر پُروقار تھا۔ اس سے قبل ہمارا گروپ سمیر' ناجیہ اور اروی' اور مجھ پر مشتمل تھا۔ وہ ناجیہ کی دوست تھی اور اب وہ ہمارے گروپ کا حصہ تھی۔ ہم سب بے تکلف تھے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ میرا تعلق' باطن سے دوستی سے کچھ زیادہ ضرور ہو گیا تھا' لیکن نہ جانے کیوں میں بار بار خود کو اس بات کا یقین دلاتا تھا۔۔۔ کہ یہ فقط دوستی ہی ہے۔ ہم بہت غریب نہ سہی' مگر اتنے آسودہ حال بھی نہ تھے کہ میں باہر جا کر پڑھ سکتا۔ علی تو ابا کی زندگی میں ہی ان کی دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ میں ایم بی اے کے ساتھ کچھ کام بھی کروں۔ خواہ ٹیوشن یا کوئی چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جاب۔ مگر مجھے یہ منظور نہ تھا۔ سمجھوتے سے مجھے نفرت تھی۔ "گزارا کرنا" یہ اصطلاح میرے لیے نہیں تھی۔ اماں کبھی کبھی مجھ سے کہتیں۔

"دیکھ پتر! تارہ کے آنے کے بعد گھر میں کیسی برکت آئی ہے۔ علی کی آمدنی میں کتنا اضافہ ہوا ہے' تو میں کھول جاتا۔

"خاک آمدنی ہے"۔ سارا گھر تارہ کے جہیز کے درمیانے سے ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا لیتا۔ البتہ مجھے تارہ یا اماں ٹرے میں لگا کر الگ سے کھانا دے جاتیں۔ مگر کبھی جو میں راضی ہوا ہوں۔۔۔ یہ ان کا فرض تھا اور میرا حق۔ میں نے ایم بی اے کے فائنل ایئر میں انگلینڈ کے ویزے کے لیے اپلائی کر دیا۔۔۔ سمیر اور اروی' نے شادی کر لی اور ناجیہ بھی رخصت ہو کر اپنے کزن کے گھر چلی گئی اور وہیں سے فائنل پیپرز کے لیے آتی رہی۔ میرا ویزا بھی آگیا اور انٹرن شپ اپروول بھی۔۔۔ مگر مجھے اپنے ٹکٹ اور رہائش کا انتظام خود کرنا تھا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ علی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بیٹے کی پیدائش پر تارہ کے آپریشن پر پچاس ہزار روپے لگ گئے۔ میرے پاس زادِ راہ کی کوئی صورت نہیں تھی' یہ بات میرے گروپ میں صرف باطن کو معلوم تھی اور وہ بھی آج کل واپس اپنے سے غائب تھی۔ جھنجلاہٹ میرے اندر گھر کر رہی تھی۔

میں سمیر اور اروی' کی طرف تھا۔ آج کل اکثر ہی سمیر بلا لیتا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں جانے والا ہوں۔ وہیں میں نے ذکر کیا کہ باطن واپس اپنے سے غائب ہے۔ مگر سمیر کو بھی اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ گھر واپس آیا تو تارہ نے ایک براؤن لفافہ مجھے دیا کہ میرے پیچھے باطن آئی تھی' وہ دے گئی۔ وہ کتنی دیر بیٹھی' مجھے تفصیل سننے میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے لفافہ پکڑا اور دروازہ بند کر لیا۔ میرے اندازے کے برعکس۔۔۔ اس میں دو لاکھ روپے نکلے' بجائے محبت نامے کے۔

یہ امدادِ غیبی تھی۔۔۔ یقیناً "میں وہاں جا کر یہ رقم اس کو لوٹا دوں گا" بلکہ آئندہ تو تحائف۔۔۔ وقت کم تھا بہت۔۔۔ میں نے جانے کی تیاری مکمل کر لی۔ اماں نے مجھ سے کہا کہ میں باطن کے گھر جاؤں۔

"کس لیے اماں؟" میرے انداز میں اس قدر حیرانی اور شاید بے گانگی تھی کہ اماں خاموش ہو گئیں۔

میں پابند نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرے خواب' بڑے گھر اور عالی شان زندگی کے خواب' ابھی اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یوں بھی باطن' ہماری طرح اوسط درجے کے مالی حالات رکھتی تھی۔۔۔ بے شک بہت خوب صورت اور اعلا اخلاق کی حامل تھی اور بے شک اس کا احسان بہت بڑا تھا۔۔۔ مگر میں یہ۔۔۔ سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ اس نے اس رقم کا انتظام کیسے کیا؟

وہ بڑی صابر، شاکر قسم کی مخلوق تھی۔ ایسے لوگ رقم جمع بھی کر لیتے ہیں۔ مجھے خود کو بہلانا آتا تھا۔۔۔ سمیر اور اروی نے مجھے الوداعیہ دیا۔ مگر باطن بخار کی وجہ سے وہاں بھی نہ آئی اور آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے میں بھی اس کے گھر ملنے نہ جاسکا۔ کہ مجھے اپنی منزل کی طرف جانے کی بہت جلدی تھی۔

میں انگلینڈ پہنچ گیا۔ گھر والوں کو اطلاع کر دی، سمیر کو کال کی اور کہا کہ "باطن" کو بھی اطلاع دے دے۔ بس پھر میں تھا اور میری دھن۔۔۔ کبھی تنہائی میں خیال آتا تھا کہ "باطن" کو فون کر لوں۔ مگر ایک گریز سا طبیعت میں آگیا تھا۔ ایک نوکری کے ساتھ دوسری بھی شروع کر دی کہ مجھے بہت پیسہ کمانا تھا اور بہت جلد۔۔۔ کئی بار خیال آتا کہ "باطن" سے رابطہ کر کے اس کو رقم لوٹا دوں۔۔۔ مگر پھر فوراً" ہی دماغ سمجھاتا کہ ابھی نہیں ابھی ایک ساتھ اتنی رقم نکالنے کا وقت نہیں آیا۔

ساتھ ساتھ میں نے بزنس اسٹیبلش کرنا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد اپنا ہدف حاصل کر کے واپس لوٹنا چاہتا تھا۔۔۔ جہاں "شاید" باطن میری منتظر تھی۔ اگر یہ خیال آجاتا کہ باطن مجھے بھول چکی ہو گی یا۔۔۔ عجیب سی وحشت دل و دماغ پر چھا جاتی۔ میں پہلے سے بڑھ کر کام میں خود کو الجھا لیتا۔

دو سال کے بجائے سات سال گزر گئے۔ تیئس سال کا فاران احمد اب تیس سالہ میچور بزنس مین تھا۔ ان سات سالوں میں کئی ہاتھ دوستی کے لیے بڑھے۔ میری ایک کولیگ نے تو شادی کی اور وہیں سیٹل ہونے کی پیش کش بھی کی۔۔۔ مگر اس کی پیش کش نے مجھے بے چین کر دیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے دل میں ہر جگہ باطن موجود ہے۔

اس عرصے میں وہ سب مل گیا جس کی حسرت تھی، مگر ایک بے کلی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ دل کھل کے نہیں دیتا تھا۔ بلکہ "عینی" کی شادی کی آفر کے بعد میں اپنا تجزیہ بار بار کرنے لگا۔ کبھی خیال آتا کہ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لوں۔۔۔ اور جب یہ خیال آتا تو بے چینی حد سے سوا ہو جاتی۔ "باطن" کے پرانے نمبرز پر کوشش کر چکا تھا۔ سمیر سے بھی ایک بار برسبیل تذکرہ "باطن" کے بارے میں پوچھا سرسری سا۔۔۔ وہ تو میرے کال کرنے پر حیران تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تین سال پہلے مڈل ایسٹ شفٹ ہو چکا ہے۔ "باطن" کے ذکر پر اس نے جیسے مجھے ٹال دیا۔ میں نے بھی اصرار نہ کیا۔ آخر کس منہ سے پوچھتا؟

اماں کا واپسی کے لیے اصرار بڑھنے لگا۔ جیسے جیسے اماں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

بالآخر میں نے واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ واپسی پر کچھ ماہ تو آفس سیٹ کرنے، بزنس ٹرانسفر کرنے میں لگ گئے۔ گھر میرے خوابوں کی طرح ہی خوب صورت تھا۔۔۔ مگر گھر والوں کی طبیعتوں میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ گھر میں کل وقتی ملازمہ تھی۔ باہر کا کام کرنے کے لیے الگ لڑکا تھا گاڑی تھی۔۔۔ مگر تارہ ابھی تک کچن میں کھڑی خود روٹیاں پکاتی نظر آتی تھی۔ علی کے بچے مہنگے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ گھر میں بڑی رونق تھی۔

اسامہ ایم بی اے کر چکا تھا اور اب اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ گھر کے اوپر کا پورشن علی نے میری ہدایت کے مطابق بنوایا تھا۔ انتہائی خوب صورت۔ آف وائٹ اور لائٹ گرین کے امتزاج سے سجا وسیع لاؤنج۔ آف وائٹ بیڈ روم۔ کیا نہیں تھا۔۔۔؟ مگر میرا دل۔۔۔

آفس سیٹ کرنے کے ساتھ ساتھ ہر جگہ میں نے اپنے طریقے سے پتا کروالیا۔ مگر "باطن" کا کہیں پتا نہ تھا۔ اماں شادی کے لیے اصرار کرتیں تو میں کام میں پناہ لیتا۔ کام سے تھک جاتا تو خود کلامی میں۔۔۔ اور آج "باطن، عمر" دیکھ کر دل جیسے زخمی ہو گیا۔ آخر میں نے اس کو کون سی امید دی تھی جو اب اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے ای میل کر دی اور تمام رات چیک کرتا رہا تھا۔

"کیا میں اب محبت کے قرینے سیکھ رہا تھا؟"

خود احتسابی کی کڑی جنگ لڑ کر بدحال ہو گیا تو یوں لگا کہ جیسے دہکتے اعصاب پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ اس کی میل آئی تھی۔ وہ اسی شہر میں تھی اور ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ اپنے گھر کا ایڈریس بھیج دیا تھا۔ آہ! کیسے دن بیتا اور شام ڈھلی۔ میں پھولوں سے لدا پھندا اس کے در پر جا پہنچا۔ بیل بجائی تو ایک چار سال کے بچے نے دروازہ کھولا۔

"ہائی فاران انکل آگئے۔" بچہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں حیران سا اس کی رہنمائی میں آگے آیا تو لاؤنج میں وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ مسکرا کر سلام کیا۔ وہی سادگی، وہی بے ریائی، کوئی گلہ نہیں۔ درمیان میں احد بھی بھی کارٹون چھوڑ کے ایک آدھ بات کلن میں کرتا۔

ملازمہ چائے سرو کر گئی۔ کافی دیر گزر گئی۔

"میرا خیال ہے کہ اب عمر صاحب آتے ہوں گے۔" ایک تاریک سایہ سا جیسے در آیا۔ "ایک حادثے نے عمر کو ہم سے جدا کر دیا۔" "اوہ!" میرا دل سخت بے چین ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے رخصت چاہی "تم پھر بھی نہیں اٹھیں۔" بلکہ اپنی کرسی کو دھکیلا۔ "اوہ تو یہ تھا تمہارا دوسرا بڑا نقصان۔ جس کا تم سرسری ساذکر کر رہی تھیں۔" اور اب میں کیا کہتا۔ احد کے سر پر ہاتھ پھیر کر واپس گاڑی میں آبیٹھا۔

رات اماں جی کی گود میں سر رکھ کر میں رو دیا اور ساری کہانی سنائی۔ اعتراف کر لیا اپنی کمینگی کا۔ اور اماں جی تو اس کی معذوری کا سن کر ہی رو رہی تھیں۔ انہوں نے میرا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"پتر اب دیر نہیں کرنی۔ اک واری مجھے اس کا گھر وکھا دے۔ میں اپنی دھی کو ہتھ جوڑ کے راضی کر لوں گی۔"

"اور اماں اس کا بچہ۔ بھی ہے۔"

"تو پتر بچے کے ساتھ ہی آئے گی وہ۔ اس کے لیے جو ہوا، وہ بچے کے لیے دل کھول کے باپ بن کے دور کرنا میرے پتر نے۔" ماں نے کیسا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میری ماں جو تھی۔

☆ ☆ ☆

یوں تو شب بے داری اب عادت بن چکی ہے مگر گزشتہ دو راتوں سے ایک پل کو بھی آنکھ نہیں لگی۔ اب جبکہ زخموں پر کھرنڈ جمنے لگے تھے۔ دل کاغذ کے پلندوں سے بہل سا گیا تھا کہ تمہاری ای میل آگئی۔ لگا کہ نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔ فاران احمد۔ یہ تم ہی تھے۔ اب بھلا رابطے کا کیا جواز تھا۔

"میرا کزن، میرا دوست۔ میرا عمر۔ میری پیاری پھپھو کا بیٹا، جس کے ذریعے میں نے بینک سے لون لیا۔ وہ بینک مینجر تھا۔ اس کے لیے تمام تر کارروائی و ضمانت اس کی تھی۔ وہ حیران ہوتا تھا کہ میں کس کے لیے یہ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی سے اپنا راز کہنا تھا اور عمر سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ یوں بھی وہ بہترین دوست تھا۔ رازدار بن کر تو اور اپنا بن گیا۔ پہلے سے زیادہ خیال رکھنے والا۔ بردبار اور سنجیدہ تو پہلے ہی تھا، اب شفیق بھی ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی نصیحت نہیں کی کہ میں کس امید پر تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ تم مل کر بھی نہیں گئے۔ اس نے کہا۔ وہ بزی ہو گا۔ اداس بھی ہے۔ ٹینس بھی۔ غرض وہ میری ڈھارس بن گیا۔"

"اماں، بابا کو لے کر ہارٹ سرجری کے لیے تایا ابو کے پاس امریکہ جانا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں گھر بیچنا تھا۔ میں نے عمر کے تعاون سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر لی۔ اور جلد ہی بینک کا قرض اتار دیا۔ سو ڈھائی سال سے تمہاری کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اماں، ابا، پھپھو چاہتے تھے کہ میں عمر سے شادی کر لوں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو بیاہ کر سکون سے سفر پر جانا چاہتے تھے۔ میں بابا کی بیماری اور اماں کی پریشانی دیکھ کر اس کے پاس بینک چلی آئی۔ کتنا خوش ہوا وہ۔"

میں نے ساری باتیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ کتنا سادہ اور مخلص انداز تھا اس کے سمجھانے کا۔ کہ والدین کی خاطر کیا گیا عمل ضائع نہیں جائے گا۔ قدرت والدین کی خاطر کیے جانے والے ایثار کا اجر ضرور دے گی۔ اور "وہ" اس کے لیے تو بس میری خوشی، میرا اطمینان ہی کافی تھا اور بس۔

"میں نے اماں کو "ہاں" کہہ دی۔ پھپھو کو پیغام بھجوا دیا گیا اور صرف دو دنوں میں سادگی سے سرخ جوڑے میں "باطن عمر" بن گئی۔ شادی کی رات عمر کے وجود سے محبت' احساس اور نرمی کے ایسے سوتے پھوٹے کہ صبح تک میں پور پور ان میں ڈوب چکی تھی کہ سچی محبت اور اخلاق کا سحر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اماں' بابا کو لے کر امریکہ چلی گئیں۔ دوران سرجری بابا کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اور وہ ہوائی سفر کے قابل نہ رہے۔ سو وہ لاکھ لاکھ خدا کا شکر کرتے کہ میرا اچھا ٹھکانا کر گئے تھے۔ عمر کی سنگت میں 'میں نے محبت کے نئے نئے زاویوں اور رنگوں کو پہچانا۔ وہ محبت سے گندھا ہوا شخص تھا۔ اس کو محبت کرنے کا سلیقہ تھا۔ وہ میری چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو یاد رکھتا' ان کا دھیان رکھتا۔ اس کے کہنے پر میں نے جاب چھوڑ دی اور لکھنا شروع کر دیا کہ یہ میرا دیرینہ خواب تھا۔ عمر میری تحریروں کو اس قدر شوق سے پڑھتا کہ میں سرشار ہو جاتی۔"

عمر کے پاس سب کچھ تھا۔ بہت دھنی تھا وہ' مگر "عمر" کی نقدی بہت کم تھی اس کے پاس۔ میرا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا۔ ہم اسپتال سے چیک اپ کروا کر نکلے ہی تھے کہ ایک تیز رفتار ویگن نے پیچھے سے ٹکر مار دی۔ عمر تو موقعے پر ہی جان سے ہار گیا۔ ہمارا احد بھی محفوظ رہا' مگر میری حالت مخدوش تھی۔ اور پھپھو نڈھال۔ ان دنوں اروی' اور سمیر نے بہت ساتھ دیا۔ میرے دو آپریشن ہوئے اور چار ماہ بعد میں وہیل چیئر پر گھر آ گئی۔ احد چار ماہ اسپتال کی نرسری میں پلا۔ عمر کے بینک نے ہمارے علاج کا خرچ اٹھایا۔ میرے ماں' باپ دور جا کر مجبور ہو گئے تھے۔ مگر ان کی دعاؤں نے مجھے مضبوط کر دیا۔

میں نے گھر' سہولت کے مطابق سیٹ کر لیا۔ میڈ رکھ لی اور پھپھو کی مدد سے احد کو سنبھال لیا اور باقاعدہ لکھنے لگی۔ زندگی کی کہانیاں۔ محبتوں کی حقیقتیں۔ محبت کا خراج ان پر بننے والے ڈرامے مقبول ہونے لگے۔ اور اب میں زندگی جیسے کسی طور پر گزارنے لگی تھی تو "فاران احمد" تمہارا پیغام آ گیا۔ اچھی طرح سوچ کر میں نے ملنے کا فیصلہ کر لیا کہ اس باب کو بند کر دینا ہی بہتر تھا کہ تمہارے نام کی کسک تک اب مجھے گوارا نہ تھی۔ زندگی بھر کے لیے عمر کی یاد میرے لیے کافی تھی۔ میرا احد تھا۔ میری پھپھو تھیں۔ میں نے تمہارے نام کا باب ورق سیاہ کی طرح پھاڑ دیا تھا۔ میں "باطن عمر ہوں" اور مجھے عمر سے عشق تھا اور عشق ہے اور اس کے سوا کبھی کوئی نہیں۔

میں نے "خدا حافظ" کہنے سے پہلے فاران احمد سے یہ کہہ دیا تھا۔

"امید ہے کہ ہماری ملاقات آئندہ پھر کبھی نہیں ہوگی۔"

احد نے ٹی وی آن کر دیا ہے۔ "محبت ہم سفر میری" میرے ڈرامے کی آخری قسط آن ایئر تھی۔ پھپھو اور میڈ شوق سے آکر بیٹھ گئی تھیں۔ میں نے ایزی چیئر پر منتقل ہو کر ٹیک لگا لی اور مغنیہ کے ساتھ ساتھ بے آواز گانے لگی۔

وہی بے سمت سا رستہ' محبت ہم سفر میری
سرابوں کا وہی دھوکا' محبت ہم سفر میری
یہاں حد نظر تک بس اندھیرے ہی اندھیرے ہیں
نہ وہ جگنو' نہ وہ تارا' محبت ہم سفر میری

☼ ☼ ☼

میں "باطن" کو ایک دفعہ پھر کھو چکا ہوں۔ خود کو سمجھاتے سمجھاتے ہر رات تنہا جاتے ہوئے۔ خود احتسابی کے کٹہرے میں کھڑے۔ میں ہر روز اس سے محبت کا اقرار کرتا ہوں۔ عملی طور پر میں نے ایک ادارہ بنایا ہے جو طالب علموں کو باہر جا کر پڑھنے کے لیے قرض حسنہ دیتا ہے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کسی کی بے غرض محبت۔ خود غرضی کی بھینٹ چڑھ جائے۔ شاید اس طرح مجھے معافی مل جائے۔

اور میں ہر روز ایک ای میل رات کے پچھلے پہر "باطن" کو کرتا ہوں۔ جواب نہیں آتا۔ میں محبت کے در پر صدا دینے کے بعد کھڑا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ کبھی تو جواب آئے گا۔

☼

حاجرہ ریحان

"عزیزہ کہاں... کیسی ہے؟"

میں نے بمشکل پوچھا۔ مگر دوسری طرف سے جواب سننے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

عقیل گھبرایا ہوا۔ پریشان سا مجھے حادثے کے بارے میں بتا تو رہا تھا' مگر میرے کانوں میں صرف میرے بے قابو دل کی دھڑکن گونج رہی تھی۔ یہ میرا دل تو شاید اسی انتظار میں تھا۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے' دل تو کئی بار خبردار کر چکا تھا۔ مگر میں ہی اپنی ضد پہ اڑا ہوا اسے سبق سکھانے۔ سدھارنے اور اس کی "میں" ختم کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

ابھی شادی کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ایسا حادثہ۔ جس طرح سے میری ہلکی رفتار سے چلتی گاڑی کو وہ رکشا باقاعدہ سائڈ مارتا تیزی سے نکلا تھا۔ اسی رفتار سے شاید میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں پورے راستے خدا سے خیر کی دعا مانگتا آیا تھا۔ راستے میں ممانی جان کو گھریلو سامان لینے کے لیے رکنا پڑا۔ میں نے رکشے میں سوار باقی لوگوں کا بہانہ بنایا تو جواب میں مجھے ہمیشہ کی طرح لیکچر ملا۔ کہ میں زن مرید ہوتا جا رہا ہوں۔ کیا ہوا اگر رکشا تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچ گیا' آخر کو ہم سب بھی پہنچ ہی جائیں گے۔ گھر میں ملازم بھی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ گھر میں اکیلی ہے۔

گھر آ کر دیکھا تو تشویش لاحق ہو گئی کہ رکشا جس کو ہم سے بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ میں گاڑی سے اترتے ہی عزیزہ کا نمبر ملانے کو تھا کہ ممانی جان نے پھر ٹوک دیا۔

"کیوں باؤلے ہو رہے ہو۔ ہماری طرح کچھ لینے رک گئی ہو گی۔ آ جائے گی کوئی اکیلی تو نہیں۔ بچی تو نہیں... کہ گم ہو جائے گی۔"

ایسی ہی بک بک جھک جھک کرتے ہم سب گھر کے اندر آ گئے' مگر میری بے چینی حد سے بڑھ چکی تھی۔ اچانک ممانی جان کی بہو نے چونک کر بتایا کہ اس نے ہی عزیزہ سے کہا تھا کہ واپسی پر رات کے کھانے کے لیے نان لیتی آئے۔ میری چھوٹی بہن یہ سنتے کے ساتھ ہی میری طرف امید سے دیکھنے لگی کہ میں کچھ تو کہوں۔ مجھے بھی ایک لمحے کو بڑی غیرت آئی کہ ایک تو ہم نے اسے گاڑی میں بٹھانے کے بجائے ممانی جان کے خانساماں (عقیل) کے ساتھ رکشے میں سوار کروایا تھا۔ اوپر سے نان لانے کی ذمہ داری بھی اس پر ہی ڈال دی۔ ایک یہ ہی نہیں' بہت سی ایسی باتوں پر میں اپنی غیرت کو جوش مارتا دیکھ چکا تھا' مگر ممانی جان کچھ یوں نقشہ کھینچ دیتیں کہ مجھے یہ بہتر لگتا کہ عزیزہ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ بقول ممانی جان کے۔ کہ جب تک اس کی "میں" نہ ختم ہو جائے اس سے سختی سے پیش آنا ضروری ہے۔

میں نے والد صاحب کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری اٹھائی تھی اور اس سلسلے میں کافی سال بیرون ملک رہا۔ امی جب تک زندہ رہیں میری شادی کی ضد کرتی رہیں۔ مگر میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ جب تک دونوں چھوٹے بھائی کسی کام دھندے میں نہ لگ جائیں اور دونوں بہنوں کی شادیاں نہ ہو جائیں' میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ سب سے چھوٹی بہن کو بیاہتے ہی امی کا انتقال ہو گیا۔ اور کئی سال میں نے امی کی یاد میں دکھ مناتے گزار دیے۔ اور شادی کا بھی دل نہ ہوا۔ مگر پھر سب بھائی بہنوں نے ضد باندھ لی کہ مجھے شادی کرنی ہی ہے۔ یوں بھی میں

پاکستان واپس آچکا تھا۔۔ اب اچھا گھر بھی تھا اور وسائل بھی تھے۔۔ گو میں اب جوان نہیں رہا تھا، مگر پھر بھی میری بہنیں بہت ذوق و شوق سے میرے لیے لڑکی تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ میں نے سختی دکھانے کے بجائے اپنی طرف سے بھی چند ایک رشتہ داروں کو کھنگالنا شروع کردیا۔۔۔ میں شادی کسی ایسی عورت سے کرنا چاہ رہا تھا جو میرے سہارے کی ضرورت مند ہو۔

اور یوں میں نے دوسری بار عزیزہ کو سوچا۔۔۔ عزیزہ میری پھوپھی زاد تھی اور عمر میں مجھ سے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ میں یوں ہی چھوٹے پھوپھا کے ہاں جانے لگا تھا۔ وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیٹھک لگاتے

تھے۔ کافی اچھے سمجھ دار لوگ حاضری دیتے، جس کے باعث مجھے ان لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔۔ کیونکہ میری پھوپھی کا گھر تھا میں اکثر گھر کے اندر بھی چلا جاتا۔۔ عزیزہ۔۔ پھوپھی جان کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔۔ میرے باقی پھوپھی زاد بھی شادی بیاہ کرکے اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ عزیزہ کی شادی بھی چھوٹے پھوپھا نے اپنی ہی حیثیت کے مطابق کھاتے پیتے

گھرانے میں کی تھی۔ مگر چند ہی مہینوں میں عزیزہ طلاق لے کر واپس آگئی تھی۔

ہمارا خاندان پرانے طور طریقوں پر کاربند تھا۔ عزیزہ کی طلاق کے بعد کافی سالوں تک چھوٹے پھوپھا کا سب نے بائیکاٹ کیے رکھا، مگر چھوٹے پھوپھا کے مطابق وہ ان باتوں سے ڈر کر اپنی بچی کو جہنم میں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ایک عام خیال یہ بھی تھا کہ شاید عزیزہ کچھ ایسی نکمی۔ آرام طلب تھی کہ اس کی سسرال میں نہ بن سکی۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ پہلی بار عزیزہ کو اپنی بہن کی شادی میں دیکھا تھا اس وقت وہ شاید انٹر یا میٹرک میں تھی، مگر اس کے اندر بچگانہ پن نہیں تھا۔ بہت بردبار اور رعب و دبدبے سے بات کرتی تھی۔ اس کی بات کو سب ہی بڑی اہمیت دیتے تھے اور جہاں بیٹھ جاتی اس ٹولے میں ہنسی مذاق کی جگہ اچانک سنجیدہ گفتگو جاری ہو جاتی۔ زیادہ تر وہ خاموش ہی رہتی تھی۔ مگر اپنی کشش سے سب پر قابو پالیتی تھی۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار اس کا نظروں نظروں میں تعاقب کیا۔ اور ہر بار اس کو بڑے ہی مدبرانہ انداز میں محو گفتگو پایا۔

اتنی سی عمر میں اس کی اتنی سنجیدہ طبیعت سے میں بڑا متاثر ہوا تھا۔ مگر اس وقت میرے ذہن میں شادی کا خیال تک نہیں تھا۔ میں اس کشش کو محض کسی خوب صورت حسینہ کو دیکھ کر دل کا تھوڑی دیر کے لیے مچل جانا ہی سمجھا تھا۔ مگر شاید اب تک میں اس کشش، اس پروقار سی شخصیت کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ اب کی بار میں نے اسے دیکھا تو اس سنجیدگی میں غم و دکھ کی ملاوٹ ہو چکی تھی۔ اور اس کی

اس گداز شخصیت نے جیسے مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ میں نے اس کے روز مرہ کے معمول پر نظر ڈالی۔ چھوٹے پھوپھا امیر آدمی ہیں۔ گھر میں ملازم بھی ہیں۔ گاڑی ڈرائیور سب ہی ہے، ایسے میں عزیزہ کا تھوڑا بہت آرام طلب ہونا تو جائز ہی تھا۔ اور اب میں بھی تو اسے یہ ساری آسائشیں بہ آسانی فراہم کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی پسند بھائی، بہنوں کے آگے اس وثوق سے رکھی کہ کسی بھی قسم کے انکار یا حجت کی گنجائش ہی نہ رہی اور ایک یہ ہی بات خاندان میں کچھ اس طرح پھیل گئی کہ سب جگہ مشہور ہو گیا کہ میں عزیزہ کو جوانی سے چاہتا تھا اور اب اپنی چاہت کا عملی نمونہ اس کے طلاق یافتہ ہونے کے باوجود اسے قبول کر کے پیش کر رہا ہوں۔ میں نے دو چار بار رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں کو غلط فہمی سے نکالنے کی کوشش بھی کی مگر پھر سوچا چھوڑو، سوچنے دو، میرا کیا جاتا ہے۔ اور بس یہیں۔ بس یہیں اسی سوچ کے ساتھ ہی ممانی جان کا سایہ مجھ پر پڑ گیا۔

انہوں نے مجھے خوب سکھایا، پڑھایا۔ بلکہ کئی گھنٹے کی لیکچر بازی کی کہ مجھے عزیزہ کی پہلی طلاق کا تو معلوم ہی ہے کہ کس وجہ سے ہوئی۔ لہٰذا اب اگر اپنی خیر منانی ہے تو اس سے پہلے دن سے سختی سے پیش آنا ہے اور اس کی آرام طلبی اور بے جا لاڈ اٹھوانے کی عادت کو ختم کرنا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی جنگلی جانور لا رہا ہوں، جس کو آبادی میں رہنے کے ادب و آداب سکھانا ضروری تھا۔ ممانی جان سکھر سے پورے دو مہینوں کے لیے آچکی تھیں اور شادی میں، ہر ایک کام اور بات میں من مانی کرتی رہتی تھیں۔ میری بہنیں خوب چڑتیں، مگر کیونکہ میں نے ہی ممانی جان کو بلوایا تھا۔ لہٰذا چپ رہتیں۔ ادھر چھوٹے پھوپھا کا اپنا رعب تھا۔ لہٰذا ممانی جان کا پھوپھی جان اور ان کے گھر والوں سے رویہ ہمیشہ اچھا رہتا، مگر عزیزہ کو سدھارنے کے لیے نت نئے پلان بناتی رہتیں۔

اور اس تعلیم کا پہلا سبق عزیزہ کو کچھ یوں دیا گیا کہ ولیمہ کے دوسرے دن ہی میں نے عزیزہ کو حکم دیا کہ ملنے والی تمام منہ دکھائی جو اسے کیش کی صورت میں ملی ہے میرے حوالے کر دے۔ ممانی جان نے سختی سے کہا تھا کہ عزیزہ کے ہاتھ پر اب کئی مہینوں تک ایک روپیہ بھی نہ رکھنا۔ میرے حکم پر عزیزہ نے لاپروائی سے سائڈ ٹیبل پر بکھرے بے شمار رنگ برنگے لفافے سمیٹ کر مجھے پکڑا دیے۔ ان لفافوں میں کچھ

میرے ہی بھائی بہنوں کے دیے ہوئے تھے۔ کچھ عزیزہ کی سہیلیاں دے گئی تھیں۔ کچھ اس کے بھائی بہن۔ اس لحاظ سے ان سب کی مالک عزیزہ ہی تھی۔ ایک لمحے کو میری غیرت جاگی مگر پھر ممانی جان کا لیکچر یاد آتے ہی میں نے بڑے دھڑلے سے تمام لفافوں سے پیسے نکال کر خالی اسے پکڑا دیے اور ہدایات دیں کہ پھینکنے سے پہلے سب لوگوں کے نام اپنے پاس درج کرلے۔

اسی شام عزیزہ۔ ممانی جان کی بہو اور میری دونوں بہنوں کے ہمراہ آئس کریم کھانے گئی۔ واپسی پر میری بہنوں کا موڈ کچھ آف تھا۔ ممانی جان کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لڑکیوں نے عزیزہ سے آئس کریم کے پیسے دینے کی ضد کی۔ یہ پہلی پہلی آئس کریم دعوت تو عزیزہ کی طرف سے ہونی چاہیے 'مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی جس کے باعث میری کسی بہن کو ہی پیسے نکالنے پڑے' عزیزہ آتے کے ساتھ ہی کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں ممانی جان کے جوش دلانے پر غصے سے کمرے میں جاکر اسے سنانے لگا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی تھکے تھکے انداز سے اپنا ہلکا پھلکا زیور اتار رہی تھی۔

"اتنے امیر باپ کی اتنی کنجوس بیٹی۔ ہونہہ۔"

میرے یہ کہنے پر وہ تڑپ کر مڑی اور سنگھار میز پر رکھے اپنے چھوٹے سے پرس کو کھول کر میرے سامنے کردیا۔ جو کہ خالی تھا۔

ظاہر ہے آج صبح ہی تو میں نے اس سے سارے پیسے نکلوالیے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے ہاں بھی نہیں گئی کہ اسے پیسے مل جاتے اور نہ ہی میں نے اسے جاتے وقت کچھ دیا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے تو لاجواب ہوا 'مگر پھر بلاوجہ اس کو لعن طعن کرکے جلدی سے کمرے سے نکل آیا کہ اس کی پلکوں کے کنارے بھیگ چکے تھے۔ دل بڑا بے چین ہوا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہ ہوا تھا کہ عزیزہ خاموشی سے میرے دل میں اس حد تک گھر کرچکی ہے کہ اس کی آنکھوں کی ذرا سی جھلک۔ ہلکی سی نمی مجھے گھنٹوں بے چین رکھ سکتی ہے۔ ایک دل ہوا کہ چھوڑوں یہ سدھارنا وغیرہ۔ عزیزہ کے ساتھ خوب گھل مل کر بیٹھوں۔ گپ لگاؤں۔ اس کو باتیں کرتا سنوں۔ ممانی جان کو چلتا کروں۔ مگر پھر سوچا وہ جہاں دیدہ خاتون ہیں۔ ان کے مشورے پر عمل کرنے میں ہی عقل مندی ہے۔

دوسرا سبق جو میں نے عزیزہ کو دیا وہ یہ تھا کہ میں نے اس سے کہا کہ کسی نوکر کو ساتھ لے جاکر وہ صبح صبح چھت کی صفائی کروائے۔ ہمارا تین منزلہ مکان تھا اور پھر چھت تھی 'جس پر ایک طرف تو کچھ پرانا سامان ڈھیر تھا اور دوسری طرف کنسٹرکشن میں کام آنے والی سیمنٹ کی ایک دو بوریاں۔ مٹی کا ڈھیر اور اینٹیں وغیرہ بکھری تھیں۔ بہنوں کے بچے اور ممانی جان کے پوتے پوتیاں جب بھی نظر بچاکر چھت پر پہنچتے 'سب بکھیر کر خوب گند کرتے۔ حد تو یہ تھی کہ ایسا کام تو شاید میں اپنی بہنوں کو بھی کبھی نہ کہتا 'جتنا بے کہ اپنی نئی نویلی دلہن کو جو اتنے بڑے گھر میں ناز سے پلی بڑھی تھی۔ وہ پہلے تو ذرا گھبرائی اور حیرانی سے میرا جائزہ لینے لگی۔ شاید وہ مجھے اور میرے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی کیونکہ جیسا نرم دل اور حساس میں مشہور تھا 'ویسا کم از کم عزیزہ کو نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے اس پر بھی بڑی جلدی ہار مان لی۔ بلکہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ سدا کی ہاری ہوئی اپنی جیت کی ہر امید ہی کھو چکی ہے۔ دوسری صبح حکم کے مطابق وہ گھر میں آنے والے ملازم کو لے کر چھت پر چلی گئی اور آدھا دن ڈھل جانے پر مٹی اور پسینے میں اٹی تھکی ہاری نیچے آئی۔ بچے تو قابو میں تھے نہیں۔ وہ دوپہر میں سب سونے لیٹے تو چپکے سے چھت پر چڑھ کر انہوں نے پھر سے مٹی 'سیمنٹ اور اینٹوں کو بکھیر دیا۔ ممانی جان بڑے ٹھسے سے شام کو چھت کا معائنہ کرنے گئیں اور آکر خوب شور مچایا کہ چھت کی تو صفائی سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ عزیزہ پر تو جو گزری سو گزری میں الگ سہم گیا کہ یقیناً "اب مجھے حکم دیں گی کہ کل صبح پھر عزیزہ کو چھت کی صفائی کے لیے بھیجوں 'مگر خیر ہو اس ملازم کی کہ اپنی بات پر اڑ گیا اور ثبوت کے طور پر مٹی سے لت پت جھاڑو پونچھا بھی

دکھا دیا۔ میں بھی موقع غنیمت جان کر سامنے سے ہٹ گیا کہ کہیں حکم ہی نہ صادر ہو جائے۔ خاموش مزاج تو وہ ویسے بھی تھی' مگر میرے رویے کی بدصورتی کی وجہ سے وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی تھی۔ اکثر مجھے مگن پا کر وہ مجھے بغور دیکھنے لگتی' جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ کیا واقعی میں وہی ہوں' جس نے اپنی پسند سے یہ شادی کی ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی تیرتی رہتی اور میں سب جان کر بھی انجان بنا بیٹھا رہتا۔ ایک بار بھی اس پر نظر نہ ڈالتا۔ وہ مہمانوں' میکے سے آئے ہوئے لوگوں میں بیٹھنے سے کتراتی اور زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کمرے کی تنہائی میں وہ گھنٹوں ایسے بیٹھی رہتی جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ کوئی بات کرنا چاہ رہی ہو۔ مگر ممانی جان کے حکم پر میں ہر ممکن یہ ہی کوشش کرتا کہ اس سے بات کم ہی کروں۔ ویسے میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اسے بہت سی خوشیاں دوں گا۔ میرا مقصد یہ ہی تھا کہ اس کے ماضی میں جو زخم اسے لگے ہیں' وہ سب بھر جائیں۔ مگر اس کو سبق سکھانے اور اس کی "میں" کو ختم کرنے کے چکر نے مجھے خود ہی اپنی نظروں میں گرا دیا تھا۔ میں بھی اس سے نظریں چراتا اور حتی الامکان اس سے دور رہتا۔

مگر یہ تیسرا سبق شاید کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ کچھ بھی تھا' وہ ابھی نئی دلہن تھی۔ کچھ نہ کچھ کر کے اپنے برابر میں نہ سہی' مگر کم از کم اپنی گاڑی میں لے بٹھا لینا چاہیے تھا۔ یہ تو بہت ہی گھٹیا پن سرزد ہو گیا مجھ سے۔

ہم سب بھائی' بہن ممانی جان سمیت ساحل سمندر کی سیر کو نکلے۔ ہمارے پاس دو گاڑیاں تھیں' جس میں سے ایک' میں اور دوسری میرا چھوٹا بھائی چلا رہا تھا۔ اس پر بھی کچھ لوگ زیادہ تھے' جس کے باعث ٹیکسی کی گئی۔ ممانی جان کے حکم کے مطابق میں ابھی تک ایک بار بھی عزیزہ کو اکیلے کہیں گھمانے لے کر نہیں گیا تھا۔ اگر ہم کسی دعوت میں بلائے جاتے تو ممانی جان آگے میرے برابر میں بیٹھ جاتیں اور عزیزہ پیچھے۔ مگر اس بار تو حد ہی ہو گئی۔ ممانی جان کے حکم سے عزیزہ کو ٹیکسی میں ممانی جان کے بیٹے اور ایک ممانی جان کے ہی ساتھ آئے ہوئے خانساماں کے ساتھ جگہ دے دی گئی۔ بہنیں تو پہلے ہی دبے لفظوں میں مجھے ٹوک چکی تھیں' آج تو میرا چھوٹا بھائی بھی بول پڑا۔ مگر میں نے جلدی جلدی بات نپٹا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ساحل پر کچھ دیر گھوم پھر کر کھانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ چلے گئے' مگر ہر بار عزیزہ ٹیکسی پر ہی سوار کرائی جاتی۔ کرائی کیا جاتی وہ خود ہی جلدی سے جا کر ٹیکسی میں بیٹھ جاتی۔ واپسی پر راستے میں ٹیکسی خراب ہونے پر جو ممانی جان کا بیٹا تھا' وہ بھی کسی نہ کسی طرح چھوٹے بھائی کی گاڑی میں چڑھ بیٹھا اور عزیزہ کو خانساماں کے ساتھ رکشا کرا دیا گیا۔ میری گاڑی ایسی ٹھسی ہوئی تھی کہ میرے پاس بھی جگہ نہیں تھی۔ راستہ کچھ زیادہ لمبا نہیں تھا' میں نے رکشے والے کو خوب خوب ہدایات دے دیں کہ ہلکے ہلکے چلائے اور میری گاڑی کے پیچھے پیچھے ہی رہے۔ مگر جناب رکشے والا کہاں سننے والا تھا۔ میں نے ابھی گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پر ڈالی ہی تھی کہ رکشا تیز رفتاری سے مجھے اور چھوٹے بھائی کی گاڑی کو سائڈ مارتا آگے نکل گیا۔

مجھے پہلی بار اپنی کمینگی پر بے حد غصہ آگیا اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ آج رات ہی میں عزیزہ سے باقاعدہ معافی مانگ کر اس سے دوستی کر لوں گا اور ممانی جان پر یہ ہی ظاہر کرتا رہوں گا کہ میں عزیزہ کے ساتھ سختی سے پیش آ رہا ہوں۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔

☼ ☼ ☼

ہم جس وقت مارکیٹ میں رکے' گھر کا سودا سلف لے رہے تھے۔ رکشا اپنی رفتار کے باعث پل سے اترتے وقت الٹ گیا تھا اور پھر پیچھے سے آتی ہوئی ایک گاڑی بھی اس سے ٹکرا گئی تھی۔ عقیل نے مجھے یہ ہی بتایا تھا کہ اس کو تو معمولی خراشیں آئی تھیں کہ رکشے کے الٹتے ہی وہ تیزی سے فٹ پاتھ پر چھلانگ لگا

چکا تھا‘ مگر عزیزہ رکشے کے اندر ہی رہ گئی اور اب وہ اسپتال میں ایمرجنسی وارڈ میں ہے۔ میں چھوٹے بھائی کے ہمراہ بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا۔ میری عجیب حالت تھی‘ نہ ہی مجھ سے بات کی جارہی تھی اور نہ ہی مجھے کسی اور کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ ایک ہی دھن سوار تھی کہ عزیزہ کو جلد از جلد دیکھوں۔ میں تو جیسے ایمرجنسی وارڈ کے باہر مسکین فقیر سا بنا اپنے چھوٹے بھائی کو گارڈ سے لڑتے دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح ہم دونوں کو اندر جانے نہیں دے رہا تھا۔ گارڈ کی ایک ہی رٹ تھی ”پہلے اندر والے کو باہر بلاؤ‘ پھر آپ لوگ اندر جاؤ۔ بڑی دیر کی بحث کے بعد ہم اندر داخل ہوئے۔ ایک ایک بستر پر نظر ڈالتے ہم نے ریسپشن سے معلومات لیں۔ وہاں سے ہمیں ایک اور کمرے کی طرف بھیجا گیا جو کہ تھا تو ایمرجنسی وارڈ کا حصہ‘ مگر الگ تھلگ تھا‘ یعنی ایکسیڈنٹ میں آنے والے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ذرا سا کونے کی طرف بستر پر پڑے ایک جسم پر سر سے لے کر پیر تک سفید چادر پڑی تھی‘ جو جگہ جگہ سے خون خون ہورہی تھی۔ میرے تو اوسان خطا ہوگئے۔ میں وہیں دروازے کی چوکھٹ پر ہی ٹک گیا اور دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا۔ نہ جانے کب میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوچکے تھے۔ چھوٹا بھائی بھی گھبرا گیا‘ اس نے مجھے سنبھالنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا کہ میں ہذیانی انداز میں چلانے لگا۔

”میں لٹ گیا‘ میں برباد ہوگیا یار! یہ کیا ہوگیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں تو کھڑے کھڑے لٹ گیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔“

اچانک ہماری نظر عقیل پر پڑی جو میرے زور زور سے چلانے کی آواز سن کر تیزی سے ایک پردے کے پیچھے سے نکل کر ہماری طرف دوڑا آرہا تھا۔

”بھابھی ادھر ہیں بھائی جان!“

اس نے کونے کی سمت اشارہ کیا‘ جس کا پردہ ہٹ جانے پر عزیزہ سامنے بستر پر بیٹھی نظر آرہی تھی۔ ایک نرس اس کے ایک ہاتھ پر پٹی باندھ رہی تھی۔

عزیزہ کی نظریں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں‘ وہی حیران نظریں جو مجھے سمجھنے کی کوشش میں مجھ پر ڈالا کرتی تھی۔ چھوٹا بھائی اور عقیل مجھے سہارا دے کر عزیزہ تک لے گئے۔

نرس نے مصنوعی غصے سے چپ رہنے کی ہدایات دیں اور یہ بھی کہانی سنادی کہ معمولی چوٹیں ہیں‘ پٹی کردی ہے۔ دو دن بعد آکر بدلوالیں اور ساتھ میں دوائیوں کا پرچا بھی تھمادیا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ عزیزہ کا نہیں میرا ہوا ہے۔ میں کچھ ایسا بدحواس ہوا جارہا تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا‘ یہیں اسپتال میں ہی عزیزہ سے معافی تلافی شروع کردوں۔ گھر پہنچے تو تمام لوگوں کو اپنے ہی انتظار میں بیٹھے‘ تسبیح اور نماز پڑھتے دیکھا۔ خیر میں جلدی سے چھٹکارا پاکر عزیزہ کو لے کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بے چاری اس قدر سہمی اور تھکی ہوئی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی سوگئی۔ مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ میری بے چینی کم نہ ہوئی تو رات کا ایک بڑا حصہ نفل پڑھتا رہا اور خوب گڑگڑا کر خداوند سے اپنی غلطی کی معافی مانگتا رہا۔ شرمندگی کے مارے آنسو امڈتے ہی چلے آتے تھے‘ خیر کسی نہ کسی طرح صبح کی اور چائے پینے کچن میں گیا تو دیکھا کہ گھر والے پہلے سے ناشتہ لگائے بیٹھے ہیں۔ بہنوں نے جلدی جلدی چائے اور کھانے پینے کی چیزیں میرے سامنے رکھ دیں۔

ممانی جان گلا کھنکھار کر بولیں۔ ”عزیزہ کو بھی جگا کے لے آتے۔ اب کب تک سوئے گی؟“

میری بہنیں بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں کہ کہیں میں واقعی عزیزہ کو جگانے نہ دوڑ پڑوں۔ میں نے اطمینان سے چائے کے دو چار گھونٹ بھر کر چھوٹے بھائی کو مخاطب کرکے کہا۔

”ممانی جان کی آج شام چار بجے کی سیٹ بک کروا دی ہے۔ میں تو عزیزہ کو لے کر اس کے مکمل چیک اپ کے لیے اسپتال جاؤں گا۔ لہٰذا تم ہی ان سب کو اسٹیشن چھوڑ آنا۔“ چھوٹا بھائی سر ہلاتا ہوا طنزیہ انداز میں بولا۔ ”تو کیا۔ اسکول بند۔ تعلیم مکمل ہوگئی؟“ میز کی دوسری طرف سے چھوٹی بہن چہکی۔

”الحمدللہ......!“

ایمل رضا

راکھ ہو گئیں سب بستیاں
در اندر ان گنت ہستیاں
بے طلب، بے وجہ کی یہ فیاضیاں
اک بپال ساز کی کرم سازیاں

اندھیاریاں اوڑھے آسمان سے لپک کر بجلی کا ایک کوندا پھسلا اور دھرتی کی سطح پر پھیل گیا۔ میدان کے وسط میں آگے برگد کے درخت نے اپنی جٹاؤں کو ساکت کر لینا چاہا تھا۔ اس کے بالکل سامنے کی قوسی سلاخ دار کھڑکی میں بوڑھے وجود کا چہرہ نمودار ہو گیا تھا۔ اپنے جھریوں بھرے چہرے کی ساری تاریکی لیے، وہ آسمان کو یوں تک رہی تھی جیسے اس میں چھید کر کے پار دیکھنا چاہتی ہو۔ اس کی دراوڑیں آنکھوں میں ہر طرح کی محبت کا جذبہ کافور ہو چکا تھا۔ اس نے اب اپنا ایک ہاتھ باہر نکال لیا تھا۔ سلاخ دار کھڑکی کی لکڑی پر کی گئی نقش و نگاری کو وہ یوں ٹٹول رہی تھی جیسے وہاں اس کا کچھ کھو گیا ہو۔ ان سب نقوش سے اس کی جان کاری انمٹ تھی۔

یک لخت سناٹے میں رعد کی آواز پھر سے گونجی اور حشرات تک کے کانوں کو بہرہ کر گئی۔

سلاخ دار کھڑکی میں نصب پانچوں آہنی سلاخیں

مکمل ناول
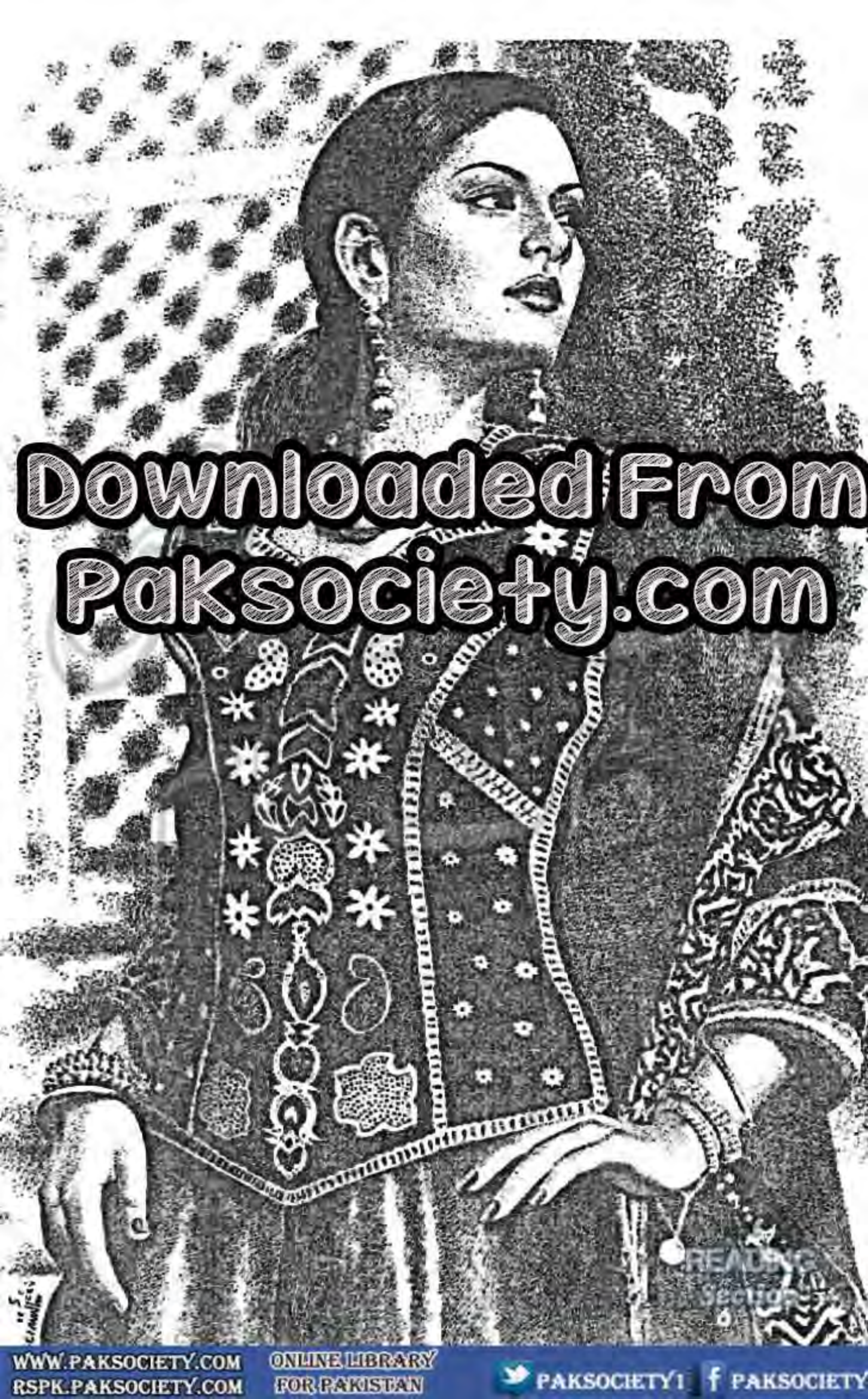
بجلی کی چمک میں واضح ہوئیں اور برگد نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لینے چاہے۔ بوڑھا وجود لازما" اب کچھ بولنے والا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ چپ نہیں رہتی تھی۔ اور اسے بڑے عجیب و غریب ناموں سے پکارا کرتی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کی برگد کو توقع تھی۔ بوڑھے وجود نے فلک پر نظریں گاڑے گاڑے اپنے کپکپاتے لب کھولے تھے۔

"چوبی درویش... او... نشان خدائی (برگد)۔ زلیخائی سے پوچھو۔ اس نے کیوں کہا۔ تھا... کہ... وہ رحمن ہے... رحیم ہے... باری ہے... باوی ہے... عادل ہے' انصاف کرنے والا' پوچھو اس مکارن سے۔" یہ آواز غم کی نمی سے رندھی ہوئی تھی۔

برگد نے جٹاؤں کو اپنے سینے پر باندھ لیا اور نظروں سمیت سر بھی جھکا لیا۔ یہ پیغام نیا نہیں تھا۔ وہ پچھلے تیس سالوں سے ایسے ہی پیغامات کو سنتا چلا آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

الارم بجنے سے بہت پہلے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ پسینے میں... سائیڈ لیمپ جلا کر اس نے ٹائم دیکھا' پانچ بج چکے تھے۔

"نانو یقینا" اٹھ چکی ہوں گی اور فجر کی نماز ادا کر رہی ہوں گی۔" اس نے اندازہ لگایا اور کھل کر انگڑائی لی۔ اسے پتا تھا کہ اب اسے نیند نہیں آئے گی۔ اس لیے باتھ روم سے نکل کر وہ باہر صحن میں چلا گیا۔

نانو نماز پڑھ چکی تھیں اور اب صحن کی لائٹ تلے چھوٹی میز پر بہت بڑے سائز کا مٹی کا گلدان رکھے اس پر پیلے رنگ میں رنگی "جوٹ" لپیٹنے میں مصروف تھیں۔ اس طرح کے جوٹ کے گولے کے بہت سے لچھے کھل کر ان کی گود اور پاؤں میں بکھرے ہوئے تھے۔

باسل کے قدموں کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو کام کرتے کرتے سر اٹھا کر انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ پہلے وہ حیران ہوئی تھیں پھر ایک شفقت آمیز مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیلتی چلی گئی تھی۔ باسل سستی سے چلتا ہوا ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"خیریت...؟ آج تم اتنی کیسے جلدی اٹھ گئے... مجھے لگا۔ یشار ہے۔" لفظ تم پر زور تھا۔ وہ واقعی حیران ہوئی تھیں۔

"کیوں...؟ کیا میں جلدی نہیں اٹھ سکتا۔ کیا جلدی اٹھنے کا حق صرف یشار کو ہی ہے۔" وہ نانو کی ذو معنی مسکراہٹ کو سمجھ رہا تھا۔

"یشار نے تو اٹھ کر بہت سارے کام کرنے ہوتے ہیں... وہ جاگنگ کرنے جاتا ہے' پھر آکر ایکسر سائز کرتا ہے۔ کلینک کا کام کرتا ہے۔ تم کیا کرو گے؟" نانو بدستور اسی طرح مسکراتے ہوئے اور برش سے گلدان کی سطح پر گوند لگاتے ہوئے بولی تھیں۔

"میں... میں وہ۔" وہ گڑبڑایا۔ صبح تو دور' وہ سارا دن بھی کوئی قابل قدر قابل ستائش کام نہ کرتا تھا اور یہ بات وہ خود بھی بخوبی جانتا تھا۔

"میں آپ کو دیکھوں گا نا... آپ سے آج یہ کام سیکھوں گا۔" وہ جوٹ لپٹے گل دان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

نانو نے ٹیڑھی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جوٹ کے بل کھولے تھے اور گوند لگے حصے پر چپکا دی تھی۔

"سامان پیک کر لیا تم نے اپنا...؟" نانو نے پوچھا تو جیسے اسے کچھ یاد آگیا اور اس کچھ کے ساتھ اور بھی بہت کچھ... ایک دم ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور وہ ذرا غصے سے نانو کو دیکھنے لگا۔

"یہ زیادتی ہے نانو! سراسر زیادتی... یشار مجھ سے صرف دو سال ہی بڑا ہے۔ لیکن آپ اس کے سارے کام اس طرح کرتی ہیں جیسے یا تو وہ ابھی بچہ ہو یا بوڑھا ہو چکا ہو۔ اور اپنے سارے کام مجھے خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ میری دفعہ آپ مصروف ہوتی ہیں یا تھکی ہوئی ہوتی ہیں... بعض اوقات تو مجھے لگتا ہے کہ میں اس گھر کا بیٹا ہی نہیں... مجھے کسی کوڑے دان سے اٹھا کر لائے ہیں آپ لوگ۔ اس کے شکوے

پر نانو آگے سے ہنس دیں اور آخری بات پر تو ہنستی ہی چلی گئیں۔

"ہنسیے مت۔۔۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔۔۔ مجھے لگتا ہے واقعی ایسا ہی ہے۔"

"ایسے سنجیدہ سنجیدہ شکوے تو نہ کرو باسل۔۔۔ تم جانتے ہو مجھے تم دونوں سے کتنی محبت ہے۔ یشار پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔۔۔ تم نہیں سمجھو گے تو اور کون سمجھے گا۔ وہ کلینک چلاتا ہے۔ لیکچر ز دیتا ہے۔ ملکوں ملکوں ۔ ورکشاپس اٹینڈ کرتا ہے۔ پھر اس کا مزاج بھی ایسا ہے کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ اور اپنے سارے کام خود ہی کر لیتا ہے۔"

"تو مجھے نصیحت کریں کہ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالو۔۔۔ اور وہ کرے تو بے چارہ۔۔۔ واہ۔۔۔ سب کچھ وہ ہی کرتا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔"

"اچھا بتاؤ کیا کیا کرتے ہو تم؟"

"کرکٹ کھیلتا ہوں۔ سوئمنگ کلب جاتا ہوں۔ اسنوکر کا بھی پلیئر ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ گانے سنتا ہوں۔ فلمیں دیکھتا ہوں' کھانا کھاتا ہوں' نہاتا ہوں' کپڑے بدلتا ہوں۔ اتنے سارے کام کرتا ہوں میں۔۔۔ بھئی تھک جاتا ہوں۔ آخر کو میں بھی انسان ہوں۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ آپ کو شاپ سے لانے اور چھوڑ کر آنے کی ڈیوٹی بھی تو ادا کر رہا ہوں۔۔۔" وہ بولتا رہا اور نانو ہنا رکے ہنستی رہیں۔

"ہاں۔۔۔ یہ آخری کام تو تم واقعی بہت اچھے طریقے سے نبھا رہے ہو۔"

"اور پچھلے دس سالوں سے۔۔۔" اس نے جتایا۔

نانو ابھی جوٹ کو سلجھانے لگیں۔ پھر برش سے گوند لگا کر انہوں نے گلدان پر جوٹ کو لپیٹا' ایک ہفتے کے بعد وعدے کے مطابق اس گلدان کی سپلائی دینی تھی انہوں نے اس لیے وہ کام بڑی تیزی سے مگر نفاست سے کر رہی تھیں۔ نفاست اور پائیداری ان کی دکان کی پہلی پہچان تھی۔ "نگار خانہ" ہینڈی کرافٹس کے بڑے بورڈ والی ایک بہت وسیع دکان۔۔۔ جو انار کلی بازار کے وسط میں واقع تھی اور جسے نانو پچھلے دس سالوں سے بڑی کامیابی سے چلا رہی تھیں۔ بازار میں اس طرح کی صرف تین چار ہی اور دکانیں تھیں اور نانو کی دکان کا مال ان سب دکانوں سے زیادہ فروخت ہوتا تھا۔

نانو اس دکان کی مالک ہونے سے پہلے گھر سے قریب حبیب اللہ روڈ پر ہی موجود غزالی ہینڈی کرافٹس کی دکان پر بھی بارہ سال کام کر چکی تھیں۔ لیکن اس دکان پر وہ ایک ورکر اور ایک گائیڈ کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ اسی جاب نے ان کے تجربے ان کے ہنر اور شوق کو مزید بڑھایا تھا۔ اسی لیے جب ان کے پاس کافی سرمایہ اکٹھا ہو گیا تو انہوں نے انار کلی بازار میں اپنی دکان خرید لی۔ اور اس دکان کا نام انہوں نے "نگار خانہ" رکھا۔

دستکاری' کندہ کاری اور چترکاری کا شوق تو انہیں بچپن سے ہی تھا۔ مگر یہ کام کبھی ذمہ داری سمجھ کر بھی کرنا پڑے گا اس بات کا انہیں گمان تک نہ تھا۔ پھر بھی نانو بہت خوش اسلوبی سے یہ کام کر رہی تھیں۔ پچھلے پچیس سالوں سے اس کام سے منسلک رہنے کے باوجود وہ ابھی تک بور نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ وہ ہر دن پہلے دن کی طرح پرجوش ہوتی تھیں۔

دکان طرح طرح کے نفیس' مہنگے اور خوب صورت سامان سے بھری ہوئی تھی۔ جس میں سلور' تانبے کے چھ دار لیمپ' فریم' تھال اور چراغ دان تھے۔ اونٹ کی کھال کے بنائی لیمپ' اونٹ کی ہڈیوں سے بنی سجاوٹی اشیاء' شیشم کی لکڑی کے گلدان' برتن' جام' طشتریاں' جواہرات کے ڈبے شیشے جڑے' جوٹ لپٹے گلدان' مرمر کے جام اور قدح' سلیمانی زرد کے جانور' ہاتھی' گھوڑے' شیر' سلیمانی کلی کے ہرن' سلیمانی سیاہ کی شطرنج' تنکا ورک کی تصویریں' راک نمک کے مختلف قالب میں ڈھلے نمونے ملتانی سفید اور نیلی نقاشی کے برتن' زرد کوڑیوں کی کشتیاں' ہار' کانٹے' کڑے' کلش کے زیورے' راکھ تھالی' بید مجنوں کے موڑھے' ہزارے کی چنگیریں' ٹکواریں اور کھڑیاں۔

نانو کی دلی آرزو تھی کہ دکان میں موجود ہر طرح کی

چیزیں ان کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہو۔ لیکن یہ آرزو پوری ہونا تقریباً "ناممکن تھی۔ بعض چیزوں میں ماہر ہونے کے لیے پوری زندگی درکار تھی۔ جس میں اونٹ کی ہڈیوں پر کی ہوئی کندہ کاری سرفہرست تھی اور جو انتہائی نفاست مانگتی تھی۔ دوسرے نمبر پر سلیمانی پتھر تھا' جس کو کسی قالب میں ڈھالنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی آدھے سے زیادہ مال نانو کے ہاتھوں سے نکل کر ہی دکان میں پہنچتا تھا۔ جوٹ ورک' تنکہ ورک' راک سالٹ' شیشے جڑے برتن' چنگیریں' ٹوکریاں' ان سب کے سیمپل نانو خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی تھیں۔ پھر کاریگر سیمپل دیکھ کر باقی پیس بنا لیتے تھے۔

سلور کے لیمپ اگرچہ نانو سالوں بعد ہی بناتی تھیں لیکن ہر لیمپ کا ڈیزائن نانو خود ڈیزائن کرتی تھیں۔ ان کی اس محنت کی وجہ سے پچھلے چند سالوں سے یہ دکان اچھی خاصی چلنے لگی تھی۔ اور نانو پہلے کی نسبت بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھیں۔۔۔ لیکن اس مصروفیت کے باوجود بھی یشار اور باسل' دونوں بھائیوں کو نانو سے کبھی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ ہر کام ہمیشہ کی طرح وقت پر اور مکمل ملتا تھا۔

یشار ایم ایم عالم روڈ پر اپنا ایک کلینک چلا رہا تھا۔ نفسیات شروع سے ہی اس کا پسندیدہ موضوع رہا تھا۔ پھر اس کے اس شوق کو اس کے والد کے اثاثہ کتب نے مزید بڑھاوا دیا تھا۔ میٹرک میں آنے تک یشار فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ نفسیات کا ڈاکٹر بنے گا۔ اس کا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ کم عمری میں ہی نفسیات کا کوئی عام نہیں بلکہ جانا مانا ڈاکٹر بن چکا تھا۔ یونیورسٹی اور ہاسپٹلز سیمینارز میں اسے لیکچرز کے لیے معاوضے پر بلایا جاتا تھا۔ غیر ممالک کی بہت ساری ورکشاپس بھی وہ اٹینڈ کر چکا تھا اور اب تو وہ دوسرے ممالک کی ورکشاپس اور سیمینار میں مہمان کی حیثیت سے بلایا جانے لگا تھا۔

باسل یشار کے بالکل الٹ تھا۔ یشار کے لیے زندگی جتنی سیریس تھی باسل کے لیے اتنی ہی نان سیریس۔ وہ شروع سے ہی بے فکر اور لاپروا تھا اور نانو نے بھی اس پر روک ٹوک نہیں کی تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی کمی بھی نہیں تھی۔ دونوں کے والد کثیر سرمایہ اور حبیب اللہ روڈ پر واقع یہ پرانی طرز کا سرخ اینٹوں سے بنا ایک منزلہ گھر جو چاروں طرف سے باغ سے گھرا تھا۔ ترکے میں چھوڑ کر گئے تھے۔ لیکن اب یونیورسٹی سے فارغ ہو جانے کے بعد نانو شدت سے یہ چاہتی تھیں کہ باسل کچھ بھی سہی مگر کرے۔

"تم بتاؤ' تم کرنا کیا چاہتے ہو باسل؟" نانو بارہا اس سے پوچھ چکی تھیں اور وہ آگے سے سر کھجا کر کہتا۔

"بہت بڑا بزنس۔۔۔ اتنا بڑا کہ میں آفس میں بیٹھا فائلز پر بس سائن ہی کرتا رہوں۔" وہ جواب دیتا تو نانو مسکرا دیتیں۔ مگر اب نانو کی مسکراہٹ بھی غائب ہونے لگی تھی۔

"جب تک اتنا بڑا بزنس شروع نہیں ہو جاتا کہ تم فائلز پر بس سائن ہی کرتے رہو تب تک تم یشار کے کام میں ہی اس کا ساتھ دے دو۔"

یشار کو نانو کے ارادے کا پتا چلا تو اس نے الگ شور مچایا تھا۔

"نانو میں نے اسے اپنے ساتھ کلینک لے کر نہیں جانا۔۔۔ لڑکیوں سے بھی زیادہ نخرے ہیں اس کے۔۔۔ اوپر سے غیر ذمہ دار۔"

نانو جانتی تھیں کہ یشار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے باوجود بھی نانو کا اصرار برقرار رہا کہ باسل یشار کے کلینک جائے۔ چاروناچار ایسا ہونے لگا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے باسل یشار کے ساتھ تھا۔

"میرے ساتھ رہنے سے اسے ڈگری نہیں مل جائے گی نانو۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن سنجیدگی ضرور مل جائے گی۔"

وہ یشار کے ساتھ ایک دو بار اندرون ملک ہونے والے سیمینارز میں بھی جا چکا تھا اور اس بار فرانس کے ٹور پر بھی نانو کا اصرار تھا کہ یشار باسل کو ساتھ لے کر جائے۔

"کلینک میں تو کچھ کرتا نہیں۔۔۔ اکاؤنٹس تک میں تو صفر ہے یہ۔۔۔ وہاں جا کر کیا کرے گا۔" نانو اور یشار

دونوں اس کے لیے فکر مند تھے اور اسے جیسے دونوں کو چڑانے میں مزہ آتا تھا۔

"دو بجے کی فلائٹ ہے نا تمہاری؟" نانو برش کو پھر سے گوند میں ڈبونے لگیں۔

"جی نانو۔"

"وہاں بھائی کو تنگ مت کرنا اور ..."

"خدا کے لیے نانو۔ پلیز آج نہیں۔ ایک ایک لفظ یاد ہے مجھے۔" اس نے لاڈ والی بے زاری سے کہا تو نانو مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔

"اور آپ اس گلدان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہیں۔ پندرہ دن ہو گئے۔ آخر یہ آپ سے مکمل کیوں نہیں ہو رہا۔"

"یہ کام بہت محنت طلب ہے باسل۔ اتنی آسانی سے تھوڑی نا ختم ہو گا۔"

"آپ خواہ مخواہ اتنی محنت کرتی ہیں۔ لائیں مجھے دیں۔ دو منٹ میں سارے گلدان پر رسی لپیٹ کر دکھاتا ہوں میں آپ کو۔" وہ جوٹ کو رسی کہہ کر اس کی توہین کر رہا تھا۔

"اچھا!!" نانو نے اسے نظروں ہی نظروں میں تولا۔ "تم پہلے بھی کافی بار کوشش کر چکے ہو۔"

"دسلور شیٹ تو ہاتھوں سے پھسل رہی تھی۔ مور پنکھ کے تار ٹوٹ رہے تھے۔ راک سالٹ توقع سے زیادہ سخت تھا۔ لیکن یہ۔ یہ تو میں جھٹ پٹ کر دوں گا۔" اس نے چٹکی بجائی اور برش پکڑ لیا۔ جلدی جلدی باقی ماندہ گل دان گوند سے تر کیا اور پھر جوٹ کو چکر پر چکر دینے لگا۔

"یہ دیکھیے۔ کیا کہ نہیں فنافٹ۔" وہ تفاخر سے بولا۔

"اچھا اب اپنے بنائے اور میرے بنائے حصوں کو دیکھو۔" نانو نے بھی اشارہ کیا تو اس نے دونوں حصوں کو باری باری دیکھا۔ فرق واضح تھا۔ نیچے والے حصے میں نفاست نمایاں تھی اور اوپر والے میں عجلت۔ نانو نے ایک ایک کر کے اس کی لپیٹی ہوئی ساری جوٹ اتار لی۔

"یہ دیکھو۔ جوٹ کو بڑی احتیاط سے لگانا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ پہلے رشتہ بنانا پڑتا ہے۔ جو زمین اور نرم گھاس کے درمیان ہوتا ہے۔ تب جوٹ اجازت دیتی ہے کہ انسان اسے اپنی مرضی سے کسی بھی قالب میں ڈھالے۔ یہ دیکھو۔ بل کے ابھار کو پچھلے بل کے دونوں ابھاروں کی درز کے عین اوپر رکھنا ہے۔ نرمی سے۔ کہیں جوٹ کو کھینچ کر کہیں ڈھیل دے کر۔ یہ دیکھو! نظر آیا۔؟ اس طرح سے بنتا ہے ڈیزائن۔ اور اس طریقے سے ملتی ہے قیمت۔"

"کریں بھئی کریں۔ آپ ہی کریں۔ ہمیں نہ تو سمجھ میں آتا ہے نہ ہی یہ کام ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہم تو چلے فرانس۔ وہاں کی خوشبوؤں میں کھونے۔" وہ کہتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ نانو پیچھے

سے اس کی پشت کو دیکھے گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

پتا نہیں وہ کون سالمحہ تھا جب ان کی جان ان کے وجود سے نکل کر یشار اور باسل 'دونوں بھائیوں میں منتقل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سورج مقام غروب پر پہنچا تو فلک پر بکھری چھوٹی بڑی بدلیوں کے ٹکڑوں کے کناروں نے جیسے آگ پکڑلی۔ ہوا کا جھونکا خط سرطان سے نکلا اور برگد کے موٹے تنے سے ٹکرا گیا۔ گرہ بندھی جٹائیں جھول جھول گئیں۔

سو جٹائیں اور ان سب پر ان گنت گرہیں اور بل ۔۔۔ پیغامات کی جواب طلبی کی یاد دہانی کے طور پر اور اب تو یہ حساب کائنات کی طرح لامحدود ہو گیا تھا ۔۔۔ بے کنار ۔۔۔ بے نتیجہ ۔۔۔ کسی نئے بل یا گرہ کی خواہش نہیں رہی تھی۔ دراوڑیں آنکھوں والے بوڑھے وجود نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کے پیغامات کے جواب دینے سے قاصر تھا۔ صدائے بشر آسمان کے پار تو جاتی تھی لیکن ندائے سلطانی واپس نہیں آتی تھی۔ ابھی صدائے آسمانی کا وقت دور تھا۔ بہت دور' اور یہ بات اس بوڑھے وجود کو سمجھانا ناممکن تھی۔ وہ کسی کی سنتی ہی کہاں تھی ۔۔۔ اور برگد کے علاوہ کسی کو سناتی بھی تو نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

فرانس کا شہر ۔۔۔ پیرس۔

دریائے سین بہہ رہا تھا ۔۔۔ روز کی طرح ۔۔۔ سورج کی کرنوں کو سمیٹے ۔۔۔ مشرق کی طرف ۔۔۔ وہ بہہ رہا تھا ۔۔۔ اس کے آنسوؤں کی طرح ۔۔۔ جن کا حجم اس قدر زیادہ تھا کہ ایک اور دریا موجوں سمیت بہہ سکتا تھا۔

انگلی کی پور سے اس نے آنکھ میں آیا ایک اور آنسو صاف کیا اور دریا کو ایسے دیکھا جیسے اس سے اپنی زندگی کی تلخیوں کی وجہ مانگ رہی ہو۔ ان آنسوؤں کا حساب کتاب بھی بڑا عجیب تھا۔ وہ کہاں سے شروع کرتی اور کہاں ختم کرتی۔ کبھی اس حساب کتاب میں سدیم انکل آجاتے' کبھی یشب انکل' کبھی ممی اور کبھی ڈیڈی۔

سدیم انکل ڈیڈ کے دوست تھے' یشب انکل کی طرح جیتنل دوست ایک کمپنی کے مالک تھے اور پیرس میں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ سدیم انکل نے شادی نہیں کی تھی۔ انہیں مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ زندہ ضمیر کی آوازوں سے ڈر جانے والے آدمی تھے۔ اسے سدیم انکل سے ڈیڈ جتنی ہی محبت تھی۔ سدیم انکل اس کے پہلے دوست تھے اور آخری بھی ۔۔۔ شاید سدیم انکل کی بیماری پر ہی اس نے پہلی بار رونا شروع کیا تھا۔ خود سدیم انکل کو زل سے اس قدر پیار تھا کہ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتے رہتے تھے۔

وہ جب بھی رات کو سوتے میں ڈر جاتی' ہمیشہ سدیم انکل کے کمرے کی طرف بھاگتی تھی۔ اور ایسے میں ہمیشہ اسے سدیم انکل کسی نہ کسی عبادت میں مصروف نظر آتے تھے۔ وہ نفل ادا کر رہے ہوتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ۔۔۔ یا دعا مانگ رہے ہوتے تھے۔

زل کو نماز پڑھنے کا طریقہ بھی انہوں نے ہی سکھایا تھا۔ ورنہ جس طرح کے اسکول میں وہ پڑھتی تھی وہاں اسے کسی بھی طرح کی مذہبی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ پھر جب وہ بڑی ہوئی تو اسے قرآن پاک پڑھانے کے لیے ٹیوٹر کا انتظام بھی انہوں نے کیا تو مام ڈیڈ نے بہت مخالفت کی تھی۔

"آگے ہی زل پر اسٹڈی کا بہت بوجھ ہے سدیم ۔۔۔ جب ذرا بڑی ہوگی تو قرآن بھی پڑھ لے گی ۔۔۔" مام ڈیڈ ملکوں ملکوں گھومنے والے آزاد پرندوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ ٹیوٹر والی بات انہیں تب پتا چلی تھی جب اسے آتے ہوئے پورا ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اور پھر سدیم انکل کی شخصیت ایسی تھی کہ کوئی ان سے زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔

سدیم انکل نے براہ راست زل سے پوچھا تھا کہ کیا

وہ قرآن کو مزید پڑھنا چاہتی ہے۔ اگرچہ اس کی کوئی بات نہ تو اس کی سمجھ میں آرہی تھی نہ ہی اس کا ابھی تک قرآن میں دل لگا تھا لیکن اس کو پڑھتا دیکھ کر سدیم انکل کے چہرے پر جو خوشی آئی تھی وہ اسے ماند ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے مام ڈیڈ سے کہہ دیا کہ جیسا سدیم انکل کہتے ہیں وہ ویسا ہی چاہتی ہے۔

وہ تیرہ سال کی تھی اور قرآن کا دوسرا پارہ ختم کر پائی تھی جب اس نے گھر کی فضا میں پریشانی کی باس کو محسوس کیا۔ یشب انکل' مام ڈیڈ سب چپ چپ رہنے لگے تھے۔ سارے دن کے علاوہ وہ کھانے کی میز پر بھی زل کے اٹھ جانے کے بعد بہت سیریس قسم کی گفتگو کیا کرتے تھے۔

بہت کوشش کے بعد بھی وہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن اتنا ضرور جان چکی تھی کہ یہ سارا ماحول سدیم انکل کی وجہ سے بنا ہے۔ اس نے سدیم انکل سے بات کی تھی اور وہ سن کے خاموش ہو گئے تھے۔

بالآخر ایک دن ممی نے اسے بتایا تھا۔ "تمہارے سدیم انکل کو بلڈ کینسر ہو چکا ہے زل۔۔۔" اور اس کا دل لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ "تم ان کے لیے دعا کرو۔۔۔" ممی نے مزید کہا تھا۔

وہ روز دعا کرنے لگی' رو رو کر' اور سدیم انکل کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ان کا علاج ہو رہا تھا لیکن وہ ٹھیک نہیں ہو رہے تھے۔ مام ڈیڈ زیادہ دیر زل کو ان کے پاس بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر بے تحاشا رونے لگتی تھی۔ سدیم انکل اس کا ننھا ہاتھ اپنے کمزور ہوتے ہاتھوں میں تھام لیتے تھے اور ہمیشہ مسکرا کر کہتے تھے۔

"تم تو اتنی مضبوط ہو میری بیٹی۔۔۔ آنسو تمہاری آنکھوں میں اچھے نہیں لگتے۔۔۔ آئندہ میں کبھی تمہیں روتے ہوئے نہ دیکھوں۔۔۔" تب سدیم انکل نہیں جانتے تھے کہ تھوڑے عرصے بعد وہ واقعی دوبارہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ اور زل بھی نہیں جانتی تھی کہ آنے والی زندگی میں رونا اس کا مقدر بننے والا ہے۔

اپنی موت سے ایک دن پہلے سدیم انکل نے زل کو اپنے پاس بلایا تھا۔

"دعا کرو زل۔۔۔ میرے سامنے۔۔۔ میرے لیے دعا کرو۔"

"میں آپ کے لیے روز دعا کرتی ہوں سدیم انکل۔" وہ بچی نہیں تھی۔ لیکن اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ بہت ضبط کے باوجود بھی وہ اپنے آنسو چھپا نہ سکی۔ اور اس کی آواز اس کے آنسوؤں کی طرح چھلک گئی۔

"میری صحت کے لیے نہیں زل۔۔۔ میری بخشش کے لیے دعا کرو۔۔۔ دعا کرو کہ وہ مجھے بخش دے۔۔۔ میرے گناہ معاف کر دے۔۔۔" سدیم انکل کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو آگئے تھے۔

"آپ بہت نیک ہیں' سدیم انکل۔"

"نہیں میں بہت گناہ گار ہوں۔ زل۔۔۔! دعا کرو وہ میرے ساتھ انصاف نہ کرے۔ مجھ پر اپنی رحمت کر دے۔" زل نے ٹشو سے ان کے آنسو صاف کیے پھر وہ خود بھی رونے لگی تھی۔

"تم رونا۔۔۔ گڑگڑانا۔۔۔ خدا بچوں کی زبان سنتا ہے زل۔۔۔ وہ تمہاری دعا ضرور قبول کرے گا۔ تم خدا سے التجا کرنا وہ مجھے عذاب میں نہ ڈالے۔۔۔ وہ مجھے معاف کر دے۔۔۔ معاف کر دے۔" سدیم انکل بولتے رہے اور وہ سر ان کے سینے پر رکھے آنسو بہاتی رہی۔

اس نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ یہ ہاتھ چھوڑ دے گی تو دوبارہ کبھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکے گی۔ اس کے سارے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو سدیم انکل جا چکے تھے۔۔۔ اسے چھوڑ کر۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

مہینے بھر بعد ڈیڈ اسے ورلڈ ٹور پر لے گئے۔ وہ سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ ذہن کی لوح پر جو نقش موت کی بھیانک تصویر نے ڈالا تھا اسے مٹنے کے لیے بہت سے درکار تھا۔ تین ماہ اس نے ڈیڈ کے ساتھ

مختلف ممالک میں گزارے تھے۔ ممی اور یشب انکل کس وجہ سے ان کے ساتھ نہ آسکے تھے۔ ورلڈ ٹور کا فائدہ ہوا تھا۔ وہ خود کو قدرے سنبھال چکی تھی۔
لیکن یہ سنبھلنا لڑکھڑاتے ہوئے رک کر دوبارہ گرنے جیسا تھا۔
سدیم انکل کی وفات کو چھ ماہ ہوئے تھے جب وہ دوبارہ ایک رات سوتے میں ڈر گئی تھی۔ رات میں وہ اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ بچپن میں اس نے اپنی میڈ کو بھی اس حوالے سے بہت تنگ کیا تھا۔ پھر جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کا خوف سدیم انکل کے پاس جانے پر ہی ختم ہوتا تھا۔ اور اب سدیم انکل نہیں رہے تھے۔
وہ تیزی سے ممی کے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ ڈیڈ ملک سے باہر تھے اور ممی کے کمرے سے مشترکہ ہنسی کی آواز آرہی تھی۔ تیز تیز چلتے چلتے وہ جیسے خود بخود ہی رک گئی۔ دوسری ہنسی کی آواز یشب انکل کی تھی۔ اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا۔ دروازہ دباؤ سے ذرا سا کھول کر اس نے اندر جھانکا اور سائیڈ لیمپس کی روشنی میں نظر آتے منظر کو دیکھ کر اس کا دل اپنی جگہ سے کھسک گیا۔
یشب انکل اور ممی دونوں ایک ساتھ ایک ہی بیڈ پر بے حد قریب قریب بیٹھے ہنس رہے تھے۔ اور یہ منظر رات کو ڈرا دینے والے خوف ناک خواب سے بھی کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ وہ الٹے قدموں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی اور کمبل میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ وہ نجانے کتنی ہی دیر روتی رہی اور نجانے کتنے ہی دن بیمار رہی۔
گھر کی خوشگوار فضا نقلی تھی۔ جذبے کھوکھلے اور رشتے منافق' اسے سدیم انکل اور خدا رہ رہ کر یاد آتے رہے۔ وہ ممی اور یشب انکل کے آپس کے تعلق کی چمک ہر روز دیکھتی۔ نظروں کے تبادلے' شوخ ادائیں۔ ڈیڈ کی معصومیت اور بے خبری کو دیکھ کر اس کا دل مزید کٹتا۔
اس نے نمازیں پڑھنا شروع کردیں۔ اسکول کے بعد وہ اسلامی سینٹر جانے لگی۔ اس کا خیال تھا شاید اس طرح اللہ خوش ہوجائے گا اور ممی' ڈیڈی' یشب انکل سب پہلے کی طرح ہوجائیں گے۔ وہ آنکھیں بند کرے گی اور کھولے گی تو ممی کی بے وفائی اور یشب انکل کی دھوکے بازی اس کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے نکل چکی ہوگی۔
لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔
وہ اولیول کے آخری سال میں تھی جب ایک رات بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ ایک ہفتے بعد اسے اس ہارٹ اٹیک کی وجہ پتا چلی تھی۔ جب ممی ایک خط اس کے نام اور ایک ڈیڈ کے نام چھوڑ کر یشب انکل کے ساتھ گھر سے چلی گئی تھیں۔
وہ خط اس نے نہیں پڑھا۔ دریائے سین میں بہا دیا۔ سدیم انکل کے بعد اس نے اس خاموش سین کو اپنا دوست بنالیا تھا۔ اسے پتا تھا اس دوست کی نہ کبھی موت ہوگی نہ اسے اس کی موت پر رونا پڑے گا۔
ڈیڈ کے نام لکھے جانے والے اس خط کی عبارت کا اسے علم نہیں تھا۔ لیکن اس خط کے لکھے جانے کے پیچھے جو تحریک کار فرما تھی اس نے ڈیڈ کو چپ لگادی تھی۔ زمل کا خیال تھا کہ وہ ممی اور یشب انکل پر چیخیں گے' چلائیں گے' انہیں برا بھلا کہیں گے' گالیاں دیں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ڈیڈ مطمئن بیٹھے رہے جیسے اس بات کے ہوجانے کا انہیں سو فی صد یقین تھا یا جیسے وہ کب سے اس واقعے کے رونما ہوجانے کے انتظار میں تھے۔
ڈیڈ نے کمپنی میں موجود دونوں کے شیئرز بغیر کسی حجت کے' دونوں کے نام منتقل کردیے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں۔ اس کے باوجود زمل نے کبھی ان سے' ممی سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اب ڈیڈ میں ہی مام' ڈیڈ دونوں تلاش کرنے لگی تھی۔ لیکن ڈیڈ میں ڈیڈ بھی مشکل سے ہی موجود رہے تھے۔
رفتہ رفتہ انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر آنا بھی چھوڑ دیا' وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہ کر گزار دیتے تھے۔ کمپنی کی ساکھ بگڑنے لگی تھی۔ لیکن انہیں جیسے

کسی چیز کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ وہ چین سموکنگ کرنے لگے۔ شراب۔ اور پھر کثرت شراب۔ زل کے لیے ان کی حالت قابل رحم تھی۔ شراب کے نشے میں وہ چیختے چلاتے۔ ملازموں کو برا بھلا کہتے۔ چیزیں توڑتے۔ زل قریب جاتی تو وہ اسے بھی دھتکار دیتے۔

"دور رہو مجھ سے۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ تم۔ تم بھی اس کمینے یشب کی بیٹی ہو نا۔" وہ غصے میں کبھی اسے برے کرتے' کبھی بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ بغور دیکھتے۔ جیسے یقین کر رہے ہوں کہ وہ ان کی ہی بیٹی ہے یا نہیں۔ ان سب کے بعد ان کا نشہ اترتا تو وہ بیٹھ کر رونا شروع کر دیتے۔ کبھی اونچی آواز سے' کبھی خاموشی سے۔ زل خود بھی رونا شروع کر دیتی۔

پچھلے چار سالوں میں وہ انہیں مختلف ڈاکٹروں کو دکھا چکی تھی۔ مشہور ملکی و غیر ملکی ماہر نفسیات سے اس نے کنسلٹنگ کی تھی۔ ڈیڈ تھوڑے عرصے کے لیے ٹھیک بھی ہو جاتے تھے اور یہ تھوڑا عرصہ سورج اور شبنم کے رشتے کی طرح کا ہوتا تھا۔ فرانس' امریکہ' برطانیہ وہ تینوں جگہوں پر بری طرح ماری ماری پھری تھی۔

اس دوران مختلف ادوار میں ممی کی کالز بھی آتی رہی تھیں۔ وہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ان سے نفرت کا اظہار بھی اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ تھوڑے وقت کی ٹیلی فونک گفتگو میں وہ ہاں ناں میں بات کیے جاتی۔ ممی اپنا فرض نبھا کر لمبے عرصے کے لیے رابطہ منقطع کر دیتی تھیں۔

ڈیڈ کی طبیعت دن بدن گر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے زل کی تعلیم بھی متاثر ہو رہی تھی۔ وہ جوان تھی' اس کے بھی کچھ خواب تھے۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن موجودہ صورت حال میں اس کے خوابوں کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے زیادہ چانسز نہیں تھے۔ اس نے ایک این۔ جی۔ او جوائن کی تھی۔ تیسری دنیا میں عورتوں کی عصمت دری میں اضافے کے حوالے سے بنی این جی۔ او۔ اور اس این جی او میں اس کا کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ دو تین آرٹیکلز لکھنے کے علاوہ وہ اب تک کچھ بھی ایسا قابل قدر کام نہیں کر سکی تھی جو دوسروں کو متاثر کرے۔

اسی این جی او کے اشتراک سے ہونے والے ایک سیمینار کی تفصیل پڑھتے وقت اس کی نظروں سے ڈاکٹر یشار کا مختصر تعارف گزرا تھا۔

جو عنقریب فرانسیسی عورتوں کی عصمت دری کے بعد کی ذہنی کیفیت پر منعقد سات روزہ سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے آرہا تھا۔

زل نے ڈاکٹر یشار سے متعلق اور بھی بہت ساری معلومات اکٹھی کر لی تھی۔ یشار کا تعلق پاکستان سے تھا۔ وہ بمشکل بتیس سال کا ایک پرکشش نوجوان تھا۔ اور اپنے کیریئر کے مختصر سے عرصے میں ہی وہ غیر ممالک کے لگ بھگ دس ٹور کر چکا تھا۔

وہ پاکستان سے تھا۔ ڈیڈ کے دیس سے۔ صرف یہ ہی ایک ایسی بات جس کے باعث وہ یشار سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یقیناً "علاج کا اچھا نتیجہ نکلے گا۔ اس نے اپنے سارے اختیارات کا استعمال کر کے یشار کے فرانس میں ایک مہینے کے شیڈول کو جانا تھا۔ اور اب وہ جلد سے جلد اس سے ملنے کی خواہاں تھی۔

ہوا میں نمی اور خنکی کی جوت جاگنے لگی۔ تو کھڑکی بند کر کے وہ راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں پھیلا نیم اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ راکنگ چیئر پر جھولتے جھولتے اور چھت کو گھورتے' وہ اپنے اعصاب کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پیرس میں پہلا دن کافی تھکا دینے والا تھا۔ ایئرپورٹ سے سیدھے ہوٹل پھر تین گھنٹے بعد کونسل ہال' جہاں چار گھنٹے کی پہلے دن کی تقریب حد درجہ بورنگ تھی۔ باسل کو دل ہی دل میں بانو پر غصہ آیا تھا کہ انہوں نے کیوں یشار سے ضد کی کہ وہ اس بار باسل کو بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یشار

یہاں اکیلا ہی آجاتا۔ اور وہ لاہور نانو کے پاس رہ جاتا۔ کلینک بھی نہ جانا پڑتا۔ ویسے بھی نانو کے ساتھ وقت گزارنا باسل کو ہمیشہ ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ پیار سے انہیں اپنی گرل فرینڈ کہا کرتا تھا۔ یشار کی غیر موجودگی میں ایک ماہ کی طویل چھٹی میں اس نے خوب انجوائے کرتا تھا۔ لیکن نانو بھی نا جب کسی بات پر اڑ جاتیں تو پھر اپنی ضد منوا کر ہی دم لیتی تھیں۔

وہ ویسے بھی باسل کو یشار کی نسبت سالوں سے ہر ہر معاملے میں ڈھیل دیتی آرہی تھیں۔

تقریب کے بعد لنچ تھا۔ وہ بھی تقریب کی طرح ہی بور کردینے والا۔ یشار کے ساتھ ساتھ لگا وہ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ یشار باسل کی اندرونی کیفیت سے آگاہ تھا اور بڑی اچھی طرح آگاہ تھا۔ ابھی تو پہلا ہی دن تھا۔ انتیس دن ابھی باقی تھے۔

"تمہارے پاس صرف ایک ماہ ہے۔ ہمیں فرانس کو دیکھنے کا آغاز آج سے ہی کردینا چاہیے۔" تقریب کے اختتام پر ہوٹل واپس آتے وقت باسل نے تجویز دی۔

"ہمارے نہیں' صرف تمہارے پاس... میں فرانس پہلے بھی گھوم چکا ہوں۔" سپاٹ لہجہ۔

"لیکن میں تو یہاں پہلی دفعہ آیا ہوں۔" اصرار نہیں منت۔

"میرے پاس وقت نہیں مائی ڈیئر برادر... مجھے کل کے لیے تیاری بھی کرنی ہے۔" ہوٹل کے گیٹ پر گاڑی رکی تو وہ کہہ کر نیچے اترا۔ باسل نے بھی دوسرے دروازے سے اترنا چاہا تو یشار نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

"اسے مال آف فلاور لے جائیں۔" اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ پھر باسل کی طرف رخ کیا۔

"معذرت برادر... مجھے کسی سے ملنا ہے۔ تم اتنی دیر مال دیکھ آؤ۔"

"معذرت۔" باسل نے قہقہے کو بمشکل ضبط کیا۔ یشار جیسے مشینی آدمی کے ساتھ مال دیکھنے میں مزہ تھا نہ صحرا دیکھنے میں۔

☼ ☼ ☼

ڈیڈ نے ساری رات پھر ہنگامہ کیا تھا۔ جیسا کہ زل کو توقع تھی۔ جب اس نے انہیں بتایا کہ وہ ان کے لیے کسی پاکستانی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے چکی ہے۔ سن کر پہلے تو وہ چپ رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ماتھا اور رہوا تھا اور چہرے کے تیور بگڑتے ہی چلے گئے تھے۔

"تم بھی اپنی بدذات ماں کی طرح مجھے پاگل سمجھتی ہو۔" انہوں نے نفرت سے کہا تھا۔ اکٹھے ڈنر کرنا اسے اتنا مہنگا پڑے گا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ دونوں طرف کھڑے ملازموں کو اس نے باری باری دیکھا۔ اور وہ جیسے نظروں کے اشارے سمجھتے ہوئے دائیں بائیں کھسک گئے۔

"تمہارے خیال میں میں ابنارمل ہوں۔" وہ غراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ زل کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ ابنارمل نہیں ہیں ڈیڈ... آپ بیمار ہیں۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔ "اور آپ کی بیماری کا مجھے بہت احساس ہے۔"

"کیوں کرتی ہو تم میری اتنی فکر؟" وہ طنزیہ بولے۔ "تم تو شاید میری بیٹی ہی نہیں ہو... اس حرام خوریشب کی بیٹی ہو... یا شاید تمہارا اصل باپ سدیم ہو۔ تمہاری ماں سے کچھ بھی بعید نہیں... یا ہوسکتا ہے کوئی اور جسے میں جانتا تک نہ ہوں۔" ڈیڈ غصے سے بولتے چلے گئے اور وہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"آپ ایسا کیوں کہتے ہیں... آپ کو پتا ہے میں آپ کی بیٹی ہوں۔" وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ ڈیڈ کے ماتھے کی سلوٹیں کم ہوئی تھیں اور وہ یک دم خاموش ہوگئے تھے۔ کافی دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد انہوں نے ملازم کو آواز دی تھی۔

"مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔" ملازم انہیں سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے گیا۔

وہاں سے پھر رات گئے تک مختلف آوازیں آتی رہی تھیں۔ ڈیڈ اپنا اندرونی غصہ بیرونی چیزوں پر نکال رہے تھے۔ چیزیں جو بہت بار گر چکی تھیں۔ ٹوٹ چکی

تھیں۔ بکھر چکی تھیں۔ اس شور کو تھمنے میں طوفان جتنی دیر لگی۔ اور سب سے آخر میں ان کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ زل جانتی تھی دروازے پر دستک دینا بے کار ہے۔ ڈیڈ کسی صورت دروازہ نہیں کھولیں گے۔

صبح سر جھکائے وہ خود ہی ناشتے کی ٹیبل پر آئے تھے۔

"کون ہے وہ نیا ڈاکٹر۔" انہوں نے زل سے پوچھا۔ ان کے سوال میں شرمندگی چھپی ہوئی تھی۔

"وہ پاکستان سے ہے۔ آپ کے شہر لاہور سے بھی... یشار نام ہے اس کا۔" زل نے ڈیڈ کو بتایا۔ "آج شام پانچ بجے کی اپوائنٹمنٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے کافی پیتے ہوئے ہلکے انداز سے کہا تھا۔

"آپ تیار رہیں گے نا۔" وہ ایک گونہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔

"ہاں۔ پروہیل چیئر نکلوا دینا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ اپنی ٹانگوں پر چل کر کہیں آجاسکوں۔" انہوں نے بے تاثر چہرے سے بے تاثر جملہ بولا تھا۔ زل وقتی طور پر خوش ہو گئی تھی۔ ڈیڈ کی رضامندی کا اطمینان اور وہیل چیئر کی بے چینی، وہ متضاد احساس میں گھری ہوئی تھی۔

"اس بار سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ خود سے بولی۔ جیسے بنا ملے ہی اسے ڈاکٹر یشار کی قابلیت پر کامل بھروسا ہو۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس بار سب پہلے سے بھی زیادہ غلط ہونے والا ہے۔

☆ ☆ ☆
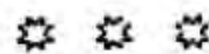
مال آف فلاورز اپنے نام کی طرح ہی خوب صورت تھا۔ جس کے کل آٹھ فلور تھے۔ اس نے ہر ایک فلور پر اچھا خاصا وقت برباد کیا تھا۔ سہ پہر سے شام اور پھر اب رات ہونے لگی تھی۔ اپنے لیے تو اسے سب ہی کچھ پسند آیا تھا جس میں سے اس نے کافی کچھ خرید بھی لیا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نانو کے لیے ایسا کیا لے جو انہیں دل سے پسند آئے۔

کاسمیٹک، جیولری، ڈریسز، سینڈل وغیرہ کا تو نانو کو سرے سے کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ یاسل نے بچپن سے ہی نانو کو بہت سادہ لباس میں دیکھا تھا۔ وہ اجلے رنگوں کے صاف اور نفیس پہناوے پہننے کی عادی تھیں۔ اور مال میں موجود کوئی بھی مشرقی لباس ان کی شخصیت سے لگا نہ کھاتا تھا۔ بہت سوچنا اور دیکھنا بھی بے کار ثابت ہوا۔ وہ واپس جانے لگا تھا جب اس کی نظر ایک اینٹک گفٹ شاپ پر پڑی تھی۔ جس کے باہر والے شیلف پر ہی اسے وہ پیام (انگریزی مرتبان) نظر آئے تھے۔ ایک سفید ایک سیاہ۔

اندر پہنچ کر اس نے بنا قیمت پوچھے ان پیاموں کی جوڑی کو پیک کروا لیا تھا۔ یہ تحفہ واقعی ایسا تھا جو نانو کو بہت پسند آنے والا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی جب وہ ہوٹل واپس آیا تھا۔ تقریباً خالی لابی میں سے گزرتے ہوئے اس کی بھٹکتی نظر ٹھٹک کر رکی تھی جب سفید پہناوے میں ملبوس ایک دلکش سراپا اسے نظر آیا تھا۔ وہ چہرہ آنکھوں کے علاوہ باقی سارا ایشیائی تھا۔ ہاتھ میں پکڑے پیاموں کی طرح خوب صورت، جاذب نظر۔ یاسل کے ست ہوتے قدم خود بخود ہی رک گئے تھے۔ اس چہرے پر آٹھ نو سال کے بچوں والی معصومیت تھی۔

زل نے بھی غیر ارادی طور پر میگزین سے نظریں ہٹا کر یاسل کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کو ملی تھیں۔ پھر یاسل نے چونکتے ہوئے اپنی نظروں کے زاویے بدلے تھے۔ زل بھی دوبارہ میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی تھی۔ راہداری میں نصب پینٹنگز کو دیکھتے ہوئے بھی وہ بار بار پلٹ کر اسے دیکھنے سے خود کو روک نہ سکا۔ پھر وہ لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی وہ لڑکی بھی تیزی سے اندر داخل ہوئی، جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لابی میں دیکھ چکا تھا۔

پوری لفٹ میں انجان خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو

کے سحر میں مبتلا وہ خاموش رہا۔ تھرڈ فلور پر یہ لمبا سفر تمام ہوا تو زنل جلدی سے لفٹ سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے راہداری عبور کر کے روم نمبر تین سو گیارہ کے سامنے پہنچ گئی اور پیچھے آتے باسل نے رک کر اپنا سر کھجایا۔ تین سو گیارہ تو اُن کا روم نمبر تھا۔ کیا وہ اپنے روم کا نمبر بھول گیا تھا یا فلور... وہ فیصلہ نہ کر سکا۔

"تھری الیون مسٹر یشار کے نام سے بک ہے سر۔" ریسپشن سے تصدیق ہو گئی تو وہ واپس اپنے کمرے تک آیا۔ تب زنل باہر نکل رہی تھی۔ ایک درمیانی عمر کے کمزور آدمی کے ساتھ جو وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ یشار بھی دروازے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔

"اپنے قیمتی وقت میں سے جو وقت آج آپ نے ہمیں دیا ہمیں اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں ڈاکٹر یشار۔" یہ الوداعی فقرہ تھا جو زنل کی طرف سے بولا گیا تھا اور جسے یشار نے مسکرا کر قبول کیا تھا۔

پھر وہیل چیئر آگے بڑھاتے ہوئے اس نے ایک نظر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوئے باسل پر ڈالی۔ باسل اسے دیکھتا رہ گیا۔ سفید جالی دار فراک جو گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے تھی اور کندھوں کو چھوتے سیدھے بال، وہ کسی مہنگی دکان میں سجی ہوئی 'سنو وائٹ' گڑیا لگ رہی تھی۔

"یہ کون تھی...؟" اندر پہنچ کر اس نے یشار سے پوچھا اور لہجے سے ایسے ظاہر کیا جیسے سرسری ہی پوچھ رہا ہو۔

"اس کے والد بیمار ہیں ان کو کنسلٹنسی کے لیے لائی تھی۔" یشار کوٹ اتارتے ہوئے بولا۔

"تمہیں تو آتے ہی پیشنٹ بھی مل گئے۔"

"کام ہی ایسا ہے۔"

"کیا کنسلٹنسی صرف ایک بار ہونی تھی۔" وہ لفظوں کی معنی خیزی کو چھپا نہ سکا۔

یشار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ تاسف سے ایسے مسکرایا جیسے اس کا بھائی ہونے پر اسے کوئی بہت بڑا ... پھر سر جھٹک کر باتھ روم میں چلا گیا۔

"میری اگلی میٹنگ اس لڑکی کے گھر پر ہے۔ تمہیں بھی چلنا ہو تو چلنا۔" دروازے سے آدھا سر نکال کر اس نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پچھواڑے کے تالاب کے — جل تھل پانی میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ صبح سے شام تک خوب پانی برسا تھا۔ کائی زدہ باسی تال ابل رہا تھا اور جمی کائی کے تھال ٹوٹے عرشے کی طرح سطح آب پر تیر رہے تھے۔

ان ہی میں سے ایک تھال برگد کی جڑ کی طرف بڑھا اور برگد نے اپنی جڑیں پیچھے کرنی چاہیں۔ یہ وہ داغ تھا جو برگد کو منظور نہیں تھا اور جس کے لیے وہ بے بس تھا۔ چوبی سلاخ دار کھڑکی سے پرے بیٹھی وہ سب دیکھ

اودے بادلوں نے ایک دوجے سے رگڑ کھائی اور شعلہ صاعقہ بھڑک کر فنا ہو گیا۔ بوڑھے وجود کو جیسے وجہ مل گئی۔

"ہمایوں بھیا... او گالب..."

"انتقام کا کالا موتیا آنکھوں میں اتر آئے تو بہت زیادہ خوں بہا ادا کرنا پڑتا ہے۔" آواز آنسو کی طرح بھیگی ہوئی، مغیر محسوس اور بے وزن تھی۔ کھڑکی کی سلاخیں بھی نہ پار کر سکی تھی، لیکن برگد نے لب ہلتے دیکھ لیے تھے۔ اس لیے یاد دہانی کے طور پر اس نے اپنی جٹا کو ایک بل اور دے دیا۔

☼ ☼ ☼

"میں ہفتے کی رات کو لاہور آ رہا ہوں۔" ہمایوں نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

انار کلی بازار کے وسط کی دکان "نگار خانہ" میں اتوار کے دن رش معمول سے زیادہ تھا۔ تانو مختلف گاہکوں کو گائیڈ کرتی مسکرا رہی تھیں۔ باقی ورکر فروخت شدہ اشیا اخباروں میں لپیٹ کر ان کا بل بنانے میں مصروف تھے۔ جب فون کی بیل پر انہوں نے بے توجہی سے ریسیور اٹھایا تھا اور آگے سے آتی ہمایوں کی آواز نے ان کی ساری توجہ اپنی طرف موڑ لی تھی اور وہ اپنی ہی

دکان میں رکھے مجسموں کی طرح چپٹی، ننگی، دھاتی صورت اختیار کرتے کرتے جامد ہو گئی تھیں۔

"میں چار دنوں کے لیے آرہا ہوں۔" ہمایوں نے مزید بتایا۔

"بس چار دن؟" نانو جانتی تھیں کہ ان کے لیے وہ چار دن کافی طویل ثابت ہونے والے تھے۔ "یشار اور باسل تو دونوں فرانس گئے ہوئے ہیں۔" انہوں نے ہمایوں کو آگاہ کیا۔

"تو کیا مجھے صرف یشار اور باسل سے ملنے آنا ہوتا ہے۔" ہمایوں نے پوچھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ دوسری طرف بھی تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔

"میرا قیام ہوٹل میں ہوگا۔ آپ تردد مت کیجیے گا۔"

"تم اس گھر میں کیوں نہیں رہ لیتے بیٹا۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اس گھر سے وحشت ہوتی ہے۔ آپ جانتی ہیں۔"

"تمہارے ہوٹل میں قیام کا یشار اور باسل کو معلوم ہوگا تو وہ کیا سوچیں گے کہ ان کا ماموں۔۔۔"

"وہ دونوں اب بڑے ہو چکے ہیں۔ بہت ساری باتوں کا انہیں اب علم ہو جانا چاہیے۔" نانو کے لب جامد ہو گئے۔

"آپ کو آگاہ کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اب رکھتا ہوں۔"

"خدا حافظ۔" نانو نے ہلکے سے کہا ہی تھا کہ ہمایوں نے فون بند کر دیا۔

نانو اس دن پھر کسی گاہک کو گائیڈ نہیں کر سکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سیمینار کے دوسرے دن کی تقریب ختم ہونے کے بعد وہ اور یشار دونوں زل کے گھر آئے تھے۔ دریائے سین کے سامنے آرام سوسائٹی کے آغاز میں ایک عالی شان گھر جو کسی قلعے کی طرح بڑا تھا۔ کسی ہوٹل کی طرح پُررونق اور تاج محل کی طرح سفید۔ باوردی میڈ کی تقلید میں وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ باسل ہر چیز کو بڑی مرعوبیت سے دیکھ رہا تھا۔ مہنگے قالین، پردے، کرسٹل کے آرائشی پیس، نوادرات، نایاب آئینے، بیش قیمت پینٹنگز، وہ گھر ہر طرح سے شان دار تھا۔

"ویل کم!" زل نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کا استقبال کیا۔ باسل سے نظریں ملیں تو اس کی آنکھوں میں پہچان کا ایک رنگ آکر چلا گیا۔ مگر وہ رنگ بے کیف تھا۔

"آپ کیا لینا پسند کریں گے۔"

"ان تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں مس زل۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں۔"

"جی۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"آپ بتائیے آپ کے ڈیڈ کہاں ہیں۔"

"وہ لائبریری میں ہیں۔۔۔ صبح سے وہیں ہیں۔ میرے خیال سے کنسلٹینسی کے لیے وہ جگہ ہی مناسب ہے۔"

"یو آر رائٹ۔" یشار اٹھ کھڑا ہوا تو زل نے میڈ کو اشارہ کیا کہ وہ انہیں ڈیڈ کے پاس لے جائے۔

"اس دوران آپ میرے بھائی کو اپنا سارا گھر وزٹ کرائیں۔ یہ بھی علاج کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہوپ یو انڈر اسٹینڈ۔ باقی آپ کو باسل سمجھا دے گا۔" یشار نے کہا اور میڈ کے پیچھے چلتا چلتا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔ زل بند کھڑکی سے پار دیکھتی رہی۔

"یہ کام پہلے بھی بہت بار ہو چکا ہے۔ لیکن میں مسٹر یشار کے طریقہ علاج میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔" باسل اس کے جواب میں کچھ نہ بول سکا تھا۔

"آپ کے خیال میں کیا اشیا اور رنگ مزاجوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔" وہ پوچھنے لگی۔

"میں نفسیات کا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ ان باتوں کو یشار

مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ مجھے تو وہی کرنا ہے جو اس نے کہا ہے، لیکن آپ کی بات کے جواب میں، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہاں۔۔۔ اشیا اور رنگ مزاجوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے والدین سے منسلک کچھ چیزیں جنہیں دیکھ کر ہم اداس ہو جاتے ہیں۔ قبریں جو ہمیں خوف زدہ کر دیتی ہیں، سفید رنگ جو کفن کی یاد دلاتا ہے، کسی خاص رنگ کے پھول جو اچھے یا برے وقت کے امین ہوتے ہیں اور اس اچھے برے وقت کو جاننا ہی علم نفسیات کہلاتا ہے۔"

زنل جیسے اس کی باتوں سے متاثر ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور لمبی راہداری پار کر کے اسے ڈیڈ کے کمرے تک لے آئی۔

"یہ ڈیڈ کا روم ہے۔" ہینڈل گھما کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

"ایکوا گرین اور اس کے فیملی رنگوں سے منسلک۔ ڈاکٹر تھامس نے ریکمنڈ کیے تھے یہ رنگ۔ ذہن کو پرسکون کرنے کے لیے۔" باسل ہر چیز کو ڈائری میں لکھنے لگا۔

"شیلف میں رکھے یہ کھلونے ڈاکٹر جمیڈ کی تجویز تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کھلونے انسان کو اس کے بچپن کی یاد دلا دیتے ہیں اور اس کا دل فرشتے جیسا معصوم ہو جاتا ہے۔" وہ رکی پھر بولی۔ "وال کلاک۔۔۔ کارٹونز۔۔۔ مرر۔۔۔ کوئی بھی چیز ڈیڈ کی یا میری چوائس کی نہیں ہے۔ یہ روم ڈاکٹرز کی اصلاحوں سے بھرا ہوا ہے۔" باسل لہجے کے اتار چڑھاؤ پر چونک گیا۔

"سوری۔ میں تھوڑی جذباتی ہو گئی۔" وہ آنکھ میں آئے آنسو کو صاف کرنے لگی۔

باسل چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ "اب تک آپ کتنے ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہیں۔"

"لاتعداد۔" باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کیا۔

"کیا گھر میں کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں۔ جن کو دیکھ کر آپ کے ڈیڈ کچھ سوچتے ہوں۔ دیکھ کر رکتے ہوں۔ غصے میں آ جاتے ہوں یا کسی بھی طرح کا دوسرا رویہ۔"

"نہیں۔۔۔ اور اگر ایسی کوئی چیز ہے بھی تو میرے علم میں نہیں ہے۔" وہ چلتے چلتے رکی۔ "یہ ڈرائنگ روم ہے۔ ڈیڈ بھی یہاں بیٹھا کرتے تھے، لیکن کافی عرصے سے اب وہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔"

"کیا کچھ چیزیں اتنی پرانی ہیں کہ آپ کے ڈیڈ کے ماضی سے جڑی ہوں۔"

"تقریباً ناممکن کی حد تک۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ممی ہر دو سال بعد پورے گھر کی ایک ایک چیز کو تبدیل کر دیا کرتی تھیں۔"

"اینٹیکس کا شوق کسے ہے۔"

"میری ممی کو ہی۔"

"وہ اب۔"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔" لمحے بھر کی خاموشی اس کے لبوں پر آئی اور درشتی آنکھوں میں "دونوں کی علیحدگی ہو چکی ہے۔" باسل نے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ گھر کا ہر پورشن گھوم لینے کے بعد وہ دونوں واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے تھے۔

"آپ کا گھر کافی بڑا ہے۔ ایک دن میں مکمل وزٹ نہیں کیا جا سکتا۔ بشار کی مطلوبہ معلومات تک کے لیے تو بالکل نہیں۔" تھوڑی دیر بعد بشار بھی وہیں آ گیا تھا۔

"اب ہمیں اجازت دیں۔" وہ بیٹھا نہیں تھا۔

"کیا کچھ بہتری کے چانسز ہیں ڈاکٹر بشار؟"

"کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔ نفسیات کی اصطلاح کی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جنہیں آپ نہیں سمجھ سکتیں، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایک طرح کا جذباتی عدم توازن ہے۔ آپ کو ان کو ہر وقت اپنے خلوص کا احساس دلاتے رہنا پڑے گا۔ ڈاکٹرز تھراپی اور ریلیشن تھراپی میں بہت فرق ہے۔ یہ دونوں تھراپیز الگ الگ طریقوں سے مریض پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کے نتائج بھی حیران کن حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ لیٹس سی کہ آگے کیا بہتری آتی ہے۔"

بشار کی کسی بھی بات کا زنل پر جیسے اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

دکان میں رکھے مجسموں کی طرح چوبی، سنگی، دھاتی صورت اختیار کرتے کرتے جامد ہو گئی تھیں۔
"میں چار دنوں کے لیے آرہا ہوں۔" ہمایوں نے مزید بتایا۔
"بس چار دن؟" نانو جانتی تھیں کہ ان کے لیے وہ چار دن کافی طویل ثابت ہونے والے تھے۔ "یشار اور باسل تو دونوں فرانس گئے ہوئے ہیں۔" انہوں نے ہمایوں کو آگاہ کیا۔
"تو کیا مجھے صرف یشار اور باسل سے ملنے آنا ہوتا ہے۔" ہمایوں نے پوچھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ دوسری طرف بھی تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔
"میرا قیام ہوٹل میں ہوگا۔ آپ تردد مت کیجیے گا۔"
"تم اس گھر میں کیوں نہیں رہ لیتے بیٹا۔"
"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اس گھر سے وحشت ہوتی ہے۔ آپ جانتی ہیں۔"
"تمہارے ہوٹل میں قیام کا یشار اور باسل کو معلوم ہوگا تو وہ کیا سوچیں گے کہ ان کا باموں۔"
"وہ دونوں اب بڑے ہو چکے ہیں۔ بہت ساری باتوں کا انہیں اب علم ہو جانا چاہیے۔" نانو کے لب جامد ہو گئے۔
"آپ کو آگاہ کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اب رکھتا ہوں۔"
"خدا حافظ۔" نانو نے ہلکے سے کہا ہی تھا کہ ہمایوں نے فون بند کر دیا۔
نانو اس دن پھر کسی گاہک کو گائیڈ نہیں کر سکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سیمینار کے دوسرے دن کی تقریب ختم ہونے کے بعد وہ لور یشار دونوں زنل کے گھر آئے تھے۔ دریائے سین کے سامنے آرام سوسائٹی کے آغاز میں ایک عالی شان گھر جو کسی قلعے کی طرح بڑا تھا۔ کسی ہوٹل کی طرح پُررونق اور تاج محل کی طرح سفید۔ باوردی میڈ کی تقلید میں وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ باسل ہر چیز کو بڑی مرعوبیت سے دیکھ رہا تھا۔ مہنگے قالین، پردے، کرسٹل کے آرائشی پیس، نوادرات، نایاب آئینے، بیش قیمت پینٹنگز، وہ گھر ہر طرح سے شان دار تھا۔
"ویل کم!" زنل نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کا استقبال کیا۔ باسل سے نظریں ملیں تو اس کی آنکھوں میں پہچان کا ایک رنگ آکر چلا گیا۔ مگر وہ رنگ بے کیف تھا۔
"آپ کیا لینا پسند کریں گے۔"
"ان تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں مس زنل۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں۔"
"جی۔ لیکن۔۔۔"
"آپ بتائیے، آپ کے ڈیڈ کہاں ہیں۔"
"وہ لائبریری میں ہیں۔ صبح سے وہیں ہیں۔ میرے خیال سے کنسلٹنسی کے لیے وہ جگہ ہی مناسب ہے۔"
"یو آر رائٹ۔" یشار اٹھ کھڑا ہوا تو زنل نے میڈ کو اشارہ کیا کہ وہ انہیں ڈیڈ کے پاس لے جائے۔
"اس دوران آپ میرے بھائی کو اپنا سارا گھر وزٹ کرائیں۔ یہ بھی علاج کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہوپ یو انڈر اسٹینڈ۔ باقی آپ کو باسل سمجھا دے گا۔" یشار نے کہا اور میڈ کے پیچھے چلتا چلتا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔
وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔ زنل بند کھڑکی سے پار دیکھتی رہی۔
"یہ کام پہلے بھی بہت بار ہو چکا ہے۔ لیکن میں مسٹر یشار کے طریقہ علاج میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔" باسل اس کے جواب میں کچھ نہ بول سکا تھا۔
"آپ کے خیال میں کیا اشیا اور رنگ مزاجوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔" وہ پوچھنے لگی۔
"میں نفسیات کا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ ان باتوں کو یشار

مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ مجھے تو وہی کرنا ہے جو اس نے کہا ہے لیکن آپ کی بات کے جواب میں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہاں۔۔۔ اشیا اور رنگ مزاجوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے والدین سے منسلک کچھ چیزیں جنہیں دیکھ کر ہم اداس ہو جاتے ہیں۔ قبریں جو ہمیں خوف زدہ کر دیتی ہیں سفید رنگ جو کفن کی یاد دلاتا ہے کسی خاص رنگ کے پھول جو اچھے یا برے وقت کے امین ہوتے ہیں اور اس اچھے برے وقت کو جاننا ہی علم نفسیات کہلاتا ہے۔"

زل جیسے اس کی باتوں سے متاثر ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور لمبی راہداری پار کر کے اسے ڈیڈ کے کمرے تک لے آئی۔

"یہ ڈیڈ کا روم ہے۔" ہینڈل گھما کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

"ایکوا گرین اور اس کے فیملی رنگوں سے منسلک۔۔۔ ڈاکٹر تھامس نے ریکمنڈ کیے تھے یہ رنگ۔۔۔ ذہن کو پرسکون کرنے کے لیے۔" باسل ہر چیز کو ڈائری میں لکھنے لگا۔

"شیلف میں رکھے یہ کھلونے ڈاکٹر جمال کی تجویز تھی۔۔۔ ان کا خیال تھا کہ کھلونے انسان کو اس کے بچپن کی یاد دلا دیتے ہیں اور اس کا دل فرشتے جیسا معصوم ہو جاتا ہے۔" وہ رکی پھر بولی۔ "وال کلاک۔۔۔ کارٹنز۔۔۔ مرر۔۔۔ کوئی بھی چیز ڈیڈ کی یا میری چوائس کی نہیں ہے۔ یہ روم ڈاکٹرز کی اصلاحوں سے بھرا ہوا ہے۔" باسل لہجے کے اتار چڑھاؤ پر چونک گیا۔

"سوری۔۔۔ میں تھوڑی جذباتی ہو گئی۔" وہ آنکھ میں آئے آنسو کو صاف کرنے لگی۔

باسل چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ "اب تک آپ کتنے ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہیں۔"

"لاتعداد۔۔۔" باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کیا۔

"کیا گھر میں کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جن کو دیکھ کر آپ کے ڈیڈ کچھ سوچتے ہوں۔ دیکھ کر رکتے ہوں۔ غصے میں آجاتے ہوں یا کسی بھی طرح کا دوسرا رویہ۔"

"نہیں۔۔۔ اور اگر ایسی کوئی چیز ہے بھی تو میرے علم میں نہیں ہے۔" وہ چلتے چلتے رکی۔ "یہ ڈرائنگ روم ہے۔۔۔ ڈیڈ کبھی یہاں بیٹھا کرتے تھے لیکن کافی عرصے سے اب وہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔"

"کیا کچھ چیزیں اتنی پرانی ہیں کہ آپ کے ڈیڈ کے ماضی سے جڑی ہوں۔"

"تقریباً" ناممکن کی حد تک۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ممی ہر دو سال بعد پورے گھر کی ایک ایک چیز کو تبدیل کر دیا کرتی تھیں۔"

"فنٹیکس کا شوق کسے ہے۔"

"میری ممی کو ہی۔"

"وہ اب۔۔۔"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔" لمحے بھر کی خاموشی اس کے لبوں پر آئی اور درشتی آنکھوں میں دونوں کی علیحدگی ہو چکی ہے۔" باسل نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ گھر کا ہر پورشن گھوم لینے کے بعد وہ دونوں واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے تھے۔

"آپ کا گھر کافی بڑا ہے۔۔۔ ایک دن میں مکمل وزٹ نہیں کیا جا سکتا۔" نثار کی مطلوبہ معلومات تک کے لیے تو بالکل نہیں۔" تھوڑی دیر بعد نثار بھی وہیں آگیا تھا۔

"اب ہمیں اجازت دیں۔" وہ بیٹھا نہیں تھا۔

"کیا کچھ بہتری کے چانسز ہیں ڈاکٹر نثار؟"

"کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔۔۔ نفسیات کی اصطلاح کی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جنہیں آپ نہیں سمجھ سکتیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایک طرح کا جذباتی عدم توازن ہے۔۔۔ آپ کو ان کو ہر وقت اپنے خلوص کا احساس دلاتے رہنا پڑے گا۔ ڈاکٹرز تھراپی اور ریلیشن تھراپی میں بہت فرق ہے۔ یہ دونوں تھراپیز الگ الگ طریقوں سے مریض پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کے نتائج بھی حیران کن حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ لیٹس سی کہ آگے کیا بہتری آتی ہے۔"

نثار کی کسی بھی بات کا زل پر جیسے اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

وہ اداس ہوگئی تھی اور اس کی اداسی کو دیکھ کر باسل کو دکھ ہوا تھا۔ وہ ان معاملات میں یشار سے یکسر مختلف تھا۔

دونوں جب اس محل نما گھر سے باہر نکلے تو دن اپنا پہناوا بدل چکا تھا۔

"کیا واقعی بہتری کے کوئی چانسز نہیں ہیں۔" باسل نے کار میں بیٹھ کر یشار سے پوچھا۔

"مریض صرف اپنی بیٹی کے لیے کنسلٹینسی پر آمادہ ہوا ہے تو آگے تم خود ہی صورت حال کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ لائبریری میں مجھ پر کیا گزری ہوگی۔"

"تو کیا اب تم کل نہیں جاؤ گے۔" وہ پریشان ہوگیا۔

"نہیں' جاؤں گا۔ اپنی آخری حد تک تو کوشش جاری رکھوں گا۔" اس نے تھوڑا توقف کیا۔ "تم زل سے ہر وہ معلومات حاصل کرلو جو کرسکتے ہو اور جتنا وہ جانتی ہے۔" اگلے دن کا شیڈول اس نے باسل کو سمجھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کے گرینڈ فادر کی ڈیتھ کب ہوئی تھی؟" اگلے روز باسل نے بلا تمہید زل کو ساری بات بتادی تھی۔ اور جسے سن کر وہ زیادہ حیران نہیں ہوئی تھی۔

"مجھے اندازہ تھا کہ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔ ڈیڈ کا رویہ باقی ڈاکٹرز کے ساتھ بھی ایسا ہی رہا ہے۔" وہ خود سے کہنے لگی۔ پھر بڑی دیر کے بعد اس نے باسل کی بات کا جواب دیا تھا۔

"میرے گرینڈ فادر کی ڈیتھ' ڈیڈ کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔"

"اور آپ کی گرینڈ مدر؟"

"میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ ڈیڈ نے بتایا تھا کہ ان کے فرانس شفٹ ہونے سے پہلے وہ بھی ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔"

"فیملی کے دوسرے لوگ؟"

"ڈیڈ اکلوتے تھے' میں اپنے کسی رشتے دار کو نہیں جانتی۔"

"پہلی بار آپ نے ان کے رویے میں تبدیلی کب محسوس کی تھی؟"

"چار سال پہلے۔ جب ممی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔" وہ رکی۔ "ڈیڈ کو ممی سے بہت محبت تھی۔"

"ان کی علیحدگی کی وجہ۔؟" باسل نے پوچھا تو تیز روشنی میں زل کی آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسو اس سے چھپے نہ رہ سکے۔

"انہیں ڈیڈ کے دوست پسند آگئے تھے۔ شادی کے سولہ سال بعد۔ اور انہوں نے ڈیڈ سے طلاق لے کر ان سے شادی کرلی۔ ڈیڈ اور ان کے دو اور دوستوں نے فرانس آکر ایک کمپنی کھولی تھی۔ وہ کمپنی اب تقریباً" تباہ ہوچکی ہے۔ ان کے ایک دوست کی ڈیتھ ہوچکی ہے اور ایک اپنا حصہ الگ کرچکے ہیں۔ باقی جو رہ گیا ہے ڈیڈ اسے سنبھالنے کے قابل نہیں رہے۔" بولتے بولتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

"مس زل۔۔۔!"

"نہیں' آپ جاری رکھیں۔ یہ سب اگر ڈیڈ کی صحت میں بہتری لا سکتا ہے تو مجھے برداشت کرنا ہوگا۔"

اس نے تیزی سے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کی تھیں' لیکن باسل اس دن مزید کچھ بھی نہ پوچھ سکا تھا۔

اگلے دن باسل نے اسے سیمینار کی تقریب میں دیکھا اور اسی دن اسے پتا چلا تھا کہ جس این جی او کے اشتراک سے سیمینارز ہورہے ہیں' وہ بھی اسی کی ایک رکن ہے۔ وہ ایک کونے کی ٹیبل پر سب سے الگ تھلگ اردگرد سے بالکل لاتعلق سی ہوکر بیٹھی تھی۔ جیسے اپنی پیدائش سے لے کر اب تک کسی سے ہم کلام ہی نہ ہوئی ہو۔ اپنی ہم عمروں سے بھی اس کے ملنے کا انداز' پہلی بار کی ملاقات جیسا انداز لیے ہوئے تھا۔ باسل اس کے قریب آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لگتا ہے آپ کو فرینڈز بنانے کا شوق نہیں۔"

"شوق تو ہے پر وقت نہیں۔۔۔ میں گھر سے کم ہی باہر نکلتی ہوں۔" پنک باربی کی آنکھیں پنک ہو گئیں۔

"مس زل آپ پریشان مت ہوں۔ یشار۔۔۔"

"کیا ڈاکٹر یشار آپ سے اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔" اس نے اسے درمیان میں ٹوکا۔

"آپ خود بھی اس سے اس مسئلے پر بات کر سکتی ہیں۔ یشار سنجیدہ طبیعت کا مالک ہے 'مگر اتنا بھی نہیں کہ آپ کو تسلی نہ دے سکے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا مسٹر باسل۔۔۔ دراصل مجھے لگا کہ شاید وہ مجھے کسی آس میں رکھ رہے ہوں 'مگر آپ سے نیوٹرل ہو کر بات کرتے ہوں۔"

"یشار پرسنل اور پروفیشنل کو آپس میں مکس نہیں کرتا۔ اپنے اسسٹنٹ کے طور پر وہ جتنا کچھ مجھ سے شیئر کرتا ہے وہ کچھ ایسا بھی خاص نہیں اور انجام کار کے طور پر وہ کیا سوچتا ہے 'اس بات کا اندازہ تو میں بھی نہیں لگا سکتا۔" باسل کی باتیں سن کر وہ جیسے مزید مایوس ہو گئی تھی۔

تین دن بعد دونوں کو مارسیلے کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ہفتہ بھر کے لیے۔ جب باسل نے زل کو اپنے مارسیلے جانے کے بارے میں بتایا تو اس کا چہرہ حیرت سے عاری تھا۔

"این جی او کے تحت ہونے والے سیمینارز کے شیڈول کا مجھے علم ہے۔ مارسیلے کے بعد آپ لیون جائیں گے۔ میرے تمام کولیگ بھی مارسیلے جارہے ہیں 'لیکن افسوس پچھلی بار کی طرح میں اس بار بھی ان کے ساتھ نہیں جاسکتی۔" شام کی اداسی لیے وہ گویا ہوئی اور باسل کا دل چاہا کسی بھی طرح کرکے وہ زل کو بھی اپنے ساتھ مارسیلے لے جائے۔

☆ ☆ ☆

"ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔" دروازے پر ہوتی دستک نے اس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔

"دروازہ کھولو۔۔۔" آواز آئی تھی۔

اس نے سن لی۔۔۔ پر وہ اٹھی نہیں۔۔۔ چوبی دروازے کو تکتی رہی۔

"دروازہ کھولو نگار بیٹی۔۔۔" اس کے ساتھ ساتھ جیسے وقت نے بھی کروٹ بدلی تھی۔

دیوار کی پلائی شیشم کے تختوں میں ڈھلی۔ لاک نے کنڈی کی جگہ لے لی۔ اور اندھیرے سے ڈھکے درودیوار نے شورش کو گلے لگالیا۔

"دروازہ کھولو نگار بیٹی۔۔۔" زلیخا بی بول رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"اتنی دیر لگادی تم نے تیار ہونے میں۔۔۔ وہاں ڈھولک بجنا بھی شروع ہو گئی ہے۔ عاصمہ بے چاری دو دفعہ بلاوا۔۔۔"

"کیسی لگ رہی ہوں۔۔۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ زلیخا بی بولتے بولتے رک گئیں۔

انہوں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ سنہرے جھمکے 'سبز پراندے' پیلے سوٹ' سرخ لپ اسٹک کے ساتھ لائٹ میک اپ اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ کھسّہ اور پازیب۔۔۔ رشک زلیخا بی کی آنکھوں میں بھر گیا۔

"بہت پیاری۔۔۔" آگے بڑھ کر انہوں نے اس کی نظر اتاری اور یہ بھی انہیں کم لگا۔

"آپ چلیے 'میں بس آرہی ہوں۔" وہ پھر سے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"جلدی آجاؤ۔ ہمایوں ناراض ہو رہا ہے۔"

"بس دو منٹ۔۔۔"

زلیخا بی باہر چلی گئیں۔ جب وہ دو کے بجائے دس منٹ لگا کر باہر نکلی تو ہمایوں کے چہرے پر بے زاری صاف نظر آرہی تھی۔ یہ اس کی نوازش تھی کہ اس نے کچھ کہا نہیں اور دونوں کو عاصمہ کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ تقریب کافی دیر پہلے شروع ہو چکی تھی۔ وہ بھاگی بھاگی عاصمہ کے کمرے کی طرف گئی۔

"اتنی دیر سے آئی ہے۔" عاصمہ نے روہانسی ہو کر شکوہ کیا۔

"کیوں۔ کیا نکاح ہو گیا؟" اس نے پریشانی سے

پوچھا۔

"ابھی نہیں۔" عاصمہ شرمائی۔ نگار نے جلدی جلدی پاس پڑے گجرے اسے پہنائے تھے۔

"اتنی جلدی میں کیوں ہے۔" عاصمہ نے ذومعنی پوچھا۔ نگار نے جیسے سنا ہی نہیں۔ پھولوں کا سارا زیور اسے پہنا کر وہ اٹھ گئی۔

"میں آنٹی سے مل کر آئی۔"

"حسن بھائی کا نام تو نے آنٹی رکھ دیا ہے۔" عاصمہ نے کہا تو نگار گڑبڑا گئی۔ کمرے میں عاصمہ کی کزنز بھی بیٹھی تھیں۔ عاصمہ کی بات پر سب ہنسیں تو شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ باہر نکل آئی۔

آنٹی سے مل کر وہ نجانے کیا تلاش کرتے کرتے پورا گھر دوبار گھوم چکی تھی جب پچھلے صحن کی طرف سے واپس آتے وقت کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کیا اور وہ جیسے نیند سے جاگ کر چونکی۔

"اوف۔ حسن۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" حسن کے سینے سے ٹکرا کر واپس ہوتے ہوئے وہ اپنا سانس بحال کرنے لگی۔ حسن کی آنکھیں اسے دیکھ کر محبت سے جگمگا اٹھیں۔

"ڈرا تو تم نے مجھے دیا ہے۔ اتنا خوب صورت لگنے کی تمہیں آخر کیا ضرورت تھی؟" وہ شرارت سے کہنے لگا۔ نگار اس کی روشن آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"گجرے نہیں پہنو گی۔" اس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بنا ہی اپنی جیب سے گجرے نکال کر اس کے آگے کیے۔ نگار نے خاموشی سے اپنی خالی کلائیاں آگے کر دی تھیں۔ حسن نے گجرے اس کے ہاتھوں پر ایسے باندھے جیسے کوئی بہت ہی مشکل کام کر رہا ہو۔ ساتھ ساتھ وہ مسکراتا ہوا اسے بھی دیکھتا رہا۔ اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو بھی۔ "اب ہاتھ چھوڑ بھی دو کوئی دیکھ لے گا۔"

"دیکھنے دو۔" اس نے ہاتھ نہ چھوڑے۔

"بدنامی ہو جائے گی۔"

"میں سنبھال لوں گا۔" وہ مڑی پھر پلٹی۔ اس کے روشن چہرے پر یک لخت ہی اداسی چھائی تھی۔

"تم نہیں سنبھال سکو گے حسن۔ تم کچھ بھی نہیں سنبھال سکو گے۔ ابو کبھی نہیں مانیں گے۔"

"آج کے دن تو ایسی باتیں مت کرو۔"

"تو پھر کس دن کروں۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میرے لیے ایک ایک دن گزارنا کس قدر مشکل ہوتا جا رہا ہے۔"

"میں جاب تلاش تو کر رہا ہوں نگار۔"

"کون سی ایسی جاب تلاش کر رہے ہو تم حسن۔ جو پچھلے چار سالوں سے تمہیں مل ہی نہیں رہی۔" حسن خاموش رہا۔

"ابو نے مجھ پر بہت محنت کی ہے حسن۔ تم جانتے ہو۔ انہوں نے اپنے منہ کے نوالے مجھے کھلائے ہیں۔ ہمایوں بھائی کا حق مجھے دیا ہے۔ وہ مجھے ایسے لڑکے کے ہاتھ کبھی نہیں سونپیں گے جس کے لیے میں بوجھ بن جاؤں۔ جو مجھے ڈھنگ سے دو وقت کی روٹی نہ کھلا سکے۔" اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

"میں باہر جانا چاہتا ہوں نگار۔ میں امریکا جا کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں سیٹ ہونا چاہتا ہوں۔"

"تم کوشش کر چکے ہو۔ اور ناکام بھی ہو چکے ہو اور اب باہر جانے کا بھلا وقت ہی کہاں رہ گیا ہے۔ ابو جلد از جلد میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" وہ تاسف سے کہنے لگی۔

"بس تم پریشان نہ ہو نگار۔ میں جلد ہی کچھ کر لوں گا۔" حسن نے اس کا بازو پکڑ کر اسے پھر اپنی طرف کھینچا تھا۔

"تمہاری یہ سیرابی باتیں مجھے بنجر کر دیں گی حسن۔"

"کہا نا کچھ کرتا ہوں۔ آج تو ایسی باتیں نہ کرو۔" وہ پیار سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

اس سے بہت ہی کم فاصلے پر کھڑی نگار نہیں جانتی تھی کہ ان دونوں کی یہ گفتگو کوئی تیسرا بھی سن رہا ہے۔ وہ تیسرا زبان عالم تھا۔ نگار کا کلاس فیلو۔

☼ ☼ ☼

"یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔" باسل نے ایک

شاپنگ بیگ زل کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟"

"خود ہی دیکھ لو۔"

زل نے شاپنگ بیگ تھام کر اسے کھولا۔ اندر سے ایک باکس نکلا اور اس کے بھی اندر سے ٹشو پیپر میں لپٹی کوئی چیز۔

"تمہیں اس کی ضرورت ہے۔" باسل نے کل رات ہی اسے خریدا تھا۔ مال آف فلاورز سے۔ ایک کیمل بون آئٹم۔ جس پر بغدادی انداز سے کندہ کاری کی گئی تھی۔ اگرچہ وہ کافی مہنگا تھا' مگر پھر بھی باسل نے اسے زل کے لیے خرید لیا تھا۔

"اچھا لگا۔؟"

"یہ فریب کی حد تک خوب صورت ہے۔"

"میری نانو کہتی ہیں' جس گھر میں اونٹ کی ہڈی ہو وہاں مصیبت اور پریشانی نہیں آتی۔" باسل نے پراعتماد لہجے میں نانو کی کہی بات کی تو کیمل بون کے منقش آرائشی پیس سے نظریں ہٹا کر زل نے باسل کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں رشک تھا۔

"کتنے عجیب لوگ ہیں یہ۔ ایک طرح سے خوش قسمت بھی۔ ایسی باتوں پر اعتقاد قائم کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو واقعی رنج و غم سے بچا لیتے ہیں۔" اس نے دل میں سوچا تھا۔

"اس کے لیے تمہارا بہت بہت شکریہ باسل۔ مگر میں تمہاری نانو کی بات سے اتفاق نہیں کروں گی۔"

"ان باتوں کے سائنسی دلائل نہیں ہوتے۔ یہ تو بس۔" باسل خاموش ہو گیا۔ زل جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک قریبی الماری کی طرف بڑھی تھی۔

"ادھر آؤ۔" باسل کے وہاں پہنچنے پر اس نے الماری پوری کھول دی۔ اندر بیش قیمت نوادرات کا ایک ذخیرہ جمع تھا۔ باسل دیکھتا رہ گیا۔ دو الماریوں میں پوری دکان سمائی ہوئی تھی۔ زل ان نوادرات کے درمیان سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چن چن کر اکٹھے کرتے ہوئے اسے پکڑانے لگی۔ جب باسل کے ہاتھوں میں آٹھ دس ٹکڑے اکٹھے ہو گئے تو وہ رکی۔

"جانتے ہو' یہ سب کیا ہیں۔" باسل جانتا تھا۔ وہ تمام کے تمام ٹکڑے کیمل بون تھے۔

"ڈاکٹر براؤن نے سال بھر پہلے چیدہ چیدہ نوادرات کو اس الماری میں قید کروا دیا تھا۔ یہ ان کا طریقۂ علاج تھا' لیکن یہ چیزیں باہر رہ کر بھی کوئی فائدہ نہ دے سکے اور نہ ہی اندر قید ہو کر۔" باسل خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

"عقیدے سچے ہوں یا جھوٹے' لیکن مصیبتوں کو اونٹ کی ہڈیوں سے نہیں روکا جا سکتا باسل۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ باسل نے تمام ٹکڑے کارنس کی شیلف پر رکھ دیے۔

"زل! تم پریشان مت ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" باسل کی بات پر زل نے سر جھکا۔

"میں یہ فقرہ بہت بار سن چکی ہوں باسل۔"

"یشار نفسیات میں بہت ماہر ہے وہ یقیناً"۔

"ڈیڈ کا مرض گیڈز سے زیادہ لاعلاج ہو چکا ہے۔" اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔

کسی حد تک زل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ایک ماہ میں پندرہ دن کی کنسلٹینسی کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔ حالانکہ اس بات کی یشار کو قطعاً امید نہیں تھی۔

"یہ ایک طرح کا گلٹ ہے' ایک طرح کا احساس جرم' جیسا آپ سوچتی ہیں ویسا کچھ نہیں ہے۔ انہیں اپنی بیوی کی بے وفائی یا اپنے دوست کی دھوکے بازی کا غم نہیں ہے۔ کچھ اور ہے۔ جو وہ بتانا نہیں چاہتے' لیکن میں جلد ہی اس تک پہنچ جاؤں گا۔ مریض کو راضی کرنا مشکل ہے پر ناممکن نہیں۔"

"لیکن آپ تو چند دن بعد پاکستان واپس جا رہے ہیں۔"

"ہم اسکائپ پر بات کر سکتے ہیں۔ اس نقطے تک ہمیں پہنچنا ہو گا جہاں سے دائرے بننے شروع ہوئے تھے۔" زل نے زیادہ امید نہیں پکڑی تھی۔

باقی کے دن بھی یوں ہی بے یقینی میں گزرتے گئے۔ وہ ان کا فرانس میں آخری دن تھا اور زل کے گھر

آخری کنسلٹینسی۔ جب زل نے ڈنر کا اہتمام کیا اور جس میں ڈیڈ نے بے حد اصرار کے باوجود بھی شرکت نہیں کی تھی۔

"تم زل کو بروشر میں درج ساری ہدایات اچھی طرح سمجھا دو۔" یشار نے جاتے ہوئے باسل سے کہا تو باسل نے اس کا بیگ کھول کر اس میں سے لاتعداد بروشر نکال لیے۔

"یشار کی غیر موجودگی میں یہ تمہیں فائدہ دیں گے۔" وہ زل کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ اس بروشر میں ٹی وی چینلز سے متعلق ساری تفصیل درج ہے۔ نیوز چینلز بیلیتھ چینلز تو بالکل بند کرنے ہوں گے۔ مزید تم اسے خود اچھی طرح پڑھ سکتی ہو۔" اس نے وہ بروشر زل کو پکڑا دیا۔

"اس والے میں گھر کے لیے ضروری ہدایات درج ہیں۔ وال کلر' فرنیچر کلر' پردے' بیڈ شیٹ' ایوری تھینگ۔" وہ بولتا جا رہا تھا اور زل توجہ سے ساری باتیں سن اور سمجھ رہی تھی حالانکہ صرف چند باتوں کے علاوہ باقی ساری باتیں اس کے لیے پرانی تھیں۔

"یہ بروشر سب سے اہم ہے۔ یہ ری ایکشن کے لیے ہے۔ اس پر تم نے سختی سے عمل کرنا ہے۔ صبر اور تحمل سے۔" وہ انگلی رکھ کر اسے ایک ایک بات سمجھا رہا تھا اور اس ساری تفصیل کو اس تک پہنچاتے ہوئے وہ غیرارادی طور پر اس کے بے حد قریب ہو گیا تھا اتنا کہ اس کے سانسوں کی مہک کو زل نے بہت قریب محسوس کیا اور اس کے وجود سے اٹھتی کلون کی خوشبو نے زل کو اپنے حصار میں لے لیا۔ سنتے سنتے اور سمجھتے سمجھتے وہ محسوسات کی ندیوں میں ڈوبنے لگی۔

یہ لمحہ اس کی زندگی کے تمام لمحوں سے جدا تھا اور اس لمحے کے سنہری پھول اس کے وجود کو ڈھانپنے لگے تھے۔ عین اس وقت جب زل اس کی ذات کی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ باسل نے بھی جان لیا کہ زل اسے سن نہیں رہی ہے۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہیں رہی ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

عجیب تعلق بنا تھا ان دنوں میں بھی۔ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا' لیکن پھر بھی ہر تعلق اس کے نام سے منسلک ہو گیا تھا۔ وہ اس کی اچھی دوست بھی نہیں بن سکی تھی اور سب کچھ بن گئی تھی۔

دونوں آہستگی سے تب چونکے تھے جب کمرے کا گھڑیال سناٹے میں بولا تھا۔

زل کو خدا حافظ کہتے وقت وہ خود بھی زل کی طرح اداس ہو گیا اور پھر پاکستان واپسی کے سفر میں تمام وقت اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اپنی کوئی بہت ہی قیمتی چیز فرانس میں کھو چکا ہے۔

☼ ☼ ☼
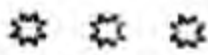
"سرزیان۔!" میڈ نے چیخ کر انہیں پکارا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بری طرح کانپ رہے تھے۔ میڈ جلدی سے ان کی طرف بڑھی۔

"دور ہو جاؤ۔ دور رہو مجھ سے۔" وہ چلائے۔ میڈ نے جیسے سنا ہی نہیں گلاس میں پانی بھر کر انہیں پلانے لگی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے کافی پانی ان کے اوپر ہی گر گیا۔

"ڈیوڈ' ڈینیئل۔" میڈ نے چلاتے ہوئے گھر کے دوسرے ملازموں کو آواز دی تھی۔

"میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے میڈ کو دھکا دیا تو گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ میڈ بھاگتی ہوئی دوسرے ملازموں کو بلانے کمرے سے باہر چلی گئی۔ کانپتے وجود کے ساتھ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد زل کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

"ڈیڈ! دروازہ کھولیے۔ خدا کے لیے دروازہ کھولیے۔" زل چلاتے ہوئے التجا کر رہی تھی۔ انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ بیڈ پر گر کر اپنے حواس بحال کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ ان کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

دروازہ بج رہا تھا۔ بار بار۔ بار بار۔ زل اب روتے ہوئے انہیں پکار رہی تھی اور وہ بے حس و حرکت لیٹے چھت کو گھور رہے تھے۔

"تحت الشعور اندھیروں کو سمیٹ لینے کا عادی ہوجائے تو شعور بھی روشنیوں سے نالاں رہنے لگتا ہے۔" زل کے بے حد اصرار پر وہ ڈنر کے لیے باہر نکل رہے تھے تب ڈاکٹر یشار کے ان الفاظ نے ان کا راستہ روک لیا تھا اور ان کی روح کو بھی جیسے قید کرلیا تھا۔

ایسی باتیں وہ پہلے بھی کہیں سن چکے تھے۔ ایسی باتیں کوئی اور بھی کیا کرتا تھا۔

کون کیا کرتا تھا۔؟ ان کا دماغ پھٹنے لگا سوچتے سوچتے۔

ربانی۔ پروفیسر صغیر ربانی۔

✲ ✲ ✲

"وہ مکڑی نوزائیدہ شکار کے گرد جالا بن دے تو آسمان بجلی کی کڑک سے کونج اٹھتا ہے۔" پروفیسر صغیر ربانی لیکچر دیتے دیتے ہمیشہ کی طرح نجانے کہاں سے کہاں پہنچ چکے تھے۔ "یہ اشارہ ہے۔ خدا کا۔ کہ قدرت ابھی زندہ ہے۔ انصاف کا خون نہیں ہوا۔" وہ مسکرا کر مزید بولے۔

حسب عادت ان کی باتیں کتابوں سے شروع ہو کر آسمان والے پر جاکر ختم ہوئی تھیں۔ وہ فلسفے کے پروفیسر تھے اور انہوں نے وجودیت کا اتنا علم حاصل کرلیا تھا کہ لیکچر کے علاوہ ان کی روزمرہ کی گفتگو بھی عام انسانوں کی سمجھ میں آنے والی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ تخیل ہی تخیل میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچے پروفیسر صغیر ربانی، نرم آواز سے لیکچر دیتے، پورا ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کلاس کو نیند آنے لگی تھی۔

"برگد جو نشان خدائی ہے۔ ہمیں پتا ہے، وہ راز جو الوہیت کی طرف لے کر جاتے ہیں۔"

کھلی آنکھوں سے پوری کلاس سو رہی تھی۔ کوئی اپنی ہی تھوڑی پہ ہاتھ رکھے مدہوش تھا۔ کوئی چیئر پر سر پیچھے ڈالے، سوائے نگار کے جو بڑے غور سے

پروفیسر صغیر ربانی کے منہ سے نکلتا ایک ایک لفظ ازبر کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ پوری یونیورسٹی میں وہ پروفیسر صغیر ربانی کی واحد مداح تھی۔ ان کی الجھی ہوئی باتوں سمیت۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہفتے کے چھ دن، وہ اس پیریڈ کو لازمی کروا دے اور جب یہ پیریڈ شروع ہو تو اس کے ختم ہوجانے کی بیل کو بھی بجنے سے رکوا دے۔

پچھلی چیئر پر بیٹھا زیان عالم بھی بے چینی کا شکار ہورہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد چوتھے پیریڈ کے آف ہوجانے کی بیل کو بجی تو پروفیسر صغیر ربانی نے اپنی عینک کو اتار کر کیس میں رکھا اور کتاب بند کی۔ حالانکہ کھلی کتاب کی انہیں بالکل بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب کچھ اپنی طرف سے ہی تو کہہ رہے تھے۔

پروفیسر نے جاتے جاتے بھی بہت ٹائم لے لیا۔ ہمیشہ کی طرح۔ اور ان کے جاتے ہی اسٹوڈنٹ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ نگار بھی اٹھ کر اپنی کتابوں کو بیگ میں ڈال رہی تھی جب اس نے آواز سنی۔

"نگار۔" اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ زیان عالم تھا۔ جسے دیکھ کر نگار کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

"ابھی جانا نہیں۔" اس نے کہا۔ نگار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ کتابوں کو بیگ میں ڈال کر آگے بڑھی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر زیان تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔

"کیا تم اپنے قیمتی وقت میں سے مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتی ہو؟" وہ کسی قدر غصے سے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے طنز سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ بولو۔" دائیں بائیں دیکھتے وہ بولی۔ جیسے اسے توجہ نہ دینا چاہتی ہو۔

"میں تمہیں انوی ٹیشن دینے آیا ہوں۔ ایک بار پھر سے۔ اپنی پارٹی میں شمولیت کی۔ تم سوچ سمجھ کر۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ پھر سے۔ میری

طرف سے صاف انکار ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ زیان نے اپنا ہاتھ آگے کرکے اس کا راستہ پھر سے روکا تھا۔

"کیا میں تمہارے اس اٹل انکار کی وجہ جان سکتا ہوں۔" اس کی گھنی بھنویں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئیں۔

"کوئی خاص نہیں ہے۔ ہر ایک کو حق ہے کہ وہ اپنی پسند اپنے ذہن کے مطابق فیصلے کرے۔"

"تم میری کلاس فیلو ہو کر مصباح کو سپورٹ کررہی ہو۔"

"میں مصباح کو سپورٹ نہیں کررہی زیان عالم۔ میں اس کے موٹو کو سپورٹ کررہی ہوں۔"

"اس کا موٹو۔ اوف۔" زیان نے ایک قہقہہ لگایا۔

"پوری کلاس میرے ساتھ ہے نگار۔ سوائے تمہارے۔"

"یہ کچھ ایسا شاکنگ بھی نہیں ہے۔ مصباح کی کلاس کے بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ اسے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ہی وہ سب کے پاس جاکر ان سے خود کو سپورٹ کرنے کی بھیک مانگتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو نگار۔" اس کی گردن کی رگ پھول گئی۔

"تم اتنی سادہ سی بات نہیں سمجھ رہے۔ حیرت ہے۔ خیر ایک میرے تمہاری پارٹی میں نہ ہونے سے تمہیں یا تمہاری پارٹی کو کیا فرق پڑے گا آخر۔"

"تم لائق ہو۔ ٹیلنٹڈ ہو۔ اور اس سے مصباح کو بھرپور فائدہ ہورہا ہے۔ ہمارے کلاس فیلو یہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"سدیم اور یشب بھی کافی ٹیلنٹڈ ہیں۔ آصفہ، وجیہہ بھی۔"

"ہماری پارٹی تمہیں اچھی آفر۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سوچوں گی۔" اس نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔ اسے پہلے ہی دیر ہورہی تھی۔ مصباح کے آفس جاکر ابھی اس کو پوسٹر بھی لکھنے تھے۔ زیان ایک بار تو کیا ہزار بار بھی آجاتا تو وہ اس کی پارٹی میں جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس معاملے میں اس کی ذاتی انا حائل تھی۔ زیان یونیورسٹی کے اولین دنوں سے ہی اسے سخت ناپسند رہا تھا۔

یہ ایک سال پہلے کی بات تھی۔ یونیورسٹی میں دوسرے دن وہ اپنی دوست زارا کے ساتھ اس کی ایک سینئر دوست سے نوٹس لے کر لائبریری سے نکل رہی تھی جب اس پر بدبودار پانی کی ایک تیز دھار پڑی تھی۔

"شٹ۔" اور ساتھ ہی لڑکے لڑکیوں کے گروپ نے انہیں تیزی سے خبردار کیا تھا۔

"یہ پانی نہیں ہے۔ کیروسین آئل ہے۔ اگر ذرا سا بھی ہلیں تو ہم اسے آگ لگادیں گے۔" زارا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جگہ ساکت ہوگئی تھی مگر نگار کا غصہ آسمانوں کو چھونے لگا تھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" اس نے پانی کی سرنج پکڑے ایک لڑکے سے چیخ کر کہا تھا۔ جسے بعد میں اس نے زیان عالم کے نام سے ہمیشہ یاد رکھا۔

"کیا ہوگیا یار۔ مذاق تھا۔" وہ پانچوں قریب آگئے۔

"تمہارے مذاق سے میرے نوٹس خراب ہوگئے ہیں۔ خبیث لڑکے!"

"زبان سنبھال کر بات کرو لڑکی۔" زیان آگے آکر بولا۔

"اب ان نوٹس کو تمہارا باپ ٹھیک کرے گا۔"

"اتنی بڑی بات تو نہیں جتنا بڑا تم تماشا لگا رہی ہو۔" گروپ میں سے ایک لڑکی وجیہہ بولی تھی۔ نگار نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یونیورسٹی آنے سے پہلے تمہیں کسی اچھے ادارے سے تمیز سیکھ کر آنا چاہیے تھی۔" اس نے اسے مشورہ دیا۔ وجیہہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔

"یہ آئل نہیں صرف پانی ہے۔ لاؤ میں اسے صاف کردوں۔" سدیم آگے بڑھا۔

"چھوڑو۔ ہاتھ مت لگاؤ۔" اس نے نوٹس سدیم کے ہاتھ سے چھینے۔

"چلو چلتے ہیں نگار۔" زارا نے سرگوشی میں کہا تھا۔ جسے گروپ کی لڑکی آصفہ کچھ اور ہی سمجھی۔
"ہاں جاؤ۔ شکایت لگاؤ جاکر ہماری پرنسپل سے۔ میرا نام آصفہ ہے۔ یہ زیان ہے۔ اس کا نام سدیم ہے یہ یشب اور یہ وجیہہ۔ جاؤ جس سے مرضی لگاؤ شکایت۔" وہ لڑکی آصفہ تڑتڑ بولتی گئی تو نگار نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر سر جھٹک کر بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔
"باسٹرڈز آف وائے بلاک۔"

یہ بڑبڑاہٹ اتنی بھی مدھم نہیں تھی کہ پانچوں سن نہ سکتے۔
"کیا کہا تم نے۔؟" زیان نے غصے میں آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا تھا۔ وہ چند لمحے اس کو دیکھتی رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہہ دیا۔ "باسٹرڈ آف وائے بلاک"
یہ انداز اور یہ الفاظ زیان کو طیش دلانے کے لیے کافی تھے۔ غصے سے پاگل ہوتے ہوئے اس نے جیب سے لائٹر نکالا تھا اور لمحے بھر میں نوٹس کو آگ لگادی۔
"لو اب صاف ہوگئے نوٹس۔ دوبارہ گالی دینے کی جرأت نہ کرنا۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ نگار نے شعلہ پکڑے نوٹس کو تیزی سے چھوڑا تھا۔ باقی چاروں بھی ہنسی کرنے لگے۔ زارا فق چہرے سے سب دیکھے گئی۔ زیان غصے سے اسے گھورتا ہوا باقی سب کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور وہ اپنے جلتے نوٹس دیکھتی رہی۔ ارد گرد کے چند ایک لڑکے لڑکیوں نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔

یہ بات اسے آنے والے دنوں میں پتا چلی تھی کہ زیان عالم نہ صرف اسی کی طرح جونیئر تھا بلکہ اس کا کلاس فیلو بھی تھا اور جو اس دن سینئرز کی طرح جونیئرز کو تنگ کر رہا تھا۔ اس بات نے نگار کو اور سلگا دیا تھا۔ اس دن کے بعد دونوں میں پھر کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ نگار اسے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتی تھی۔ وہ بھی نگار کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ کچھ زیان کے لائف اسٹائل نے بھی زیان کو کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح نگار کا دل پسند لڑکا نہیں بنایا۔ اس کی گرل فرینڈز آئے دن بدلتی تھیں۔ جو لڑکی مختصر عرصے کے لیے زیان کے ساتھ ہوتی اس کا پوری یونیورسٹی میں چرچا رہتا تھا۔ اس کی حرکتیں بگڑے ہوئے امیرزادوں والی تھیں۔
یونیورسٹی میں ہونے والے الیکشن کی وجہ سے اگرچہ اس کی شخصیت اور لائف اسٹائل میں کافی نمایاں تبدیلیاں ہوئی تھیں لیکن نگار کو ان تبدیلیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ پہلے دن والا زیان ہی رہا تھا۔ جس نے رینگنگ کے دوران اس کے نوٹس کو آگ لگادی تھی۔ یہ آگ کبھی نہ بجھ سکی۔ بارہ مہینے تین سو پینسٹھ دن اس آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکے تھے۔
الیکشن میں صدر کی حیثیت سے حصہ لینے کے بعد وہ اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے مہینوں پہلے والی حرکت پر اس سے معذرت کی تھی۔ اس کے باوجود نگار نے مصباح کی پارٹی جوائن کرلی تھی اور وہ بڑے دل وجان سے اس کی پارٹی کے لیے کام بھی کر رہی تھی۔
وجیہہ' آصفہ' یشب' سدیم کے بعد زیان بھی ایک بار اس کے پاس آچکا تھا کہ وہ ان کی پارٹی جوائن کرے۔ اور نگار نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اپنے محلے کی سہیلی عاصمہ سے یونیورسٹی کی باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان پر زیان کا نام آیا تو عاصمہ چونکی۔
"زیان۔ زیان عالم نا۔ گورا سا لڑکا ہے۔ بھنویں ملی ہوئی ہیں۔ کالے رنگ کی کار ہے اس کے پاس۔"
"ہاں۔ تم جانتی ہو؟"
"میں اور امی۔ ان ہی کے گھر تو کام کرنے جاتے ہیں۔" عاصمہ نے جتایا۔
"کیا زیان تمہاری مالکن کا بیٹا ہے۔" نگار نے حیرانی سے پوچھا۔ اسے اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔
"ہاں۔ ان کا نام مہتاب عالم ہے۔" نگار عاصمہ کے ذریعے مہتاب عالم سے تب سے واقف تھی جب

اس نے۔۔۔ ان کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ عاصمہ ان کی متنازعہ شخصیت کے بارے میں بہت بار بہت کچھ بتا چکی تھی۔

گلناب عالم جوانی کی بیوہ اور ایک بگڑے ہوئے بیٹے زیان عالم کی ماں تھیں۔ اپنی دسترس میں اپنے مرحوم شوہر کا بہت بڑا کاروبار رکھتی تھیں۔ نگار' عاصمہ کی منگنی پر گلناب عالم سے ایک بار مل بھی چکی تھی۔ وہ ویسی ہی تھیں جیسا عاصمہ نے اسے بتایا تھا۔ ایک فل فیشن ایبل لیڈی جو ہر وقت کم عمر لگنا چاہتی ہے اور اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ باب کٹ بالوں میں اس دن وہ ساڑھی باندھ کر آئی تھیں۔ جس کا بلاؤز بغیر آستین کے اور کافی چھوٹا تھا۔

گلناب عالم کردار کی ہلکی نہیں تھیں۔ وہ بس ذرا آزاد خیال تھیں آوارہ مزاج نہیں۔ اسموکنگ بھی کرتی تھیں۔ ان کے سہیلیوں کے ساتھ ساتھ مرد دوست بھی تھے۔ اور وہ ان سب دوستوں سے کافی زیادہ بے تکلف بھی تھیں۔ ان کے گھر میں آئے دن پارٹیز ہوتی تھیں۔ جن میں شراب کو ممنوع نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گیٹ ٹو گیدر کر کے باقاعدہ جوا بھی کھیلا جاتا تھا۔

اپنے لباس کے معاملے میں گلناب عالم بے خوفی کی حد تک لاپروا تھیں۔ جینز' ٹی شرٹ' کوٹ' ساڑھی' اسکرٹ یہ ان کے عام پہناوے تھے اور اس بات سے قطع نظر ان کے دیسی پہناوے بھی خالص مغربی لگتے تھے۔ عموماً" گھر پر کم ہی ملتیں۔ پارٹی کے دن کے علاوہ زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزارتی تھیں۔

ان کے گھر کے اس کھلے ڈلے ماحول کے باعث عاصمہ کی والدہ نے اکثر ہی وہاں سے کام چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا' لیکن ان کے گھر کے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے اور گلناب عالم انہیں اچھی خاصی تنخواہ دیتی تھیں۔

عاصمہ نے زیان کے بارے جو انکشاف کیا کہ وہ گلناب عالم کا بیٹا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی نگار اس کے نام کے ساتھ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کو بھی جوڑنے لگی۔ اسے زیان اور اس کی فیملی کے طرز زندگی سے گھن سی آئی تھی اور زیان کے متعلق اس کی ناپسندیدگی مزید بڑھتی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یونیورسٹی کے سرسید احمد خان ہال نمبر دو میں نصب بڑے بڑے لاؤڈ اسپیکر سے نکلتی زیان عالم کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ فائل تھامے تب وہ عقب کے دروازے کے قریب سے گزر رہی تھی۔

آج ہال میں زیان کی پارٹی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ کسی بھی طرح کی بدنظمی سے بچنے کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے دونوں پارٹیوں کے لیے ہال کھول دیے تھے۔ گراؤنڈ میں یا کسی کھلی جگہ میں جلسہ کرنا صورت حال کو خراب کر سکتا تھا۔

اس کا ہال کے اندر جانے کا کوئی ارادہ تو نہیں تھا' لیکن زیان کی تقریر میں اس نے کچھ عجیب سی بات محسوس کی تو وہ سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہونے سے خود کو روک نہیں پائی۔ بھیڑ میں جگہ بناتی وہ آگے کو بڑھتی گئی اور کچھ اسٹوڈنٹ تو اسے دیکھ کر خود ہی راستہ صاف کرنے لگے۔

اسٹیج پر مائیک تھامے وہ ڈائس پر کھڑا اپنے سامنے بیٹھے ایک بہت بڑے مجمع سے مخاطب تھا۔ اس کی باتوں میں جوش تھا۔ ولولہ تھا۔ کچھ کر گزرنے کی لگن بھی اور اس کا چہرہ اپنے ارادوں کی پختگی سے دمک رہا تھا۔ نگار آگے ہوتے ہوئے اسٹیج کے بالکل قریب ہو گئی۔

"ہم چاہتے ہیں کہ بک فنڈ کا اجرا یونین کے ہاتھوں میں ہو تاکہ اس کے منافع کو طلبہ کی بہبود پر لگایا جائے۔ ہماری پارٹی کا موقف ہے کہ پوائنٹس کی تعداد دگنی ہو۔ یونیورسٹی میں فری ورکشاپس کا انعقاد زیادہ سے زیادہ ہو اور وہ..." زیان ایک لمحے کو ٹھہرا تھا۔ چہرے پر پھر سے مسکراہٹ آئی تھی۔ نگار جانتی تھی کہ یہ "وہ" کا لفظ کس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ مصباح اور اس کے حامیوں کے لیے بولا گیا تھا۔

"اور وہ چاہتے ہیں کہ اینٹ گارے سے کلاسز کے درمیان میں دیواریں کھڑی کی جائیں تاکہ لڑکے لڑکیاں الگ الگ بیٹھ سکیں۔"

فقرہ ختم ہوا تھا اور پورا ہال۔۔۔ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

زیان کی تقریر میں یہی وہ عجیب عنصر تھا جسے سننے وہ ہال کے اندر تک آ گئی تھی۔ غصے کی ایک لہر نگار نے اپنے دماغ میں اٹھتی محسوس کی۔ زیان اس قدر کر سکتا تھا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ براہ راست وار کرنے پر آ گیا تھا۔ قہقہے گویا نیزے تھے جو اسے آ آکر لگتے گئے۔

"ہم چاہتے ہیں کہ پرائیویٹ اسٹوڈنٹ کی فیسز کو کم کیا جائے۔ فیس معافی میں گریڈ کے معیار کو کم کیا جائے' ہاسٹل ڈیوز میں سبسڈی دی جائے۔ کینٹین میں وہ ہو ٹوٹ ٹیکس اشیا مہیا کی جائیں اور۔۔۔" پھر سے خاموش۔۔۔ ہال تقریر کے بجائے جیسے اس کی اگلی بات کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ نگار کو اپنا غصہ ضبط کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

"اور ان دین کے ٹھیکیداروں کا موقف ہے کہ بینچ پر کوئی لڑکا لڑکی اکٹھے نہ بیٹھ سکے۔۔۔ کوئی بیٹھا مل جائے تو اسے چارج کیا جائے' زدوکوب کیا جائے' سزا دی جائے۔ سب کے سامنے ذلیل کیا جائے۔" وہ جوش میں۔۔۔ بولتا چلا گیا تھا۔

ہال کے تھم چکے قہقہے پھلجھڑی کی طرح پھر پھوٹے تھے۔ اس بار خاموشی چھانے میں بڑا وقت لگا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ زیان کے حامیوں کی تعداد دن بدن کس قدر زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ نئی ہوا کو قبول کر رہے تھے۔ وہ اس مجمع میں شامل بہت سے ایسے گروپس کو جانتی تھی' جنہوں نے پہلے پہل مصباح کو جوائن کیا تھا' لیکن اب زیان کی یونین میں شامل ہو گئے تھے۔

مصباح اور اس کے حامیوں کے مذاق اڑانے والے قہقہے رک رک کر پھر شروع ہوتے اور پھر تھمنے میں نہیں آتے تھے۔ وہ بار بار انہیں دین کے ٹھیکیداروں کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔ نگار کا دماغ گرم ہونے لگا۔ غصہ اس کی آنکھوں میں خون کی طرح اترا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے تیور بگڑ گئے تھے۔ اگر اس کے ہاتھ میں اس وقت پستول ہوتی تو وہ شاید زیان کو جان سے مار دینے سے بھی دریغ نہ کرتی۔

"دنیا کی بہترین چھ سو یونیورسٹیز میں ہمیں اس یونیورسٹی کا نام پھر سے درج کروانا ہے۔ اس کے گرتے ہوئے گراف کو پھر سے مستحکم کرنا ہے۔ دین کا نام لے کر ورغلانے والوں کو مات دینی ہے اور اس یونیورسٹی کے خراب ماحول کو درست کرنا ہے۔"

تقریر کا اختتام ہوا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ آخری بات پھر مصباح کی طرف طنز کرکے کہی گئی تھی۔ تالیاں تھمیں' زیان اسٹیج سے نیچے اترا۔ سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے جب ایک نسوانی قہقہے نے سب کو اپنی اپنی جگہ پر جامد کر دیا تھا۔

یہ نسوانی قہقہہ نگار کا تھا جو بری طرح ہال کے در و دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ اور ایسی خاموشی چھائی تھی جو زیان کی تقریر کے وقت بھی نہیں تھی۔

نگار کو اپنا یہ خیر مقدم اچھا لگا۔ وہ مزید ہنسے گئی۔

زیان سیڑھیاں اتر کر نگار کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ بات جتانے کے لیے اس کا ساکت چہرہ ہی کافی تھا کہ اسے نگار کا اس طرح ہنسنا کس قدر برا لگ رہا ہے۔ سدیم' عیشب' وجیہہ' آصفہ بھی ساتھ ساتھ کھڑی اسے گھورنے لگی تھیں۔

"دین کا نام لے کر ورغلانے والوں سے کیا مراد ہے تمہاری' زیان عالم؟" ہونٹوں کے کونوں میں مسکراہٹ چھپائے وہ پوچھنے لگی۔

"جو بے بنیاد باتوں کو بڑھاوا دیتے ہیں۔" اس کی آنکھیں باہر آ گئیں۔

"کیا تم ایسا نہیں کرتے۔"

"وہی تو میں کرنے والا ہوں۔۔۔ سب درست۔۔۔"

"سب درست۔۔۔؟ تمہیں معلوم ہے سب درست کرنے کا مطلب کیا ہے؟" زیان کو اس کے

لہجے میں چھپے طنز سے آگ لگ گئی۔
"ہاں۔ مجھے سب معلوم ہے۔"
"اگر سب معلوم ہے تو اس درستی کی ابتدا تم اپنے گھر سے کیوں نہیں کرتے۔ اپنی ماں سے۔؟" نخوت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بولی تھی۔
ہال میں خاموشی نے سناٹے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ جیسے پورا ہال ایک خالی میدان ہو اور وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ ہو۔ زیان کی جامد آنکھوں میں انگارے دہلنے تھے۔
"تو۔" غصے سے وہ اس کی طرف لپکا۔ جب سدیم اور ریشب نے اسے پکڑ لیا تھا۔
نگار پیچھے ہٹی تھی نہ ہی ڈری تھی۔ وہ وہیں کھڑی اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی تھی۔ سدیم اور ریشب نے ہی اس کو کندھے پر دباؤ ڈال کر باہر کی طرف کھینچا تھا۔ وجیہہ اور آصفہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔ زیان جب تک باہر نہیں نکل گیا گردن موڑے اسے گھورتا رہا۔ اور پورے ہال کے چہروں پر اپنے لیے نفرت دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے بچی۔" مصباح نے چلا کر پوچھا تھا اور اس کے بنائے نئے پوسٹر کو پھاڑ کر پرے پھینک دیا تھا۔ وہ پوسٹر زیان کے خلاف لکھا گیا تھا اور کافی کھل کر لکھا گیا تھا۔
نگار ایک ٹک مصباح کو دیکھتی گئی۔ مصباح کا یہ روپ اس کے لیے نیا تھا۔ وہ پٹھان نسل بڑے ہی نرم انداز میں بات کرنے والا اور لڑکیوں کے سامنے تو بالکل ہی نظریں نیچے کیے رکھنے والا لڑکا تھا، لیکن اب اس کی آنکھیں کے ڈورے اور۔۔۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نگار کچھ نہیں بولی۔ اس کے غصے کی وجہ وہ خود تھی۔ اس کی تازہ ترین فتوحات کی خبر باقی سب کو بھی ہو گئی تھی۔ یہ بات اتنی انوکھی، اتنی حیران کن اور غیر متوقع تھی کہ جنگل کی آگ سے بھی زیادہ تیزی سے پھیلی تھی۔ نگار نے نظریں جھکائیں۔

"یہ یونین کے الیکشن ہیں۔ قومی اسمبلی کے نہیں جو تم نے انہیں اپنے اوپر اتنا سوار کرلیا ہے۔"
"وہ آپ کے خلاف بول رہا تھا۔ مذاق اڑایا اس نے ہم سب کا۔ ایک بار نہیں نجانے کتنی بار۔ وہ ہم سب کو طنز سے دین کے ٹھیکیدار کہتے ہیں۔"
"تم کہنے دیتیں اسے۔ جو بھی وہ کہہ رہا تھا۔ کسی کے کچھ کہنے سے کیا فرق پڑتا تھا ہماری پارٹی کو۔ وقت آنے پر ہم بھی ویسا ہی رویہ اپنا لیتے، لیکن اس طرح ذاتیات پر اترنے کی کیا ضرورت تھی آخر۔؟"
"میری جو سمجھ میں آیا میں نے کہہ دیا۔"
"اپنے پرسنل ایشو صرف اپنے تک رکھو نگار۔!" اس نے تنبیہہ کی۔
"اگر تمہیں اس سے کوئی ذاتی عناد ہے تو اسے ہماری پارٹی کے نام سے منسلک ہو کر مت نکالو۔"
"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے جھوٹ بولا۔
مصباح کو غصہ آیا۔ جیسے وہ اس کو بخوبی جانتا ہو۔
"جو بھی بات ہے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے کتنی غلط حرکت کی ہے۔ اگر کوئی اس طرح سب کے سامنے تمہارے پیرنٹس کے بارے میں کچھ کہے تو۔ تمہیں کیسا لگے گا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ تک تمہیں رسائی کس نے دی۔"
"میں شرمندہ ہوں۔" نظریں اور چہرہ جھکائے مصباح کے پاؤں کو گھورتے ہوئے اس نے کہہ دیا۔ اور جھوٹ نہیں کہا۔ وہ واقعی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔۔۔ مصباح غصہ ہوا تو اس کی شرمندگی مزید بڑھ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس نے واقعی بہت غلط حرکت کی ہے۔
"اس گلٹ کو ابھی دور کرو۔ زارا! تم نگار کو زیان عالم کے پاس لے جاؤ تاکہ یہ اس سے ایکسکیوز کر سکے۔ سب کے سامنے۔" اس نے پہلے نگار کو پھر زارا کو مخاطب کرکے کہا۔ زارا نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ نظریں جھکائے وہ جیسے مصباح کی بات ماننے کا عندیہ

دے رہی تھی۔ دونوں زیان کے آفس آئیں تو پتا چلا کہ زیان گھر جاچکا ہے۔

"تم یہ کام کل صبح آتے ہی کرو گی۔" مصباح نے تاکید کی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اپنی شرمندگی کو مٹانے کے لیے اسے سزا منظور تھی۔

"اور ایک ہفتے تک تم ہماری پارٹی سے الگ رہوگی۔ کوئی کام نہیں کروگی۔ کسی جلسے میں شرکت نہیں کروگی۔ یہ تمہاری پینالٹی ہے۔" زارا نے چونک کر مصباح کو دیکھا تھا اور نگار نے آفس میں بیٹھے باقی سب کو۔

"ٹھیک ہے جیسے تم کہو۔" وہ بے دلی سے گھر واپس آگئی۔ اگلے ایک ہفتے تک اسے ویسے بھی یونیورسٹی نہیں جانا تھا۔ اس کی دوست عاصمہ کی شادی تھی، لیکن اپنی غلطی ہونے کے باوجود بھی مصباح کا رویہ اسے دکھی کر گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"اٹھو زیان۔۔۔ مجھے عاصمہ لوگوں کے گھر چھوڑ آؤ۔"

گلناب عالم نے پہلے دروازے پر دستک دی تھی۔ پھر خود ہی دروازہ کھولا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لائٹ جلاتے ہوئے انہوں نے زیان سے کہا۔

وہ اس وقت سینٹر ٹیبل پر جام، آئس کیوب اور ___ بوتلیں سجائے بیٹھا تھا۔ ایک جام ختم ہوچکا تھا۔ دوسرا ابھی اس نے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا جب گلناب عالم کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ دھیرے سے منہ موڑ کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ گلناب عالم اس وقت اونچی ہیل پر چوڑی دار پاجامہ اور باریک کپڑے کی کام دار فراک پہنے ہوئے تھیں۔ فراک بیس کلیوں کی ہونے کے باوجود بھی کمر اور جسم پر انتہائی تنگ تھی اور بازو عریاں تھے۔

"ڈرائیور سے کہہ دیں۔" وہ گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"وہ بیمار ہے ورنہ میں تم سے کہتی ہی کیوں؟" وہ اپنی چوڑیوں کو ترتیب دینے لگیں۔

"تو مت جائیں۔" بیڈ کی سائیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے حل بتادیا۔

"کیسے نہ جاؤں۔ ان لوگوں نے اتنی چاہت سے بلایا ہے۔"

"یہ ایسا لباس پہن کر جائیں گی آپ وہاں۔۔؟" وہ بھنویں جوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کیوں۔؟ اس میں کیا خرابی ہے۔ لیڈیز فیشن کو تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔" وہ اترائیں۔

"وہاں کی سوسائٹی۔۔۔"

"تب اٹھو۔ دیر ہورہی ہے۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ اسے اٹھانے لگیں۔

"تم گاڑی میں باہر ہی انتظار کرنا۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گی۔۔۔ اتنی دیر تم سانگ سن لینا۔" انہوں نے اس کی بوریت کا مسئلہ بھی سلجھادیا۔ زیان نے چاروناچار اٹھ کر سائیڈ ٹیبل سے چابیاں اٹھائی تھیں۔

عاصمہ کے گھر کے باہر گاڑی روکنے کے بعد اس نے ممی سے پھر سے جلدی واپس آنے پر اصرار کیا اور خود آہستہ آواز میں گانے لگا کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں۔۔۔ آج دن میں ہوا واقعہ ماضی کا حصہ نہیں بن رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جیسے کسی ___ قوت نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا تھا۔ سامنے والی گلی سے اسے نگار آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ جسے پہچاننے میں اسے ایک سیکنڈ بھی بمشکل لگا تھا۔ گانے کی آواز یک لخت تھمی تھی اور اکلوتے جام کا سارا نشہ ہرن ہوگیا تھا۔

نگار گھر کے اندر داخل ہوئی تو وہ بھی بلا سوچے سمجھے اندر چلا گیا۔

✲ ✲ ✲

عاصمہ کی شادی کے بعد وہ ساتویں دن یونیورسٹی آئی تھی۔ اپنی پینالٹی کے سارے دن اس نے

یونیورسٹی سے غیر حاضر رہ کر ہی گزار دیے تھے۔ آخر
ٹی تو سب نے ہی اسے خیر مقدمی نظروں سے دیکھا۔
بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔ وہ بھی تازہ دم ہو کر
آئی تھی۔ اس کے پیریڈ میں بھی ابھی دیر تھی۔ بیگ
سائیڈ پر ڈال کر وہ پوسٹر لکھنے لگی۔

مصباح اور زارا کب اندر آئے اسے پتا ہی نہ چلا۔
وہ تب چونکی جب سفید چارٹ کی سطح پر ایک سایہ کافی
دیر جما ہی رہا۔ وہ پیچھے پلٹی تو وہاں مصباح اور زارا
کھڑے تھے۔ اس کی مسکراہٹ اور سلامتی آدھے
راستے میں ہی تھم گئی۔ مصباح کی آنکھوں میں کچھ تھا
جسے وہ پڑھ نہیں پائی تھی۔ اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔

"تمہیں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ اسے جیسے ہی
موقع ملا اس نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔" مصباح
نے کہا۔

وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ زارا نظریں جھکائے کھڑی
تھی۔

"بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے کہ لڑکیوں کو اتنا بد زبان
نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ پھر وہ کسی بھی بد کو بد نہیں
سمجھتیں۔"

زناٹے دار تھپڑ کی طرح مصباح کے یہ الفاظ اس
کے کانوں میں اترے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ
ہو گئی تھیں۔ وہ نگار کے منہ سے کوئی بھی جملہ نکلنے
سے پہلے باہر نکل گیا۔ زارا وہیں ہی کھڑی رہی۔

"تم کچھ بتاؤ گی؟" اپنی آواز کو وہ زارا کے آگے پست
نہ رکھ سکی۔

"تم نے نوٹس بورڈ نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"تو چل کر دیکھ لو۔" زارا کے ساتھ ہی وہ نوٹس بورڈ
تک آگئی۔ جہاں بہت بڑے سائز کا پوسٹر پن اپ تھا
جس کی اوپری سطح پر تو بڑے حروف میں واضح کر کے
لکھا گیا تھا۔ "دین کے ٹھیکیداروں کی اصلیت" اور
نیچے جو کچھ تھا اس پر نظر پڑتے ہی پوری یونیورسٹی ایک
جھٹکے میں نگار کے پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔

نیچے لاتعداد تصویریں چسپاں تھیں جن میں ہر
ایک میں وہ اور حسن نظر آرہے تھے۔ اتنے قریب کہ
اسے خود دیکھ کر شرم آگئی۔ لمحے میں اس کا ذہن ماؤف
ہونے لگا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" وہ بے ہوش ہو کر گرنے کے قریب
تھی۔ وہ تصویریں عاصمہ کی مہندی اور بارات والے
دنوں کی تھیں۔ جس میں حسن نے اس کا ہاتھ تھام
رکھا تھا۔ کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کر رہا تھا اور
کچھ تصویروں کے زاویے تو اس قدر غیر مناسب تھے
کہ اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما
جائے۔

"کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ وہاں زیان کے
سپورٹر میں سے بھی کوئی موجود ہے۔" زارا پوچھ رہی
تھی اور وہ جیسے کچھ بھی سن نہیں پا رہی تھی۔

پوسٹر جھپٹ کر اتار کر اس نے ٹکڑے ٹکڑے
کر دینا چاہا تھا۔ آس پاس سے گزرتے لڑکے لڑکیوں
نے اسے ایسا کرتے دیکھا تھا اور کیا خوب نظروں سے
دیکھا تھا۔

"کس کس پوسٹر کو پھاڑو گی نگار۔" زارا تاسف
سے بولی۔

اور شائیں شائیں کرتے اس کے دماغ میں کرنٹ
کی طرح گلناب عالم کا خیال آیا۔ وہ دونوں دن انہیں
وہاں دیکھ چکی تھی اور یہ کام یقیناً زیان کے کسی سپورٹر
کا نہیں بلکہ خود زیان کا ہی تھا۔ غصے سے اس کے جسم
کا تمام خون اس کی رگوں میں لاوے کی صورت بہنے لگا
تھا۔

"پریشان مت ہو نگار۔" زارا نے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مصباح وائس پرنسپل سے
بات کرنے گیا ہے۔ جلد ہی تمام پوسٹرز ہٹا دیے جائیں
گے۔"

"اور لوگوں کے ذہنوں سے ان تصویروں کو کون
نکالے گا۔" وہ سوچنے لگی۔

"ذاتیات پر اترنے کی پہل تم نے کی تھی
نگار۔ معذرت کے ساتھ۔ پر اب اس چیز کو
برداشت کرو۔" زارا جوں توں گھسیٹ کر اسے کینٹین

تک لے آئی۔

"تم بیٹھو۔ میں تمہارے لیے جوس لاتی ہوں۔" زارا نے کہا پر وہ جوس لینے جانہ سکی۔ کینٹین کے شور شرابے میں کچھ نیا پن تھا جس کا اندازہ دونوں کو ہی بیک وقت ہوا تھا۔

وہاں رش معمول سے کافی زیادہ تھا جیسے وہاں کوئی جشن منایا جارہا ہو اور وہاں واقعی جشن منایا جارہا تھا۔ زیان عالم کی طرف سے اس کے سپورٹرز اور نان سپورٹرز کو بھی ہر چیز فری فراہم کی جارہی تھی۔ آج کے تازہ ترین واقعے کی کامیابی کی خوشی میں۔۔۔ اسی خوشی میں ہر طرف افراتفری سی پھیلی تھی۔ نگار کا غصہ ٹھنڈا ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا۔ چنگاری نے جیسے آگ پکڑی۔ زارا نے زبردستی اسے اٹھانا چاہا' لیکن وہ اپنی جگہ پتھر بنی ہوئی تھی۔ دونوں داخلی دروازے تک پہنچیں تو زیان اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ پہلے گلاسز اتار کر شرٹ کے کھلے گریبان میں لگائے اور پھر دونوں ہاتھ دائیں بائیں دیوار پر ٹکائے۔

"آپ کچھ کھا کر نہیں جائیں گی مس نگار۔؟" وہ ایسے پوچھ رہا تھا جیسے کچھ جانتا ہی نہ ہو۔

"راستہ چھوڑو میرا زیان۔" اپنی آواز کو نرم رکھنے کی ساری کوشش بے کار ثابت ہوئی۔

"سب کچھ فری ہے۔"

"ایک کپ چائے تو پی لو یار!" یشب کے ہاتھ سے کپ پکڑ کر اس نے نگار کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارے اعصاب کو سکون دے گی۔" آگے جھک کر رازداری سے کہا گیا۔ افراتفری کا شکار اور کنٹرول میں بنی ساری کینٹین لمحوں میں اکٹھی ہوگئی تھی۔ ایک ہجوم نگار کے پیچھے آکھڑا ہوا تو ایک زیان کے پیچھے۔

"حساب برابر ہوگیا نگار۔ غصہ تھوک دو اب۔

یہ کپ ہماری نئی دوستی کا آغاز ہے۔ ایک سچی مخلص دوستی۔" اس کا لفظ لفظ زہریلا تھا۔

نگار نے دائیں بائیں دیکھا اور تماشا ختم کردینے کی غرض سے کپ تھام لیا۔ زارا بھی آگے ہوئی جب زیان نے پھر دونوں ہاتھ کھول کر ان کا راستہ روک لیا۔

"بس ایک شرط اور۔۔۔ آخری التجا۔۔۔ لاسٹ وش۔" وہ سپاٹ چہرے سے اس کو دیکھے گئی۔

"وہ فقرہ دوبارہ بول دو نا۔ تمہارے منہ سے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ جو تم نے اس رات اس لڑکے سے کہا تھا کہ۔۔۔ چھوڑ بھی دو ہاتھ 'کوئی دیکھ لے گا۔"

چھن کی آواز کے ساتھ کینٹین کے سارے شیشے ٹوٹ کر اس پر آگرے تھے۔ سماعت نے ذہن پر ہتھوڑے برسائے تھے اور لمحوں میں نگار کی دونوں آنکھیں ابل کر باہر کو آگئی تھی۔ زیان کے پیچھے کھڑے گروپس میں کھی کھی ہوئی تھی۔ اس کے دوست سدیم اور یشب تو دل کھول کر ہنسے تھے۔

"اف وہ فقرہ۔۔!! پلیز بول دو نا۔۔۔ چھوڑ دو ہاتھ 'کوئی دیکھ۔۔۔"

بھاپ اڑاتی گرم چائے کا کپ نگار نے اس کے منہ پر دے مارا۔ گرم سیال زیان کے منہ پر گرا تھا۔ زیان کی زبان ایک دم بند ہوئی۔

دونوں طرف کے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سنبھل کر زیان نے ایک تھپڑ نگار کے منہ پر مارنا چاہا تھا اور اس کا ہاتھ مصباح کے ایک حامی نے پکڑ لیا تھا۔ پھر تو دونوں طرف کی بھیڑ میں جیسے بجلی کے کوندے بھر گئے۔ دونوں حریف آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں زبردست قوت موجود تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ آوازیں' گالیاں' توڑ پھوڑ' شور شرابا' ہنگامہ' کینٹین میں موجود تمام چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اور کھانے پینے والی اشیا فرش پر بکھر گئیں۔

لاتیں' مکے' گھونسے' ہر چیز سے وار کیا جارہا تھا۔ بہت سوں کے سر پھٹ گئے تھے۔

پھر یہ تماشا بڑی دیر بعد تھما تھا۔

☼ ☼ ☼

چنگیزی نارنجی کے بلوری جام میں برف کے ٹکڑے ڈال رہا تھا۔ ایک' دو' تین اور آج اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے خلاف معمول چوتھا بھی ڈال دیا۔ پھر کاگ ہٹا کر جام کو بھرنے لگا اور ڈرتے ڈرتے

اپنے مالک کو دیکھا جس کی آنکھیں میز پر جمی تھیں۔ گلاس بھر کر چنگیزی نے اپنے مالک کی طرف بڑھایا۔ احتیاط کے باوجود بھی وہ اس قدر بھر گیا تھا کہ چھلکنے کے بالکل قریب تھا۔

زیان نے گلاس نہیں پکڑا تھا۔ وہ ٹیبل کی سطح سے نظریں ہٹا کر چنگیزی کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر گرم چائے سے جلنے کے نشان تھے۔ جو دوپہر تک سرخ تھے مگر رات ہوتے ہوتے کالے ہوگئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے گرم لوہے کی سلائیاں پھیر دی تھیں اور اس کے چہرے کی رگیں غصے کے باعث پھولی ہوئی تھیں۔

"چنگیزی!" وہ بولا۔

"جی مالک!"

"تیزاب پھینکنے کا فیشن اتنا پرانا کیوں ہو گیا ہے۔" اس نے پوچھا تو چنگیزی اندر ہی اندر تھر تھر کانپنے لگا۔

"آپ تھوڑی دیر آرام کریں مالک۔"

"چنگیزی۔"

"جی مالک۔"

"چائے اور ---- میں سے کون سی چیز زیادہ گرم ہے؟" وہ اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا کہ اگر اس نے جواب نہ دیا تو وہ اسے قتل کردے گا۔ اس سے دگنی عمر کا چنگیزی خوف زدہ ہو گیا۔

"چائے بدن کو گرمی دیتی ہے مالک۔ لو ---- اور ---- روح جھلساتی ہے۔" نظریں جھکا کر اس نے کہہ دیا۔

زیان کی طرف بڑھا اس کا ہاتھ دکھنے لگا تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھتا رہا جیسے اس کی بات پر غور کر رہا ہو پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے گلاس پکڑ لیا' لیکن ہونٹوں سے نہیں لگایا بلکہ گردن پیچھے ڈال کر اور بھرے گلاس کو اوپر لے جا کر اپنے چہرے پر گرانا شروع کردیا۔ یہ دیکھ کر چنگیزی کی جیسے روح فنا ہو گئی۔

"مالک۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ مالک۔" وہ آگے بڑھا' لیکن زیان نہ رکا۔

"مجھے روح کو جھلسانا ہے چنگیزی۔ مجھے نہ روک۔ مجھے روح کو جھلسانا ہے۔" اس کا چہرہ' بال اور شرٹ بھیگنے لگی تھی۔ زیان نے سارا گلاس اپنے اوپر خالی کردیا۔ پھر اسے دیکھنے کے بعد فرش پر دے مارا۔ چنگیزی گھبرا کر پیچھے ہوا۔ خالی جام نے ٹوٹتے وقت بھرپور ماتم کیا تھا۔

"لائٹر پکڑ کر میرے چہرے کے زخموں کو اور جلا دے چنگیزی۔! یہ زخم اتنی جلدی ختم نہیں ہونے چاہئیں۔" زیان نے چلاتے ہوئے حکم دیا تھا اور چنگیزی کو وہ آواز اور وہ چہرہ بالکل اجنبی لگا تھا۔

☆ ☆ ☆
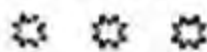
الیکشن ملتوی ہوگئے تھے۔ غیر معینہ مدت کے لیے۔ جیسا کہ سب کو امید تھی اور جس کا اس دن کے ہنگامے کے بعد تو ہونا لازمی ہی تھا۔ وائس پرنسپل کی طرف سے دونوں پارٹیوں کو سخت الفاظ میں وارننگ دی گئی تھی جس پر زیان کے کارندوں نے کافی شور مچایا تھا۔ وہ اپنی پارٹی کے خلاف ایک بھی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا موقف تھا کہ پہل مصباح کے سپورٹرز نے کی ہے۔ بہرحال جو بھی تھا۔ یہ معاملہ ایسا بھی نہیں تھا کہ باقاعدہ بیٹھ بٹھایا جاتا یا نئے سرے سے تحقیقات کرائی جاتیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ غلطی پر کون تھا۔ اس لیے کینٹین میں ہونے والے نقصان کا ہرجانہ دونوں پارٹیوں کو آدھا آدھا بھرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

مصباح نے وہ ہرجانہ خاموشی سے ادا کردیا تھا۔ اس نے نگار سے اس حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنا رہا تھا۔ بے شک نگار نے وہاں کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا تھا۔ اس کی وجہ نگار ہی تھی۔

سرسید احمد خان ہال میں ہوئے جلسے' حسن کے ساتھ اس کی تصویروں والے پوسٹرز اور آخر میں کینٹین والے واقعے نے اس کی تھوڑی بہت عزت کو بھی ختم کردیا تھا۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتی اسے خاص نظروں سے دیکھا جاتا۔ تمسخر کے ساتھ' طنز سے یا کسی

اور طرح سے۔۔۔ اسے دیکھا ضرور جاتا۔ شاید وہ پوری یونیورسٹی کی واحد لڑکی تھی جس کا نام تمام لڑکے لڑکیوں کے علاوہ اسٹاف کو بھی پتا چل گیا تھا۔ اس کے باعث مصباح کی پارٹی بھی بدنام ہوئی تھی۔

گروپس کے نظریوں کے ساتھ ساتھ رویے بھی بدلے تھے۔ مصباح نے اس سے بات کرنا بند کی ہوئی تھی۔ وہ اندر سے سخت ناراض تھا۔ یہ بات نگار جانتی تھی۔

زیان کا کچھ اتا پتا نہیں تھا وہ پچھلے دس دنوں سے غائب تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے سپورٹرز بھی پریشان تھے۔ تاہم اس کی غیر موجودگی میں سارے کام سدیم، ریشب، آصفہ اور وجیہہ بخوبی سنبھال رہے تھے۔ خود مصباح کو بھی زیان کا انتظار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے اسے خوش اسلوبی سے ختم کردیا جائے۔ گزرے وقت کو کوئی واپس تو نہیں لاسکتا تھا لیکن آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کرلینے سے یقیناً" بہتری ہوسکتی تھی۔ مصباح اپنے سپورٹرز کی طرف سے کیے جانے والے جھگڑے پر معافی مانگنے کو بھی تیار تھا لیکن زیان کے اتنے دنوں کی عدم موجودگی نے اس معاملے کو مزید پیچیدہ کردیا تھا۔ سدیم اور ریشب بھی اس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر تھے۔

پھر گیارہویں دن وہ نگار کو نظر آیا۔

اپنی اسائنمنٹ کی فائل تھامے وہ سائنس بلاک کی پچھلی طرف سے نکل کر پارکنگ والے حصے سے باہر جارہی تھی جب کسی ہاتھ نے اسے اندر کھینچ لیا۔ سائنس بلاک کی بیرونی دیواروں کو خوب صورتی کے لیے قدرے باہر کو نکال کر گولائی کی شکل میں موڑا گیا تھا۔ زیان انہیں گولائیوں میں سے ایک کے اندر چھپا ہوا تھا۔ نگار کو اندر کھینچ کر اس نے ایک نم رومال اس کی ناک پر رکھا تھا۔ کلوروفام کی عجیب کڑوی سی خوشبو اس کی سانسوں میں گھلی تھی اور اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ آنکھیں پھاڑے روشنی میں اس نے زیان کو دیکھا اور ہر بات اس پر واضح ہوگئی۔

اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ اور پاؤں چلائے لیکن زیان کے غصے اور مردانگی کے آگے وہ بے بس اور کمزور تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن نے کام کیا اور اس نے پاؤں اٹھا کر اپنے جوتے کی ہیل زیان کی ٹانگ پر دے ماری۔ جو اس کی پنڈلی پر بری طرح لگی تھی۔ زیان کراہ کر پیچھے ہوا تھا۔ نگار نے ناک پر سے رومال ہٹا کر مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ درد سے تڑپتا زیان جھٹکے سے پھر اس کے قریب ہوا اور اس بار اس نے اپنی کلائی نگار کی گردن پر رکھی۔۔۔ اسے دیوار سے لگایا اور کلائی کو اس کی گردن پر دباتا چلا گیا۔

"تم ایک گھٹیا خون ہو۔" نگار بمشکل بولی۔ "ایک بدکار عورت کے بدکار بیٹے۔۔۔ تم سے ایسی فعل کی امید تھی مجھے۔" نگار چپ نہیں رہی تھی۔ اس نے کانٹے دار جملے اس کی طرف اچھالے تھے۔

زیان نے دانت پیس کر جھٹکے سے پھر زور بڑھایا تھا۔ اسے اس لڑکی پر مزید غصہ آیا تھا جو کسی صورت زیر ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

"آج کے بعد زمانہ تمہیں بتائے گا کہ کون گھٹیا ہے۔" اس کے مضبوط ارادے اس کی زبان سے نکلے۔

"اچھا کیا واقعی۔۔۔؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ طنزیہ ہنسی' اس کے سوال میں تمسخر تھا۔ زیان کو مزید جوش آیا۔

"اتنا کمزور سمجھ لیا ہے تم نے مجھے۔"

"تم کتنی مضبوط ہو آج کے بعد پتا چل جائے گا۔" وہ بھی غصے سے غرایا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور دونوں جانتے تھے کہ وہ دونوں کیا ہیں۔ اچانک نگار نے منہ نیچے کرکے زیان کی کلائی پر دانت گاڑ دیے تھے۔ پوری طاقت سے۔۔۔ وہ تڑپ کر چلایا تھا۔ پھر پیچھے ہوا تھا۔

تب ہی باہر سے ایک سیٹی کی آواز آئی۔ نگار اس اشارے کو خوب سمجھی تھی۔ زیان کو دھکا دے کر وہ باہر کی طرف لپکی۔ زیان نے تیزی سے اسے پھر قابو کرنا چاہا تھا۔

وہ گولائی والے حصے سے باہر نکل آئی۔ زیان نے

اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سدیم اور یشب بھی قریب کھڑی گاڑی میں سے باہر نکل آئے تھے۔ جس کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں نگار کے اس طرح باہر نکل آنے پر حیران تھے۔ نگار سے اپنا ہاتھ۔ چھڑایا نہ گیا تو اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی فائل کھینچ کر زیان کے منہ پر دے ماری تھی۔ کاغذ نکل کر ہوا میں بکھرے تھے۔ زیان جیسے اب ہر حملے کے لیے تیار تھا۔ وہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا نہ سکی۔ زیان اسے زبردستی کار کی طرف لے کر جا رہا تھا تب ہی وہ چلانے لگی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب۔۔۔؟" پروفیسر صغیر ربانی کی آواز گونجی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ ضعف عمری کے باعث ان کا وجود لڑکھڑانے لگا تھا۔ حیرت سے وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگے۔ زیان نے نگار کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں۔۔۔ یہاں کیا ہو رہا تھا۔" وہ کسی حد تک تیز لہجے میں بولے۔

"سر! یہ میرے ساتھ بدتمیزی۔۔۔"

"سر یہ دیکھیے! اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔" غصے کے باعث زیان کے منہ سے الفاظ پورے نہیں نکل رہے تھے۔ اس نے اپنی کلائی آگے کر کے پروفیسر کو دکھائی۔ جس پر نگار کے دانتوں کے بڑے واضح نشان تھے۔ پروفیسر صغیر ربانی نگار کو دیکھنے لگے۔

"یہ سچ کہہ رہا ہے نگار؟"

"سر۔۔۔ یہ۔۔۔"

"نگار! تم معافی مانگو۔۔۔ اسی وقت زیان سے۔" پروفیسر نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا تھا۔

"سر لیکن۔۔۔" وہ حیرانی سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔

"میں کہہ رہا ہوں معافی مانگو تم اسی وقت زیان سے۔" نگار نے غصے سے زیان کو دیکھا تھا۔ زیان بھی ان ہی تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے ہلکے سے کہہ دیا۔ وہ طنز سے مسکرایا۔

"مجھے سنائی نہیں دیا۔"

"آئی ایم سوری۔" وہ چلائی تھی۔

"زیان بیٹا! اب تم گھر جاؤ۔ خون گرم ہو تو غلط فہمیاں آگ بننے میں وقت نہیں لگاتیں۔۔۔ لیکن نگار نے تم سے معافی مانگ لی ہے۔۔۔ تو اب تم بھی اسے معاف کر دو۔" پروفیسر صغیر ربانی نے پیار سے کہا تھا۔

زیان ایک لمحے نگار کو گھورتا رہا تھا پھر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ نگار کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا سر۔۔۔ غلطی اس کی تھی۔" زمین سے کاغذ اکٹھے کر کے وہ فائل میں رکھتے ہوئے پروفیسر سے شکوہ آمیز لہجے میں بولی۔

"مجھے خوب علم ہے کہ غلطی کس کی تھی۔۔۔ تم نے دیکھا نہیں اس کی آنکھوں کو۔ انتقام کا کالا موتیا آنکھوں میں اتر آئے تو بہت زیادہ خون بہا دا کرنا پڑتا ہے۔ سمجھیں؟" نگار نے بے یقینی سے اپنے ہر دل عزیز پروفیسر کو دیکھا۔

وہ تجربہ کار تھے۔ صحیح بات کہہ رہے تھے۔ جو اپنی بے عزتی کا ملال تھا وہ اسی بات نے دل سے نکال دیا۔

"آج میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑنے چلوں گا۔" وہ بولے۔

"جیسا آپ کہیں۔" نگار نے گردن جھکا کر اپنی رضامندی ظاہر کی اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"تم گھٹیا خون ہو۔"

"ایک بدکار عورت کے بدکار بیٹے۔" ان جملوں کی بازگشت کافی دیر سے کمرے میں گونج رہی تھی۔ زیان نے کھڑکیوں کے پردے نوچ ڈالے تھے۔

"نگار۔" شعور میں ہوتی بازگشت سے کہیں زیادہ تیز آواز میں وہ چلایا تھا۔ شیلف میں رکھے مہنگے ڈیکوریشن پیسز کو اس نے ہاتھ مار کر توڑ ڈالا تھا۔ کرسٹل ٹیبل۔ ٹی وی کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ٹوٹتی چیزوں کا شور تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔

"مالک۔" چنگیزی بھاگا بھاگا کمرے میں آیا۔ ایک صرف اس کی ہی ہمت تھی زیان کے کمرے میں آنے

کی۔ زیان نے اسی وقت کرسٹل کا واحد گلدان کھڑکی کے شیشے پر دے مارا تھا۔ اور شور کان پھاڑ دینے والا تھا۔ پھر زیان دھم سے بیڈ پر گرا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام پکڑ لیا۔

چنگیزی تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا پھر باہر نکل گیا۔

گلناب عالم اپنی دوستوں کے ساتھ تھائی لینڈ کے ٹور پر گئی ہوئی تھیں۔ پانچ دن بعد ان کا فون آیا تو چنگیزی نے انہیں ساری بات بتادی تھی۔

"کیا ہوا زیان کو۔" وہ بری طرح گھبرا گئیں۔

"پتا نہیں۔۔۔ بس آپ جلدی سے آجائیں بیگم صاحب۔ چھوٹے مالک اپنے حواس میں نہیں ہیں۔" چنگیزی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ اور گلناب عالم اگلے ہی دن چلی آئیں۔

زیان اپنے بیڈ پر اپنے دونوں بازو لپیٹے ان میں اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔

"زیان! میرے بیٹے! کیا ہوا؟" گھبراہٹ، پیار اور بے چینی سے بولتی گلناب عالم اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ زیان نے بازوؤں میں چھپا چہرہ نکال کر انہیں دیکھا تھا۔ اور پھر اپنے چہرے کا رخ بدل لیا تھا۔ گلناب عالم نے جینز کے اوپر تنگ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اور اس طرح ایک دم سے بیٹھتے وقت ان کے اوپر کا ایک بٹن کھل گیا تھا۔ زیان کے رخ بدلے چہرے کی وجہ کو جان کر وہ جھجک کر رہ گئیں۔

"چنگیزی! رفعت سے کہو وارڈ روب سے میری شال لائے۔" جتنی دیر شال کو انہوں نے اپنے گرد لپیٹ نہ لیا وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا۔ وہ اپنے بیٹے کی ماں تھیں یا دوست وہ سمجھ نہ سکیں۔ یا اس ملے جلے رشتے نے کسی ایک رشتے کو بھی صحیح سلامت نہ رہنے دیا تھا۔ وہ سوچنے لگیں۔

"زیان بتاؤ۔۔۔ تمہیں کیا ہوا ہے میری جان۔۔۔" انہوں نے اسکا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ زیان مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اپنا رنگ اور خوشبو سب کھو چکا تھا۔

"تمہارے چہرے پر یہ نشان کیسے ہیں؟ مجھے بتاؤ زیان! ان دنوں میں کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے؟" وہ خلاؤں میں دیکھنے لگا۔

"مجھے محبت ہو گئی ہے ممی۔۔۔!" اس نے انکشاف کیا۔ گلناب عالم حیرت سے اسے دیکھتی رہیں۔

"کون ہے وہ۔ جس نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ اس کا نام بتاؤ مجھے۔"

"آپ اس کے گھر جائیں گی نا ممی۔ میری خاطر۔"

"ہاں۔۔۔ میں جاؤں گی میری جان ضرور جاؤں گی۔ بتاؤ مجھے کون ہے وہ۔۔۔؟ کہاں رہتی ہے۔۔۔ مجھے اسے خریدنا بھی پڑا تو میں تمہارے لیے اسے خرید لاؤں گی۔"

"وہ ہماری پرانی ملازمہ کے محلے میں رہتی ہے ممی۔ نگار نام ہے اس کا۔" زیان نے کہتے ہوئے اور نگار کے بارے میں مزید بتاتے ہوئے اپنا چہرہ گلناب عالم کے سینے میں چھپا لیا۔

٭ ٭ ٭

یونیورسٹی میں ہونے والے الیکشن کی نئی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ اور تیاریاں پھر زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں۔

مصباح نے پوسٹر بنانے کا کام نگار سے لے کر زارا کے حوالے کر دیا تھا۔ نگار کے حوالے سے ایک تجربہ ہی اس کی پابندی کے لیے کافی تھا۔ نگار نے اس حوالے سے احتجاج نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ فیصلہ صرف مصباح کا نہیں بلکہ باقی تمام سپورٹرز کا ہے۔ وہ دوسری سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی تھی۔

سائنس بلاک کے باہر ہوئے واقعے کے بارے میں اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ پروفیسر صغیر ربانی کو بھی اس نے منع کر دیا تھا کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائیں۔ اس دن کے بعد سے وہ روز ہما یوں کے ساتھ یونیورسٹی آنے جانے لگی تھی۔ زیان کے حوالے سے یہ بات جان کر اسے تھوڑی حیرت ہوئی تھی کہ وہ الیکشن سے

دستبردار ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ اب یشب مصباح کے مدمقابل الیکشن میں کھڑا تھا۔ اس کی وجہ جو بھی تھی اس سے نگار کو یا کسی بھی سپورٹر کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ دونوں طرف کی اپنی اپنی تیاریاں جاری تھیں۔

اوپر تلے کے جو دو واقعات ہوئے تھے اس نے دونوں طرف کے ماحول کو کافی گرم کر دیا تھا۔ مصباح صلح جو نرم مزاج کا مالک لڑکا تھا۔ لیکن اس کے سپورٹر ایسے نہ تھے۔ اور ان ہی باتوں کی وجہ سے حالات ایسی کروٹ لے چکے تھے کہ الیکشن سے پہلے کچھ بھی اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے تک نگار یقینی طور پر مصباح کی جیت کے لیے پرامید تھی۔ لیکن اب وقت جیسے بدل چکا تھا۔ اب اگر ترازو زیان کی پارٹی کی طرف کا وزنی نہیں تھا تو جھکا ہوا مصباح کی طرف بھی نہیں تھا۔

ان ہی باتوں کو سوچتے سوچتے وہ گھر آئی تھی۔ جب اس نے گھر کی فضا میں کچھ نیا پن محسوس کیا تھا۔ برآمدے میں لگے جالی دار پردے کے پیچھے سے آتی تیز خوشبو اور مہذب نسوانی آواز نے جیسے اسے خوش آمدید کیا تھا۔ وہ تھکی ہوئی تھی اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی پر زلیخا بی نے آواز دے کر اسے وہیں روک لیا۔

"نگار بیٹی ادھر آجاؤ۔" انہوں نے پیار سے پکارا تو وہ ادھر چلی گئی جہاں گلناب عالم عین دوپہر کے سورج کی طرح روشن ان کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ نگار کو ہزار میگاواٹ کا جھٹکا لگا۔

"ادھر میرے پاس آؤ بیٹی۔" گلناب عالم نے نگار کو پیار سے اپنے قریب بلایا۔

مگر وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ کمرے میں نگار کے والد محمد خدایار بھی بیٹھے تھے۔ نگار نے حرکت نہ کی تو زلیخا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اسے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آہستگی سے ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

گلناب عالم نے شیفون کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اور پلو کو کندھوں پر لپیٹ لینے کے باوجود بھی ان کے عریاں بازو اور پیٹ نمایاں ہو رہا تھا۔ محمد خدایار نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی۔۔۔" انہوں نے نگار کی تعریف کی۔ نگار نے سوالیہ نظروں سے زلیخا بی کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پر کسی اور ہی خوشی کی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"پھر میں ہاں ہی سمجھوں بھائی صاحب۔" وہ محمد خدایار سے مخاطب ہوئیں۔

"جی۔ جی۔۔ کیوں نہیں۔۔۔" زلیخا بی جلدی سے بولیں تو محمد خدایار نے انہیں ٹوکا۔

"ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں بیگم صاحبہ۔" نگار کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس کی چھٹی حس نے خطرے کا اعلان کر دیا تھا۔

"پلیز مجھے بیگم صاحبہ تو نہ کہیں۔" وہ ہنسیں۔ "مجھے جواب "ہاں" میں ہی چاہیے" اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اب اجازت دیں" باقی سب بھی اٹھے تھے۔

"میں دو دن بعد پھر آؤں گی۔" انہوں نے جاتے جاتے پھر آگاہ کیا۔ زلیخا بی انہیں چھوڑنے باہر تک گئی تھیں۔ اور محمد خدایار نگار کو دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

"یہ کس لیے آئی تھیں امی؟" اس نے کانپتی آواز سے زلیخا بی سے پوچھا۔ جیسے واقعی وہ کچھ بھی نہ سمجھی ہو۔

"تیرا رشتہ مانگنے۔۔ اپنے بیٹے زیان کے لیے۔" زلیخا بی نے اس کا ہاتھ دبا کر خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے اس کے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی میں نیوکلیئر بم پھوڑا تھا۔ نگار چکرا کر گرتے گرتے بچی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صوفیہ امجد

جگنو یادوں کے

جہاز چند منٹوں میں لینڈ کرنے والا تھا اور میرے احساسات و جذبات میں تلاطم سا برپا تھا' جب تک جہاز نے کراچی ائیرپورٹ پر لینڈ نہیں کیا میں یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ڈولتی رہی۔ گزشتہ بیس روز میں تین مرتبہ موسم کی خرابی کے باعث فلائٹ کینسل ہوئی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وطن جانا اور اپنوں سے ملنا میرے مقدر میں نہیں ہے۔

شادی کے تقریباً" دو سال بعد ہی مزید حصول علم کی خواہش احسن کو نیویارک کھینچ لائی تھی' میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ نائن الیون کا سانحہ رونما ہو گیا اور حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ وطن واپسی محال ہو گئی۔ کافی عرصے بعد حالات میں بہتری پیدا ہوئی۔ کئی مرتبہ پاکستان جانے کا قصد کیا' مگر ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو گئی۔ میں نے بارہ

سال اپنوں سے دوری کا درد سہا تھا۔ تمام تر آرام و آسائش کے باوجود زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا اور اب۔ جبکہ میں نے وطن کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا تو اس وقت مجھ پر ایک ہیجانی سی کیفیت طاری تھی۔

"پتا نہیں اپنی زندگی میں تمہیں دیکھنا نصیب ہوگا کہ نہیں۔" امی کا مایوس لہجہ بار بار میری سماعت سے ٹکراتا اور مجھے رلاتا رہا تھا۔

جہاز سے اتر کر ائیرپورٹ کی عمارت میں داخل ہونے تک اور وہاں سے نکل کر باہر گاڑی میں بیٹھنے تک میں عجیب احساسات سے دوچار رہی۔ تین مرتبہ سب کو مایوس کرنے کے بعد اس دفعہ ہم نے کسی کو اپنی آمد سے مطلع نہیں کیا تھا اور سرپرائز دینے کی ٹھانی تھی۔

احسن نے ایک ٹیکسی ہائر کرلی تھی' میں نے اس میں بیٹھنے کے بعد سکون کا طویل سانس لیا اور فضا میں رچی مانوس خوشبو کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی' مجھے اپنے رگ وپے میں خوشی کی لہریں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور ایک مسرت آمیز احساس تھا جو میرے وجود پر غالب آگیا تھا۔ میں نے گاڑی کا شیشہ نیچے کرکے ارد گرد نظریں دوڑائیں۔ صاف ستھری کشادہ سڑکیں' فلائی اوورز اور بلند و بالا پلازہ دیکھ کر مجھے خوش گوار سی حیرت نے آلیا تھا۔

"کراچی میں تو بہت تبدیلی و ترقی کے آثار نظر آرہے ہیں بھئی۔" احسن نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ جگہ جگہ کھلے ہوئے ریسٹورنٹ جدید شاپنگ مالز اور خوش باش لوگ ہمیں حیران کیے دے رہے تھے۔

"یہ وہ کراچی تو نہیں ہے' جس کی تصویر ہمیں مغربی میڈیا دکھاتا رہتا ہے۔" میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

"واؤ۔" میرے بیٹے حذیفہ نے سامنے دیکھتے ہوئے ایک مسرت آمیز چیخ ماری۔ "مام! یہاں تو میکڈونلڈ اور کے ایف سی بھی ہے' میں تو سمجھ رہا تھا صرف ایسٹرن فوڈ ہی کھانا پڑے گا۔" اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔

سب سے زیادہ اچنبھا مجھے بیوٹی پارلرز کے بورڈز دیکھ کر ہوا جو ہر گلی اور ہر موڑ پر لگے ہوئے تھے' میں جب یہاں سے گئی تھی تو بیوٹی پارلر خال خال ہی ہوا کرتے تھے اور ہر ایک کی دسترس میں بھی نہ تھے' میں نے بھی ضد کرکے بیوٹیشن کا کورس کرلیا تھا اور اس کے بعد جو میری شامت آئی وہ الگ ہی کہانی تھی۔ وہ سب سوچ کر میں بے اختیار ہی مسکرانے لگی۔

بے شمار خوش کن و خوش گوار یادیں اس وقت کے ساتھ وابستہ تھیں۔ یادوں کا در اچانک ہی وا ہوگیا تھا اور گزرے لمحے آ آکر میرے دامن سے لپٹنے لگے تھے' میں نے بھی سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلی تھیں اور خود کو ان یادوں کے سپرد کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مسلسل دروازے کی گھنٹی بجنے پر صباحت نے دروازہ کھولا تو سامنے والی آنٹی کا بیٹا دانت نکالے کھڑا تھا۔

"وہ جی یہ۔ سویلا امی نے خاص طور پر ملاحت باجی کے لیے بھیجا ہے۔" صباحت کے گھورنے پر اس نے بڑبڑا کر ڈش اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ "امی کہہ رہی تھیں بہت دن ہوگئے ملاحت باجی نے چکر نہیں لگایا۔ سب انہیں یاد کر رہے ہیں۔ اگر آج یا کل انہیں فرصت ملے تو وہ ضرور۔"

"اچھا بابا اچھا۔ میں تمہارا پیغام تمہاری چہیتی ملاحت باجی تک پہنچا دوں گی۔" ملاحت نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا اور جلدی سے دروازہ بند کردیا۔ اندر آتے ہوئے اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ نکلا تھا۔ میں نے حیرت سے اور امی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور کچن کی طرف چلی دیں۔

"ایک تو میں اس لڑکی کے موقع بے موقع ہنسنے سے عاجز ہوں اتنی بڑی ہوگئی ہے' لیکن سنجیدگی نام کی کوئی

چیز نہیں ہے اس میں۔" ان کی بھرواہٹ کچن سے بھی سنائی دے رہی تھی۔
"کیا زعفران کا کھیت دیکھ لیا ہے۔ جو ہنسی تھمنے میں نہیں آرہی ہے۔" آخر میرا ضبط بھی جواب دے گیا۔
"بات ہی کچھ ایسی ہے۔ اس ہفتے یہ تیسری ڈش ہے۔ جو محلے سے اسپیشلی تمہارے لیے آئی ہے۔ دو دن پہلے پڑوس سے جو انڈوں کا حلوہ آیا تھا وہ بھی تمہارے لیے تھا اور اس سے پہلے رضوانہ آنٹی کے یہاں سے کباب بھی تمہاری محبت میں ہی آئے تھے اور اب یہ مٹر پلاؤ۔ اس تاکید کے ساتھ کہ اللہ رخ روشن تو ضرور چکھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یک بیک یہ اہل محلہ کو تم سے اتنی محبت کیسے ہوگئی۔ ان سب کے یہاں تو کوئی لڑکا شادی کے لائق بھی نہیں ہے۔" اب وہ معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔
"اف میرے خدا! صباحت کیا تم سچ کہہ رہی ہو اس ڈش کے ساتھ کیا میرا بلاوا بھی آیا ہے۔"
"جی جناب لو بھی بصد اصرار۔"
"اوہ" میں نے پریشانی سے سر پر ہاتھ مارا اور کرسی پر ڈھے گئی۔ "یہ سب اس بیوٹیشن کورس کا نتیجہ ہے۔ جو میں نے ابھی مکمل کیا ہے۔" میں بھی کہوں یہ آخر اہل محلہ یک بہ یک مجھ پر مہربان کیسے ہوگئے۔ "لیکن انہیں پتا کیسے چلا۔" میں ابھی تک حیران تھی۔

"بھئی تم دونوں کی باتیں ختم ہوں گی یا نہیں۔ رافع کالج سے آتا ہی ہوگا' جلدی سے روٹی ڈال دو۔" امی کی آواز سنتے ہی میں نے کچن کا رخ کیا اور صباحت ٹیبل پر رکھی ہوئی ڈش کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆ ☆ ☆
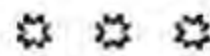
میں اسکول سے بھنائی ہوئی آئی تھی۔ گریجویشن کے بعد میں نے کچھ کورسز کرلیے تھے اور اب ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔
"آخر ہوا کیا ہے۔" صباحت نے سلاد کی پلیٹ ٹیبل پر رکھتے ہی میرے سرخ چہرے کی طرف دیکھا۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر پینے لگی۔
"تھوڑا سر پر بھی ڈال لو' افاقہ ہوگا۔" اس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔
"حکومت۔۔۔ اس سدرہ کی بچی کو تو میں اچھی طرح دیکھ لوں گی' سارا کیا دھرا اسی کا ہے۔"
"بھئی اس کا قصور کیا ہے۔"
"صرف اسی کو پتا تھا کہ سلائی کے کورس کے ساتھ میں نے بیوٹیشن کا کورس بھی کیا ہے۔ اسی نے سارے محلے کو اطلاع پہنچائی ہے۔ ویسے بھی اسے گھر گھر جھانکنے کی عادت ہے' لیکن اس کا بھی کیا قصور' ساری خطا تو میری ہے۔ نہ میں کورس کرتی نہ میری شامت آتی۔" میرا غصہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔
"آج کوئی خاص واقعہ پیش آیا کیا؟" وہ کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔
"ایسا ویسا؟ وہ جو محترمہ ہیں نا' وہی جو کونے والے گھر میں رہتی ہیں۔ بھئی جن کا بیٹا رافع کے ساتھ پڑھتا ہے۔"
"اچھا اچھا مسز فاروق' وہ تو خاصی نک چڑھی سی خاتون ہیں۔ محلے والوں سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتیں اور جب سے انہوں نے ڈبل اسٹوری مکان بنوایا ہے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔"

"جی ہاں۔۔۔ وہی مغرور خاتون ایک ہفتے سے اپنی مسکراہٹ کے پھول نچھاور کررہی تھیں مجھ پر' جب بھی اسکول سے واپسی پر دیکھتی' گیلری میں کھڑی ہیں اور مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی ہیں' میں تو ان کی خوش مزاجی کی قائل ہو چلی تھی کہ آج اس مسکراہٹ کا راز فاش ہوگیا۔" میں بہت جل جل کر اسے بتارہی تھی۔
"پتا ہے جب میں اسکول سے گھر آرہی تھی تو انہوں نے راستے میں ہی مجھے چھاپ لیا اور اپنے گھر چلنے پر اصرار کرنے لگیں' فرمارہی تھیں محلے والوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے انہیں ایک دوسرے کے

یہاں آتے جاتے رہنا چاہیے۔ میل جول سے محبت بڑھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اچھا۔ پھر کیا ہوا۔" صباحت کی حیرت بجا تھی۔

"ہونا کیا تھا ان کے اصرار پر چاروناچار مجھے جانا پڑا۔ پہلے تو محترمہ نے پانی میں روح افزا گھول کر پلایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر بالآخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔"

"یعنی۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"انہیں اپنے حسن کی نگہداشت کے لیے میری خدمات درکار تھیں وہ بھی بلامعاوضہ۔ پڑوسیوں کے حقوق کی بنیاد پر۔ عمر دیکھو اور چونچلے دیکھو۔" میں نے تپ کر کہا۔

"ارے احمق! اسی عمر میں تو زیادہ ضرورت ہوتی ہے اچھا نظر آنے کے لیے دس جتن کرنے پڑتے ہیں۔" اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

"ویسے اس میں اتنا ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارا تو غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ امی ٹھیک کہتی ہیں تم سسرال جاکر کیا کرو گی۔" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"بھئی میں تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ یہاں زیادہ تر لوگوں کا تعلق تو متوسط طبقے سے ہے۔ جو ظاہر ہے پارلر کے اخراجات افورڈ نہیں کرسکتے۔ کبھی کبھار کی بات اور ہے۔ شادی بیاہ یا اہم تقریبات پر تو انسان گنجائش نکال ہی لیتا ہے۔ لیکن عام دنوں میں تو بندہ بلکہ بندی یہ سوچتی ہے کہ مسکہ پالش سے کام نکل جائے یا ایک آدھ ڈش سے گزارا ہوجائے تو کیا برا ہے۔"

"تو ان کو کس حکیم نے مشورہ دیا ہے ان چکروں میں پڑنے کا۔" میرا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

"بھئی آخر ان کا بھی دل ہے ان کے بھی جذبات ہیں۔ دل امیر کا ہو یا غریب کا بوڑھے کا ہو یا جوان کا دل تو دل ہی ہوتا ہے نا سسٹر۔"

"اچھا آپا جان! اپنا لیکچر بند کرو اور اچھی سی چائے پلاؤ۔ سر پھٹ رہا ہے درد سے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا' وہ مسکرا کر چائے بنانے چل دی۔

☆ ☆ ☆
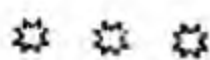
"تمہاری خالہ رابعہ کا دو مرتبہ فون آچکا ہے حیدر آباد سے کہہ رہی تھیں ہفتہ بھر رہ گیا ہے شادی میں اور بچیاں ابھی تک نہیں پہنچیں۔ نورین اکیلی ہی ہلکان ہورہی ہے۔" میں اور صباحت ٹی وی دیکھ رہے تھے جب امی نے آکر ہمیں بتایا۔

"امی میرے دوپٹے رنگ کر آگئے؟ میں نے آپ کو رسید دی تھی۔"

"اور میری شرٹس بھی تو ٹیلر کے پاس پڑی ہیں۔" صباحت کو بھی یاد آگیا تھا۔

"بھئی یہ رافع تو کسی کام کا نہیں ہے۔ ہر کام آج کل پر ٹالتا رہتا ہے۔" امی کے لہجے میں ناراضی تھی۔

"اسے اپنے دوستوں سے فرصت ملے تو وہ ہمارا کوئی کام کرے نا۔" میں نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

"آپ لوگ کیا میرے بارے میں کچھ ارشاد فرمارہے ہیں؟" رافع نے انجان بن کر پوچھا۔ وہ ابھی ابھی کمرے سے برآمد ہوا تھا۔

"جی نہیں۔ آپ کے فرشتوں کے بارے میں بات ہورہی ہے۔" صباحت نے جل کر جواب دیا۔

"ہائی وا وے خواتین! آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔" اب وہ پوری طرح ہماری طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"مسئلہ نہیں مسائل۔ ہمارے کتنے ہی کام بیچ میں اٹکے ہوئے ہیں اور تمہیں فرصت میسر نہیں ہے۔ امی کے جوڑوں کے درد کی وجہ سے تو ہم مجبور ہوگئے ہیں۔" صباحت نے دہائی دی۔

"میرے تو بس کا نہیں ہے دکان دکان تمہارے ساتھ پھرتی پھروں۔ رافع! تم کل وقت نکال کر بہنوں کو بازار لے جانا اور تم لوگوں کو بھی بازار جاکر زیادہ مٹر گشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' جلدی جلدی کام نمٹاؤ اور تیاری مکمل کرلو تو سمیع ایک دو دن میں آکر

تمہیں لے جائے گا۔ میں تو وقت پر ہی آسکوں گی ورنہ تمہارے ابو اور بھائی کو جانے میں کی پریشانی ہو گی۔"

امی نے کسی کو بولنے کا موقع دیے بغیر معاملہ نبٹا دیا تھا اور فہ بھی خلافِ توقع راضی ہو گیا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہم دونوں شادی میں پہننے کے لیے کپڑے ڈسکس کرنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اچھا ہی ہوا جو میں نے اسکول سے زیادہ دن کی چھٹیاں لے لی تھیں۔ اب دیکھو' دو دن ہو گئے ہیں شادی سے آئے ہوئے لیکن لگتا ہے ابھی بھی تھکن نہیں اتری۔" میں نے کپڑے ہینگر میں لٹکاتے ہوئے کہا۔ میں صبح اسکول جانے کے لیے کپڑوں پر استری کررہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ لیکن مزا بہت آیا کتنے عرصے بعد ہم نے کوئی شادی اٹینڈ کی تھی اور بھئی میں تو تمہاری مشاقی اور مہارت کی قائل ہو گئی' کیا ہاتھ چلتے ہیں تمہارے اور کیا جادوگری ہے۔ واہ بھئی واہ۔" صباحت نے رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے مکمل کرداد دی۔

"جی ہاں! یہ جادوگری خدمتِ خلق کرکے پیدا ہوئی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی کو میری ضرورت پیش آجاتی ہے اور ہم ٹھہرے مروت کے مارے' انکار تو ہم سے ہوتا نہیں' پھر ہاتھ تو رواں ہونا ہی تھا۔"

"نورین کو دیکھ کر تو کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اسے گھر پر تیار کیا گیا ہے۔ سب ہی پوچھ رہے تھے کہ کون سے پارلر سے تیار ہوئی ہے دلہن۔"

"ہاں اُسے تو میں نے بہت دل لگا کر تیار کیا تھا۔ ساری مہارت جھونک دی تھی سمجھو۔ اور پھر اس کے نقوش بھی تو بہت خوب صورت ہیں نا۔ لیکن غصہ تو مجھے ان دو جن بھر چڑیلوں پر آرہا تھا جو میری جان کو چمٹ گئی تھیں۔ کسی کو بھنویں ادھڑوانی تھیں' کسی کو مونچھیں صاف کرانی تھیں تو کسی کو پر فیشیل کروانے تھے

توبہ توبہ سب کو ہری ہری سوجھنے لگی تھی۔" مجھے پھر سے غصہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

"اوہو۔۔۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں اور پھر

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

والا حساب ہوتا ہے ایسے موقعوں پر" صباحت نے میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ویسے ایک بات ہے ملاحت' تمہاری کارکردگی دیکھتے ہوئے ایک خیال آیا ہے میرے ذہن میں بلکہ یوں کہنا چاہیے زبردست آئیڈیا ہے۔" اس کی آنکھوں سے شرارت عیاں تھی۔

"پھوٹو منہ سے لیکن کوئی فلاپ آئیڈیا نہ دینا۔" میں نے بھی تھوڑی سی دلچسپی ظاہر کی۔

"دیکھو' عید قریب ہے یہی کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوگا عید میں تم ایسا کرو مروت کو بالائے طاق رکھ کر سجنے والوں کے لیے عید پیکج کا اعلان کردو۔

"عید پیکج۔"۔۔۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ارے بے وقوف' عید کے موقعے پر دکانداروں سے لے کر پارلر والے تک سب ڈسکاؤنٹ عید پیکج اناؤنس کرتے ہیں تم بھی کردو۔ تمہارے چارجز کا چارٹ کچھ اس طرح ہونا چاہیے آئی بروز کے لیے ایک ڈش دہی بڑے' نارمل فیشل کے لیے شامی کباب کم از کم بارہ عدد' تھریڈنگ کے لیے کسٹرڈ ٹھیک رہے گا۔

ہینڈ کٹنگ کے لیے چکن سموسے مناسب رہیں گے اور مینی کیور اور پیڈی کیور کے لیے۔۔۔"

باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے میں نے قریب رکھا ہوا ہینگر اسے کھینچ مارا تھا۔

"ٹھہرو میں ابھی بتاتی ہوں تم کو اور تمہارے پیکج کو۔" میں نے یکے بعد دیگرے اس کو چیزیں کھینچ کھینچ کر مارنا شروع کردی تھیں میرے ہاتھ میں جو آرہا تھا میں بے دریغ اس پر پھینکتی جارہی تھی اور وہ بوکھلا

بوکھلا کر میرے حملوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بولنے سے پھر بھی باز نہیں آرہی تھی۔

"ارے ارے' اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی حتمی فہرست تھوڑی ہے۔ تم چاہو تو اپنی پسند کی ڈشیز شامل کر سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم غور تو کرو میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ تم افطاری بنانے کی زحمت سے بچ جاؤ گی۔"

ہم دونوں کو بریک اس وقت لگا جب اچانک ہی ابو کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ ایک تکیہ اڑتا ہوا ان کے قدموں میں جا گرا تھا۔ انہوں نے جھک کر تکیہ اٹھالیا اور حیرت سے ہم دونوں کی جانب دیکھا۔

"یہ... کیا ہے بیٹا؟" انہوں نے کمرے کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے سوال کیا جو کسی میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دشمن شکست کھا کر بہ عجلت تمام فرار ہو گیا ہے اور مال غنیمت جا بجا بکھرا پڑا ہے۔

"وہ ابو... میں... یہ... دراصل' ہم دونوں سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر صباحت نے ہی اپنے حواس بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ابو دراصل میں نے اسے ایک مشورہ دیا تھا جو غالباً" اسے پسند نہیں آیا لہٰذا یہ میری خاطر تواضع کر رہی تھی۔"

"بہت بری بات ہے ملاحت بیٹا... مشورہ کرنا' دینا اور لینا تو بہت اچھی بات ہے۔ ہاں... اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا انسان کا اپنا اختیاری فعل ہے اور پھر... ہر شخص اپنی صوابدید کے مطابق ہی مشورہ دیتا ہے۔ اس میں اتنا غصہ کرنے کی تو کوئی بات نہیں ہے بچے!" وہ بہت پیار سے سمجھا رہے تھے۔ میں شرمندگی اور غصے کی وجہ سے اور صباحت ہنسی ضبط کرنے کے سبب سرخ ہو رہی تھی۔

"ایسا کون سا مشورہ دے دیا تھا تم نے جو ایسے رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔" اب وہ صباحت سے مخاطب تھے۔ اس مرتبہ شرمندہ ہونے کی باری اس کی تھی۔

"بس وہ... کچھ نہیں' بس ایسے ہی ابو۔" اس کی بوکھلاہٹ پر ابو مسکرا دیے تھے۔

"اچھا چلو کمرہ سمیٹو اور سو جاؤ۔ تمہاری امی دیکھ لیں گی تو بہت خفا ہوں گی۔ ویسے بھی کافی رات ہو گئی ہے۔"

"اور ہاں" وہ جاتے جاتے پھر پلٹ آئے تھے۔

"تمہارا رزلٹ کب تک آرہا ہے صبا بیٹے!"

"بس ابو رمضان میں یا پھر عید کے بعد متوقع ہے۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"ہوں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو ہم ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر بے اختیاری ہنستے چلے گئے۔

"ویسے آپس کی بات ہے ہیکچ کچھ اتنا برا بھی نہیں تھا۔" "جی ہاں یہ میری ہی آواز تھی۔"

☼ ☼ ☼

"میں اس لڑکی کی طرف سے سخت پریشان ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب وہ اسکول کی نوکری کو خیرباد کہے اور گھر میں ٹک کر بیٹھے' کچھ گھرداری سیکھے' کچھ سلیقہ پیدا ہو اس میں۔" صباحت امی کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا رہی تھی جب انہوں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"تمہارے چچا نے صمد کے لیے کہا ہے۔ ویسے تو رابعہ بھی دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کر چکی ہے لیکن صاف بات ہے' قریب کے رشتوں میں میں شادی بیاہ کرنے کی قائل نہیں ہوں۔ تعلقات میں کشیدگی سی آجاتی ہے۔ ویسے خاندان سے باہر بھی ایک دو رشتے ہیں تمہارے ابو کی نظر میں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ اب اس کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں تو پھر تمہارے متعلق بھی سوچوں۔"

"امی اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" اس نے مٹر چھیلتے ہوئے جواب دیا۔

"جلدی...!" انہوں نے حیرت سے صباحت کی

طرف دیکھا۔

"پڑھائی ختم کیے اسے سال بھر سے زیادہ ہونے کو آیا ہے۔ اسکول میں پڑھانے کی ضد اس نے پوری کرلی ہے۔ الٹے سیدھے کورس کرکے الگ وقت ضائع کرچکی ہے۔ کیا اب بھی میں اس کے متعلق نہ سوچوں۔" انہیں تاؤ آگیا تھا۔

"امی ایسے تو نہ کہیں، اس نے اسٹیچنگ اور بیوٹیشن کے کورس کیے ہیں اور وہ دونوں ہی کارآمد ہیں۔" اس نے میری حمایت لینے کی کوشش کی تھی اور بعد میں پوری رپورٹ مجھے پیش کرکے داد بھی چاہی تھی۔

"پتا نہیں کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے اس کے کورسز سے، ایک قمیص تک تو سلی نہیں ہے۔ جب سے ابھی نورین کی شادی پر بھی سارے کپڑے درزی کے یہاں سے ہی سل کر آئے تھے اور عید پر بھی مجھے کوئی توقع نہیں ہے کہ وہ کچھ سی کر دکھائے گی، یا تو درزیوں کی چاندی ہوگی یا پھر اللہ مارے سلے سلائے سوٹ آجائیں گے بازار سے۔ یہ سب تمہارے ابو کی دی ہوئی چھوٹ کا نتیجہ ہے۔" امی کچھ زیادہ ہی خفا تھیں۔

"امی اسکول سے تھکی ہاری تو آتی ہے وہ۔ اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن محلے سے بلاوا آجاتا ہے۔" صباحت نے میرا مقدمہ لڑنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

"جب ہی تو کہتی ہوں چھوڑے ان چکروں کو، کچھ کھانا پکانے میں دلچسپی لے، کچھ سینے پرونے میں دیدہ لگائے۔ ہمارے زمانے میں تو لڑکیاں بیسیوں چیزیں تیار کرلیا کرتی تھیں جہیز کے لیے۔" انہوں نے مسالا بھون کر دیگچی میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"امی۔۔۔ آپ بھی کن وقتوں کا ذکر لے بیٹھیں۔ اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے اب تو ہر چیز ریڈی میڈ مل جاتی ہے پھر جان کھپانے سے فائدہ۔ ویسے بھی اب ہاتھ کی ہنرمندی اور کاریگری کون دیکھتا ہے۔ اب تو لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ کپڑے کون سے بوتیک کے ہیں اور سامان پر کسی بڑی شاپ کا ٹیگ ہے کہ نہیں اور یہ چیزیں لوکل ہیں یا امپورٹڈ۔ میری بھولی ماں! اب تو برینڈز کا زمانہ ہے۔" اس نے مٹر کے کچھ دانے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"سچ پوچھیے تو امتحانوں کے بعد دو مہینے سے گھر بیٹھے بیٹھے میں بھی سخت بور ہوچکی ہوں گھر کا کام تو کچھ اتنا زیادہ ہے نہیں میں نے تو پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ پڑھائی کے بعد اپنی پسند کے دو تین کورسز ضرور کروں گی اور موقع ملا تو ملازمت بھی۔" اس نے بڑی ترنگ میں اپنے مستقبل کے منصوبے امی کو بتائے تھے۔

"بس بس۔۔۔ ایک کو بھگت لیا میں نے اب میں تمہیں من مانی کی اجازت نہیں دوں گی، جو کرنا ہے اب اپنے گھر جاکر ہی کرنا۔" ان کا طیش میں آنا لازمی تھا۔

"اپنا گھر۔۔۔؟" صباحت نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "امی! کیا لڑکیوں کا اپنا بھی کوئی گھر ہوتا ہے؟ ایک گھر باپ کا ہوتا ہے ایک شوہر کا ہوتا ہے۔ وہ بے چاریاں تو ساری زندگی "بے گھر" ہی رہتی ہیں۔"

"ہیں ہیں لڑکی۔۔۔ کیا واہی تباہی بک رہی ہو۔ اپنے نادر خیالات اپنے پاس ہی رکھو۔ کیا زمانہ آگیا ہے، بچوں کو کوئی سمجھانے کی بات کرو تو وہ الٹا ہمیں ہی سبق پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ عقلِ کل سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔"

امی کا پارہ ہائی ہوچکا تھا۔ انہوں نے چمچہ اٹھایا اور زور زور سے ہنڈیا میں چلانا شروع کردیا۔ صباحت نے چھلے ہوئے مٹر خاموشی سے ان کے پاس رکھے اور وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ بعد میں یہ پوری روداد اس نے مجھے من و عن سنا کر خاصی تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صائمہ بھابی کے یہاں سے آکر مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی پھر سوچ

سوچ کر ہنسنا شروع کردیتی۔

"تم جب بھی پڑوس سے آتی ہو سخت بھنائی ہوئی ہوتی ہو۔ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو اور آج تمہاری ہنسی تھمنے میں نہیں آرہی۔ مجھے تو لگتا ہے تمہارے "ٹاپ فلور" میں کچھ خلل واقع ہوگیا ہے۔" صباحت نے جھنجلا کر میری طرف دیکھا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے کہ تم بھی سنو گی تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاؤ گی۔" میں نے اسے جواب دیا اور پھر ایک خاص منظر یاد کرکے میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔

"لگتا ہے تم پاگل ہوگئی ہو۔ میں جارہی ہوں۔ رافع کا دوست آیا ہوا ہے۔ اس کے لیے چائے بھیجنی ہے۔"

"سنو تو صباحت' اصل بات تو سنتی جاؤ۔" میں نے اسے پکارا لیکن وہ رکی نہیں اور چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ وہ چائے بھیج کر واپس آئی تو میں صوفے پر اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

"آج میں نے قصہ ہی تمام کردیا۔ اب محلے والوں کو میری یاد نہیں ستائے گی اور ہاں اب نہ ہی میری محبت میں کوئی ڈش بنا کر بھیجے گا۔" میں گویا ہوئی۔

"اصل ماجرا کیا ہے آخر؟ کیوں اتنا سسپنس پھیلا رہی ہو۔" اس نے زچ آکر کہا۔

"تمہیں معلوم ہے صائمہ بھابی نے مجھے بلایا تھا بلکہ کئی دن سے پیغام بھیج رہی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچی تو یہ دیکھ کر میری جان جل گئی کہ انہوں نے اپنی بہن کو بھی بلا کر بٹھا رکھا تھا اور تو اور نائلہ کو بھی کہیں سے سن گن مل گئی' وہ بھی آن دھمکی اور سب نے مجھے ایسے گھیر لیا جیسے مریض ڈاکٹر کو۔ خیر۔ میں نے بھی اس دفعہ ایسا علاج کیا ہے کہ آئندہ انہیں میری ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"اچھا۔ ؟ایسا کیا کردیا تم نے ذرا تفصیل تو بتاؤ۔" اس نے بے تابی کا مظاہرہ کیا۔

"صائمہ بھابی کو بھنو کٹنگ کروانی تھی اپنی جٹھانی کے جیسی۔ ان کی ایک تصویر بھی انہوں نے مجھے دکھادی تھی۔ نائلہ کے سسرال والے "عیدی" لے کر آنے والے ہیں اسے فیشل کروانا تھا۔ بھابھی کی بہن کو آئی بروز بنوانا تھیں اور کچھ ٹپس درکار تھیں اپنے حسن میں اضافے کے لیے جو بے چارہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔"

"اچھا پھر۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا۔ مجھے غصہ تو چڑھا ہی ہوا تھا میں نے ان سب کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے نائلہ کی شامت آئی۔ مساج کے نام پر میں نے اس کے چہرے کو اتنی بے دردی سے رگڑا کہ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ بلیک ہیڈز نکالنے میں تو میں نے اسے رلا ہی دیا اور بھاپ لینے کے لیے اتنی دیر بٹھایا کہ اس کی کمر ہی اکڑ گئی۔ بچاری بار بار پوچھ رہی تھی۔ "کیا بات ہے۔ ملاحت کیا آج غصے میں ہو۔" میں نے کہا نہیں نہیں آج میں تمہارا اسپیشل فیشل کررہی ہوں آخر تمہارے سسرال والے آرہے ہیں ناں۔"

"بہت ظالم ہو تم ملاحت بہت ظالم۔" صباحت نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

"میں ظالم ہوں۔ ؟اور اتنے عرصے سے جو یہ لوگ میرے ساتھ کررہے ہیں وہ ظلم نہیں تھا۔ سب کو مفت کے مزے پڑے ہوئے تھے۔ کم بختوں نے مجھے اپنی فیملی بیوٹیشن سمجھ لیا تھا۔"

"اچھا اچھا' آگے بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا' پھر صائمہ بھابھی کی بہن کا نمبر آیا۔ میں نے بھی بے دلی سے ایسا تھریڈ چلایا کہ اس کی ایک بھنوں کے بیچ میں سے دو حصے ہوگئے یوں سمجھو ایک راستہ بن گیا درمیان میں سے۔"

"اف میرے خدا۔ اور اس نے کچھ نہیں کہا۔"

"وہ کسی پارلر میں بیٹھی ہوتی تو بنانے والی کا منہ نوچ لیتی شاید مجھے اس نے کیا کہنا تھا الٹا میں نے ہی خفگی کا اظہار کیا کہ تمہارا بھانجا اس بری طرح چیخ کر رودیا کہ

میرا ہاتھ بہک گیا۔ شکر ہے بچہ بروقت رویا ورنہ پھر کوئی اور بہانہ بنانا پڑتا۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"ملاحت 'ملاحت! کسی دن پٹ جاؤ گی بری طرح کسی نہ کسی کے ہاتھوں۔" اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ویسے میں نے اس کا علاج بھی اسی وقت کر دیا تھا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ کلٹ کر اس کی آئی برو پر گرا دی تھی۔ یہ لو مسئلہ حل ہو گیا۔ بظاہر تو وہ مسکرا مسکرا کر میرا شکریہ ادا کر رہی تھی لیکن۔۔۔ مجھے یقین ہے دل ہی دل میں اس نے بہت گالیاں بھی دی ہوں گی مجھے۔"

"ملاحت تمہیں خدا سمجھے! تم نے کچھ اچھا نہیں کیا اس بے چاری کے ساتھ۔" صباحت کو ہنستے ہنستے اچھو لگ گیا تھا۔

"اصل مزا تو اب آئے گا۔ آگے سنو۔ میں نے صائمہ بھابھی کو اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ ان کی جسمانی والا پھٹو اسٹائل ان کو بالکل سوٹ نہیں کرے گا۔ میں ایسے انداز میں ان کی پھٹو کٹنگ کروں گی کہ وہ بالکل مادھوری نظر آئیں گی اور ان کے دشمن جل کر خاک ہو جائیں گے۔"

"پھر۔" صباحت نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"پھر یہ کہ میں نے قینچی ہاتھ میں تھامی اور جہاں سے میرا دل چاہا کاٹتی چلی گئی بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں وہ اپنے بالوں کو مگر اف تک نہ کی۔ ہائے ہائے یہ فیشن۔۔۔ اچھے اچھوں کی مت مار دیتا ہے۔ صباحت! میں تمہیں بتا نہیں سکتی آخر میں وہ کیا چیز لگ رہی تھیں۔ کہیں سے بال چھوٹے کہیں سے بڑے کہیں ترچھے کہیں آڑے 'بالکل پرنچی مرغی نظر آ رہی تھیں جس کا کسی مرغے سے جھگڑا ہو گیا ہو۔"

"خدا کے لیے بس کرو ملاحت۔" اس نے پیٹ پکڑ کر کہا۔ وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی تھی۔

"اس کی بہن نے نہیں بتایا کہ پھٹو اسٹائل کیسا لگ رہا ہے اور وہ۔ نائلہ بھی تو وہیں موجود تھی 'اس نے بھی اس تباہی کے بارے میں اسے آگاہ نہیں کیا۔" ہنسی کا طوفان تھما تو اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

"نائلہ تو فیشل کرواتے ہی چلی گئی تھی شاید کبھی نہ آنے کے لیے اور وہ ہمشیرہ۔۔۔ وہ بھی کہیں روپوش ہو گئی تھی۔ شاید کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی آئی برو کا غم منا رہی ہو گی۔"

"اور وہ خود؟ کیا انہوں نے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔" اس کی حیرت انتہا کو چھو رہی تھی۔

"دکھایا تھا آئینہ لیکن آخر میں۔" میں نے شان بے نیازی سے کہا۔ "پہلے تو بھونچکا رہ گئیں اپنی شکل دیکھ کر' بالکل "دور فٹے منہ" لگ رہی تھیں پھر اٹک اٹک کر پوچھنے لگیں یہ کون سا اسٹائل ہے۔"

میں نے کہا بالکل جدید اسٹائل ہے۔ اسے "اسٹیپ کٹنگ" کہتے ہیں۔ ابھی تو شہر میں دو چار ہی خواتین نے بنوایا ہو گا وہ بھی ہائی سوسائٹی کی۔ آپ کسی پارلر جاتیں تو ہزار روپے تو یوں ہی رکھوا لیتے انہوں نے۔" میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا۔

"اس کے بعد ان کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔ میرے جانے کے بعد ان کا اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہ رہا ہو تو یہ اور بات ہے۔" میں اپنی بات مکمل کر کے آرام سے صوفے پر پھیل کر لیٹ گئی تھی۔

کیوں کہ اب تو راوی میرے لیے چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

✿ ✿ ✿
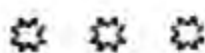
"اتنی دیر لگا دی تم نے ملاحت۔" میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ صباحت بے تابی سے بولی۔

"تمہیں پتا تو ہے اسکول میں "ہفتہ طلبہ" منایا جا رہا تھا۔ آج آخری فنکشن تھا۔ میں امی کو بتا کر تو گئی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس بہت زبردست نیوز ہے تمہارے لیے۔" اس سے شاید صبر نہیں ہو رہا تھا۔ "لیکن پہلے تم چینج کرکے فریش ہو جاؤ پھر بتاؤں گی۔" اس نے مجھے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"امی نظر نہیں آرہیں۔ کہاں ہیں؟" میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"ابھی تو یہیں تھیں' شاید وضو کرنے چلی گئی ہوں۔ عصر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے نا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ باہر آجائیں تو بتادینا کہ میں آگئی ہوں' میں وہ ہلکان ہوتی رہیں۔" میں اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر کمرے میں چلی گئی تھی۔ فریش ہو کر واپس آئی تو صباحت چائے لیے میری منتظر تھی۔

"تھینک یو' مجھے اس وقت بہت طلب محسوس ہو رہی تھی چائے کی۔" میں نے تشکر سے اس کی طرف دیکھا۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے' ہمشیرہ یہ خاطر صرف اس لیے ہو رہی ہے کہ اب آپ چند دنوں کی مہمان نظر آرہی ہیں اس گھر میں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ اہل خانہ اب مزید تمہیں اس گھر میں برداشت کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اب تم اپنا بوریا بستر گول ہی سمجھو اور پیا دیس سدھارنے کی تیاری کرو۔" اس نے بڑی ادا سے کہا۔

"کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں' کیا بات ہے" مجھے غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔

"صاف صاف سننا چاہتی ہو تو سنو۔ تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جو رابعہ خالہ کے ہاں شادی میں ملی تھی۔ بھئی وہی غالباً" نورین کی دوست تھی اور سارا وقت تمہارے سر پر سوار رہی تھی۔"

"میرے سر پر تو ساری کی ساری مسلط تھیں۔ تم پتا نہیں کس کی بات کر رہی ہو۔" میں نے الجھ کر کہا۔

"ارے وہی جس کے بازوؤں کی تھریڈنگ کی تھی تم نے اور اس کو آئی بروز بنوانی تھیں اس کی دو اور بہنوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی نا' نکاح والے دن' جن کو دیکھ کر تم پوچھ رہی تھیں ان کا تعلق کس قبیلے سے ہے۔" صباحت نے مجھے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں یاد آگیا۔ بھئی ان کا قد کاٹھ ہی ایسا تھا۔ لمبے چوڑے وجود' بازوؤں پر رواں اور چوڑی چوڑی باہم ملی ہوئی بھنویں' اماں تو خاصی معقول تھیں' بیٹیاں پتا نہیں کس پر چلی گئیں۔"

"توبہ کرو ملاحت! اب وہ اتنی بھی خوفناک نہیں تھیں جتنا تم نے نقشہ کھینچا ہے۔ اچھی خاصی پرکشش تھیں۔" اس نے جل کر کہا۔

"ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہی لڑکیاں' بمع اپنی والدہ کے رابعہ خالہ کے ساتھ آج یہاں آئی تھیں اپنے بھیا جانی کا رشتہ لے کر۔ شادی کی تقریب میں تم انہیں اتنی بھا گئیں کہ جھٹ سے انہوں نے اپنے بھائی کے لیے پسند کر لیا اور پٹ سے رشتہ لے کر آ گئیں۔" وہ مزے لے لے کر بتا رہی تھی اور میں ہونق بنی اس کی شکل تک رہی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے امی ابو کو بھی رشتہ پسند آگیا ہے اور انہوں نے شاید کوئی حوصلہ افزا جواب بھی دیا ہے۔ جب ہی اگلے ہفتے وہ لوگ دوبارہ آرہے ہیں۔" اس کی باتیں سن کر میرا گھوما ہوا دماغ مزید گھوم گیا تھا۔ میں تلملا کر کھڑی ہو گئی۔

"آخر میں ہی کیوں پسند آئی پوری تقریب میں ان لوگوں کو اور بھی تو درجنوں لڑکیاں تھیں۔ مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب سازش ہے میرے خلاف۔ صباحت! میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں ان کو بھائی کی نہیں بلکہ پرمننٹ بیوٹیشن کی ضرورت ہے' اسی لیے میں ان کی نظروں میں سمائی۔ ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں انہوں نے بلکہ ایک ٹکٹ میں دو مزے والا معاملہ ہے۔ میری تو وہی حالت ہوگی وہاں جاکر کہ ایک انار اور سو بیمار۔" محاورے بڑی سرعت سے میری زبان سے نکل رہے

تھے۔ طیش کے عالم میں، میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کردیا تھا۔

"تم اپنی سوچ اپنے تک ہی محدود رکھو احمق لڑکی۔" صباحت کو بھی آخر تاؤ آگیا تھا۔

"رابعہ خالہ بتارہی تھیں اچھا خاصا کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ اپنی زمینیں ہیں، جائیداد ہے اور خاصے وضع دار لوگ ہیں وہ یہ سب تو وہ خود بھی افورڈ کرسکتے ہیں اگر چاہیں تو۔ ندرت نے بتایا تو تھا کہ ان کے والد پرانے خیالات کے ہیں ان سب چیزوں کو پسند نہیں کرتے۔ تمہاری سوچ تو بس ایک ہی نکتے پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کردیا ہے تم نے۔" اس نے مجھے خوب ستاڑا لیکن میں پھر بھی مطمئن نہ ہوسکی۔

میرے دماغ میں کوئی بات سما جائے تو مشکل سے ہی نکلتی تھی اور اب تو میری سوئی ایک ہی جگہ پر اٹک گئی تھی میں بڑبڑا رہی تھی۔

"بہنوں کو دیکھ کر تو مجھے "تبلائی خاں" کی یاد ستاتی رہی۔ بھائی تو کیا کم ہوگا چنگیز خان سے۔" میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں نہیں خاصا ڈیسنٹ بندہ لگ رہا ہے وہ تو۔ بہنیں تصویر بھی لائی تھیں اپنے ساتھ شاید امی کی الماری میں رکھی ہو۔ موقع ملتے ہی تمہیں بھی دکھاؤں گی۔ سب بہنیں بہت پیار سے ذکر کررہی تھیں اس کا، پانچ بہنوں کا اکلوتا لاڈلا بھائی ہے وہ۔ اس لحاظ سے تم بھی لاڈلی چھیتی بھابی..." میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا تھا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی تھی۔

"کیا کہا؟ پانچ بہنیں؟ یعنی یک نہ شد پانچ شد اور میں تماشا شد پھر تو میں ختم شد۔"

میں نے چیخ ماری اور دھم سے بستر پر گر گئی۔ اب نہ جانے بہنوں کی بھرتی کا اثر تھا یا صباحت کی بات کا، میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

☆ ☆ ☆
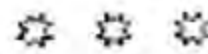
اس کے بعد میری ایک نہیں چلی تھی۔ نہ تو میری بے ہوشی کارگر ثابت ہوئی تھی نہ میری دہائیاں کسی پر اثر انداز ہوئی تھیں۔ منگنی کے جھمیلے میں پڑنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی اور میں دو مہینے کے اندر اندر ہی دلہن بن کر سسرال سدھاری تھی۔

سسرال پہنچ کر مجھے اپنے سابقہ خیالات پر خاصی پشیمانی ہوئی تھی۔ احسن ان کے والدین اور بہنیں سب ہی محبت اور عزت کرنے والے ثابت ہوئے تھے۔ بہنیں تو گویا مجھ پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ اور... ایک خاص بات یہ کہ وہی کام... جی ہاں، وہی جن کے تصور سے میں بے ہوش ہوگئی تھی، بعد میں، میں نے بہت ذوق و شوق محبت اور لگن سے سرانجام دیے تھے اور رفتہ رفتہ اپنی نندوں کا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔

"اوہ گاڈ!" حذیفہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ گاڑی زور سے اچھلی تھی۔ شاید کوئی اسپیڈ بریکر تھا۔ جس نے میرے خیالات کو بھی بریک لگا دیا تھا۔ گاڑی کی رفتار خاصی کم ہوگئی تھی شاید ہم منزل مقصود پر پہنچنے والے تھے۔ احسن نے پیپر نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا جس پر ایڈریس درج تھا اور اب وہ قطار میں بنے ہوئے مکانات کی نیم پلیٹس کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"ہاں بس یہی ہے۔" انہوں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا تھا۔ گاڑی پھولوں اور پتوں سے ڈھکے ہوئے ایک خوب صورت گھر کے آگے جارکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر تیز ہوگئی تھیں میں اپنوں سے صرف چند لمحوں کی دوری پر تھی۔ حذیفہ گاڑی سے نکل کر چاروں طرف دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ احسن ڈگی سے سامان نکلوا رہے تھے اور میں بھی بالآخر اپنا دل اور دامن سنبھال کر گاڑی سے اتر آئی تھی۔

خوش گوار یادوں میں بہہ کر میں یہاں تک آ پہنچی تھی اور اب... دوبارہ مجھے یادوں کے بہت سے جگنو دامن میں بھر کر اپنے ہمراہ لے جانے تھے۔ دوری کی تاریک راتوں کو روشن رکھنے کے لیے، میں نے ڈور بیل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

☆

"تیمور.....!" اب کی بار انہوں نے زیادہ بلند اور زیادہ کرخت آواز سے پکارا تھا۔

"آرہا ہوں بابا جان! آرہا ہوں۔" تیمور ان کی آواز کی گونج اور لہجے کی کرختی سے ہی جان چکا تھا کہ وہ اس وقت کس قدر اشتعال میں ہیں۔ اسی لیے وہ انتہائی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اترتا نیچے آگیا تھا۔

"جی بابا جان..... خیریت....." وہ اپنی دھن میں کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔

"خبردار.....! آگے مت بڑھنا..... جہاں کھڑے ہو..... وہیں کھڑے رہو۔" رضا حیدر کے لہجے میں شعلے لپک رہے تھے اور ان شعلوں کی تپش سے تیمور حیدر کے قدم وہیں ٹھہر گئے تھے۔

"لیکن بابا جان.....!" تیمور نے بولنا چاہا مگر.....

"کہاں ہے وہ لڑکی؟" رضا حیدر نے اس کی بات کاٹی۔

"کون لڑکی.....؟" تیمور ان کا مفہوم نہیں سمجھ پایا تھا۔

"جس سے تم نے شادی کی ہے۔" رضا حیدر کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ہنوز شعلوں کی لپک لیے ہوئے تھے اور اب مفہوم سمجھ میں آتے ہی تیمور کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

"وہ لڑکی نہیں..... میری بیوی اور آپ کی بہو ہے۔" تیمور کا لہجہ تیکھا ہو چکا تھا۔

"وہ نہ تمہاری بیوی ہے اور نہ ہی میری بہو..... وہ ایک دھوکے باز لڑکی ہے۔" رضا حیدر رفتہ رفتہ اپنی اصلیت کی طرف آرہے تھے۔

—— ۳۰ ——

تیسویں قسط

ماورا ابھی بالآخر اٹھ کر باہر آہی گئی تھی اور ان دونوں باپ 'بیٹے کی آواز سن کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب رک گئی تھی۔
اس کے دونوں ہاتھ ریلنگ پہ تھے اور نظریں ان دونوں باپ 'بیٹے پہ تھیں اور چند قدم کے فاصلے پر عزت اور رابعہ بیگم خاموش تماشائی بنی کھڑی تھیں۔
"بابا جان۔۔۔! وہ میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے۔ میں اس کے بارے میں کوئی بھی غلط بات برداشت نہیں کروں گا۔"
تیمور نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ جس کو سن کر ماورا کے دل پہ چند بوندیں سکون کی برسی تھیں کہ اور کوئی نہ سہی 'لیکن تیمور تو ہے نا اس کا ساتھ دینے والا۔
اس کے لیے ڈھال بننے والا۔
اس کا دفاع کرنے والا۔
اور اس کو مضبوط کرنے والا۔
اب اس کے ہوتے ہوئے اسے فکر کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔۔۔
"اور میں اس کو تمہاری بیوی کے روپ میں برداشت نہیں کروں گا۔ تمہیں طلاق دینی ہوگی اس کو۔" رضا حیدر کے الفاظ ماورا مرتضیٰ اور تیمور حیدر کے قدموں تلے سے زمین کھینچ گئے تھے۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟" عزت ان دونوں سے بھی پہلے تڑپ اٹھی تھی۔
"تم خاموش رہو۔۔۔" انہوں نے یک دم عزت کو خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔
"لیکن بابا۔۔۔" عزت کو طلاق کا لفظ سن کر ہی چکر آگیا تھا۔
"میں بکواس کررہا ہوں کہ تم خاموش رہو۔۔۔" وہ سب پر غصہ کررہے تھے۔ عزت چند ثانیے کے لیے چپ ہوگئی تھی۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ میں ماورا کو طلاق دینے کے لیے تیار ہوں۔" تیمور کے جواب پہ تو جیسے ماورا مرتضیٰ کے سر پہ چھت آن گری تھی اور عزت نے یک دم پھٹی پھٹی نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا تھا' جبکہ رضا حیدر کے چہرے پہ ایک فخریہ سی لہر دوڑ گئی تھی۔
"شاباش۔۔۔ یہی بہتر فیصلہ ہے۔" انہوں نے داد دی۔
"لیکن میری ایک شرط ہے۔" تیمور کا اگلا جملہ ان کے چہرے کی فخریہ لہر کو وہیں کا وہیں ٹھہرا دینے کے لیے کافی تھا۔
"کیا۔۔۔؟" رضا حیدر اس وقت اس کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار تھے۔
"آپ ماورا سے نفرت کی وجہ بتادیں۔" تیمور کا سوال ماورا کے تنے ہوئے اعصاب کو ایک دم سکون دے گیا تھا۔
اور اس کے اس سوال پر عزت کی آنکھیں بھی کھل گئی تھیں کہ واقعی سوچنے کی بات ہے' بابا جان کو ماورا مرتضیٰ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ جبکہ دوسری طرف رضا حیدر اس کے اس قدر گہرے اور اہم سوال پر اندر سے سنبھل گئے تھے۔ لیکن بظاہر اپنے تاثرات سے ذرا بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا' کیونکہ اس کام میں وہ شروع سے ہی ماہر تھے۔
"بات نفرت کی نہیں۔۔۔ بات پسند اور ناپسند کی ہے۔ وہ لڑکی مجھے ناپسند ہے۔" انہوں نے بات کو بڑے طریقے

سے سنبھالا۔
"ہوں ۔۔۔" تیمور ان کی بات پہ طنزیہ مسکرایا۔
"بابا جان ناپسندیدگی اور نفرت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں آپ کی پسند یا ناپسند نہیں پوچھ رہا۔ بلکہ آپ کی نفرت اور نفرت کی وجہ پوچھ رہا ہوں۔" تیمور اپنے سوال پہ ڈٹ چکا تھا۔

"مجھے اس سے نفرت کیوں ہوگی؟" وہ پینترا بدل گئے تھے۔
"تو پھر میں اسے طلاق کیوں دوں؟" تیمور کے لہجے میں طنز تھا۔
"کیونکہ وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔" انہوں نے فٹ سے ایک اور جواز دیا۔
"بابا جان۔۔۔ میں ایک مرد ہوں اور مرد ایک نظر میں ہی جان لیتا ہے کہ اس کے سامنے والی عورت اس کے قابل ہے یا نہیں۔۔۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ماورا میرے قابل ہے۔" تیمور کا جواب پہلے سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔
"وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ وہ تمہیں دھوکا دے رہی ہے۔ اسے تم سے کوئی محبت' کوئی عشق نہیں ہے۔" رضا حیدر نے مزید زہر اگلا۔
"مجھے پتا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی عشق محبت نہیں ہے۔ یہ بات اس نے مجھے پہلے روز ہی بتا دی تھی۔" تیمور کو یاد تھا جو کچھ ماورا نے کہا تھا۔
"تو پھر۔۔۔؟" رضا حیدر نے سوالیہ دیکھا۔
"تو پھر مجھے تو اس سے محبت ہے نا۔ مجھے تو اس سے عشق ہے۔ پہلے محبت مجھے ہوئی تھی اسے تو نہیں۔۔۔ پرپوز میں نے کیا تھا اس نے تو نہیں۔۔۔ اس کی طلب مجھے ہوئی تھی اسے تو نہیں۔" تیمور ہر بات سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔
"اب تمہاری خواہش پوری ہو گئی ہوگی۔ اب اسے چھوڑ دو۔" رضا حیدر نے بیوی اور بیٹی کے سامنے بھی شرم نہیں رکھی تھی۔
"یہ محبت ہے بابا جان' ہوس نہیں۔ اس میں طلب اور بڑھتی ہے' کم نہیں ہوتی۔ آپ کو کیا پتا کہ میرے اندر اس کی محبت کتنی بڑھ چکی ہے۔"

تیمور کے الفاظ سے رضا حیدر کی رگوں میں زہر گھل رہا تھا اور ماورا کی رگوں میں تیمور حیدر کی محبت کی لہریں' لہو کے ساتھ شامل ہو چکی تھیں اور ان کا رخ دل سے جسم اور جسم سے جان تک مڑ چکا تھا۔
تیمور کو خبر ہی نہیں تھی کہ ماورا مرتضیٰ اس کی محبت کی بارش میں بھیگ رہی ہے اور پور پور ڈوبنے والی ہے بس۔
"جو بھی ہے۔۔۔ جیسا بھی ہے۔۔۔ لیکن وہ لڑکی مجھے گوارا نہیں ہے۔ اس گھر میں یا تو وہ رہے گی۔۔۔ یا میں رہوں گا۔" رضا حیدر نے اب کی بار دھمکی دے ڈالی تھی اور تیمور کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی چونک گئے تھے۔
لیکن تیمور کو کمزور نہیں پڑنا تھا۔ اسے یہ جنگ جیتنا تھی۔۔۔ ماورا کے لیے' ماورا کے حق میں۔۔۔
"تو پھر ہم چلے جاتے ہیں۔۔۔ کیونکہ یہ گھر تو اس کا ہے۔" تیمور نے کسی اور نظریے سے کہا تھا اور رضا حیدر کسی اور نظریے سے سمجھے تھے۔
"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ چونک گئے تھے۔
"مطلب یہ کہ میں گھر اس کے نام لکھ چکا ہوں۔ بلکہ یہ گھر ہی نہیں اپنا سب کچھ۔۔۔ اب وہ مالک ہے سب کو رکھے یا نکال دے' مجھے کوئی پروا نہیں رہے۔"

تیمور نے کھرے کھرے، بہت ہی سکون اور اطمینان سے رضا حیدر کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ جیسے سن ہو کے رہ گئے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو تم...؟" رضا حیدر کے الفاظ بے ربط ہو گئے تھے۔

"جو بھی کہہ رہا ہوں سچ ہی کہہ رہا ہوں۔" تیمور کے انداز میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔

اور اب کی بار ماورا کو پتا تھا کہ معاملہ بگڑنے کے قریب تر ہے' اسی لیے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتے ہوئے تیمور کے برابر آکھڑی ہوئی تھی اور خود ہی تیمور کا ہاتھ بے حد آہستگی سے تھام لیا تھا' جس پر تیمور نے یک دم چونک کر دیکھا تھا۔

تیمور اپنے برابر کھڑی ماورا کو دیکھ کر چند ثانیے کے لیے مبہوت سا رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ محبت اور سنگت کی او ہی چمک بکھری نظر آرہی تھی' لیکن رضا حیدر کا خون کھول اٹھا۔

"میں خون پی جاؤں گا اس لڑکی کا۔ اس نے یہ دولت ہتھیانے کے لیے ہی تو سارا ناٹک کیا ہے۔" رضا حیدر بری طرح غرائے تھے۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" تیمور اصل مطلب کب سمجھ پا رہا تھا بھلا۔

"اس سے پوچھو۔ اس نے تم سے شادی کیوں کی۔" رضا حیدر نے ماورا کی طرف اشارہ کیا۔

"میری محبت... میرے پروپوزل... میری ضد سے مجبور ہو کر۔" تیمور نے کہتے ہوئے بڑے مان سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا تھا۔

"بیوقوف...! یہ غلط فہمی ہے تمہاری... تم سے شادی کرنے کے پیچھے اس کا ایک مقصد تھا۔ اس کا پلان تھا۔ اس نے تمہیں الو بنایا ہے۔ وہ کسی محبت' کسی پروپوزل اور کسی ضد سے مجبور نہیں ہوئی۔"

"یہ بات غلط ہے۔" ماورا نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

"تو صحیح بات کیا ہے' وہ بتا دو۔" رضا حیدر نے اسے سچ اگلنے پہ مجبور کیا تھا اور ماورا نے ذرا توقف کے لیے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

"سچ یہ ہے کہ میں علی مرتضیٰ کی بیٹی ہوں۔ آپ پہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے والے علی مرتضیٰ کی بیٹی... آپ کے سب سے لاڈلے' پیارے اور چہیتے دوست کی بیٹی... اور علی مرتضیٰ کی بیوہ عافیہ مرتضیٰ کی بیٹی۔"

ماورا کا ایک ایک لفظ سرد... سپاٹ اور پتھریلا محسوس ہو رہا تھا۔

تیمور نے اب کی بار چونک کر دیکھا تھا' اسے اپنے برابر کھڑی ماورا پہلے روز والی ماورا کے روپ میں نظر آئی تھی' بالکل سپاٹ...

لیکن اس کے سرد سپاٹ الفاظ نے رضا حیدر کے چہرے کی رنگت چھین لی تھی۔ وہاں ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"سچ یہ ہے کہ میں نے آپ کی طرح کچھ بھی ہتھیانے کی کوشش نہیں کی... کیونکہ یہ سب کچھ ہے ہی میرا۔ اس پہ میرا حق ہے... اور میں نے اپنا حق لینے کی کوشش کی ہے۔" وہ کچھ اور بھی بول رہی تھی' لیکن تیمور کے دماغ میں سائیں سائیں کی آوازیں آنا شروع ہو چکی تھی۔

"وہ حق جو آپ نے دھوکے سے علی مرتضیٰ کی بیوہ سے چھین لیا تھا۔ وہ حق جو آپ نے علی مرتضیٰ کی اولاد تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔ وہ حق جو لینے کی اب خواہش ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اب خواہش ہے تو صرف تیمور حیدر کی قربت کی... اب اس کے آگے اور کچھ نہیں ہے۔"

ماورا نے تیمور کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔
لیکن یہ کیا۔؟ تیمور کا ہاتھ بے دم سا ہو کر اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔
ماورا اس کے انداز پہ یک دم چونک گئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر تیمور کو دیکھا۔ لیکن تب تک تیمور ہاتھ چھوڑ چکا تھا۔
"تیمور۔!" ماورا نے اتنی شدت سے اسے پکارا ٗیوں جیسے وہ بہت فاصلے پہ کھڑا ہو۔ اور تیمور کو واقعی اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے بس ماورا کے چند الفاظ سنائی دے رہے تھے۔
"کیونکہ یہ سب کچھ ہے ہی میرا۔ اس پہ میرا حق ہے اور میں نے اپنا حق لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ حق جو آپ نے دھوکے سے علی مرتضیٰ کی بیوہ سے چھین لیا تھا۔"
اس کے یہ الفاظ تیمور حیدر کو ششدر کرنے کے لیے کافی تھے اور ایسا ہی کچھ حال عزت حیدر کا بھی تھا۔ وہ بھی ششدر سی رہ گئی تھی۔
"اگرچہ اب تم سب کچھ ہتھیا چکی ہو۔ لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔"
رضا حیدر' تیمور کو اس کا ہاتھ چھوڑتے دیکھ کر پھر سے بولنا شروع ہو گئے تھے۔ ان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ لوہا گرم ہے اور ضرب بڑی کاری ثابت ہو گی۔
"میں نے کچھ بھی ہتھیانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے تیمور حیدر کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے کبھی بھی اسے اپنی طرف راغب نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اسے اپنے آپ سے دور رہنے کو کہا۔ ہمیشہ اس سے دامن چھڑانے کی کوشش کی۔ کیونکہ میں اسے اور اس کی محبت کو استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی اور میں نے ایسا کیا بھی..... جو کچھ بھی ہوا ہے تیمور کی مرضی سے ہوا ہے۔ اس کی پسند' اس کی خوشی سے ہوا ہے۔ تیمور بتائیں نا۔ آپ خاموش کیوں ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے روز ہی......"
"تم نے اسے پہلے روز ہی دھوکا دینا شروع کر دیا تھا۔ تم نے اسے اس طرح پھنسایا کہ اسے پتا بھی نہیں چلنے دیا۔" رضا حیدر ضرب لگانے سے باز نہیں آرہے تھے۔
"تیمور۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ بتاتے کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہیں؟ پلیز۔"
ماورا نے پلٹ کر تیمور کو دوبارہ مخاطب کیا تھا' لیکن تیمور کیا بولتا' اس کے پاس تو کچھ بولنے کے لیے رہا ہی نہیں تھا۔

کیونکہ اس کا دل چند لمحوں میں ہی ویران ہو چکا تھا۔
آخر اس کی محبت کا سودا ہوا تھا۔
ماورا نے ایک ہاتھ دے اور ایک ہاتھ لے والا کام کیا تھا۔
وہ تیمور سے نفرت کرتی' یہ بھی تیمور کو منظور تھا۔ وہ تیمور سے کبھی محبت نہ کرتی۔ یہ بھی تیمور کو منظور تھا۔ وہ اس سے سب کچھ لے لیتی۔ یہ بھی تیمور کو منظور تھا۔ لیکن وہ دھوکا دے کر جھوٹ بول کر اپنا مقصد پورا کرتی' یہ اسے منظور نہیں تھا۔ وہ ماورا پہ سب کچھ لٹا کر بھی خوش رہتا' لیکن ماورا اس سے دل کا اور جذبات کا سودا دولت کے لیے کرتی' یہ اسے گوارا نہیں تھا۔
کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔

❁ ❁ ❁
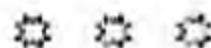
ڈرائنگ روم میں سناٹا تھا۔ مکمل سناٹا۔ موت کی سی خاموشی۔ اور اس موت کی سی خاموشی میں ماورا کی آواز خلل ڈال رہی تھی۔

تیمور ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھا تھا اور ماورا اس کے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ تیمور کے زانو پہ رکھے تھے اور تیمور کی سمت دیکھتی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہوئی جا رہی تھیں۔

وہ آنکھیں جو ہمیشہ تیکھے چتون رکھتی تھیں، وہی آنکھیں آج نمکین پانیوں میں ڈوب رہی تھیں۔

اور اسے سہارا دے کر یہاں تک لانے والا خود ذرا سے فاصلے پہ ناراض ہوا بیٹھا تھا اور ماورا اپنے ازلی ہٹ دھرم، ضدی اور سرکش مزاج سے ہٹ کے اپنی انا اور نسائیت کے سنگھاسن سے اتر کے اسے منانے میں مصروف تھی۔

"تیمور۔ میں نے آپ کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے آپ کی محبت کی قدر کی ہے۔ میں نے محبت کا جواب نفرت سے نہیں دیا۔ میں نے محبت کو محبت سمجھا ہے۔ آپ کو مجھ پہ نہیں یقین تو میری ماں سے پوچھ لیں۔ میری بی گل سے تصدیق کروالیں۔ وہ کہتی ہیں۔ میری آنکھوں میں۔ میرے چہرے پہ آپ صاف نظر آتے ہیں۔ دکھائی دیتے ہیں آپ۔ میں نے غصے میں اس چہرے کو نوچا بھی تھا۔ مگر آواز اندر سے آنا شروع ہو گئی۔ اور آج وہی اندر کی آواز باہر کی آواز بن رہی ہے۔ جسے آپ سن ہی نہیں رہے۔"

ماورا اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے بات کر رہی تھی مگر تیمور حیدر کے پاس ایک چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"دیکھیں۔ اگر مجھے دولت کی ہی ضرورت ہوتی تو میں اس وقت آپ کو یوں نہ منا رہی ہوتی۔ کیونکہ ضرورت تو پوری ہو چکی ہے۔ اب مجھے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن۔ میں۔ میں اس دل کا کیا کروں۔ ؟ جس کی ضرورت آپ ہو۔ صرف آپ۔" ماورا کے اندر محبت کی ندی اُمڈی تو لفظوں کو روانی کا ڈھنگ بھی آگیا تھا۔

"ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیے۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیونکہ ہمیں ایک ساتھ جینا ہے۔ زندگی گزارنی ہے۔ ایک ساتھ رہنا ہے۔ محبت کا محبت سے سودا کرنا ہے۔ محبت بیچ کر محبت خریدنی ہے۔"

ماورا کا لہجہ بھیگ رہا تھا اور ہاتھ تیمور کے زانو کو چھو رہے تھے، لیکن اس کی آخری بات پہ تیمور یک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اب کوئی سودا نہیں ہو گا ماورا مرتضیٰ۔ کیونکہ اب میں بالکل خالی دامن ہو چکا ہوں۔ اب میں نہ خرید سکتا ہوں نہ بیچ سکتا ہوں۔ اب مجھ سا مفلس زمانے بھر میں نہیں ملے گا۔ اس لیے میری طرف سے تمہیں تمہارے بابا کا حق اور امیری مبارک۔"

تیمور کسی روبوٹ کی طرح کہہ کر آگے بڑھا، لیکن ماورا نے یک دم ہاتھ تھام لیا تھا۔

"نہیں تیمور۔ اگر آپ کا سب کچھ میرا ہے تو میرا سب کچھ بھی آپ کا ہے۔ آپ مفلس کیسے ہو سکتے ہیں؟"

ماورا اس کے سامنے راستہ روکے کھڑی تھی اور تیمور کو اس سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔

"راستہ چھوڑو۔" تیمور کا لہجہ اور انداز دوٹوک تھا۔

"آپ کے سارے راستے مجھ تک آتے ہیں۔" ماورا اسے یاد دلا رہی تھی۔

"ہمارے راستے الگ ہیں۔" تیمور کے لہجے میں ذرا بھی لچک نہیں تھی۔

"کب۔ الگ ہو گئے؟" ماورا نے شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔

"کبھی تو ہوتے ہی تھے۔" وہ بھی برجستہ جواب دے رہا تھا۔
"آپ بھی دوسروں کی باتوں میں آگئے؟" شکوہ در شکوہ تھا۔
"میں دل کی باتوں میں آنے والا انسان تھا۔" تاسف اس کے لفظ لفظ میں تھا۔
"تو اب کیا ہوا؟"
"عقل آگئی۔" تیمور کا انداز استہزائیہ سا ہو رہا تھا۔
"محبت کی راہ میں عقل نہیں آتی۔" ماورا دلیلیں دے رہی تھی۔
"محبت میں ٹھوکر کھاتے تو عقل حد سے زیادہ آتی ہے۔" وہ زہر خند ہونے لگا۔
"میں نے آپ کو کوئی ٹھوکر نہیں لگائی۔"
"مجھے پتا ہے۔ میں نے ٹھوکر خود کھائی ہے۔" اسے خود پہ تاسف تھا۔ "نہیں تیمور۔ آپ۔"
"پلیز۔ راستہ چھوڑو۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ اس پہ حق تمہارا ہے۔ اس میں تم رہو۔ اکیلی۔ یا سب کے ساتھ۔ مجھے اس سے مطلب نہیں۔ میرا اس گھر پہ اب کوئی حق اور کوئی اختیار نہیں۔ اللہ حافظ۔"
تیمور کہہ کر ایک ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹا کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا تھا اور ماورا پیچھے تڑپ کے رہ گئی تھی۔
"تیمور۔" اس نے اسے چیخ کے پکارا تھا۔
مگر یہ وہ تیمور نہیں تھا جو اس کی ذرا سی آواز پر ہی پلٹ آتا۔
وہ تیمور کھو چکا تھا اور ماورا اس تیمور کو گنوا چکی تھی۔
ایک دن میں زندگی بدل کے رہ گئی تھی۔
نیت بدل گئی تھی۔ ارادے بدل گئے تھے۔ محبت نفرت میں بدل گئی تھی۔ ہر سو ویرانی تھی۔ ہر سو سناٹا تھا۔
سب کچھ پا کر بھی ہاتھ خالی تھے۔ وہ گلہ کرتی تو کس سے کرتی؟
سب اپنے ہی بوئے ہوئے بیج تھے۔
تیمور کو سزا دینے کے لیے رضا حیدر نے بھی گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیوی اور بیٹی کو لے کر وہاں سے جا چکے تھے اور ماورا مرتضیٰ ان کو روک بھی نہیں سکی تھی۔
جب تیمور حیدر خود سب کچھ چھوڑ کر جا چکا تھا تو باقی سب بھلا کیسے رک سکتے تھے؟ اتنا بڑا گھر تھا۔ اور ماورا مرتضیٰ اکیلی بیٹھی تھی۔ بالکل اکیلی۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ گھر سے نکلا تھا۔ اور شام ڈھل چکی تھی۔

پورے دن کی دھوپ اس کے جسم میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پہ بے حس و حرکت بیٹھا' سمندر کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس کے سامنے نہ جانے کتنی لہریں کنارے تک آکر دم توڑ گئی تھیں۔ بڑے جوش سے آتی تھیں اور بڑی خاموشی سے لوٹ جاتی تھیں' بالکل ایسے جیسے تیمور حیدر کی محبت۔

جسے کنارے پہ آکر بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اور وہ دم توڑ گئی تھی۔

ماہیٔ بے آب کی مانند۔

اور ماورا۔ اس کے لیے سمندر ہی تو تھی' جس کا دوسرا کنارہ ہی نہیں تھا۔

جس کا کوئی سرا ہی تیمور کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

جس کو پانے کے لیے' جس کو حاصل کرنے کے لیے تیمور خود اپنی پہچان کھو بیٹھا تھا۔

اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ پہلے رضا حیدر نے اپنی دولت بڑھانے کے لیے اسے اپنا مہرہ بنائے رکھا اور پھر اسی دولت کو پانے کے لیے ماورا مرتضیٰ نے اسے مہرہ بنا لیا۔ اور وہ محبت کا اندھا۔ کسی بھی کھیل کو سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

اور وہ دونوں اپنی اپنی چال چل گئے تھے۔

اور ان کی یہ چالیں تیمور حیدر کو توڑ کے رکھ گئی تھیں۔

وہ اندر سے مر چکا تھا۔

اور اس کو مارنے والے سب اپنے ہی تو تھے۔

اس کے منہ سے آہ نما سانس خارج ہوئی تھی' اور اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا' لیکن اتنے میں اس کا فون بج اٹھا تھا۔

تیمور کو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا فون کہاں ہے۔ لیکن رات کے اندھیرے میں ریت پہ گرے موبائل کی لائٹس جلنے بجھنے سے اس کی نظریں موبائل اسکرین پہ جم گئی تھیں۔ جس پہ دلہن بنی ماورا مرتضیٰ کی تصویر اپنے تمام تر رنگوں اور رعنائیوں سمیت جگمگا رہی تھی۔

ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری گھنٹی بجی۔ اور پھر بجتی چلی گئی۔ تیمور دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔

"چلی جاؤ۔ ماورا مرتضیٰ! چلی جاؤ۔ چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تنہا چھوڑ دو۔ مر گئی ہو تم میرے لیے۔ مر گئی ہو۔"

تیمور نے چلاتے ہوئے موبائل اپنی پوری قوت سے یک دم انتہائی دور سمندر میں پھینک دیا تھا اور موبائل کی احتجاج کرتی آواز لگے ہی پل ساکت ہو گئی تھی۔

سمندر کی لہروں کے سوا ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

"چلی جاؤ۔ چلی جاؤ۔ چلی جاؤ۔" وہ پتھر کو ٹھوکریں مارتا جیسے پاگل ہو چکا تھا۔ اس کا وجود زخمی ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماورا اسے فون کر کر کے تھک چکی تھی۔ پہلے گھنٹی بجتی رہی۔

اور اب تو اس کا نمبر ہی بند جا رہا تھا۔ وہ سوچ سوچ کے پاگل ہو رہی تھی کہ اب کیا کرے؟ اور اسی سوچ کے دوران اسے ولید کا خیال آیا تھا۔

"وہ۔ وہ۔ میری بات ضرور سمجھے گا۔ میرا ساتھ دے گا۔" ماورا خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی تھی اور ساتھ ہی اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"زہے نصیب۔ آج ہمارے مقدر کیسے جاگ اٹھے۔؟" ولید نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" ماورا نے دعا سلام کیے بغیر چھوٹتے ہی اپنے مطلب کی بات کی تھی۔

"خیریت ہے۔؟" ولید اس کے لہجے کی سنجیدگی اور پریشانی بھانپ چکا تھا۔

"خیریت نہیں ہے ولید۔ تم جہاں بھی ہو۔ گھر پہنچو۔"

"گھر۔ کون سے گھر۔" ولید چونکا۔

"میرے اور تیمور کے گھر۔" ماورا عجلت میں بول رہی تھی۔

"لیکن میرا وہاں آنا جانا تو عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے۔" ولید، تیمور کے گھر نہیں جاتا تھا۔ خاص طور پہ جب سے نکاح ہوا تھا۔

"ولید۔ گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے۔ میں پریشان ہوں، میرا تم سے ملنا ضروری ہے۔ یہاں بہت مسئلہ ہو گیا ہے۔ پلیز تم ابھی پہنچو۔" ماورا جھنجلا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔" ولید نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

اور ماورا بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید، ماورا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا ماورا سے سنی ہوئی داستان پہ یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کیونکہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر۔ علی مرتضیٰ کے قاتل تھے۔ عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں جا پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا، سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پرسوچ آنکھیں ہنستا رہی تھیں۔

"بتاؤ ولید! میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے۔ ہر حال میں۔" ماورا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد، ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

"مصائب اور مشکلات زندگی کا حصہ ہیں اور موت تک انسان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہر حال میں رب کا شکر ادا کرنا سیکھو۔ شکر ادا کرنے سے دل غنی اور قناعت پسند ہوتا ہے اور رب کی خوش نودی عطا ہوتی ہے۔

میرا اللہ تو اتنا مہربان ہے کہ کبھی کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ وہ اس پر وہ بوجھ ڈالتا ہی نہیں جو وہ سہار نہ سکے پر انسان یہ سب کب یاد رکھتا ہے۔"

بارہ تیرہ سال کی وہ چھ سات لڑکیاں نہایت انہماک سے ان کی بات کو سن کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دو چہرے ایسے بھی تھے جن پر بیزاری تھی

ناولٹ

پر ان کا احترام تھا جو ان کو وہیں بیٹھ کر خاموشی سے سب سننے پر مجبور کیے دے رہا تھا۔

"تم سب بچیاں ہو۔ کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ایسے ہیں جو صرف عورت کے لیے ہی مختص کردیے گئے ہیں۔ کل تم لوگوں کو مائیں بننا ہے' گھر گھرداری کرنی ہے ایک عورت کی سب سے بڑی ذمہ داری اپنی عزت کی حفاظت اور اپنی اولاد کی تربیت ہے جو عورت یہ کام احسن طریقے سے نہ کرسکے نسلوں کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔"

گھر گھرداری کا ذکر ان نوخیز بچیوں کے چہروں پر شرم کی سرخی پھیلا گیا۔ ایک دو نے تو ایک دوسرے کو شرارت سے کہنیاں بھی ماری تھیں بات کی نزاکت کو سمجھے بنا ہی۔

"اچھا بچیوں! اب اپنی اپنی کتابیں سمیٹو اور اپنے گھروں کی راہ لو اور ہاں سیدھی گھروں کو جانا اور نگاہوں کو جھکا کر رکھنا۔ راستے میں باتوں اور ہنسنے سے بھی گریز کرنا۔ اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

انہوں نے روزانہ والی ہدایت دہرائی اور ان سب کو روانہ کرکے دروازے کی کنڈی لگائی اور خود آکر صحن میں بچھی اس چارپائی پر بیٹھ گئیں جہاں پر تھوڑی دیر پہلے بچیوں کو درس دے رہی تھیں۔

فضا میں حبس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے

سر کے گرد لپیٹا دوپٹہ کھول کر سائیڈ میں رکھا اور خود گہری سانس بھر کر آسمان کو دیکھا کہ شاید بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا ٹھنڈی ہوا کی نوید دے جائے۔ دوپٹے میں چھپا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے بے حد خوب صورت نظر آ رہا تھا اب شام کے جھٹپٹے میں کریہہ اور خوفناک لگ رہا تھا۔ ان کا چہرہ دائیں گال سے لے کر پوری گردن تک بری طرح جھلسا ہوا تھا باقی ماندہ سفید بے داغ چہرے پر وہ جھلسا ہوا حصہ بہت عجیب اور بہت بد صورت لگ رہا تھا۔

"زندگی میں انسان کو جو چاہیے' اسے حاصل کرنے کے لیے ہر داؤ آزمانا چاہیے۔" ماضی کی ایک بازگشت نے انہیں اپنی طرف کھینچا تو ایک زخمی مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔۔۔ اماں! بنوا دیں ناں کالج میں فنکشن کے لیے سوٹ۔" اس نے لجاجت سے اماں کا گھٹنا پکڑ کر ہلایا۔ "دو سال پہلے عید پر جو سوٹ آپ نے بنوایا تھا' وہ اس کے بعد ہونے والے ہر فنکشن پر پہن پہن کر مجھے تو چھوڑیں' خاندان اور کالج میں ہر کسی کو ازبر ہو گیا ہے اب آپ نے مجھے وہ سوٹ پہننے کو کہا تو میں اسے آگ لگا دوں گی۔" چہرے پر التجائیہ تاثرات سجائے سجائے جب اسے اس سوٹ کا خیال آیا تو اس نے غصے سے کہا۔

اماں کا مشین چلاتا ہاتھ جھٹکے سے رک گیا انہوں نے عینک اتار کر سائیڈ میں رکھی اور دل میں امڈ آنے والے غصے کو دبایا گویا ہو ئیں۔

"دیکھو عفاف! اس گھر کے حالات تم سے چھپے ہوئے ہرگز نہیں ہیں۔ میری سلائی اور تمہارے ابا کی روزی دیہاڑی سے کتنی مشکل سے اور کھینچ تان کر گزارا ہوتا ہے۔ تم جانتی ہو ہادیل بھی تو تمہارے جتنی ہے۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھا کے اپنی اور تمہاری کالج کی فیس' یونیفارم اور سینکڑوں بکھیڑے مشکل سے پورے کرتا ہے۔ کالج کے فنکشن میں جانا کوئی اتنا ضروری تو نہیں ہے ناں بیٹا۔ چھوڑو یہ فضول کی ضد اور جا کر بہن کے ساتھ کچھ ہاتھ ہی بٹا لو کچن میں۔ اس کا فرض نہیں ہے سب کچھ۔ رات کو دیر دیر تک جاگ کر اخبار کے لیے کالم لکھتی ہے تب ہی دو پیسے ہاتھ آتے ہیں' اوپر سے گھر بھی سارا اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ کالج تک آ گئی ہو۔ ماشاء اللہ سمجھ دار ہو پھر بھی کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

ان کے نصیحت لہجے پر دھیان دیے بغیر اس نے خراب موڈ اور تنے چہرے کے ساتھ اماں کی ساری بات سنی جیسے ہی انہوں نے اپنی بات ختم کی۔ وہ جھٹکے سے اٹھی اور اپنے اور ہادیل کے مشترکہ کمرے میں آ کر بستر پر گر کر رونے لگی۔ کچن کے کام سے فارغ ہونے کے بعد تھکی ہاری ہادیل نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا اسے روتے دیکھ کر ٹھٹک گئی اور تیزی سے اس کی پاس آئی۔

"عفاف۔۔۔ عفاف کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟" پریشانی سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں اس نے مزید زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

"کیسی زندگی ہے ہماری ترس ترس کے گزارتے رہو۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستے رہو۔ تین ماہ پہلے سے اماں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ جب ہماری فیئرویل پارٹی ہو گی تو میں نیا سوٹ سلواؤں گی۔ ہر بار وہ چپ کر جاتی تھیں۔ اب جب پارٹی میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے تو صاف انکار کر دیا ہے۔"

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ہادیل کے دل کو کچھ ہوا' اس کی روئی روئی صورت دیکھ کر۔ وہ دونوں جڑواں بہنیں تھیں۔ محض پانچ منٹ چھوٹی تھی عفاف اس سے لیکن شکل و صورت سے لے کر مزاج تک میں مختلف تھیں دونوں' ہادیل نے رنگ و روپ اور نقوش ابا سے چرا لیے تھے۔ سنہری رنگت پر سیاہ آنکھیں' ستواں ناک' خوب صورت دہانہ اور بے تحاشا گھنے سیاہ بال اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیتے۔ وہ فطری طور پر بہت ہمدرد اور احساس ذمہ داری

رکھنے والی لڑکی تھی۔ ابا کا پھلوں کا ٹھیلا تھا' وہ منہ اندھیرے جسے لے کر نکلتے تو شام ڈھلے ہی واپس آتے۔ کبھی تو سارے پھل بک جاتے اور کچھ منافع بھی ہاتھ آجاتا' کبھی کچھ پھل بچ بھی جاتے جن میں سے کچھ گھر کے استعمال کے لیے رکھ لینے کے بعد اماں کبھی تایا کے گھر بھجواتیں تو کبھی کسی ہمسائے کے گھر۔ اماں کی سلائی اچھی تھی۔ محلے کی عورتیں ان سے کپڑے سلواتیں یوں کھینچ تان کر گزر بسر ہو ہی جاتی۔ ہادیہ نے میٹرک سے ہی بچیوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا تھا۔ پڑھائی میں اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی آگے آگے تھی سماجی موضوعات پر اس کے لکھے ایک مضمون کو ایک ٹیچر نے کسی اخبار میں بھیج دیا تھا تب سے اخبار میں کالم لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک چل رہا تھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی جلا ملتی اور کچھ رقم بھی ہاتھ آجاتی' جسے وہ خود پر کم عفاف پر زیادہ خرچ کرتی تھی۔ جبکہ عفاف اماں کی طرح بے حد گوری' بے داغ رنگت لیے ہوئے تھی۔ آنکھیں عفاف کی بھی ہادیہ کی طرح ابا پر گئی تھیں۔ البتہ بال سنہرے اور کندھوں تک تھے۔ ہزار ہا جتن کے بعد بھی ہادیہ کی طرح بڑھ کے نہ دیے تو اس نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ پڑھائی میں بس ٹھیک تھی عفاف۔ میٹرک تک صبرو شکر کے ساتھ اپنے حالات کے ساتھ گزارا کرنے والی عفاف کو کالج میں مضامین الگ ہونے کی بنا پر ہادیہ سے الگ ہونا پڑا۔ دوستوں کے اس کی خوب صورتی پر کیے گئے' تبصرے اسے ساتویں آسمان تک لے گئے۔

"ارے عفاف! تمہاری رنگت تو میدے سے گندھی لگتی ہے۔ ہادیہ تو تمہاری بہن بھی نہیں لگتی۔" ایک کہتی۔ "تمہیں دیکھ کر تو کسی ریاست کی شہزادی کا گمان ہوتا ہے۔ جو ہاتھ لگنے سے بھی میلی ہو جاتی ہو۔" دوسری کا تبصرہ اس کی گردن مزید اکڑا دیتا۔ ارے عفاف ان آنکھوں میں اگر کاجل ڈالو تو کیا کیا قیامت نہ ڈھا دیں گی اور تمہارے ہاتھ جیسے کسی سنگ تراش نے بڑی مہارت سے تراشے ہوں۔ یہ ان کا

گاہے بگاہے ادا کیے جانے والے جملوں کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے گھر کے ان کاموں سے بھی ہاتھ کھینچ لیا جو مارے باندھے اماں کی ڈانٹ ڈپٹ کے نتیجے میں کبھی کرلیا کرتی تھی۔ اسے لگتا برتن دھونے سے اس کے خوب صورت ہاتھ خراب اور گلابی ناخنوں کی چمک ماند پڑ جائے گی۔ ایسی خوب صورت لڑکیوں کے لیے شہزادے ہی آیا کرتے ہیں۔ اس سوچ نے حسن کو مزید نکھارنے کی سوچ بخش دی۔ پہننے' سجنے' سنورنے کا شوق کیا پیدا ہوا وہ ہادیہ سے فرمائش کرتی فلاں میچنگ چوڑیاں لینی ہیں' پنک کلر کا ایسا شیڈ لپ اسٹک میں لادو۔ ہادیہ اس کی فرمائشیں بڑی خندہ پیشانی سے پوری کردیتی تھی لیکن اماں کو اس کے یہ طور طریقے پسند نہیں آرہے تھے۔ انہیں جب موقع ملتا اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں جسے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔

☆ ☆ ☆

چھٹی کا دن تھا۔ ہادیہ نے صبح مشین لگا کر سارے کپڑے دھوئے تھے۔ اب وہ کھانا بنا کے آئی تھی۔ گھر کی صفائی وہ کپڑے دھونے کے ساتھ ساتھ ہی مکمل کر چکی تھی۔ اماں صبح سے کپڑوں کی سلائی میں الجھی تھیں۔ جبکہ عفاف کی چھٹی والے دن صبح دیر سے ہوتی تھی۔ اس کے اٹھنے پر ہادیہ نے اس کا پسندیدہ مل دار پراٹھا' آملیٹ کے ساتھ بنا کے اسے دیا۔ اماں نے کہا بھی کہ بہن کے ساتھ مل کر کپڑے ہی دھلوا لو وہ ان سنی کیے اپنے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ چھوٹے ٹیپ ریکارڈر میں پسند کے گانوں کی کیسٹ لگائی ساتھ ہی منہ پر انڈے' شہد' لیموں کا ماسک لگا کر لیٹ گئی۔ اس سے فارغ ہو کر بالوں کی سیوا کے لیے دہی اور سرسوں کا تیل سر میں لگایا۔ درمیان میں ایک دفعہ چائے بھی پی اور اماں کو دی اور کچھ دیر سے اماں پر دباؤ تھا کہ اسے اگلے ہفتے ہونے والی پارٹی میں نیا سوٹ دلا دیں جس سے انکار کی صورت میں اب اسے روتے دیکھ کر ہادیہ کا دل پسیج گیا۔

"اچھا تم اگر رونا چھوڑ دو تو میں کچھ کر سکتی ہوں۔" سوں سوں کرتی عفاف کو دیکھ کر ہادیہ نے کہا۔

"سچ۔" شفاف چہرے پر خوشی کے رنگ اتنے واضح تھے کہ ہادیہ نے نظر لگ جانے کے ڈر سے نظر چرالی۔

"مجھے کل اخبار سے کچھ پے منٹ ملنی ہے۔ کالج سے واپسی پر میں اور تم مارکیٹ چل کے تمہاری پسند کا سوٹ خرید لائیں گے ٹھیک۔" ہادیہ کے کہنے پر وہ بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔

"ہادیہ تم دنیا کی سب سے اچھی بہن ہو۔" خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے کہا۔

"السلام علیکم چچی جان کیا حال ہے۔" باہر سے آتی علی کی آواز پر وہ دونوں چونک گئیں۔

"ارے علی آیا ہے!" ہادیہ خوشی سے دروازے کی سمت بڑھی۔

"میرا پوچھے تو کہنا سو رہی ہوں ورنہ یہاں آجائیں گے موصوف دماغ چاٹنے اور تم خوش ہو رہی ہو علی آگیا۔ جیسے علی نہیں کوئی وزیراعظم آگیا ہو۔" اس نے منہ بناتے ہوئے باہر جاتی ہادیہ کو کہا تو جواباً اس نے مڑ کر اسے تنبیہی نظر سے دیکھا اور خود باہر نکل گئی۔

"پاگل ہے یہ ہادیہ بھی۔" اس نے سوچا اور کروٹ بدل کر سوتی بن گئی۔

"کیا حال ہے علی؟ کیسے ہو؟ گھر میں سب کیسے ہیں؟" سلام کے بعد ہادیہ نے اماں کے پاس بیٹھے علی سے سب کی خیریت دریافت کی۔

"وعلیکم السلام اور بس رہنے دو یہ منہ دیکھے کی محبتیں۔ مہینوں شکل نہ دکھاؤ تب بھی آپ نے نہیں پوچھنا ہوتا کہ خیر تو ہے اور جب نظر پڑ جائے تب ساری خیر خیریتیں یاد آجاتی ہیں۔" علی نے منہ بنا کر خاصے جلے لہجے میں کہا تو ہادیہ اس کے بچپنے پر مسکرا دی۔ علی سے بڑے کھمل سے اس کی نسبت بچپن سے طے تھی۔ جبکہ علی سے وہ بھائیوں کا سا انس رکھتی تھی۔ وہ بھی اس سے خوب لاڈ اٹھواتا۔ فرمائشیں کر کر کے اپنی پسند کی چیزیں بنواتا جبکہ عفاف جو کہ ہادیہ کو صرف اپنی پراپرٹی سمجھتی تھی ان دونوں کے لاڈ و پیار کے مظاہرے پر خاصی جلس ہو جاتی اور اکثر یا تو اس کی علی سے لڑائی ہو جاتی یا اپنا کمرہ بند کر کے نظر بند ہو کر بیٹھ جاتی۔ جب سے اس نے تائی اماں سے سنا تھا کہ ہادیہ کی شادی ___ کے ساتھ ان کی خواہش ہے کہ علی کی جاب ہوتے ہی وہ عفاف کو بھی اپنی بہو بنائیں تو اماں جہاں خوشی سے نہال ہو گئیں وہاں عفاف یہ سن کر تو آگ بگولہ ہو گئی کہ اس سے نسبت کی خواہش کا اظہار علی نے خود تائی اماں سے کیا تھا۔ جبکہ وہ اپنے ان خوابوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی جس میں اس کی اڑان کسی بے حد امیر کبیر شخص تک تھی جو اس کی ہر وہ خواہش پوری کر دینے کی طاقت رکھتا ہو جو اس کے منہ سے ادا ہو جبکہ علی جیسے متوسط گھر کے لڑکے کا ان خوابوں میں کہیں دور دور تک گزر نہیں تھا جو ابھی اپنے تعلیمی مدارج کو طے کر رہا تھا بھلے وہ اس کا تایا زاد ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اس کی لو دیتی آنکھوں سے سخت الجھن ہوتی سو کچھ عرصہ سے وہ اس کا سامنا کرنے سے گریز کرنے لگی تھی۔

"آج وہ شاہانہ مزاج کی مالک آپ کی بہن نظر نہیں آرہیں کہیں آج پھر کسی فرمائش کے پورا نہ ہونے پر کمرہ بند کر کے تو نہیں بیٹھیں۔" وہ بھی اس کے مزاج کے تمام رنگوں سے واقف تھا۔ ہادیہ تو پکوڑے اس کے سامنے رکھتے ہوئے محض مسکرا دی جبکہ اماں کو اس کی شکایتیں لگانے کے لیے یقیناً کوئی سامع درکار تھا سو شروع ہو گئیں۔

"بس بیٹا! بیٹا سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اس لڑکی کا؟ کیسے سمجھاؤں ماں باپ اور اس گھر کی حالت سے ناواقف تو نہیں ہے۔ کیسے کھینچ تان کر گزارا ہو رہا ہے اس ہوشربا مہنگائی میں دیکھتی ہے سب کچھ نادان تو نہیں ہے پر پھر بھی ہر دوسرے دن کوئی نئی فرمائش لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کبھی سوٹ، کبھی جوتا، کبھی میچنگ جیولری چاہیے نوابزادی کو۔ اوپر سے بگاڑنے کے لیے یہ کھڑی ہے ہادیہ اور جو کسر رہ جاتی ہے وہ تمہارے چچا پوری کر دیتے ہیں۔" اماں تو خاصی جلی بھنی بیٹھی تھیں۔

"اچھا اماں۔ آپ غصہ نہ کریں بابا بھی ہے آپ کا بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔ اور عفاف میں تھوڑا سا بچپنا ہے اور کچھ نہیں وقت گزرنے کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ۔ یہ پکوڑے کھائیں۔ ہادیل نے اماں کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

"جی چچی ہادیل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ ہمارے گھر کب آرہی ہیں؟" اس نے بات بدل دی تو اماں بھی سر جھٹک کر اپنی مصروفیات کا رونا رونے لگیں۔

"بس بیٹا چکر لگاؤں گی جلدی۔ یہ تو آج بچیاں گھر میں ہیں چھٹی کی وجہ سے ورنہ تو گھر کے ہزاروں بکھیڑے کہاں نکلنے دیتے ہیں۔ ہادیل ناشتا، دوپہر کا سالن بنا کے جاتی ہے۔ پھر بھی چھوٹے چھوٹے کئی کام کرنے والے ہوتے ہیں اور پھر سلائی بھی کرنی ہوتی ہے۔" انہوں نے علی کو خاصی تفصیل سے اپنی مصروفیات سے آگاہ کیا۔

☼ ☼ ☼

"انسان کی زندگی میں سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا اس نے سوچا ہوتا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو ازل سے انسان کی قسمت میں لکھا ہے۔ تو پھر کیوں نہ رب کی مرضی کو اپنا ارادہ بنا کر زندگی کو پرسکون کر لیا جائے۔ اسی میں جزا ہے۔ اسی میں فلاح ہے۔" اسی میں بھلائی ہے۔ پر ہم ناشکرے انسان خواہشات کے پورا نہ ہونے پر شور مچا دیتے ہیں۔ رب کی رضا میں راضی ہونے والوں کو شکوے کی ضرورت کبھی بھی نہیں پڑی، وہ رب کی عطا کردہ ہر چیز پر قانع رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی راستہ نہیں بھٹکتے اور ہمیشہ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔" آسمانی رنگ کے لان کے دوپٹے کو اپنے مخصوص انداز میں لپیٹے وہ پورے جذب سے اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ان نوخیز بچیوں کے اندر انڈیل رہی تھیں۔ جن کو کبھی تو ان کی باتیں سمجھ میں آجاتیں اچھی بھی لگتیں پر کبھی تو سر کے اوپر سے گزر جاتیں۔

"باجی جی، میری اماں مر گئی ہے۔ ابا نشہ کرتا ہے۔ سارا دن نشہ کر کے پڑا رہتا ہے۔ دوسری اماں سارا کام مجھ سے کرواتی ہے اسکول بھی نہیں جانے دیتی۔ یہاں بھی صرف سپارہ پڑھنے کے لیے مشکل سے اجازت ملتی ہے۔ دو وقت کی روٹی بھی کبھی نصیب ہوتی ہے کبھی نہیں۔ ایسے میں انسان اللہ سے شکوہ نہ کرے تو کیا کرے۔" ان میں سے ایک لڑکی تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔ دس گیارہ سال کی اس بچی کی سوچ اس کے حالات کی عطا کردہ تھی۔

"یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے اسے پاس بلایا۔

"یہ بتاؤ اللہ سے شکوہ کرنے سے کیا تمہاری زندگی بدل گئی؟ نہیں ناں۔" نفی میں ہلاتے سر کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"تو کیوں نہ شکر کر کے کچھ ثواب کما لیا جائے۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا مہربان آج اگر تمہیں دکھ کی بھٹی میں سلگا رہا ہے تو اس میں اس کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ اس کی رضا پر راضی رہو وہ تمہیں سکھ کی چھاؤں بھی بخشے گا۔"

"باجی جی، یہ بھی اپنی سوتیلی اماں کے آگے زبان چلاتی ہے۔ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کو خوب مارتی ہے اور اس کی اماں میری اماں کو بتا رہی تھی کہ چھپ کے بھی چوری کر کے چیزیں کھاتی ہے۔" ایک دوسری لڑکی جو غالباً" اس کی ہمسائی تھی نے کہا تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے اپنے پاس بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔

"ہاں تو کیوں نہ ماروں، جب مجھ سے کام کروائیں گی تو ماروں گی۔ روٹی نہیں دیں گی تو چوری کر کے کھاؤں گی ناں۔" جواب میں اس لڑکی نے بھی ذرا سی شرم بھی نہ رکھی اور فٹ سے جواب دے دیا۔

"دیکھو بیٹا اللہ نے دو چیزیں انسان کو ایسی عطا کی ہیں جن سے وہ ساری دنیا کو زیر کر سکتا ہے۔ صبر کی طاقت اور محبت کا جذبہ، پر شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال بروقت ہو۔ مثلاً" صبر وقت پر کرو۔ وقت گزر جانے کے بعد جو کیا جائے وہ صبر نہیں مجبوری ہوتی ہے۔ دوسرا محبت کو ایسے لوگوں پر ضائع مت کرو جو اس کے

قابل نہ ہوں۔ یہ بڑا انمول جذبہ ہے۔ تمہاری سوتیلی ماں بھی انسان ہے۔ اس کو اپنی سگی ماں کا درجہ دو اس سے محبت کرو۔ اس کا کہنا مانو۔ صرف چند دن ایسا کر کے دیکھو پھر مجھے آکر بتانا کہ کیا ہوا۔ کرو گی ناں ایسے؟" انہوں نے بڑے مان سے کہا تو لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب سب جاؤ اور یاد رکھنا کہ اچھی بات اور اچھی نصیحت کو وقت پر سمجھ لینا اور آزمالینا ہی فائدہ مند ہوتا ہے۔" انہوں نے دھیرے سے کہا تو لڑکیاں اپنے بیگ، سپارے اٹھائے اللہ حافظ کہتی چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

"بس جمال دین اب میں کوئی بھی عذر نہیں سنوں گا میرے کمیل کی بینک میں نوکری ہو گئی ہے۔ اب ہماری ہادیل کو جلدی سے ہمارے حوالے کر دو۔" تایا ابا' تائی امی اور علی آج مٹھائی لے کر ان کے گھر آئے تھے۔

"بھائی جان "آپ کی امانت ہے جب چاہے لے جائیں میں نے کب منع کیا ہے۔" جمال دین نے بڑے بھائی کا مان رکھا تو وہ خوشی سے کھل گئے۔

"پر بھائی صاحب' لڑکیوں کی شادیوں میں ہزار قسم کی تیاریاں ہوتی ہیں' بھلے سے ہماری بچی آپ کی امانت ہے پر اگر سال چھ ماہ کی مہلت دے دیں گے تو زیادہ نہیں تو اپنی اوقات کے مطابق تو رخصتی کریں ناں ہم لوگ۔" اماں نے ہچکچاتے ہوئے جمال دین کو دیکھ کر تایا ابا سے کہا۔

"کیا بات کرتی ہو بھابھی! ہم ہادیل کو بہو بنا کر نہیں لے جا رہے جو آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔ یہ جب پیدا ہوئی تھی تب ہی سے کمیل کے ابا نے اور میں نے اسے بیٹی مان لیا تھا اور بیٹیوں کو دیتے ہیں ان سے لیتے تھوڑا ہی ہیں۔ خبردار جو کوئی غیروں والی بات کی ہو تو۔ بس اگلے مہینے کا کوئی مبارک دن ہمیں دے دو جب ہم اپنی بیٹی کو لے جائیں۔" تائی امی نے کہا تو تایا ابا نے بھی تائید میں سر ہلا دیا جبکہ ان کے اتنے ظرف اور محبت پر اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ احساس تشکر کے مارے وہ کچھ بول ہی نہ پائیں۔

"کمیل کی طرف سے بھی کوئی پابندی نہیں اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اگر ہادیل بیٹی چاہے تو آگے بھی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے۔" تایا ابا نے کہا۔ تو اماں کو اپنی بیٹی کے نصیب پر رشک آیا۔ جسے اتنے قدر کرنے والے لوگ مل رہے تھے۔

علی کب کا بڑوں کی محفل سے نظر بچا کر کچن میں کام کرتی ہادیل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ آج تو خوش قسمتی سے عفاف بھی وہیں موجود تھی لیکن ہادیل کا کسی کام میں ہاتھ بٹانے کے بجائے وہ ایک طرف کھڑی بس نخرے کیے جا رہی تھی جب علی وہاں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر عفاف کا منہ بن گیا تھا جسے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کرتے ہوئے علی نے زوردار آواز میں سلام کرنے کے بعد ان دونوں کی خیریت دریافت کی۔

"ویسے یار ہادیل اب تو تم اس گھر میں مہمان ہو یہ کام وام چھوڑو اور فارغ لوگوں کے ذمے بھی کچھ کام لگاؤ' کچھ ہاتھ پیر وہ بھی ہلالیں۔" اس نے کن انکھیوں سے عفاف کو دیکھتے ہوئے کہا۔ حسب توقع اس کی بات سنتے ہی وہ بگڑ گئی۔

"فارغ ہوں میرے دشمن' تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے تم سے تو نہیں کروا رہے کام۔" وہ بد تمیزی سے بولی۔

"بہت غلط بات ہے عفاف' مذاق اپنی جگہ لیکن اب تم بد تمیزی کر رہی ہو۔" سالن میں چمچ ہلاتی ہادیل نے تنبیہی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ ہونہہ کر کے رہ گئی۔ جبکہ علی ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ عفاف جو پہلے اس کے مذاق کا جواب مذاق سے دیا کرتی تھی اور شرارتی سی نوک جھونک کو وہ دونوں انجوائے کرتے تھے اب اس کی کسی بھی بات کا الٹا مطلب نکال کر بد تمیزی سے جواب دے کر یا تو منہ پھیر لیتی یا وہاں سے ہٹ جاتی۔ اسے یہ صورت حال خاصی تکلیف دے رہی تھی کیونکہ محبت بے رخی تو سہ سکتی ہے' تضحیک برداشت کرنے کا

حوصلہ نہیں رکھتی وہ بھی ایک مرد کی محبت۔

"ویسے میں سوچ رہا تھا اگر آج کمیل بھائی بھی آجاتے اور آپ کے چہرے پر کھلے یہ رنگ دیکھ لیتے تو ایک ماہ بعد کے بجائے ابھی شادی پر زور دیتا تھا انہوں نے۔" اس نے دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بادیل کو دیکھ کر چھیڑا۔

"حد ادب لڑکے! اب تم سے میرا جو رشتہ بننے والا ہے وہ احترام کا متقاضی ہے مسٹر۔" بادیل نے مصنوعی رعب سے اسے کہا۔

"ارے یار وہ تو بہت بعد کی بات ہے سب سے پہلے تو میری بہن ہو تم۔ اس کے بعد سہیلی ہو جس سے ہر دکھ سکھ بانٹ لیتا ہوں پھر چچا زاد ہو۔ ان سب کے بعد ہی بھابھی کا رشتہ آتا ہے۔ ویسے جب جب میں تمہاری کوکنگ سے لطف اندوز ہوتا ہوں دعا کرتا ہوں جلدی سے ہمارے گھر کی رونق بننے آجاؤ تاکہ مزے مزے کے کھانے کے لیے مجھے یہاں نہ آنا پڑے۔"

"کیوں یہ تمہاری نوکرانی بن کے آرہی ہے کیا؟" دروازے سے ٹیک لگا کر ہاتھ باندھے کھڑی عفاف سے زیادہ دیر برداشت نہ ہو سکا تو جل کر بولی۔

علی جو اسے دانستہ نظر انداز کیے بادیل سے باتیں کر رہا تھا چونک کر مڑا۔

"ویسے کزن کیا آج کل روز کریلے کھا رہی ہو یا نیم کا سالن جو بھی بولتی ہو کڑوا کڑوا سا ہی نکل رہا ہے زبان سے۔" وہ خاصے دوستانہ انداز میں اس سے بولا۔ ابھی وہ جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہی تھی کہ اماں کچن میں داخل ہوئیں۔

"بادیل' عفاف جلدی کرو بیٹا۔ کھانا لگا دو۔" اماں عجلت میں اندر آکر بولیں تو عفاف بھی جواب تک فارغ ہی کھڑی تھی بادیل کی مدد کی غرض سے آگے بڑھ آئی۔ جبکہ علی پر سوچ انداز میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے انداز کچھ چونکا رہے تھے لیکن وہ دانستہ نظر انداز کر رہا تھا' پتا تھا کہ اس کے مزاج میں بچپنا ہے۔ اس دن تایا اور تائی جان اگلے مہینے کی تاریخ طے کر ہی گئے تھے اور ساتھ ہی تائی اماں نے اماں' ابا کے کان میں عفاف کے رشتے کی بات بھی ڈال دی تھی کہ جونہی علی تعلیم سے فارغ ہوا تقریباً" سال بھر بعد تو وہ اس کی تاریخ بھی لے جائیں گے۔ اماں دل میں اپنے رب کی بے حد مشکور تھیں جنہوں نے گھر بیٹھے ہی ان کو شریف' قابل اور ایسے داماد دیے تھے جو ان کو اپنی ماں کی طرح سمجھتے تھے۔ ویسے بھی بادیل کی طرف سے تو وہ مطمئن ہی تھیں انہیں عفاف کے تیور ڈراتے تھے اس کے مزاج کی تیزی اور خود سری انہیں بہت خوفزدہ رکھتی تھی۔

اگلے دن وہ شام کو وہ ہی سوٹ پہن کر بہت اہتمام سے تیار ہوئی جو تین دن پہلے ہی بادیل نے اپنے پیسوں سے اسے حسب وعدہ دیگر لوازمات کے ساتھ دلوایا تھا۔ اسی دن اس نے اماں سے وہ شیفون کا رائل بلیو سوٹ سلوایا تھا جس پر گلابی کٹ موتیوں کا خوب صورت سا گلے' بازو اور گھیرے پر کام تھا۔ ساتھ میں بلیو اور پنک چوڑیاں۔ ٹوپز اور پاؤں میں ست رنگی دھاگوں والی چپل پہن کر تیار ہو گئی۔ اندر آتی بادیل اسے دیکھ کر ٹھٹک کر دروازے کی چوکھٹ پر ہی رک گئی۔

"یہ... یہ سوٹ تو تم نے فنکشن کے لیے بنوایا ہے۔ پھر آج کیوں پہن لیا؟" اس نے حیرانی سے بے حد خوب صورت نظر آتی بہن کو دیکھ کر سوال کیا۔

"ہاں بنوایا تو پارٹی کے لیے تھا پر آج شرمین نے انویٹیشن دیا ہے اپنی برتھ ڈے کا۔ نہ صرف دعوت نامہ بلکہ جب واپسی میں تم تو اپنا آرٹیکل دینے چلی گئی اخبار کے دفتر۔ وہ میرے ساتھ ہی آگئی تھی۔ اماں سے اجازت لینے' پہلے تو اماں نہیں مان رہی تھیں پر وہ شرمین ہی کیا جو اپنی نہ منوا سکے۔" اس نے بے حد خوش ہو کر دیوار پر لگے آئینے میں گھوم کر خود کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا اپنے بے پناہ حسن کی آگہی کا احساس تھا یا شرمین کی برتھ ڈے پر جانے کی خوشی۔ بادیل نے بے حد الجھ کر کہا۔

"پر ابا تو شام کو آتے ہیں مغرب کے بعد تم جاؤ گی

کیسے؟" اب کے بادیل نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"شرمین لے جائے گی اور چھوڑ جائے گی۔ اماں نے اسی شرط پر تو اجازت دی ہے۔" اس کی بے نیازی قابل دید تھی۔
"جو بھی ہو میں تو یہی کہوں گی کہ بندہ کم از کم دوستی اپنے جیسے لوگوں میں کرے تاکہ دوستی جیسے رشتے کو نبھایا جاسکے اور برتھ ڈے پر اس کی حیثیت کے مطابق گفٹ بھی تو دینا ہوگا' وہ کیا دو گی؟" ناصحانہ انداز میں اسے سمجھاتے اس نے بار بار گھڑی پر نظر ڈالتی عفاف سے سوال کیا۔
"اف بادیل۔۔۔ تم میں بھی ناں۔۔۔ اماں کی روح حلول کرتی جارہی ہے۔ پتا نہیں بے چارے کمیل بھائی کا کیا ہوگا؟" تیزی سے کہتی عفاف کا لہجہ آخر میں شرارتی ہو گیا۔
"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بادیل نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔ پتا نہیں کیوں عفاف کی شرمین سے دوستی اسے ویسے ہی ناگوار گزرتی تھی اور اب یہ دوستی کالج سے نکل کر گھر کی حد تک آپہنچی تھی تو اسے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ شرمین کسی مل اونر کی فیشن کی بے حد دلدادہ لڑکی تھی جو کلاسز بنک کر کے اکثر گراؤنڈ میں ہی اپنی دوستوں کے ہمراہ نظر آتی تھی۔ اس سے دوستی نے عفاف کی پڑھائی پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا اس لیے اس نے بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اب عفاف کے بدلے تیور کی کچھ وجہ تو سمجھ میں آہی گئی تھی ایسے میں اس دوستی کا پروان چڑھنا اسے قطعاً گوارا نہیں تھا۔
"کافی دنوں سے کچھ پیسے جمع کیے تھے کہ اگر اماں نے سوٹ نہ بنایا تو اپنا سوٹ اور دوسری چیزیں لوں گی۔ اب سوٹ اور چیزیں تو تم نے دلا دیں۔ ان پیسوں کا میں نے اس کی پسند کا پرفیوم لے لیا ہے۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔ بادیل کی اتنی تفتیش اسے ناگوار گزری تھی۔ ایک تو کوئی خوشی اگر غلطی سے میری زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اسے بھی اماں اور بادیل کی باتیں ضائع کرنے میں ایک منٹ نہیں لگاتیں۔ ایک چھوٹے سے شکوے نے دل و دماغ کا چور دروازہ کھول کر جھانکا ہی تھا کہ باہر گلی میں شرمین کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔
"اماں کہہ رہی تھیں وہ تایا کے گھر سے مغرب سے پہلے تک لوٹ آئیں گی۔ تم دروازہ بند کرلو میں جارہی ہوں۔ شرمین واپسی پر بھی چھوڑے گی لہٰذا کہنا پریشان مت ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا اور بادیل کو کسی سوچ کے حصار میں چھوڑ کر بیرونی دروازہ پار کر گئی۔

☼ ☼ ☼
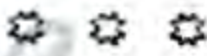
رنگوں' روشنیوں اور خوب صورتی کا ستاروں بھرا جہاں تھا عفاف آگئی تھی۔ اپنا قیمتی لباس باقی سب سے اسے بے کا لگا اور کم مائیگی کے احساس نے کچھ دیر تو اپنے حصار میں لیے رکھا اس وقت تک جب تک کسی کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ مخلوط محفل میں لڑکیوں کا ہجوم جس شخصیت کے گرد جمع تھا' وہ ٹی وی و فلم کا ایک ابھرتا ہوا اداکار تھا جو رشتے میں شرمین کا تایا زاد تھا اور جس نے اداکاری میں بے حد دولت اور شہرت کمانے کے بعد اب اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولا تھا۔ لڑکیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں جب ہجوم میں ہی اس کی نظر ایک جانب کھڑی کچھ ہراساں سی اس لڑکی پر پڑی۔ اسی پل وہ اس ہجوم کو ایک طرف ہٹاتا تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔
"ہیلو! آئی ایم فخر جمال۔ کین آئی آسک یور گڈ نیم پلیز؟" بڑی خوش دلی سے اس نے اس کو مخاطب کر کے چونکا دیا۔ جبکہ عفاف کا پوری زندگی میں مردوں کے نام پر اپنے ابا سے واسطہ پڑا تھا یا علی' کمیل اور تایا ابا سے سو بالکل کسی اجنبی کو اتنا فری ہوتا دیکھ گھبرا گئی ایسے میں شرمین ہی اس کی مدد کو آئی تھی۔
"عفاف ہے میری کالج میٹ' کلاس فیلو اور فرینڈ۔"
"ان کی طرح ان کا نام بھی بہت منفرد اور خوب

صورت ہے۔" وہ شوبز کی دنیا کا باسی تھا پھر مرد تھا ایک عورت پر تڑپ کا کون سا پتا کس پل آزماتا ہے اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پندرہ منٹ کی اس ملاقات میں وہ سر جھکائے اپنی انگلیاں چٹخاتی رہی پر ایک دولت مند، وجیہہ شخص کو جس کی باتوں میں جادو تھا اپنے دل میں آنے سے نہ روک پائی تھی۔ واپسی کا سفر جیسے خوشبو کا سفر تھا۔ وہ پوری رات اس کے خوب صورت جملوں کے حصار میں رہی تھی۔

"عفاف! آج کل میں ایک ڈراما شوٹ کرنے والا ہوں۔ اس میں ہیروئین کی جو ڈیمانڈ ہیں حسین، معصوم، جس کو دیکھتے ہی خیال آئے کہ اس کو تو ہوا بھی چھونے سے ڈرتی ہو گی۔ آپ ان تمام خصوصیات پر ایک سو ایک فیصد پوری اترتی ہیں یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ فخر پروڈکشن میں کام کرنے کو لوگ ترستے ہیں اور فخر جمال آپ کو خود یہ آفر کر رہا ہے کاش آپ جان سکتیں کہ کتنا بڑا اعزاز پایا ہے آپ نے۔ اپنے حسن کی طاقت سے واقف نہیں ہیں آپ ورنہ اس وقت ایسے پریشان نہ کھڑی ہوتیں۔ کچھ بولیں تو سہی جواب میں۔" اس کے اصرار کرنے پر پاس کھڑی شرمین نے اس کو شوکا دیا تو وہ چونک گئی۔

"جی میں سوچوں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"شرمین مجھے چھوڑ آؤ بہت دیر ہو گئی ہے۔" فخر کو کچھ لڑکیوں نے آگھیرا تو اس نے شرمین کا بازو ہلا کر کہا۔

☆ ☆ ☆
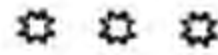
اگلے دن کالج میں بھی یہی موضوع زیر بحث رہا اس کا گروپ اس کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ آج باویل نے موسمی نزلہ بخار کی لپیٹ میں آجانے کے باعث چھٹی کی تھی سو آج کلاسز بنک کر کے اپنی تعریفیں سنتے ہوئے اس کا سر فخر سے اونچا ہوا جا رہا تھا۔

"کتنی خوش قسمت ہو تم عفاف! جو فخر جیسے شخص نے تمہیں اہمیت دی اور اپنے ڈراموں میں کام کرنے کی آفر کی۔ میں تو حیران ہوں تم نے یہ کیوں کہا کہ میں سوچوں گی۔ تمہیں تو فوراً" ہاں بھر لینی چاہیے تھی۔" شرمین کا تعلق جس کلاس سے تھا اس میں تو شوبز سے تعلق رکھنے والوں کا اسٹیٹس ہی الگ تھا۔

"میرے گھر والے کبھی بھی نہیں مانیں گے شرمین۔ اماں تو یہ سنتے ہی مجھے گھر بٹھا لیں گے۔ شاید امتحان بھی نہ دینے دیں۔ ان کے خیال میں تعلیم مجھے نہیں، میں تعلیم کو بگاڑ رہی ہوں۔" اس نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ دل میں کہیں دور دبی حسرت اچانک انگڑائی لے کر جیسے بیدار ہو گئی۔ "اور باویل" اماں سے زیادہ اس نے رولا ڈال دینا ہے۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"بہرحال میرا پھر بھی یہی مشورہ ہے تم اس آفر کو بغیر سوچے ٹھکرا مت دینا۔ فخر جمال ایسی آفرز ہر کسی کو نہیں کرتا۔" شرمین نے اس سے مزید کہا اور اس کے بعد ان کی گفتگو کوئی اور رخ اختیار کر گئی۔ جبکہ عفاف دماغ میں الجھی سلجھی کئی سوچیں لیے گھر لوٹ آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج وہ بہت دنوں بعد گھر سے باہر نکلی تھیں۔ سفید چادر میں خود کو اس طرح لپیٹے کہ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ گلی سے نکل کر مین روڈ تک آئیں، وہاں سے رکشہ پکڑ کر راستے میں ایک سپر اسٹور سے مختلف کھانے پینے کی چیزیں خریدیں اور مطلوبہ جگہ پر مطلوبہ وقت میں پہنچ گئیں۔ چھٹی کا ٹائم ہو چلا تھا۔ سامنے گیٹ سے سفید یونیفارم میں ملبوس ننھے فرشتوں کے غول کے غول شور مچاتے، چھٹی کی خوشی لیے باہر نکل رہے تھے ان کی متلاشی اور پیاسی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جلد ہی وہ گوہر مقصود سامنے آئے تو وہ بے چین ہو اٹھیں انہوں نے بھی شاید اس مخصوص جگہ پر ان کو کھڑے دیکھ لیا تھا وہ تیزی سے بھاگ کر ان کے پاس آ گئے۔

"آپ کہاں چلی گئیں تھیں؟ ہم روز آپ کا ویٹ

کرتے تھے۔" ننھے فرشتے نے شکوے کا سرا پکڑا یا تو چھوٹی پری بھی پیچھے نہ رہی۔

"آج ہمارے لیے کیا لائی ہیں؟" وہ اچھل کر گویا شاپرز پکڑے ہاتھوں تک پہنچنے کی سعی کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں ان کے ہاتھ کی بنی کھیر مزے سے کھا رہے تھے اور واپسی پر ڈھیروں چاکلیٹس اور جوس کے ڈبے ان کے ساتھ تھے۔ وہ درخت کی اوٹ میں کھڑی ہو کر ان کو اس وقت تک دیکھے گئیں جب تک کہ ان کی گاڑی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اس تڑپ اور تنہائی نے اب مرتے دم تک ان کے ساتھ رہنا تھا۔ انہوں نے گہری سانس لے کر سوچا اور ہولے ہولے چلتی واپسی کے سفر کے لیے قدم بڑھاتی گئیں۔

"کب سے آپ کو کہے جا رہی ہوں کہ ہر دس پندرہ روز بعد ایک اجنبی عورت آکر بچوں کو الا بلا کھلا کے چلی جاتی ہے۔ جو بھی تھوب میں چھپا ہوتا ہے۔ اور آپ ہیں کہ نوٹس ہی نہیں لے رہے۔ اسکول کی انتظامیہ سے بات کریں، مجھے تو یہ سوچ کر ہول اٹھتے ہیں کہ آخر اس کو پانچ سو بچوں میں سے ہی ہمارے بچوں سے کیوں محبت ہے اور اگر کسی دن وہ ان کو لے گئی تو؟ خدانخواستہ بردہ فروش گروپ سے تعلق نہ ہو اس کا۔ آج کل شہر میں اس قسم واقعات بھی بہت ہو رہے ہیں۔" عورت کے غم و غصے پر اب جیسے خوف غالب آگیا۔ جبکہ مرد نے اس کی بات کسی قدر سنجیدگی اور فکر سے سنی پر جب وہ بولا تو اس کے تاثرات کے برعکس اس کے الفاظ اس کی بیوی کو بھونچکا کر گئے۔

"وہ جو کوئی بھی ہے ہمارے بچوں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔" مرد نے اطمینان سے کہا کہ ان کے الفاظ کی گواہی خود اس کے دل نے دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا۔؟ یہ تم نے ابھی کیا کہا؟" کاغذ پر تیزی سے چلتا اس کا ہاتھ اور دروازے میں کھڑی اماں کا دل اس کے الفاظ کی سنگینی سے رک سا گیا۔ کہاں مجھ سے ایسی کوتاہی ہو گئی کہ اس کے قدم انجانی راہوں کی طرف اٹھنے کو بے قرار ہیں جن کی کوئی منزل ہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔

"اس میں کیا کہا وائی کیا بات ہے؟ بلکہ مجھے تو تمہارا رد عمل بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے کوئی ڈاکا ڈالنے کا پروگرام تم سے ڈسکس کر لیا ہو" لہجے کے سب ہی رنگ بغاوت لیے ہوئے تھے۔

"ڈاکا ہی تو ہے ماں باپ کی محبت اور اعتماد پر، جو تمہیں ہر روز دعاؤں کے حصار میں علم کی روشنی لینے کے لیے بھیجتے ہیں، فلم اور ٹی وی کے اندھیرے میں قدم رکھنے کے پروگرام بنانے کے لیے نہیں۔" اماں کی بد فعلی آواز پر وہ چونک کر مڑی ایک لمحے کے لیے رنگ ضرور پھیکا پڑا پر دوسرے ہی لمحے اس کی اڑی خود سری عود آئی۔

"دنیا ترستی ہے ایسے مواقع حاصل کرنے کے لیے۔ ہمارے گھر پر دولت اور شہرت کھڑی دستک دے رہی ہے تو یہاں زندگی موت کے مسئلے کھڑے ہونے لگتے ہیں ہر بات پر۔" بدتمیزی سے اس نے کہا۔

"دولت و شہرت بھلے تمہیں دستک دیتی دکھائی دے رہی ہے پر اس عزت کا جنازہ نکلتا دکھائی نہیں دے رہا جو دور کھڑی اپنی موت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہے۔ ہمیں غریب ہی رہنے دو ہمیں ایسی مشہوری بھی نہیں چاہیے۔ ہم غریبوں کے پاس سب سے قیمتی دولت ہماری عزت ہے۔ آج تمہارا باپ پھلوں کا ٹھیلا لے کر صبح منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا ہے پر اس کا سر اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ تمہاری ماں کے ہاتھ سلائیاں کر کر کے زخمی ہو گئے پر چار لوگ اس کی غیر موجودگی میں اس کا ذکر احترام سے کرتے ہیں۔ تم اپنے ماں باپ سے یہ فخر اور عزت چھیننا چاہتی ہو تو اس کی اجازت نہ تمہیں تمہارا باپ دے سکتا ہے نہ میں۔" اماں کے غصے کے آگے وہ چپ ضرور ہو گئی پر ان کے دلائل نے اسے قائل ہرگز نہیں کیا تھا۔

"کل سے تم کالج نہیں جاؤ گی۔ ویسے بھی دو ہفتے بعد پیپرز ہیں تو گھر میں رہ کر تیاری کرو۔ ہاویل تو ہفتہ ہو گیا گھر پر ہی ہے۔"

"ہاویل۔ ہاویل۔ ہاویل میں تھک گئی ہوں یہ نام سن سن کر۔ کان پک گئے ہیں میرے۔ ہاویل نہ ہو گئی کوئی فرشتہ ہو گئی جس کا کیا گیا ہر کام کرنا مجھ پر بھی فرض ہو جاتا ہے۔ اسے آوارہ گردی کرنے کی کھلی چھوٹ ہے۔ بازار' مارکیٹ' اخبارات کے دفتر کہاں کہاں نہیں پھرتی رہی یہ۔ کبھی جاننے کی کوشش بھی کی آپ نے کہ کیا کرتی پھرتی ہے باہر۔ پر آپ کی ساری پابندیاں میرے اوپر ہیں۔ کالج سے دیر کیوں ہوئی۔ کتنے پیریڈز لیے؟ کون تمہاری سہیلی ہے؟ کس کے ساتھ اٹھی بیٹھی؟" ہاویل کے نام نے اس کے شوریدہ اور باغی احساسات پر جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ بھڑک گئی۔ ہاویل جو اس کے تیکھے تیور دیکھ کر ہی بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ اپنے بارے میں جان سے پیاری بہن کے زہر آلود الفاظ سن کر ساکت رہ گئی۔ جبکہ باہر جاتی اماں پلٹ کر آئیں اور آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کیے۔

"یہ تھپڑ مجھے تمہاری پہلی ناجائز فرمائش کرنے پر لگانے چاہئیں تھے ایسا کرتی تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ہاویل میری ایسی اولاد ہے جس کے ہونے نے مجھے بیٹا نہ ہونے کا غم بھلا دیا اور تم ایسی اولاد کہ جس کے بیٹی ہونے کے خوف سے ساری عمر سکون سے سو نہیں پائی۔ آج مجھے پتا چلا کہ میرا وہ ڈر۔ وہ خوف بے جا نہیں تھا۔" غم و غصے سے ان کے سرخ و سفید چہرے عجیب سی یاسیت پھیل گئی۔ جبکہ عفاف بے یقینی سے اماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ سترہ سالہ زندگی کا کوئی پل بھی ایسا نہیں تھا جب اماں نے انہیں اونچی آواز میں بھی ڈانٹا ہو۔ کوئی سمجھانے والی بات ہوتی تو نرمی سے سمجھاتیں۔ اس پل دونوں بہنوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے' پر احساسات کے الگ الگ۔ بھنور نے دونوں کو جکڑا تھا۔ ہاویل کو جتنا عفاف کے الفاظ نے زخمی کیا تھا اتنا ہی اماں کے الفاظ اس کی قدر اپنی ہی نظر میں بڑھا گئے تھے۔ جبکہ عفاف کے اندر غم' غصے' بغاوت اور خود سری کا ایسا طوفان تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔ اس کی پسند کی زندگی لکن چھپائی کھیلتے ہوئے ایسی چمک دمک اور رنگینی دکھا کے لبھا رہی تھی' پر رشتے اس کے آڑے آرہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پلک جھپکنے میں ان ساری رکاوٹوں کو دور کر کے من پسند زندگی میں چلی جائے' جہاں سے کبھی پلٹ کر نہ آسکے۔ اس دن گھر میں ایک سوگ کی کیفیت طاری رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ان بہنوں نے اتنا لمبا وقت ایک دوسرے سے بغیر کلام کیے گزارا تھا۔ ہاویل نے کھانا بنایا تھا اور اس کے پاس آکر چپ چاپ کھانے کی ٹرے رکھ گئی تھی' جسے اس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ شام کو ابا کے آنے پر بھی وہ باہر نہ نکلی حالانکہ روزانہ کا اس کا معمول تھا کہ ابا جوں ہی گھر آتے ان سے پیار لے کر وہ اپنی پسند کے پھلوں کا لفافہ لے جاتی اور کاٹ کر دستر خوان پر رکھتی وہ کھانے کے دوران سارے دن کی روداد ابا کے گوش گزار کی جاتی' کوئی فرمائشی سلسلہ ہوتا تو وہ بھی اسی وقت پورا کرواتی جبکہ ہاویل اور اماں ابا کے ساتھ اس کے لاڈ دیکھ کر مسکرائے جاتیں۔

آج ابا کے آتے ہی کھانا کھا کر اماں اور ابا تایا جان کی طرف چلے گئے تھے۔ ہاویل باہر برآمدے میں ہی بیٹھی رہی تھی ایک بار کسی کام سے اندر آئی تو کھانے کی ٹرے جوں کی توں دیکھ کر محض ایک نظر اس پر ڈال کر واپس چلی گئی تھی۔ اماں' ابا کی واپسی بہت دیر میں ہوئی تھی۔ کمیل بھائی انہیں چھوڑنے آئے تھے۔ ہاویل سے انہوں نے عفاف کا پوچھا تو اس نے آہستگی سے جواب دیا کہ وہ سو چکی ہے۔ کچھ دیر وہیں اماں ابا کے ساتھ بیٹھ کر وہ واپس لوٹ گئے تھے۔ رات کو پتا نہیں کیا سوچتے سوچتے آخر نیند اس پر مہربان ہو ہی گئی تھی۔ صبح اپنے معمول پر اٹھ کر وہ کسی سے کچھ بولے بغیر اپنا یونیفارم لے کر صحن میں بنے واش روم کی طرف

بڑھی۔

"آج سے تم کالج نہیں جاؤ گی اور سترہ دن بعد تمہاری بھی بادیل کے ساتھ شادی کی تاریخ طے کر دی ہے ہم نے علی کے ساتھ۔ گھر بیٹھو اور شادی کی تیاریوں میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔" تخت پر بیٹھی چڑیوں کو روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتی اماں نے سپاٹ انداز میں اسے اطلاع فراہم کی۔ اس نے رک کر کچھ سوچا اور کپڑے وہیں پٹخ کر کمرہ نشین ہو گئی۔ آنسو ایک بار پھر اسی رفتار سے بہنا شروع ہو گئے۔ آئینے کے سامنے چٹیا گوندھتی بادیل کے ہاتھ اس کے بہتے آنسو دیکھ کر ذرا سست پڑے لیکن پھر سوچا کہ اس وقت ہمدردی کرنا اسے خود منہ کی پڑ سکتا ہے، سو آئینے میں ایک تنقیدی نظر خود پر ڈالتی وہ باہر نکل گئی۔

"بادیل کے لیے تو ایک سوٹ بھی لیں اماں تو وہ بھی اس کی مرضی، پسند اور رنگ پوچھ کر لیتی ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ بھی ایسے کر دیا کہ کوئی اپنے پالتو جانوروں کے بارے میں کیا کرتا ہو گا۔ اس پر بھی آپ کہتی ہیں کہ میں شکوہ نہ کروں تو کیا کروں۔ ساری زندگی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے پورا ہونے کے لیے سسک سسک کر گزاری، سوچا تھا میرا غیر معمولی حسن ہی میری قسمت بدلنے میں مدد دے گا اور کبھی میں بھی اپنے گھر میں راج کروں گی جس کے میں نے خواب دیکھے ہیں، پر آپ نے میری چھوٹی سی خواہش کی ایسی سزا دی مجھے کہ میری خواہشوں کو ہی میری قبر بنا دیا اور ویسا ہی گھر میرے نصیب میں لکھ ڈالا جس کا میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر جاؤں گی کہ آپ میری شکل دیکھنے کو بھی ترس جائیں گی۔ دل نے اس عجیب فیصلے پر اسے ڈانٹا بھی تھا، پر بے حسی کی جو چادر اس نے اوڑھ لی وہ ان سترہ دنوں میں کوئی بھی نہ اتار سکا، نہ ابا کی شفقت نہ اماں کا وہی معمول کا رویہ نہ بادیل کا بار بار شاپنگ پر جانے کے لیے اصرار۔ حتیٰ کہ اماں اور ابا نے جب رخصتی کے وقت اسے گلے سے لگایا تو وہ جلدی سے دور ہٹ گئی۔

دونوں بہنیں رخصت ہو کر ایک ہی گھر آئی تھیں۔

——— مختلف احساسات رکھنے والی ان بہنوں کے احساسات آج کیسے ایک ہو سکتے تھے۔ بادیل فطری طور پر مطمئن اور خوش تھی زندگی میں قناعت اور شکر گزاری کا سبق یاد کرنے والے لوگ ہمیشہ ہی پرسکون رہتے ہیں۔ پر عفاف کا دل اپنی بربادی کا ماتم کرنے کو کر رہا تھا۔ یہ گھر، یہ شخص اس کی منزل نہیں تھا۔ بے سکونی کی کیفیت نے اسے مستقل جکڑا ہوا تھا۔ ناشکری اور خود سری کا سبق لینے والے کبھی آسودہ نہیں رہتے وہ بھی نہیں تھی۔ علی کے والہانہ جذبے بھی اس پر جمی برف نہ ہٹا سکے وہ اس کا ساتھ پا کر بے حد خوش تھا۔ اس کی بے حسی کو وہ اس کی نئی نویلی دلہنوں والی شرم اور گریز سمجھا۔ ٹھٹکا تو اس وقت جب ولیمہ سے اگلے روز اماں اور ابا ان دونوں بہنوں کو ان کے دولہاؤں سمیت رسم کے لیے لینے آئے۔

"مجھے اس گھر میں دوبارہ قدم نہیں رکھنا جہاں سے ایک ان چاہا بوجھ سمجھ کر مجھے نکال باہر کر دیا گیا ہے۔" اس کے سخت اور سرد انداز پر علی پریشان ہو گیا۔

"کیا بات ہے عفاف کوئی ناراضی ہے چچا اور چچی سے تو دور ہو جائے گی۔ ماں باپ سے اولاد اور اولاد سے ماں باپ بھلا کب تک ناراض رہ سکتے ہیں۔" اس نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سمجھانا چاہا۔

"شاباش اٹھو تیار ہو جاؤ۔ چچا چچی، اماں ابا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ بادیل تو کب کی تیار ہو کر ان کے پاس بیٹھی ہے۔ صرف ملکہ عالیہ کا انتظار ہے۔" اس نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔

"میں نے کہا ناں، مجھے نہیں جانا نہ آج نہ آئندہ کبھی اور آج کے بعد کبھی نہ اس بات کے لیے تم اصرار کرو گے نہ وجہ پوچھو گے۔" وہ چیخ کر بولی۔ تو علی نئی نویلی دلہن کا یہ انداز دیکھ کر دنگ رہ گیا وہاں اماں، ابا چچا، چچی کے سامنے نظر آ گئے کہ اس کی چیختی آواز

وہاں موجود سب لوگوں نے سنی تھی۔

"اصل میں عفاف کو اپنی پڑھائی کے چھوٹنے کا بہت دکھ ہے تو غصے میں ایسا کہہ رہی ہے۔" بادیل صفائی دینے والے انداز میں بولی کہ اب وہ ان کے محض تایا' تائی نہ تھے' ساس سسر بھی تھے۔

"تو بیٹا میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ دونوں بچیاں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہو۔" تایا جان نے تحمل سے کہا۔ اماں آہستہ سے اٹھ کر عفاف کے کمرے کی طرف آ گئیں۔ وہاں کھڑا علی پریشان' بند دروازہ بجا رہا تھا۔

"عفاف۔ مت جاؤ چچا کے گھر' دروازہ تو کھولو ناں۔" اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مڑا۔ "بیٹا وہ ہم سے بہت ناراض ہے۔ جب ہم چلے جائیں گے تو دروازہ کھول دے گی۔ تم تو میرے پیارے بیٹے ہو ناں۔ پتا ہے اس کی عادتوں کا' نادان ہے۔ دل میں کوئی بات مت لانا۔ گھرداری میں پڑے گی تو سنبھل جائے گی۔" اماں کے لہجے میں ایک ماں کے اندیشے بول رہے تھے۔

علی نے ان کے گرد اپنے بازو حمائل کیے "ارے چچی' آپ پریشان مت ہوں۔ آپ سے زیادہ جانتا ہوں اس کو۔" اس نے مسکرا کر چچی کو تسلی دی۔ بادیل اور کمیل ان کے ساتھ چلے گئے تھے۔ بادیل کا رزلٹ آچکا تھا حسب معمول نمایاں نمبروں سے پاس ہوئی تھی جبکہ عفاف نے ضد میں آکر پیپرز دیے ہی نہ تھے' بادیل نے تایا اور تائی کے کہنے کے باوجود کالج میں داخلہ نہ لیا تھا بلکہ آرٹس مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے تھرڈ ایئر کی کتابیں منگوا کر گھر میں تیاری شروع کردی تھی۔ علی نے شادی کے بعد دن میں یونیورسٹی اور شام کو دو اکیڈمیز میں جاب کرلی تھی' وہ عفاف کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ حالانکہ معاشی طور پر تایا ابا کی فیملی زیادہ مستحکم تھی۔ تایا ابا ہر ماہ ایک معقول رقم خود بھی عفاف کو دیتے تھے۔ عفاف اس دن کے بعد اماں کے گھر نہیں گئی تو اماں' ابا نے بھی دوبارہ یہاں آنا گوارا نہیں کیا تھا۔ بادیل نے یہاں بھی پورا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ عفاف نے سرد مہری کی جو دیوار اپنے اور بادیل کے درمیان کھڑی کی تھی اس میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ تائی اماں بھی زیادہ تر بادیل کے گن ہی گاتیں ہر آئے گئے کے سامنے گیلے میں عفاف کا جی اور جل جاتا۔ ان ہی دنوں میں اس کے دماغ میں نہ جانے کیا سمائی کہ علی سے بیوٹیشن بننے کی اجازت طلب کی۔ وہ تو چاہتا یہی تھا کہ وہ خوش رہے سو اجازت دے دی۔ یوں شہر کے ایک مشہور پارلر سے ٹریننگ لینا شروع کردی۔ حسن کو نکھارنے کا صحیح فن اس نے وہیں سے سیکھا۔ اب وہی داؤ خود پر بھی آزمانے لگی۔ تائی امی بھی اب کھل کے نہیں تو دبے دبے انداز میں اس کے طور طریقوں پر بڑبڑانے لگی تھیں لیکن اسے پروا نہیں تھی شوپیس کی طرح گھر میں حسن کے جلوے بکھرائے پھرتی۔ دن کا آدھا حصہ باہر گزار کر باقی دن کسی مہمان کی طرح بسر کرتی۔ ان ہی دنوں جب اس کا کورس مکمل ہونے والا تھا علی کو ملنے والی جاب اور اس کا امید سے ہونا اسے ہواؤں میں اڑانے لگا۔ بادیل اب فورتھ ایئر میں آگئی تھی۔ اماں درمیان میں ایک مرتبہ پھر آئی تھیں ان کی آمد کا جان کر وہ چھٹی کا دن ہونے کے باوجود پارلر چلی گئی تھی۔

بادیل کے امتحانات ہو رہے تھے جب اس نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ شایان اور میرب بھی اس کے رویے میں تبدیلی نہ لاسکے' ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بچوں کی پیدائش پر آنے والے اماں اور ابا کے لیے وہ پچھلی ہر بار کی طرح کا رویہ نہ اپنا سکی' وہ لوگ بچوں کے لیے بے شمار سامان کھلونے لائے تھے۔ بادیل نے جس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی ابھی' بچوں کو اپنی پرشفقت آغوش میں لے لیا تو گویا عفاف اس ذمہ داری سے بھی آزاد ہوگئی۔ دبے دبے لفظوں میں کہنے والی تائی اماں اب کھلے الفاظ میں اس کی روش اور طور طریقوں کو ٹوکنے لگی تھیں پر یہاں پروا کسے تھی۔ اور اب تو کورس مکمل کرنے پر اس نے اسی پارلر میں جاب بھی کرلی تھی۔ دل میں دبی حسرتیں دبی ہی

رنجشیں اگر جو وہ واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا۔ اس دن وہ پارلر میں ہی تھی جب ایک پرجوش اور زوردار آواز نے اسے چونکا دیا۔

"ارے عفاف! اومائی گاڈ یہ تم ہو۔ ویسی ہی اسمارٹ' ویسی ہی خوب صورت۔" شرمین نے اسے پہچان کر چونکا ڈالا۔ عفاف بھی شرمین کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی' شرمین اب ایک ڈراما آرٹسٹ تھی' وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی' جتنا خود کو منوانے کے فن سے واقف تھی' دونوں ایک ریسٹورنٹ میں آ گئیں۔

"لوگاڈ اتنا سب کچھ ہو گیا اور ہمیں پتا بھی نہ چلا۔ ایک دن تمہارے گھر بھی گئی تھی تالا لگا ہوا تھا ساتھ والوں نے بتایا تم بہنوں کی شادی ہو گئی ہے۔ بعد میں کالج میں ایک دفعہ بادیل دکھائی دی ایگزام میں' سوچا تمہارا پوچھ لوں پر وہ بھی پیپر کے بعد غائب ہی ہو گئی اور میرا وہ کزن جس کو اپنی ایک جھلک دکھا کر دیوانہ کر گئی تھیں اس نے پوچھ پوچھ کر سر کھا لیا میرا۔ اپنے ڈرامے میں کاسٹ کرنا تو گویا ایک بہانہ تھا۔ وہ تو تمہیں دل ہی دے بیٹھا تھا یار' تمہاری شادی کا سن کر تو گم صم ہی ہو گیا۔ شادی تو خیر کر ہی لی تھی اس نے' پر دل ہی نہ آپس میں جڑ پائیں تو گھر کب جڑتے ہیں۔ ایک آدھ مہینہ ہی بمشکل خوشی گزرا ہوگا ان کا' روز کی چخ چخ۔ دو بچے بھی ہو گئے اب بھی ایک کا رخ مشرق دوسرے کا مغرب ہوتا ہے۔ فخر جمال شوبز کی دنیا میں جس کا نام کامیابی کی ضمانت ہے ازدواجی زندگی میں اتنا ہی ناکام

ہے۔ وہ تو رائنہ کے بھائی خاصے دولت مند اور پہنچ والے ہیں ورنہ تو وہ اسے چھوڑ بھی چکا ہوتا۔" عفاف کا حال سننے کے بعد اس نے فخر جمال کے بارے میں بتایا۔ اس روز انہوں نے کافی وقت ساتھ بتایا تھا۔ یہ ایک ملاقات اگلی آنے والی کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆
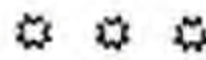
"ہماری بیگم تو دن بدن خوب صورت ہوتی جا رہی ہیں؟ خوش بھی بہت رہنے لگی ہیں۔ کیوں میرب! ماما سے پوچھو کوئی لاٹری نکل آئی ہے کیا!" ننھی میرب کو اچھالتے ہوئے علی نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنی نوک پلک سنوارنے میں لگی عفاف کو دیکھ کر کہا۔

"کیوں آپ کو خوش بری لگ رہی ہوں کیا؟" اس نے پلٹ کر تیکھے لہجے میں کہا تو علی بے اختیار مسکرا دیا۔

"ہم تو آپ کی خوشی میں خوش ہیں جناب۔ لیکن پلیز ذرا فارغ ہو کے بچوں کو خود بھی دیکھ لیا کرو۔ سارا دن بادیل سنبھالتی ہے۔ گھر کو بھی وہی دیکھتی ہے۔ اماں بھی اب بیمار رہنے لگی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کتنے ہی کام ہیں۔ میں تمہاری جاب کے خلاف نہیں ہوں لیکن گھر کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانا بھی ایک عورت کی ہی ذمہ داری ہے' یہ تو بادیل کی محبت ہے جو ہمارے بچوں کو اپنی اولاد کے جیسا سمجھتی ہے لیکن کچھ عرصہ تک کمیل کا ارادہ بادیل کو بھی ساتھ ہی لے جانے کا ہے' پھر تو تمہیں ہی دیکھنا ہے تا' یہ سب تو ابھی سے کیوں نہیں۔"

علی اس کے مزاج کی تیزی سے واقف تھا سو نرمی سے بات کی تھی۔ میرب اس کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ شایان تو سوتا ہی بادیل کے پاس تھا۔ کمیل کی جاب اسلام آباد ہو گئی تھی۔ وہ ہر ویک اینڈ پر آتا تھا۔

"افوہ علی! چل تو رہا ہے ناں سب کچھ ٹھیک۔ بادیل اگر یہ سب کرتی ہے تو اس کا نیچر ہی اس قسم کا ہے۔ اسے گھر گھرداری کرنا اچھا لگتا ہے۔ تائی اماں ہوں۔

آپ ہوں۔ اماں' ہر وقت کا یہ بادیل نامہ مجھے مت سنایا کریں میں بھی جاب کرتی ہوں۔ گھنٹوں کھڑے کھڑے کسٹمرز کے ساتھ دماغ کھپاتی ہوں۔ میں سوتی نہیں رہتی۔ جب بادیل چلی جائے گی تو دیکھیں گے کہ کیا کریں ابھی تو مجھے سونا ہے بہت تھک گئی ہوں بہت نیند آ رہی ہے۔"

گھر' بچوں' شوہر سے بے اعتنائی کی یہ حد دیکھ کر علی

بس تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ تو اپنی اولاد کو بھی بس جھک کر پیار کر لیتی بس۔ بچے ہادیل کو ہی اپنی ماں سمجھتے تھے اسی کی گود میں خوش رہتے تھے۔ تائی اماں نے اس کے رویے کی شکایت کئی بار علی سے کی تھی۔ وہ خود دیکھتا تھا پر اسے عفاف سے پہلے روز جیسی ہی محبت تھی جو کسی قسم کا سخت رویہ اپنانے سے روکتی تھی۔ حالانکہ فنانشلی وہ اب اتنا اسٹرونگ تھا کہ اس کی ہر خواہش پوری کر سکتا لیکن اپنی جاب کے حوالے سے وہ خوش تھی اور علی اس کی خوشی کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بہرحال دو سال کے اس عرصے میں عفاف کے مزاج نے اسے الجھایا بہت تھا۔ وہ اس کی محبت کو کسی اعزاز کی طرح وصول کرتی جبکہ شوہر اور بچوں کے لیے اس کے پاس دینے کے لیے نہ وقت تھا نہ محبت کے دو بول۔

آج اس کی ملاقات فخر جمال سے ہوئی تھی جسے دیکھ کر اس نے زندگی جینے اور اس کا بن کر رہنے کی خواہش کی تھی۔ وہ ویسا ہی خوب صورت تھا ویسی ہی دل کو دھڑکا دینے والی گفتگو کرنے والا اور آج ہی اسے علی کا اپنا گھر اور اپنے بچے بے حد برے لگے۔ گھر آتے ہی جو بچوں کو ذرا سا پیار کر لیتی تھی آج اس کے بچے اس سے بھی محروم رہ گئے تھے۔ ہادیل کو بہت دنوں بعد وہ اسی موڈ میں دکھائی دی جیسے شادی کے اولین دنوں میں رہا کرتی تھی۔ کرو فشین بات بات پر پھاڑ کھانے کو دوڑتی لیکن اگلے روز موڈ ٹھیک تھا اس کا۔ ہادیل نے شکر ادا کیا۔ کبھی کبھی ہادیل کو خوف آتا اس کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھ کر۔ اس نے اب فخر جمال سے فون پر بات کرنا شروع کر دی تھی کبھی کبھار ایک آدھی ملاقات بھی ہو جاتی۔ فخر جمال تو اس کھیل کا پکا اور پرانا کھلاڑی تھا جبکہ عورت ہو کر، ماں ہو کر، بیوی ہو کر وہ نفس کے بدکتے گھوڑے کو روک نہیں پائی تھی۔ گھر میں اس کا رویہ دن بدن خراب سے خراب ہوتا جا رہا تھا۔

اس روز وہ بہت خوشگوار موڈ میں خاصی لیٹ گھر پہنچی تھی۔ تائی اماں اماں کے گھر گئی تھیں۔ گھر میں علی ہادیل اور بچے تھے۔ علی کا موڈ بہت خوفناک سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ ہادیل سے آتے ہی اس نے اسی کی بابت دریافت کیا تھا اور اس کی غیر موجودگی کا سن کر ضبط سے اس کے چہرے کی رگیں تک ابھر آئی تھیں۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی بیٹھ جاتا کبھی کھڑا ہو جاتا۔ ہادیل میرب کو گود میں لیے اسے دیکھ کر بس ہولتی رہی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ دفعتاً بیرونی دروازہ کھول کر وہ سرشار سی داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔ ہادیل یار ایک کپ چائے ملے گی۔ میرے کمرے میں دے دو بہت تھک گئی ہوں۔" علی کو نظر انداز کر کے وہ کمرے میں جانے لگی۔

"دوپہر کو ہوٹل میں کون تھا تمہارے ساتھ؟" پہاڑوں کی سی سختی تھی اس کے لہجے میں وہ جھٹکے سے علی کی طرف مڑی اس کے خطرناک تیور اسے باور کرا گئے کہ وہ اسے فخر جمال کے ساتھ لنچ کرتا دیکھ چکا ہے۔

"فخر جمال تھے میرے ساتھ ملک کی مشہور سیلبریٹی۔ کیوں کیا ہوا؟" کمال بے اعتنائی سے اس نے پوچھا۔

"ملک کی مشہور سیلبریٹی کے ساتھ تم کیا کر رہی تھیں؟" شدید غصے کو ضبط کرتے مٹھیاں بھینچ کر اس نے کہا۔ ہادیل کا دل تو جیسے رک رک کر چلنے لگا اس کی بہن خود سر تھی، آزاد خیال تھی۔ وہ جانتی تھی۔

"اوکے، جلد یا بدیر تمہیں بتانا تو ہے ہی تو مسٹر علی! سن لو کہ میں اور فخر جمال ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں مجھے تم سے طلاق چاہیے۔" وہ نشتن پر قدم جمائے اس کے قریب آئی تو کیلے اور زہریلے یہ الفاظ اس نے علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے تھے۔

"ہادیل تیزی سے بھاگ کر اس کے قریب آئی اور بازو سے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ "عفاف پاگل ہو گئی ہو؟ کیا بکواس کر رہی ہو۔ تم علی سے؟" اس نے

بہتے آنسوؤں اور لرزتی آواز میں بے ربط جملے اس سے کہے۔

"نہ تو میں پاگل ہوئی ہوں نہ بکواس کر رہی ہوں۔ بس ایک دوغلی زندگی جیتے جیتے تھک گئی ہوں۔ زندگی کی خوشیوں پر، رنگینیوں پر میرا بھی حق بنتا ہے اور ہر بار میں یہ حق چھوڑ کر ایک ان چاہی زندگی نہیں بسر کر سکتی۔" اس نے دیدہ دلیری سے کہا۔

"خدا کے لیے عفاف چپ کر جاؤ۔ اپنے بچوں کا ہی خیال کر لو۔ برباد ہو جائے گا سب کچھ قیامت آجائے گی۔" ہادیل زار و قطار رو رہی تھی۔

"اور ایسا نہ ہوا تو میں برباد ہو جاؤں گی میرا دل برباد ہو جائے گا۔ اب کی بار قربانی میں نہیں دوں گی۔" اس نے ہادیل کا اپنے بازو پر رکھا ہوا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"میں علی مرتضیٰ بقائمی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔

"طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔

میرے دل اور میری زندگی سے تو نکل ہی گئی ہو۔ ہادیل اس سے کہو میرے گھر سے بھی چلی جائے۔ یہ میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے مر گئی ہے آج۔" علی نے کہا تھا۔

نہ زمین پھٹی نہ آسمان گرا بس ہادیل کے آنسو ٹھٹھر کر وہیں جم گئے وہ اس طوفان کی زد میں آیا کچھ بھی نہ بچا پائی تھی نہ نفس کے اندھے سفر کی جانب بڑھتی اپنی بہن کا گھر، نہ علی کی محبت نہ ان دو معصوم بچوں کی ماں جن کو ابھی ادراک بھی نہیں تھا کہ ان کی ماں نے اپنے ہاتھوں اپنی جنت گنوا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج میں بہت خوش ہوں، بہت خوش، تمہیں کھو کر جتنا وقت میں نے تمہارے ہجر میں گزارا۔ تمہیں پا کر آج اس کٹھن وقت کی چبھن کو بھول گیا ہوں۔" اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فخر جمال نے کہا تو وہ فخر سے مسکرا دی تھی۔ وہ اپنا ہنی مون پیریڈ گزارنے ملائیشیا آئے تھے۔ علی کا گھر جس وقت اس نے چھوڑا اسی وقت فخر جمال کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی تھی۔ عدت کی مدت اس نے شرمین کے گھر پوری کی تھی۔ نکاح کے بعد وہ دن ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کے بعد ایک مہینے کے لیے وہ لوگ ملائیشیا آگئے تھے۔ وہ بہت خوش تھی۔ یہی وہ زندگی تھی جس کی اس نے چاہ کی تھی۔ کچھ وقت ضرور لگا تھا پر اسے لگتا کہ اس کے دل کی ساری خواہش پوری ہو گئی ہوں۔ قدم قدم پر سراہنے والا ساتھی، دولت جس کے گھر کی باندی تھی اور جو اشارہ کرنے پر ہر اس چیز کو اس کے قدموں میں ڈھیر کرتا جا رہا تھا جسے وہ دیکھ کر سراہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اس کے تیور شروع سے مجھے ڈراتے تھے۔ میں بدنصیب کبھی اس کے جذبات کی شوریدہ سری جان ہی نہ پائی۔ بہتر یہی سمجھا شادی کر دوں تو خاوند کا پیار گھر کی ملکیت کا احساس اسے بدل دے گا پھر بچے ہو گئے میں مطمئن ہو گئی کہ سنبھل گئی ہے سارے خوف سارے اندیشے ہوا ہو گئے۔ پر کیا کیا اس نے پھول سے بچوں کا بھی نہ سوچا، دنیا کی جنت بھی چھوڑ دی آخرت کا بھڑکتا ہوا جہنم خرید لیا بدقسمت نے۔" اماں بار بار اپنی گیلی آنکھیں دوپٹے سے پونچھتیں۔ ہادیل پاؤں پاؤں چلتی میرب کی طرف متوجہ ہوئی، کبھی شلیان کی طرف پر توجہ اماں کی طرف تھی۔

"اماں! تائی اماں کا رویہ تو اب میرے ساتھ بھی بدل گیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے رونے لگتی ہیں۔ طعنے دیتی ہیں مجھے۔ اسے جھولی پھیلا پھیلا کر بددعائیں دیتی ہیں جب جب علی کی حالت دیکھتی ہیں۔ علی سارا سارا دن باہر رہتا ہے یا اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا ہے۔" ہادیل نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"مجھ میں تو اس بچے سے آنکھ ملانے کی ہمت بھی

نہیں ہے۔ جس نے اس بدبخت کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی ' ہر جائز ناجائز مانی اس کی۔ کاش اسی وقت اسے روک لیا ہوتا جب اس کے پاؤں اس موئے کورس کو سیکھنے کے لیے باہر نکلے تھے یا نوکری ہی نہ کرنے دی ہوتی۔ اسے تو صرف اس کم بخت کی خوشی کی پروا تھی یہ کب سوچا تھا اس نے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دے کر اپنے گھر کی بنیادوں میں پانی ڈال رہا ہے وہ۔" اماں کو علی کا دکھ الگ رلائے جاتا۔

"ہماری قسمت میں بدنامی کی یہ سیاہی لکھی تھی سو مل کے رہی۔ یہ سوچنا معنی نہیں رکھتا کہ ایسا نہ کرتے تو ویسا نہ ہوتا۔ اس نے جانا تھا سو چلی گئی۔" بادیل نے گہری سانس بھر کے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو بیٹا۔ خدا ایسی آزمائش کسی کا مقدر نہ کرے۔ تم ذرا باہر قرآن والی بچیوں کا سبق سن کے چھٹی دے دو۔ اس کو مجھے دو میں اسے سلا دوں۔" اماں نے آگے بڑھ کر میرب کو بادیل سے لے لیا اور بادیل سر ہلا کر باہر چلی گئی۔

اماں نے ان دونوں کی شادی کے بعد سلائی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ محلے کی بچیاں اب ان سے قرآن پاک پڑھنے آتی تھیں۔ ابا وہی صبح کے گئے شام کو آتے تھے۔ گود میں بے خبر انگوٹھا چوستی میرب کو اماں نے بغور دیکھا اور کئی آنسو نکل کر ان کا چہرہ بھگو گئے۔ خدا نہ کرے تم معصوموں پر اپنی ماں کی سیاہ بختی کا سایا بھی پڑے۔

☆ ☆ ☆

فخر جمال نے اسے فلم میں متعارف کروایا تھا۔ راتوں رات وہ زمین سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچی تھی۔ آزادی ' دولت ' شہرت اس کی زندگی کا جو مقصد تھا اس نے وہ پا لیا تھا۔ فخر جمال بھی بہت خوش تھا ' زندگی ایک دم جیسے بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ اس دن بہت سارے تھکا دینے والے دنوں کے بعد

اس کا شوٹنگ کا آف تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے سمندر کا نظارہ کرتی وہ بہت پرسکون تھی جب دروازے کی گھنٹی کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔ کل وقتی ملازمہ ابھی چھٹی لے کر گئی تھی اس کا بچہ بیمار تھا۔ فخر جمال کے آنے کا وقت نہیں تھا تو کون؟ وہ سوچتی ہوئی دھیرے دھیرے چلتی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔ اچھی خاصی خوب صورت عورت جدید تراش خراش کا لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس نے مختصر نظروں سے اسے دیکھا جبکہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی وہ عورت اسے دھکیل کر ایک دم اندر آ گئی اور طائرانہ نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔

"تو تم ہو وہ عورت! جو دو معصوم بچوں کو چھوڑ کر ایک ایسے مرد کے ساتھ بھاگ آئی ہو جو پہلے سے ہی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔" خاصی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا۔

"تو تم سے مطلب۔ تم ہو کون اور بلا اجازت یہاں کیسے گھس آئی ہو؟ نکلو یہاں سے۔" عفاف اس عورت کو بھی اپنی کوئی فین سمجھی تھی اور اس کے منہ سے نکلنے والے خلاف توقع الفاظ نے اسے زمین پر لا پٹخا تھا۔

"میں فخر جمال کی خاندانی بیوی ہوں اور صرف تم جیسی حرافہ کو دیکھنے چلی آئی تھی جو ایک مرد پر اکتفا نہ کر سکی اور کوئی ضمانت نہیں کہ جس نے ایک کے لیے دوسرے کو چھوڑا وہ دوسرے کو تیسرے کے لیے نہیں چھوڑے گی۔ اس لیے تو فخر جمال نے تم سے شادی کو خفیہ رکھا۔ تمہاری خصلت جانتا ہو گا۔ ہاں کیا پتا نکاح بھی کیا ہے یا۔۔۔" نفرت سے کہتے کہتے اس عورت کا لہجہ اچھا خاصا استہزائیہ ہو گیا۔

"بکواس بند کرو اور نکلو یہاں سے ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔" بے عزتی کے شدید احساس نے عفاف کا چہرہ سرخ کر دیا۔

"جا رہی ہوں تم جیسی عورت کے ساتھ تو ایک لمحہ بھی گزارنا میرے لیے سزا ہے 'پر جس خوب صورت

چہرے پر تمہیں ناز ہے وہ جس پل ماند پڑا اس سے اگلے پل یہ مرد تمہارے منہ پر تھوک کر چلا جائے گا' جس کے لیے پتا نہیں کیا کیا چھوڑ آئی ہو۔ ہونہہ۔" نفرت سے کہتی وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی وہاں سے چلی گئی پر غم اور غصے کے بھانبھڑ میں اس کو جلتے رہنے کے لیے چھوڑ گئی۔ فخر جمال کو نمبر ملا ملا کے اس کے ہاتھ تھک گئے پر ہر بار نمبر ملانے پر پاورڈ آف کی آواز اس کے غصے کو مزید ہوا دے رہی غصے میں اس نے موبائل سامنے دیوار پر دے مارا۔

☆ ☆ ☆

گاڑی چلاتے ہوئے سرخ بتی روشن ہونے پر اسے رکنا پڑا تھا' بے ارادہ سی نگاہ جونہی گاڑی کے باہر گئی تو وہیں ساکت ہو جانا پڑا۔ سامنے ہی ایک بل بورڈ پر دشمن جان کو مسکراتے ہوئے دیکھا وہ کسی فلم کا اشتہاری بورڈ تھا۔ دل میں درد کی لہریں نئے سرے سے کروٹ لینے لگیں۔ "کس قدر سستا سودا کیا ہے تم نے۔ ماں تو بچے کی ایک مسکراہٹ کے لیے دنیا لٹا دیتی ہے تم نے دنیا حاصل کرنے کے لیے بچوں کی مسکراہٹ تو کیا بچوں کو ہی داؤ پر لگا ڈالا۔ بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے تم نے عفاف۔ بہت گھاٹے کا۔" اماں بابا کی طرف سے اس پر دوسری شادی کے لیے بہت دباؤ تھا۔ بادل امید سے تھی۔ بھلے ہی وہ بچوں سے بہت پیار کرتی تھی پر کبھی تو اب کو اس کے گھر اور بچوں کو عورت کی ضرورت پڑنی ہی تھی۔ بہت سوچنے پر بھی دل و دماغ آمادہ نہ ہونے پائے تھے۔ لیکن گھر والوں کے شدید اصرار پر اس کی نظر انتخاب اپنے دوست کی بیوہ بہن پر پڑی تھی جس کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن شوہر کی موت کے بعد سسرال والوں نے منحوس کہہ کر گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ امجد نے اسے اور چند اور دفتر کے ساتھیوں کو اس کے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا کیونکہ اس کی بیوی بھی ایک بیوہ نند کا بوجھ تاعمر اٹھانے کو تیار نہ تھی۔ آج اس نے گھر والوں کو اعتماد میں لینے کا سوچا تھا۔ دل کی بستی تو اب تمام عمر سونی رہنی تھی گھر کی بستی میں کوئی بھی عورت آجاتی اس سے کیا فرق پڑتا تھا بس دعا کی تھی کہ آنے والی عورت اس کے بچوں کے حق میں اچھی ماں ثابت ہو جبکہ ان کی سگی ماں… اس کا دل استہزائیہ ہنسی ہنس دیا۔ دفعتاً گاڑیوں کے تیز ہارن اسے چونکا گئے۔ سبز بتی جل چکی تھی اور وہ درمیان میں گاڑی روکے زندگی کے سود و زیاں میں مصروف تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو اس عورت کو ہر صورت طلاق دینی ہو گی۔ اس کی اتنی جرات میرے ہی گھر آکر مجھے بے عزت کر گئی وہ اور آپ کہتے ہیں چپ ہو جاؤں۔ درگزر سے کام لوں۔" اس کا غصہ کم ہونے میں نہ آرہا تھا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ تمہیں ایک عورت آکر کہے کہ میں فخر جمال کی بیوی ہوں اس نے مجھ سے شادی کرلی ہے تو تم کیا کرو گی؟" اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے رسان سے پوچھا۔

"میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔" اس نے چیخ کر کہا تو وہ کتنی ہی دیر ہنستا چلا گیا۔ "تو میری جان وہ اس وقت اس اسٹیج پر ہے' بھلے ہی بے اعتنائی برتتی ہو۔ لڑتی ہو' جھگڑتی ہو' مرد کی دوسری بیوی تو کوئی بھی عورت برداشت نہیں کرتی۔ رہی اس کے کچھ نازیبا الفاظ استعمال کرنے کی بات تو اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ یہ لو۔" اس نے سمجھاتے سمجھاتے سچ مچ ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

"نہیں مجھے آپ سے معافی نہیں چاہیے۔ مجھے اس عورت کو سبق سکھانا ہے بس میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ اتنی گھٹیا باتیں کی اس عورت نے آپ نے نہیں سنی ناں اس لیے ایسے کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے میں سب کچھ بھول جانے کو تیار ہوں۔ ساری انسلٹ اگنور کر دوں گی اپنی پر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" اس کی سنجیدگی پر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا

تھا۔
"یا تو آپ کو ہماری شادی ڈکلیئر کرنی پڑے گی۔ اخبار میں بیان دیں پریس کانفرنس کریں کچھ بھی لیکن دنیا کو پتا چلنا چاہیے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ یا اس عورت کو طلاق دیں گے آپ۔" اس نے اپنی مخصوص ہٹ دھرمی سے کہا جو اس کا خاصا تھا۔ پر آج اسی لہجے اور انداز پر فدا ہونے والا فخر جمال بھنا گیا۔
"تمہارے لیے صرف یہی بات اہم ہونی چاہیے کہ میں نے تم سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور اسے نبھایا بھی۔ کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں کی میں نے تمہاری اور رائنہ کو میں چاہتے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتا یہ بات میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں۔ میرے خاندان والے میرے ماں باپ میرا سوشل بائیکاٹ کر دیں گے اور رائنہ کے بھائی تو شاید مجھے جان سے بھی مار ڈالیں۔ رہی شادی ڈکلیئر کرنے کی بات تو اس میں بھی کچھ تحفظات ہیں۔ ہم دونوں اپنے پروفیشن میں جس اسٹیج پر ہیں ایسے میں اس شادی کو ظاہر کرنا ہم دونوں کے کیریئر کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور میں اپنے عروج کے زمانے میں ایسی کسی حماقت کا ثبوت نہیں دے سکتا نہ تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دوں گا۔" فخر جمال نے سمجھانے والے انداز میں کہتے کہتے حتمی انداز میں بات مکمل کی تو اپنے کام اور کیریئر کے حوالے سے تو وہ خود بھی بہت حساس تھی۔ اس کی یہی بات من کر ڈھیلی پڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

راحیلہ اس کی زندگی میں کیا آئی اس نے اس کے لیے زندگی کا مفہوم بدل کر رکھ دیا۔ بظاہر عام سی شکل و صورت والی راحیلہ کا اندر بڑا خالص تھا اس نے بچوں کو ایسے سنبھال لیا جیسے وہ ان کی سگی ماں ہو۔ رشتوں اور حالات کی ڈسی ہوئی راحیلہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی وجہ سے دوبارہ بھائی بھابھی کے در پر جا پڑے جہاں اس نے زندگی اور دنیا کا تلخ ترین روپ دیکھا تھا اسے علم تھا کہ اس کے شریک سفر کی محبت کا پیالہ اپنی پہلی بیوی کی محبت سے لبریز ہے اس سے شادی کی وجہ اس کی اولاد تھی سو پہلے پہل تو اپنی ازدواجی زندگی کی بقا کے لیے اس نے ان بچوں کو ماں کا پیار دیا۔ پر ماںتا کا جذبہ ہر عورت کو فطری طور پر خدا کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ سو جلد ہی اس کے دل میں بچوں کے لیے پیار کے سوتے خود بخود پھوٹ پڑے گھر کے حالات معمول پر آتے دیکھ اور بچوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بادل، کہکشاں کے پاس اسلام آباد چلی گئی تھی تائی اماں سے اس کے تعلقات اب معمول پر آگئے تھے۔ وہی تائی اماں جو اس کی بہن کی وجہ سے اس سے بھی نالاں نظر آنے لگی تھیں اب ان کا رویہ خود بخود بہتر ہو گیا تھا۔ وہ اب راحیلہ کے گن گاتے نہ تھکتیں جس نے ان کے بیٹے کے بکھرے گھر کو سمیٹ کر دوبارہ ایک آشیانے کی شکل دے دی تھی۔ علی کی زندگی میں جو بے چینی تھی اس کی جگہ ایک ٹھہراؤ نے لے لی تھی وہ اس عورت کو وہ جگہ تو دل میں نہ دے سکا جو عفاف کی آج تک تھی پر اس نے اسے بیوی کا درجہ دیا تھا تو عزت بھی دیتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جس عورت نے اتنے کم عرصے میں اس کو عورت کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا تھا ہو سکتا ہے کچھ عرصہ میں اپنی محبت بھی اس کے دل میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عفاف کی بے وفائی اگرچہ اب بھی رلاتی تھی پر اس میں اب وہ پہلے والی شدت نہ تھی۔
بادل اور کہکشاں کا ایک بیٹا تھا وہ اور کہکشاں مہینے بعد چکر لگاتے تھے۔ ہاں علی، عفاف کے جانے کے بعد بھی اپنی چچی اور چچا کی خبر لینا نہیں بھولتا تھا پہلی دفعہ تو عفاف کے جانے کے بعد جب وہ چچی کے گھر گیا تھا وہ اسے دیکھ کر ساکت ہو گئیں۔
"علی... میرا بچہ... میرا بیٹا۔ مجھے معاف کرو۔ اس بدبخت کے کیے کو کوئی بھول نہیں سکتا کہ اس نے زخم ہی ایسا لگایا ہے پر تم صرف اس کے شوہر ہی نہیں تھے میرے بیٹے بھی ہو۔ مجھے معاف کر دینا میں نے ہی تم لوگوں پر جلدی شادی پر دباؤ ڈالا تھا۔ رہ رہ کے پچھتاوا

دل میں سر اٹھاتا ہے کہ اپنی خود سر بیٹی کی زندگی سنوارنے کے لالچ میں میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی میرے بچے۔"

وہ زار و قطار روتے ہوئے ہاتھ باندھ کر اس سے معافی طلب کرنے لگیں۔

"بس کریں چچی۔ قسمت میں جو آزمائش ہمارے حصے کی ہے اور ہمیں ہر صورت ملنی ہے اس میں آپ کا یا کسی اور کا کوئی دوش نہیں ہے۔ آپ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں اور وعدہ کریں کہ آئندہ ہمارے درمیان یہ ذکر کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے ساتھ لگا کر انہیں کہا تو وہ ایک بار پھر اس کی اعلیٰ ظرفی پر رو دیں جبکہ ان کے سر کو تھپکتا علی خود بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔ اتنے پیارے رشتوں کو آنسو دے کر کیا تم اپنے لیے خوشیاں خرید پاؤ گی؟ اس نے دکھ سے سوچا۔ بعد میں جب اس نے شادی کی تب بھی وہ ان کے پاس آیا تھا۔

"چچی اپنے بچوں کی اچھی تربیت اور بقا کے لیے جس عورت کو میں اب زندگی میں لا رہا ہوں اس کے انتخاب کا فیصلہ میں نے اللہ پر چھوڑا تھا اور میرا اللہ اس بندے کو ہرگز مایوس نہیں کرتا جو اس کی مرضی کو اپنا ارادہ بنا لے۔ میرے اور میرے بچوں کے حق میں دعا کیجیے گا۔" رنجیدگی اس کے حرف حرف سے ٹپک رہی تھی۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے میرے بچے۔ ہر عورت دولت کی پجاری نہیں ہوتی۔ میری دعائیں ساتھ ہیں اور میرا دل کہتا ہے کہ خوشیاں اب تم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔" بھیگتی آنکھوں کے ساتھ چچی نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

★ ★ ★

میرب پاؤں پاؤں چلتی ہوئی تیز قدموں سے بھاگ رہی تھی۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔ "میرب مت آگے جاؤ۔ آگے کھائی ہے۔" دفعتاً وہ پتھر سے ٹھوکر کھا کر نیچے گر پڑی۔ اُف اللہ اسے بہت زور سے چوٹ لگی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کو دیکھا جس سے خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ میرب۔۔۔ وہ تو میرب کے پیچھے جا رہی تھی۔ کسی خوف کے زیر اثر اس نے خون آلود پاؤں کو چھوڑا اور تیزی سے سیدھی ہوئی میرب کہیں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے آگے آئی جہاں ڈھلوان ختم ہو رہی تھی وہاں نیچے جھانکنے پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی بلندی سے بھی نیچے بہت نیچے ساکت پڑی میرب اور آس پاس بہتا خون کا تالاب۔ اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے اپنا جسم پسینے میں شرابور دیکھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ گلا خشک محسوس ہوا تو اس نے سائیڈ ٹیبل سے پڑے جگ سے گلاس میں انڈیل کر پانی پیا۔

"علی! دیکھو تو میں نے کتنا خوفناک خواب دیکھا شکر ہے وہ خواب تھا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ طویل سانس ساتھ ہی اتنے عرصہ بعد اپنے منہ سے بے ساختہ نکلنے والا وہ نام حیران کر گیا۔

شکر ہے فخر میرے ساتھ نہیں۔ لیکن میرب۔۔۔ میرب ٹھیک تو ہو گی ناں؟ دل میں بچوں کی خیریت جاننے کی ایسی ہڑک جاگی کہ سائیڈ ٹیبل پر پڑا اپنا فون اٹھا کر ذہن کے نہاں خانوں میں چھپا علی کا نمبر بے ساختہ ڈائل کیا، پر گھنٹی بجنے سے پہلے ہی کچھ سوچ کر رابطہ منقطع کر دیا کہ اب وہ کس منہ سے اس شخص سے اپنے بچوں کی بابت دریافت کر پائے گی۔ جس کے سامنے ہی باویل نے اسے بچوں کے کتنے واسطے دیے تھے اور ہر واسطہ اس نے اپنی ہر خواہش کے بدلے رد کر دیا تھا۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔ ہچکیوں سے سسکیوں سے تڑپ تڑپ کر۔۔۔ پر کیوں اسے اپنی اس حالت سے بے حد خوف محسوس ہوا۔ اس نے سیل اٹھا کر دیوانوں کی طرح فخر کا نمبر ملایا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو فخر آپ کہاں ہیں؟" چھٹی یا ساتویں گھنٹی پر اس کی خمار آلود آواز سنائی دی۔

"گھر پر ہوں یار۔۔۔ تمہیں آج بتایا تھا کہ بہت دن سے بچوں کو نہیں دیکھا آج میں بچوں کے پاس رہوں گا کیوں کیا ہوا؟" اسے بتا کر اتنی رات گئے فون کرنے کی وجہ پوچھتا اسے وہ کچھ بے زار سا لگا۔

"فخر۔ فخر میرے پاس آئیں ابھی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بے ساختہ رو دی۔

"کیوں کیا ہوا۔ ملازم نہیں ہے تمہارے پاس؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہے وہ بھی ہے باہر۔ پر مجھے اس پل آپ کی ضرورت ہے مجھے لگ رہا ہے میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی۔" سسکیاں بھرتے اس نے کہا۔

"اوہ ربش یار۔ عفاف اب تم بچی تو نہیں ہو جو سمجھ نہ سکو کہ شہر کے دوسرے کونے پر موجود ہوں میں اس وقت آتے آتے بھی گھنٹہ لگ جائے گا اور صبح تو ویسے ہی ہونے والی ہے، میں آجاؤں گا سو جاؤ شاباش اور مجھے بھی سونے دو۔ لیٹ نائٹ شوٹ سے واپس آیا تھا آنکھ لگے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ گڈ نائٹ۔" اس نے بے جان ہوتے سیل کی اسکرین کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور ایک بار پھر نمبر ملایا پر دوسری طرف فخر نے شاید فون آف کر دیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے فون کی طرف دیکھا۔

"تم ایک بار دل سے بلا کے تو دیکھنا میں دنیا کے جس بھی کونے میں ہوا واپس آجاؤں گا۔" ایک بار اس نے کہا تھا۔ پر یہ تو علی نے۔ پر آج کیوں بار بار مجھے وہ یاد آ رہا ہے۔ کس قدر خوف میں گھر کر اس نے سوچا۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر زندگی میں پہلی بار پر سکون نیند کے لیے اس نے نیند کی گولی کو پانی کے ساتھ نگلا اور لیٹ گئی۔ جب میں اپنی مرضی کی زندگی پا کر خوش ہوں۔ مطمئن ہوں تو یہ آنسو؟ اس نے جلدی سے آنکھوں کو بے دردی سے مسل ڈالا۔ یونہی الٹی سیدھی سوچیں لیے اسے کب نیند آگئی پتا ہی نہیں چلا۔

☼ ☼ ☼

آج بہت عرصہ بعد ان کے گھر میں حقیقی خوشیوں کا رنگ اترا تھا۔ آج شایان اور میرب کی تیسری سالگرہ کے موقع پر وہ سب جمع تھے۔ چچی اور چچا بھی۔ راحیلہ اور علی دونوں بچوں کو گود میں بھر کر ٹیبل کے قریب لائے اور کیک کٹوایا۔ ہیپی برتھ ڈے کے شور میں دونوں بچوں نے کیک کے ٹکڑے ماں اور باپ کو کھلائے تو چچی اور چچا کی آنکھیں نجانے کیوں بھیگی تھیں۔ ہادیل نے بھی بیٹے کو اٹھانے کے بہانے نیچے جھک کر آنکھ میں آیا کسی بد نصیب کے نام آنسو جھٹک ڈالا۔

"جاؤ بیٹا اب نانا ابو، نانی اماں، دادا ابو اور دادی اماں کو کیک کھلا کے آؤ۔" راحیلہ نے دونوں بچوں کو کہا اور دونوں بچوں کو چچا چچی اور تایا، تائی کے پاس لے کر کیک کھلایا۔ راحیلہ نے ان کو یہی بتایا تھا کہ یہ ان کے نانا ابو اور نانی اماں ہیں اور خود بھی ہادیل کی طرح اماں کو اماں اور ابا کو ابا کہتی جوابا" دونوں نے ہی اپنی محبت اور شفقت کے حوالے سے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ محبتوں اور رشتوں کی ترسی لڑکی دل و جان سے ان سب کے بے حد تیزی سے قریب آگئی تھی۔ بچوں کی معصومانہ باتوں اور حرکتوں نے ماحول میں ایک روشنی سی بھر دی تھی پر بظاہر اس ماحول کا حصہ بنے رہنے کے باوجود کچھ دل ایسے تھے۔ جن میں ایک انجانی سی کسک لو دے رہی تھی نجانے کیوں۔

☼ ☼ ☼

"مسٹر فخر آپ کی مسز کو صرف ڈپریشن کا مرض لاحق ہے اور کچھ نہیں۔ ان کے ہفتے میں تین سیشن ہوں گے میرے ساتھ اور یہ میڈیسن باقاعدگی سے استعمال کرانے کے ساتھ ساتھ خیال رکھیں کہ یہ خوش رہیں اور کوئی منفی بات یا منفی رویہ ان کی زیادہ خراب طبیعت کا باعث بن سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے بیٹھے فخر جمال کو دوائیوں والا پرچہ تھماتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں تاکید کی جبکہ وہ خود کسی روبوٹ کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ دونوں کسی گہری خاموشی کے زیر اثر گھر تک آئے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے عفاف تمہیں۔ پلیز مجھے میری پہلے والی عفاف چاہیے ہنستی مسکراتی۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میری ساری وفائیں تمہاری ہیں۔ ایک دنیا

تمہیں چاہتی اور پسند کرتی ہے۔ پھر کیا سوچ تمہیں تنگ کرتی ہے۔ کیا سوچ کر پریشان ہوتی ہو' کچھ تو بتاؤ خدا کے لیے۔ ڈائریکٹر' پروڈیوسر الگ پریشان ہیں۔ تمہارے اس رویے سے ساری شوٹنگز رکی ہوئی ہیں ان کا لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ تم سے خود بھی ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ جب تک تم خود اپنی اس کیفیت سے نکلنے کا نہیں سوچو گی' کوشش نہیں کرو گی۔ نہ تو کوئی ڈاکٹر فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ میڈیسنز۔ شوٹنگز کا کام ختم کرا دو پھر کہیں باہر چلتے ہیں سوئٹزرلینڈ' کینیڈا' امریکہ' ملائشیا جہاں بھی کہو۔"

آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ سر کھپانے کے باوجود وہ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی لانے میں ناکام رہا تھا۔ ڈپریشن کے بار بار پڑنے والے دوروں کے بعد ہر دفعہ وہ اسے یونہی بہلا لیا کرتا تھا' کبھی ڈھیروں ڈھیر شاپنگ سے' کبھی کسی باہر ملک کے ٹور سے پر اس بار اس کا کوئی حیلہ' کوئی تدبیر اس کی کیفیت میں تبدیلی نہ لا سکی تھی۔ گھنٹوں بیٹھی پتا نہیں کیا سوچتی رہتی پھر بیٹھے بیٹھے چیخیں مارنے لگتی' کبھی خود کو مارنے لگتی۔ دورہ شدید ہوتا تو بے ہوش ہو جاتی تھی۔ عرصہ ہو گیا پرسکون نیند سونے کو ترس گئی تھی وہ۔ سلیپنگ پلز بھی نیند لانے میں ناکام ہو جاتیں۔ فخر جمال نے اسے ملک کے بہترین ڈاکٹرز کو دکھایا تھا۔ سب نے ہی کم و بیش ڈپریشن کہا تھا اور اسے خوش رکھنے کو کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما۔" شایان اپنے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا۔

اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ "اللہ نے تمہیں جس حال میں بھی رکھا ہے۔ صبر و شکر سے اسی حال میں جینا سیکھو۔" اماں کی آواز کمرے کے ایک کونے سے گونجی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"تمہارے ہونٹوں پر مسکان لانے کے لیے میں دنیا کا ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو ایسا کر سکے۔" علی کی آواز نے یاد کا دامن اپنی طرف کھینچا۔ اس کی آنکھیں

پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔

"دیکھو تو عفاف آج میرب نے پہلا دانت نکالا ہے۔" ہادیل کی خوشی سے چہکتی آواز پر اس کی حالت پھر غیر ہونے لگی' اس کا گلا بے تحاشا خشک ہونے لگا اس نے جھپٹ کر اپنا سیل اٹھایا اور کوئی نمبر ملا کر بے چینی سے دوسری طرف فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگی۔

"ہاں الطاف۔ میں نے ایک کام تمہارے ذمہ لگایا تھا۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"یس میم آپ کا کام ہو چکا ہے آپ نے جن دو بچوں کے کوائف ہمیں دیے تھے وہ۔" اس کا سیکریٹری اسے تفصیلات فراہم کرنے لگا اور وہ اضطراری انداز میں سنتی گئی۔ فون بند کر کے وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آئی ہو۔

"فخر۔ فخر۔" وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ فخر جمال اور ملازمہ ایک ساتھ کمرے میں آئے تھے۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی چیخ چلا رہی تھی۔ جس پل بے ہوش ہو کر وہ فخر کے بازوؤں میں ہی جھول گئی۔ اس کے لبوں پر جو دو نام آئے تھے ان کو سن کر فخر جمال کی پیشانی پر بے شمار بل پڑ گئے تھے۔ اس کو تو کہ بس لگتا ہی تھا کہ اپنی اولاد کے قصے اسے بڑے شوق سے سناتا جب دل چاہتا ان سے جا کر مل آتا' بعض اوقات ان کے اصرار پر وہاں رہ بھی جاتا' اپنے بچوں کی باتیں سناتے وقت اسے اس عورت کے چہرے پر محرومی اور دکھ کا سایہ کبھی نظر نہیں آیا تھا یا اس نے دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی پر آج بے ہوشی میں ہی سہی اس کے لبوں سے نکلنے والے بچوں کے صرف نام سن کر اس کا دماغ ایک انجانی آگ سے سلگ اٹھا تھا۔

اس دفعہ اس پر پڑنے والا دورہ شدید تھا اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا تھا۔ تیسرے دن اسے ڈسچارج کر دیا گیا' ڈسچارج ہونے کے بعد اس نے فخر جمال کو کال کی تبھی وہ کسی شوٹ پر بزی تھا۔ اسے ڈرائیور کے ساتھ گھر جانے کو کہا تھا۔ ابھی وہ گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ دو نقاب پوش مسلح افراد نے آکر گن

لوگوں کی موجودگی میں اس پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ اس کی دلدوز چیخوں سے پورے ہسپتال کی عمارت لرز اٹھی تھی۔ سلیبریٹی ہونے کی بنا پر فوراً" اسے طبی امداد دی گئی تھی۔

شام تک اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر اخبار/ٹی وی کے ذریعے ہر گھر تک پہنچی تھی۔ فخر جمال مصروفیات کے باعث محض چند بار ہی آپایا تھا۔ اور اب آخری بار آئے ہوئے بھی اسے ہفتہ ہو چلا تھا اس کا چہرہ ایک سائیڈ سے اور گردن کا ایک بڑا حصہ مکمل جھلس گیا تھا۔ کچھ زخم اگرچہ بھر گئے تھے' پر آدھے جھلسے چہرے کے ساتھ وہ بہت خوفناک دکھتی تھی۔ ایک دو روز میں اسے ڈسچارج ہو جانا تھا جب اسے ایک خط اور کچھ دستاویزات فخر جمال کی طرف سے موصول ہوئی تھیں۔

عفاف۔۔۔!

میں تمہارے نزدیک تمہاری خوب صورتی کی وجہ سے آیا تھا۔ بارہا تمہاری ناجائز خواہشات نار وا رویئے اور خاندان کے بے حد دباؤ کے باوجود اگر تمہیں چھوڑنے پر خود کو آمادہ نہ کر پایا۔ وجہ تمہاری خوب صورتی تھی۔ پر اب تمہیں ایک دفعہ دیکھنے کے بعد دوسری دفعہ دیکھنے کی خود میں ہمت نہیں پاتا تو ساری عمر کیسے گزار پاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔ طلاق کے کاغذات کے ساتھ اپارٹمنٹ کے کاغذات ساتھ ہیں جو میں حق مہر کے طور پر تمہارے نام کر دیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

فخر جمال

پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ اپنے ساتھ ہونے والے اس حادثے اور اب فخر جمال کے اس اقدام نے اسے دکھ نہیں دیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اپنی زندگی میں جو کچھ وہ کر چکی تھی اس کی سزا کا عمل اسی دنیا میں ہی شروع ہو چکا تھا اور جتنا کچھ وہ کر چکی تھی اس سب کے لیے تو اسے بہت کم لگی تھیں یہ سزائیں۔ یہاں سے سیدھا وہ اماں کے گھر آگئی تھی اسے اپنی زندگی میں ہی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ اسے اگر قدرت اسے موقع

دے رہی ہو۔ دستک دے کر وہ بے چینی سے ان پیارے چہروں کا انتظار کرنے لگی جن کو اس کی خود سری نے بہت دکھ دیے تھے۔

"ارے عفاف بیٹا اتنی دیر لگا دی کالج سے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ آجاؤ منہ ہاتھ دھو کے آجاؤ تمہاری پسند کا مٹر پلاؤ بنایا ہے آج۔" بیتے پل نظروں کے سامنے پھر گئے۔ دفعتاً" دروازہ کھلا ابا کا شفیق چہرہ وہاں نظر آیا۔

"عفاف۔۔۔" ان کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی اور کچھ کہے بغیر نم آنکھیں اور کپکپاتے ہاتھ لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دروازہ کھولتی تیزی سے اندر آگئی۔

"ابا۔۔۔ ابا دیکھیں تو سہی آپ کی عفاف نے کیسا سستا سودا کیا تھا اور برباد ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔ خدا کے لیے آپ معاف کر دیں گے تو رب معاف کر دے گا۔ اماں کہاں ہیں۔ اماں۔۔۔ اماں آئیں مجھے ماریں۔ پر خدا کے لیے معاف کر دیں۔

ابا آپ اماں کو کہیں نا۔ ایک بار مجھے معاف کر دیں؛" وہ ان کے قدموں میں ہی گر گئی۔ "یہ دیکھیں میرا سوختہ چہرہ میرا دل بھی ایسے سوختہ ہے اس پر کئی لوگوں کی بددعائیں اور آہوں کے داغ ہیں۔ جو مجھے سونے نہیں دیتے۔ چین نہیں لینے دیتے۔"

"یہ کیا ہوا عفاف؟" ابا اس کا چہرہ اور گردن دیکھ کر کانپ گئے تھے۔ آدھا دوپٹے میں چھپا چہرہ اب پورا سامنے تھا۔ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میرے گناہوں کی سزا ہے ابا۔ میرے نصیب کی سیاہی ہے۔" وہ زارو قطار روتے ہوئے بولی تو ابا بھی پیاری اولاد کے دکھ پر ضبط نہ کر سکے دونوں باپ بیٹی گلے لگ کر بے تحاشا روئے۔

"ابا۔۔۔ اماں کہاں ہیں وہ مجھے معاف تو کر دیں گی ناں؟"
اس کا ایسا لہجہ اور انداز نے ابا کا دل کاٹ دیا۔

"تم نے دیر کر دی بیٹا۔ تمہاری ماں پندرہ دن پہلے ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" ساتوں آسمان گویا عفاف کے سر پر ایک ساتھ گرے تھے۔

"مجھے معاف کیے بنا مجھ سے ملے بغیر۔" اس نے سرگوشی میں کہا اس کے بعد تو وہ جو تڑپ تڑپ کر روئی۔ ابا کو ایک بار پھر رلا دیا۔ پاگلوں کی طرح اماں کے بستر کو، کمرے کی دہلیز کو، ان کے تکیے کو چھو چھو کر محسوس کرتی اور روتی جاتی۔

"دیکھیں تو اماں آپ کی حماں نصیب بیٹی آئی ہے۔ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔ اپنا چہرہ بھی دکھانا گوارا نہیں کیا۔ اللہ مجھے کیسے معاف کرے گا؟"

"بس کرو بچے! وہ اللہ ہماری سوچ سے کہیں زیادہ غفار ہے۔ وہ معاف کرے گا، بچے اٹھو رونے سے مرے ہوؤں کو تکلیف ہوتی ہے۔" ابا نے دہلیز پر پڑی عفاف کو ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

"اور نہ رونے سے زندہ لوگ درگور ہو جاتے ہیں ابا۔ مجھے رونے دیں اتنا کہ میرا دل پھٹ جائے۔ میری اماں پیاری اماں چلی گئیں۔ مجھے پتا ہے ان کو میرا غم لے گیا۔ میرا دکھ کھا گیا میری اماں کو۔" اب کے اس نے پھر اپنے آپ کو مارنا شروع کر دیا تھا اور روتے روتے ابا کی آغوش میں ہی جھول گئی۔

ہوش آنے پر خالی خالی نظروں سے دیکھنے پر اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پر حواس نے جونہی شعور کا دامن پکڑا" آنسو لڑیوں کی صورت بہتے چلے گئے ابا اس کے سرہانے بے حد پریشان بیٹھے تھے۔

"ابا۔۔۔" اس کی بے حد نحیف آواز ابھری۔
"جی بیٹا!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"مجھے ہادیہ سے ملنا ہے اور۔۔۔ اور علی سے بھی معافی مانگنی ہے۔ میرے اندر پچھتاووں کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں ہے میں اب مزید دیر نہیں کرنا چاہتی۔" اتنی آہستہ سے اس نے کہا کہ ابا بمشکل سن سکے تھے۔

وہ ان کی بہت پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی بہت دفعہ اپنی ناجائز خواہشات بھی منوا لیا کرتی تھی۔ کاش زندگی اسے بدترین ٹھوکریں لگائے بغیر سبق سکھا دیتی۔ پر کیسے؟ ٹھوکر کھائے بغیر انسان کچھ سیکھتا کب ہے؟ ان کا دل دکھ سے بھر گیا انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر اس

کلا تھوتھپتھپایا۔

اگلے دن اس نے ابا سے کہا تھا کہ محلے کی جو بچیاں اماں سے قرآن پاک کی تعلیم لینے آتی تھیں ان کے گھروں میں کہلوا دیں کہ وہ لوگ اپنے بچوں کو دوبارہ سے پڑھنے کے لیے بھیجیں وہ نہ صرف قرآن کی شمع جلائے گی بلکہ علم کی روشنی بھی ان میں بانٹے گی۔ ان دونوں بہنوں نے بھی قرآن پاک کی تعلیم اماں سے لی تھی۔ آہستہ آہستہ بچیاں اس کے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگیں۔ اس کو پڑنے والے دوروں کا وقفہ حیرت انگیز طور پر کم ہونا شروع ہو گیا۔ ابا نے ہادیل کو فون کیا تھا وہ اسلام آباد میں تھی۔ عفاف تین چار دفعہ اپنے بچوں کو اسکول سے باہر جا کر مل آئی تھی۔ ایک دو دفعہ جھجکنے کے بعد اس کے محبت بھرے رویے نے ان کو اس کی طرف راغب کر ہی دیا تھا۔ ان کی پسند کی چیزیں پتا کر لے جاتی ان کو ڈھیروں چیزیں خرید کر دے آتی تھی۔

☼ ☼ ☼
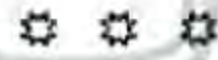
ابھی ابھی ہادیل کمرے سے باہر گئی تھی اس نے ہادیل سے معافی مانگی تھی اور اس نے اسے کھلے دل سے معاف کر دیا تھا مخصوص انداز میں دوپٹہ لپیٹے وہ دروازے کی جانب پشت کیے کھڑی تھی جب وہ اندر داخل ہوا تھا۔ ہزاروں صدیوں کا فاصلہ جیسے ان کے مابین حائل تھا۔ اس نے اس شخص کی آہٹ کو محسوس کیا۔ آنسو قطار در قطار بہنے لگے۔ دل کا درد حد سے سوا ہو گیا۔ کاش میں وقت کو پیچھے لے جانے پر قادر ہوتی تو تمہارے پاؤں کی دھول بن کر زندگی گزار دیتی۔ کاش اس وقت پیار سے 'مار سے' تم نے مجھے روک لیا ہوتا۔ پر میں نے تمہیں سنبھلنے کا موقع کب دیا تھا۔ دو دل آپس میں ہمکلام تھے۔

"میں نے تمہارا دل 'تمہارا گھر' تمہاری دنیا سب کچھ اجاڑ دیا تو قدرت نے ہرا بھرا مجھے بھی نہ رہنے دیا۔ دلوں کو توڑنے والے لوگوں کے نصیب میں بھی نا آسودگی دیمک کی طرح چمٹ جاتی ہے۔ تم سے معافی مانگنا تمہارا حق بنتا ہے اور تو کوئی حقوق پورے نہ کر پائی سوچا یہ آخری حق ہی ادا کر دوں تاکہ سکون سے مر تو سکوں۔ مجھے میرے کیے سب گناہوں کے لیے معاف کر دینا۔ تمہارا ظرف کتنا بڑا ہے مجھ کم ظرف سے زیادہ کون یہ بات جانتا ہو گا۔" نم لہجے میں ہزاروں دکھ بین کر رہے تھے۔

"ایک خیانت کر چکی ہوں تمہارے بچوں سے اپنی پہچان کرائے بغیر کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا جب وقت تھا اور ضرورت تھی ماں تا غفلت کی نیند سوتی رہ گئی اور اب جاگی ہے تو اپنے بچوں کو دیکھنے کی ' ملنے کی ہڑک اتنی شدید ہے کہ کسی پل چین ہی نہیں آتا۔"

کہتے کہتے وہ چپ ہو گئی کہ آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ علی بے چین ہو کر رہ گیا۔ اس عورت سے کی جانے والی خود ساختہ نفرت کہیں دور جا سوئی تھی۔ وہ حیران ہوا کہ اس کے دل میں موجود اس کی بے حد و حساب محبت جوں کی توں موجود تھی۔

"اپنی بیوی کا بے حد شکریہ ادا کرنا جس نے وہ کام کیا جو ایک سگی ماں نہ کر سکی۔ اولاد کو محبت دینے اور تربیت دینے کا کام۔ اسے کہنا میری میرب کی ایسی تربیت کرے تاکہ کبھی کہیں دوسری عفاف جنم نہ لے۔" ایک گہری خاموشی ان کے درمیان کئی لمحے موجود رہی جس کو علی کی آواز نے توڑا۔

"میں نے تمہیں معاف کیا عفاف! تم جب بھی چاہو اپنے بچوں سے مل سکتی ہو۔" اس نے عفاف کی پشت کو دیکھتے آہستہ آواز میں کہا۔ اس نے ایک دفعہ بھی اس شخص کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا تھا شاید وہ واحد شخص تھا جس کی نظر کی ستائش کی عادی تھی کراہت کی نظر کیسے برداشت کرتی۔ "اور اگر تم چاہو تو آج بھی میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں، لیکن تمہیں دوسری بیوی بن کر رہنا ہو گا۔ کیوں کہ راحیلہ کو میں کبھی طلاق نہیں دوں گا۔"

علی نے کچھ دیر اس کے کچھ کہنے کا انتظار کیا تھا پھر کوئی جواب نہ پا کر آہستہ سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

☼

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

"سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔" "پچھتاؤ گی۔" ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔

عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم وصلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

ناولٹ

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑجاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سعد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں جاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارحم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارحم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارحم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

موناعدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً"شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً"شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارحم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

پندرھویں قسط

بختاور ابھی ابھی ٹیکسی کر کے بسوں کے اڈے تک پہنچی تھی۔ اسے لاہور سے پنڈی جانا تھا اور پھر وہاں سے مظفر آباد۔ لاہور سے پنڈی تک کا سفر اس نے بے آواز آنسوؤں کے ساتھ کیا تھا۔ سیاہ رنگ کے عبایہ میں اس نے بلیک اسکارف کے ساتھ اپنا منہ بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں' جن کی سرخی اس کے اندرونی خلفشار کی گواہی دے رہی تھی۔

"بیٹا! کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟" اس کے ساتھ بیٹھی خاتون نے اسے مخاطب کیا۔

"پنڈی۔۔۔" بختاور نے مختصراً" جواب دیا۔

"مجھے لگتا ہے تمہاری آنکھیں خراب ہو رہی ہیں۔ کہیں ڈسٹ الرجی تو نہیں۔" وہ خاتون اپنے حلیے سے خاصی پڑھی لکھی لگ رہی تھیں اور ان کی گود میں آج کا تازہ اخبار رکھا ہوا تھا۔

"جی' الرجی ہے مجھے۔" اس نے نمکین آنسوؤں کے گولے کو حلق میں دوبارہ دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔
"کون سی میڈیسن استعمال کرتی ہو۔۔۔؟" ان کی دلچسپی بختاور کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔
"جو مل جائے۔" اس نے صاف انہیں ٹالا۔
"اچھا۔ میں تمہیں کچھ میڈیسن لکھ کر دیتی ہوں' وہ استعمال کرو' ان شاء اللہ افاقہ ہوگا۔" وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔
"آپ ڈاکٹر ہیں کیا۔۔۔؟" بختاور کی زبان سے پھسلا۔
"ہاں۔۔۔" وہ مسکرائیں۔
"لاہور میں رہتی ہیں کیا۔۔۔؟" بختاور کو ایک دم ہی ان میں دلچسپی محسوس ہوئی۔
"نہیں' لاہور تو میں ایک میڈیکل کانفرنس اٹینڈ کرنے گئی تھی۔" انہوں نے فوراً" جواب دیا۔
"میڈیکل کانفرنس۔۔۔" وہ حیران ہوئی۔
"ہاں انٹرنیشنل لیول کی تھی۔" انہوں نے لاپروائی سے بتایا۔
"پنڈی' اسلام آباد سے کون کون ڈاکٹرز آئے تھے وہاں؟" بختاور نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تو وہ حیران ہوئیں۔
"کافی سارے تھے' آپ کسی خاص کے متعلق پوچھنا چاہ رہی ہیں کیا؟"
"جی ڈاکٹر جلال کے بارے میں' بہت اچھے فزیشن ہیں وہ۔۔۔" بختاور کی بات پر اس خاتون کے چہرے بیزاری اور کوفت کا تاثر نمایاں ہوا۔
"معاف کرنا بیٹا! ڈاکٹر تو بہت اچھے ہیں لیکن اپنی اولاد کی پرورش ڈھنگ سے نہیں کی انہوں نے۔"
"آپ جانتی ہیں انہیں۔۔۔؟" بختاور کو لگا جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔
"ہاں ان کی بڑی بیٹی کے ساتھ میرے بھانجے کی بات چیت چلی تھی' پھر پتا چلا اس نے کسی یونیورسٹی فیلو سے شادی کرلی ہے اور۔۔۔"
"اور کیا۔۔۔؟" بختاور نے بے تابی سے ان کی بات کاٹی۔
"تم کیسے جانتی ہو انہیں۔۔۔؟" وہ اپنی بات بھول کر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔
"ان کی چھوٹی بیٹی طیبہ' میری بہن کی بہت اچھی دوست ہے۔" بختاور نے جلدی سے بات بنائی اور وہ کچھ مطمئن ہوگئیں۔
"طیبہ کے ساتھ تو بہت برا کیا انہوں نے' اپنے کسی کزن کے دیہاتی سے بیٹے کے پلے باندھ دیا اور فوراً" ہی شادی کردی۔ سنا ہے خوش نہیں ہے وہ۔" وہ خاتون بختاور کا سارا سکون درہم برہم کر گئیں۔
"اور ان کا بیٹا۔۔۔؟" آنسوؤں کا پھندا بختاور کے گلے میں پھنس گیا۔
"وہ تو شاید انگلینڈ میں ہوتا ہے۔" وہ خاتون بہت اچھی طرح ان کے گھر کے حالات سے واقف تھیں۔
"لگتا ہے' آپ کے فیملی ٹرمز ہیں ان کے ساتھ۔" اس نے یونہی پوچھا۔
"ارے نہیں بیٹا! ایک دفعہ ہی اپنی بہن کے ساتھ گئی تھی ان کے ہاں لڑکی دیکھنے' لیکن ملاقات نہیں ہو سکی' البتہ ڈاکٹر جلال سے تو اکثر ملاقات رہتی ہے' اسپتال میں' اور ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔۔۔" وہ سادگی سے بتانے لگیں۔
"تم کیا لاہور میں رہتی ہو۔۔۔؟" انہیں اچانک خیال آیا۔
"جی۔۔۔" بختاور نے سر جھکا لیا۔
"اور میکہ کہاں ہے تمہارا؟"
"پنڈی میں۔۔۔" بختاور نے مختصراً" بتا کر کھڑکی سے ٹیک لگالی۔ اس خاتون کی باتوں نے اس کا رہا سہا سکون بھی برباد کردیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار معصوم سی طیبہ کا چہرہ آرہا تھا اور وہ سمجھ سکتی تھی کہ بابا نے اس کی شادی اتنی اچانک کیوں کی ہوگی۔
"جس خاندان کی ایک لڑکی بھاگ کر شادی کرلے تو اس خاندان کی باقی لڑکیوں کو ساری زندگی اس کا تاوان بھرنا پڑتا ہے۔" بختاور کا دل احساس ندامت کے

گہرے احساس سے بھر گیا' اپنی زندگی تباہ ہونے کا تو دکھ تھا ہی لیکن طیبہ کی خوشیاں پامال کرنے کا دکھ اسے اور زیادہ بے چین کر رہا تھا۔ اس کے گناہوں کی فہرست بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔

اسے پتا ہی نہیں چلا' کب پنڈی آیا اور کب اس نے ٹکٹ خرید کر اپنا بیگ مظفر آباد جانے والی کوسٹر میں رکھا۔

وہ شدید ذہنی پژمردگی کا شکار ہو چکی تھی۔ اپنے وجود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے اس نے خود کو کوسٹر پر سوار کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

موسم کافی بدل چکا تھا۔ ایک چمکیلی صبح جب موسم بہار کی ہوا ہر طرف اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھی اور بندیا پانی کا پائپ پکڑے پودوں کو پانی دیتے ہوئے ہلکا ہلکا گنگنا رہی تھی' اچانک گیٹ کھلا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ اس کی جانب چلا آیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" بندیا نے آنکھیں سکیڑ کر اپنے سامنے کھڑے تیمور کو دیکھا۔

"جی جناب آپ کا خادم' تیمور جلال' آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھے متبسم لہجے میں بولا۔ آنکھوں سے صاف شرارت جھلک رہی تھی۔ بندیا کو ایک دم ہی اپنے گندے حلیے کا احساس ہوا' وہ تین دن پہلے کا میلا جا سا کاٹن کا سوٹ پہنے' دوپٹہ کمر پر باندھے' بڑے گھریلو سے حلیے میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"بتا کر نہیں آسکتے تھے کیا۔" بندیا نے بوکھلا کر سب سے پہلے کمر پر باندھا ہوا دوپٹہ کھولا۔

"بتا کر آتا تو تمہاری آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں کو کیسے دیکھتا۔" اس نے مسکرا کر ایک دفعہ پھر سر خم کیا۔

"کیسی ہو۔؟" وہ محبت پاش نگاہوں سے دیکھتا ہوا اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

"آپ اندر چلیں' میں حلیہ ٹھیک کر کے آتی ہوں۔" اس نے ہلکا سا جھینپ کر کہا۔

"پلیز' اس سرپرائز کو مت بتانا' میں آتے ہی اس کا مکار چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔" اس نے بندیا کے ساتھ چلتے چلتے شوخ لہجے میں گزارش کی' بندیا رکی اور گھور کر اسے دیکھا۔

"ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو' مرجاؤں گا۔" وہ شرارتی انداز میں گنگنایا۔ بندیا نے شرما کر اس کے کندھے پر مکا مارا اور بینش کے پورشن کی جانب بھاگ گئی' اس کی آمد ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد بینش کے ہمراہ ہوئی تھی۔

"تمہاری سرپرائز دینے کی عادت گئی نہیں۔" بینش نے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی اس پر فقرہ کسا۔

"اس دفعہ تو ایسا سرپرائز دوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گی۔" اس کا معنی خیز لہجہ بندیا کی دل کی دھڑکنوں کو مرتعش کر گیا۔

"اچھا' وہ کیا۔" بینش فوراً" بے تاب ہوئی۔

"ایسے ہی ہانک رہا ہے' تم لوگ بیٹھو ناں' کھانا کھاؤ۔" تائی اماں نے گھبرا کر بات بدلی۔ وہ دونوں بھی ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر براجمان ہو گئیں۔

تیمور کا یہ سرپرائز دورہ خاصا مختصر تھا' اس نے آتے ہی یہ بات سب کو بتا دی تھی۔ اس دفعہ تو بابا کا موڈ بھی خاصا خوش گوار تھا۔ رات کے کھانے پر سب ہی لوگ موجود تھے' بابا نے آغا جی اور بینش کو بھی بلوا لیا تھا۔

"اگلے ہفتے میں اپنی ایک میڈیکل کانفرنس نبٹالوں' پھر تیمور اور بینش کے نکاح کی تقریب رکھ لیتے ہیں۔" انہیں اسی طرح اچانک اپنے فیصلے سنانے کی عادت تھی۔ تیمور نے بوکھلا کر اپنی ماں کا پریشان چہرہ دیکھا۔

"جی جی بھائی جان' جیسا آپ کہیں۔" آغا جی نے مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔

"تایا ابا' میں بھی یہ میڈیکل کانفرنس اٹینڈ کرنے جاؤں گی آپ کے اور آغا جی کے ساتھ۔" بینش نے اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے فرمائش کی۔

"ارے ہاں ہاں۔ کیوں نہیں، میں وہاں سب کو بتاؤں گا کہ یہ ذہین و فطین ڈاکٹر میری ہونے والی بہو ہے۔" وہ خوشگوار لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنی بیگم اور بیٹے کو سخت ٹینشن میں ڈال رہے تھے۔

"سن لیا ناں تمہارا باپ کیا کہہ رہا تھا؟" رات کو موقع پاتے ہی اماں تیمور کے کمرے میں آگئیں۔

"آپ کیوں اپ سیٹ ہو رہی ہیں۔" وہ مطمئن تھا۔

"میڈیکل کانفرنس میں صرف چار دن رہ گئے ہیں اور تین دن کے بعد وہ واپس آکر نکاح کر دیں گے تمہارا۔" وہ جھنجلا کر بولیں۔

"ابھی پورے سات دن پڑے ہیں، ویسے بھی میں یہاں ہوں گا تو نکاح کریں گے۔" وہ مزے سے بولا۔

تیمور نے بھاگ دوڑ کر کے اپنی اور بندیا کی سیٹیں کنفرم کروالی تھیں۔ وہ ڈاکٹر جلال سے اپنے دوستوں کے ساتھ ناردرن ایریاز میں جانے کا کہہ کر ایک دن پہلے ہی گھر سے نکل آیا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کی ماں کسی عتاب کا شکار ہو۔ اسی طرح بندیا نے بینش کو بتا دیا تھا کہ اس کے بابا اسے لینے کے لیے آ رہے ہیں اور وہ ایک ہفتہ اپنے گاؤں میں رہے گی۔ بینش نے مطمئن ہو کر باقی سارا گھر لاک کروا دیا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا' ان شاء اللہ ایک ہفتے بعد ملاقات ہو گی۔" بینش خلاف توقع اس سے بڑے پرجوش انداز میں مل کر گئی تھی۔

جس وقت ڈاکٹر جلال لاہور پہنچے تھے اس وقت تک تیمور' بندیا کے ساتھ پاکستان کی حدود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل چکا تھا۔ ڈاکٹر جلال تین دن کے بعد لاہور سے اسلام آباد پہنچے تو ان کا یہی خیال تھا کہ تیمور

اپنے دوستوں کے ساتھ ناران کاغان گیا ہے جبکہ بینش یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ بندیا اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے' اس سے پہلے کہ کسی کو تیمور اور بندیا کے جانے کا پتا چلتا' باہر سے آنے والی قیامت خیز اطلاع نے سب کے حواس گم کر دیے۔

مظفر آباد جانے والی ایک تیز رفتار کوسٹر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور گہری کھائی میں گرنے کی وجہ سے زیادہ تر مسافر انتقال کر گئے تھے۔ مسافروں کے سامان میں بختاور عرف ڈیزی کا شناختی کارڈ اور کچی پھٹی ناقابل شناخت لاش ملی تھی' جسے ڈاکٹر جلال نے وصول کرنے سے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

"تم نے یہ سب کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا میرے بارے میں۔" ماہیر آندھی اور طوفان کی طرح شانزے کے فلیٹ میں پہنچا تھا اور وہ جو اس وقت لاہور سے واپس آکر اپنا سامان کھول رہی تھی' اس اچانک حملے پر بوکھلا گئی۔

"آئی ایم سوری ماہیر۔ وہ۔" وہ گھبرا گئی۔

"مجھے ایم ایکسکیوز مت دو شانزے! یہ بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟ میری بات کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی کیا۔" وہ لمحہ آہی گیا تھا جس سے وہ ڈر رہی تھی' وہ بدگمان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ایکچوئلی۔" وہ بات کرنے کے لیے تمہید باندھ ہی رہی تھی کہ ماہیر نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"مجھ سے غلط بیانی مت کرنا شانزے۔" اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"اصل بات بتاؤں گی تو تم خفا تو نہیں ہو جاؤ گے؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"تو اب کون سا خوشی سے بھنگڑے ڈال رہا ہوں میں۔" غصے کی زیادتی سے اس کے ناک کے نتھنے پھڑپھڑائے۔

"آئی ایم سو سوری ماہیر۔" وہ انگلیاں مسلتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے اصل بات بتاؤ شانزے ورنہ۔" وہ ایک دم جھنجلا گیا۔

"میں نے یہ پراجیکٹ اس لیے سائن کیا تھا کیونکہ۔"

وہ جھجک کر چپ ہوئی۔
"بولتی کیوں نہیں ہو تمہاری زبان پر مہر کیوں لگ گئی ہے۔" ماہیر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر ایک آدھ تھپڑ لگا دے اسے۔
"کیوں کہ اس ڈفر نے مجھے گاڑی نہ ہونے کا طعنہ دیا تھا۔" شانزے کی بات پر ماہیر کو وچھو کا لگا۔
"کس نے۔؟"
"یاور بیگ نے۔" شانزے نے خفت زدہ لہجے میں جواب دیا۔
"تم نے صرف پیسوں کے لیے اس سیریل میں کام کیا۔؟" اسے وچھو کا لگا تھا۔
"ہاں مجھے بہت برا لگا تھا کیونکہ میں اس وقت فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔"
"اس گدھے کی ہمت کیسے ہوئی، تمہیں گاڑی نہ ہونے کا طعنہ دے۔" ماہیر کا چہرہ سرخ ہوا۔ "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"
"اس لیے کہ تم پاکستان میں نہیں تھے۔" وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔
"پھر گاڑی لے لی۔؟" ماہیر کا غصہ قدرے کم ہوا۔ شانزے نے جلدی سے اثبات میں سرہلایا۔
"تم سے بڑھ کر بے وقوف لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" وہ جھنجلا سا گیا۔ اس کی جھنجلاہٹ میں اس دفعہ ناراضی کا عنصر کم تھا، جسے محسوس کرکے شانزے نے سکون کی سانس لی۔
"ادھر بیٹھو اور غور سے میری بات سنو۔" ماہیر نے اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔
"کیا ہوا۔؟" وہ گھبرا گئی۔
"میں نے پاپا سے تمہارا ذکر کیا ہے اور وہ تمہاری فیملی سے ملنا چاہتے ہیں۔" اس دفعہ پریشان ہونے کی باری شانزے کی تھی۔
"لیکن۔؟" وہ گھبرا گئی۔
"تو کیا شادی کرنے کا ارادہ بھی بدل دیا ہے تم نے؟" وہ بدگمان ہوا اور تیزی سے کھڑا ہو گیا۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ماہیر، کیوں بچوں کی طرح بات بات پر خفا ہو رہے ہو۔" وہ بھی ہلکا سا جھنجلائی۔
"کیونکہ تم حرکتیں ہی مجھے چڑانے والی کرتی ہو، ابھی تمہاری اس سیریل میں کام کرنے والی بے وقوفی کو بھی سنبھالنا ہے مجھے۔" وہ منہ بنا کر ٹہلنے لگا۔
"خود بھی تو میڈیا کے لیے کام کرتے ہو۔" شانزے کو غصہ آیا۔
"ہاں تو میری تو جاب ہے وہ، بلکہ ایک طرح کا بزنس۔" ماہیر نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔
"اچھا اب یہ گھورنا بند کرو میں بات کرتی ہوں اپنی پھپھو سے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"تم پھپھو سے بات کرکے فوراً مجھے بتاؤ میں اب تمہیں مزید بچکانہ حرکتیں کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر بیٹھ گیا۔ اس کا موڈ بحال ہو چکا تھا اور ساتھ ہی سانسیں بھی ہموار انداز میں چلنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"میں تم سے ایک سو ایک دفعہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے سڈنی نہیں آنا۔" ارصم کی غصے سے بھری آواز مینش کی سماعتوں سے ٹکرائی، وہ جو لان میں پائپ لگائے پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔ ایک دم گھبرا گئیں۔
"تم نے جو کرنا ہے کرلو میرا فیصلہ یہی رہے گا۔" ارصم نے ٹھوکر مار کر لان کی سائیڈ والا دروازہ بند کیا اور باہر نکل آیا۔
"یہ بات تم مجھے نہیں اپنی ممی کو سمجھاؤ، کلس اوکے۔" ارصم کی گفتگو مینش کے لیے اعصاب شکن تھی۔
"کیا ہوا ہے۔؟" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔
"ممی! یہ ارسلہ کو اپنی زبان میں سمجھا دیں کہ مجھے آسٹریلیا نہیں آنا، ورنہ اپنی منگنی کی انگوٹھی رکھے سنبھال کر۔" ارصم کا ناگوار لہجہ ہزاروں میل فاصلے پر موجود ارسلہ کو آگ لگا گیا۔

"کیا ہوا ہے آخر۔۔۔؟" انہوں نے اپنے اندر سے اٹھتی ہوئی ناگواری کی لہر کو بمشکل دبایا۔

"پوری دنیا باہر آنے کے لیے ترستی ہے اور یہ اس کے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔" دوسری جانب ارسلہ کا مزاج بھی آج سوا نیزے پر تھا۔

"اچھا میری عمیرہ سے بات کرواؤ۔۔۔ میں سمجھاؤں گی ارصم کو۔" بینش نے معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"میرا خیال ہے 'آپ ممی سے بات کرنے کے بجائے اپنے بیٹے سے پہلے بات کریں۔" ارسلہ کا گستاخانہ انداز بینش کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا اس بات سے؟" وہ بھی تھوڑا بدلحاظ ہوئیں۔

"یہ تو ارصم اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں بھی اس کی خاطر پاکستان میں آکر رہوں گی 'اس لیے اس نے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کرلے۔ کل کو نہ خود خوار ہو اور نہ مجھے کرے۔" وہ بھی ایک دم پھٹ پڑی۔

"اور اگر ارصم کا جواب ناں میں ہو تو۔۔۔؟" بینش بھی غصے میں آگئیں۔

"تو میری طرف سے ابھی اور اسی وقت انکار ہے 'آپ جہاں چاہیں 'اپنے بیٹے کی شادی کرلیں 'گڈ بائے۔" ارسلہ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں ان کے اعصاب پر بم گرا چکی تھی۔

"تم اس طرح کیسے منگنی ختم کرسکتی ہو۔" بینش بوکھلائیں لیکن دوسری طرف سے کال ڈسکنکٹ ہو چکی تھی۔

"اب سکون آگیا؟ شوق پورا ہو گیا آپ کا۔۔۔" ارصم نے ناراضی سے ان کے ہاتھ سے سیل فون پکڑا۔

"وہ کیسے بات ختم کرسکتی ہے۔ میں تمہاری پھپھو سے بات کروں گی۔" بینش نے اپنی ڈوبتی نبضوں کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

"آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گی۔۔۔" ارصم نے انگلی اٹھا کر انہیں وہ ٹوک انداز میں وارننگ دی۔

"وہ تو بے وقوف ہے 'نا سمجھ ہے۔" بینش نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن میں اس سے زیادہ بے وقوف نہیں بن سکتا آپ نے جو کرنا تھا وہ کرلیا 'اب میں وہ کروں گا جو میں چاہوں گا۔" ارصم کا سرد لہجہ انہیں پاتال کی گہرائیوں میں گرا گیا 'انہوں نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا 'جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑے ابا کے پورشن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

دوسری طرف اوریدا ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بڑی اماں سے اپنے بالوں میں ناریل کا تیل لگوا رہی تھی۔ ارصم لاؤنج کا دروازہ کھول کر ناراض انداز میں اندر داخل ہوا۔ بڑی اماں اور اوریدا دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو دھپ کر کے صوفے پر یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی مسافر صدیوں کی تھکن کے بعد ایک دم زمین پر گر گیا ہو۔

"ارصم بیٹا! طبیعت ٹھیک ہے۔۔۔؟" بڑی اماں اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"بڑی اماں! میرے سر میں بھی مساج کردیں 'بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ آنکھیں بند کیے افسردہ انداز میں بولا۔ اوریدا کا دل دھک سے رہ گیا 'اس نے کافی دن کے بعد اس دشمن جان کا چہرہ غور سے دیکھا تھا 'آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور تھکا تھکا سا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار کی عکاسی کر رہا تھا۔

"بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔" بڑی اماں نے اوریدا کو اپنے قدموں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"پتا نہیں بڑی اماں۔۔۔" وہ اوریدا کی چھوڑی ہوئی جگہ پر آکر بیٹھ گیا 'بڑی اماں نے ناریل کے تیل کے ساتھ اس کے سر کا مساج شروع کردیا 'ارصم کو بہت عرصے کے بعد طمانیت کا احساس ہوا۔

"جاؤ 'ارصم کے لیے اسٹرابری کا شیک بنا کر لاؤ۔" بڑی اماں نے کسی ہیلتھ جرنل میں سر دیے بیٹھی اوریدا کو اٹھایا۔

"جی بڑی اماں۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی آئی' شیک بنا کر وہ اگلے ہی دس منٹ میں باہر تھی' جبکہ لاؤنج میں آتے ہی اسے حیرت کا جھٹکا لگا وہ مساج کرواتے کرواتے بڑی اماں کی گود میں سر رکھے سو چکا تھا۔

"اسے کیا ہوا۔؟" اوریدا نے ہاتھ کے اشارے سے بڑی اماں سے پوچھا۔

"شش۔" بڑی اماں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اسی وقت ماہیر باہر سے شور مچاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"آج تو کمال ہو گیا بڑی اماں۔" ماہیر کی پُرجوش آواز پر ارصم کی آنکھ کھل گئی۔

"ارے تم تو یہاں نیند کے مزے لے رہے ہو' خیر تو ہے ناں۔" ماہیر دھپ کر کے ارصم والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب کہ اوریدا دوبارہ سے جرنل میں سر دے کر بیٹھ گئی لیکن اس کا سارا دھیان ارصم کی طرف تھا۔

"جس طرح سے تم حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے' کوئی شریف بندہ سو سکتا ہے۔" بڑی اماں کو اس پر غصہ آیا۔

"بات ہی ایسی ہے میں کیا کروں۔" وہ ہنسا۔

"کیا کوئی پرائز بانڈ نکل آیا ہے تمہارا۔" بڑی اماں نے منہ بنا کر اندازہ لگایا۔

"وہ نہیں' مزاجوں پر چھائی ہوئی سرد مہری کی برف تھوڑا سا پگھلی ہے۔" اس نے گھما پھرا کر جواب دیا۔

"کیا اوٹ پٹانگ بولے جا رہے ہو۔" وہ جھنجلا گئیں۔

"بڑے ابا نے آج پاپا کی ساری میڈیکل رپورٹس منگوائی ہیں اپنے کلینک میں۔" ماہیر کی بات پر بڑی اماں' اوریدا اور ارصم خوش گوار حیرت کا شکار ہوئے۔

"کیا واقعی بھائی۔؟" اوریدا جھٹ سے اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں ناں' اب اسی خوشی میں ایک بڑا سا گلاس میرے لیے بھی اسٹرابری شیک کا بنا کر لاؤ۔" ماہیر نے جھٹ سے فرمائش کی۔

"آپ یہ لے لیں۔" ارصم جو کافی دیر سے گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا' فوراً بولا۔

"ارے نہیں یار! تم پی لو' پتا نہیں آسٹریلیا میں ارسلہ بنا کر پلائے یا نہ پلائے۔" ماہیر اسے بڑے غلط موقعے پر چھیڑ بیٹھا تھا۔ ارصم کا چہرہ پل بھر کو متغیر ہوا یک دم وہ اٹھا اور غصے سے کمرے سے نکل گیا۔

"یہ تو مائنڈ کر گیا۔" ماہیر نے حیرانی سے بڑی اماں اور اوریدا کا چہرہ دیکھا جو خود بھی ہکا بکا تھیں۔

"تم نے ضرور اس سے ایسا مذاق کرنا تھا۔" بڑی اماں نے اپنے پوتے کی کلاس لی' اس سے پہلے کہ ماہیر ان کی بات کا جواب دیتا' بوا رحمت ہانپتی کانپتی ہولائے ہوئے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"بیگم صاحبہ بڑی دھماکے دار خبر لائی ہوں میں۔" بوا رحمت کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"کیا ہوا' آغا جی نے اس عمر میں دوسری شادی تو نہیں کر لی۔" ماہیر کی زبان پھسلی۔

"آئے ہائے' ماہیر میاں! یہ کیسا مذاق کر رہے ہو۔" بوا رحمت صوفے پر بیٹھ کر اپنی سانسیں بحال کرنے لگیں۔

"بوا! بتا بھی دو' کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔؟" بڑی اماں کے لہجے میں ناگواری کا تاثر ابھرا۔

"آپ کو پتا ہے' ارصم میاں کی منگنی ٹوٹ گئی۔" بوا رحمت نے کمرے میں بم ہی تو پھوڑا تھا۔ اوریدا کے ہاتھ میں پکڑا اسٹرابری شیک کا گلاس ہلکا سا چھلکا۔

"منگنی ٹوٹ گئی' لیکن کیوں۔؟" بڑی اماں تعجب سے بولیں۔

"اللہ ہی جانتا ہے' مجھے تو ان کی ملازمہ صغرا نے بتایا ہے کہ بینش بی بی اپنی نند سے فون پر جھگڑا کر رہی تھیں کہ آپ لوگوں نے منگنی توڑ کر اچھا نہیں کیا۔" انہوں نے اس دفعہ تفصیل سے وضاحت کی۔

"اوہ۔ اسی وجہ سے ارصم اتنے غصے میں اٹھ کر گیا ہے۔" ماہیر کو اصل معاملہ سمجھ میں آگیا تھا۔

اوریہ انے ہاتھ میں پکڑا گلاس سائیڈ میز پر رکھا اور خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی' اس کے اندر ایک حشر سا برپا تھا۔ منگنی ٹوٹ جانے پر ارصم کا افسردہ سا رویہ اسے تکلیف دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہاشم کراچی سے واپس آیا تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی' وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے خالی فلیٹ اور ڈرائنگ روم کی میز پر رکھے بختاور کے آخری خط کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دماغ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ وہ اسے یوں چھوڑ کر بھی جا سکتی ہے۔

ہاشم۔۔۔!!!

تم سے محبت اور شادی میری زندگی کے دو ایسے گناہ ہیں جن پر اللہ تو شاید مجھے معاف کر دے لیکن میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی' میں نے اپنے والدین کی دل آزاری کی۔ جس کا نتیجہ مجھے تمہاری صورت میں بھگتنا پڑا۔ بعض گناہوں کی سزا اللہ قیامت والے دن دے گا لیکن کچھ غلطیاں ایسی ہیں' جس کی سزا انسان کو دنیا میں بھی ملتی ہے' تم وہ عذاب تھے جو ماں باپ کی نافرمانی کرنے کے جرم میں مجھ پر مسلط کر دیے گئے۔ میں تمہارے ساتھ گزرے ایک ایک لمحے پر شرمندہ ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ اللہ مجھ پر رحم کرے اور مجھے معاف کر دے۔ تمہاری بیٹی میں نے تمہارے بڑے بھائی کے سپرد کر دی ہے' اگر زندگی میں کبھی تم نے واقعی ایک پل کے لیے بھی مجھ سے سچی محبت کی ہو تو تمہیں اس ایک پل کی محبت کا واسطہ' میری بیٹی کو اپنے جیسا مت بنانا' میں نہیں چاہتی کہ وہ قیامت کے دن میرا گریبان پکڑے۔ تمہارے لیے میں صرف ہدایت کی ہی دعا کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ بختاور۔

ہاشم' پگلوں کی طرح ربوہ پہنچا تھا اور وہیں جا کر اسے پتا چلا کہ اعظم بھائی نے اس کی بیٹی کو اس کی بڑی بہن کے سپرد کر دیا ہے' جو پچھلے کئی سالوں سے بے اولادی کا غم سہہ رہی تھیں۔ اس نے اگلے ایک گھنٹے میں سب لوگوں کو حویلی میں اکٹھا کر لیا تھا۔

"تم لوگ میری بیٹی کو زبردستی کیسے رکھ سکتے ہو۔" وہ مشتعل ہوا۔

"میں مر جاؤں گی' لیکن اسے واپس نہیں کروں گی۔" اس کی بہن نے ننھی زینب کو زور سے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" ہاشم کی جیسے ہی اپنی بیٹی پر نظر پڑی' اسے بے ساختہ اس معصوم پری پر پیار آیا۔

"اکیلے کیسے پالو گے اسے۔" اعظم بھائی نے اسے تلخ حقیقت سے آگاہ کیا۔ "اور جس دن اسے تمہاری اصلیت پتا چلی' وہ بھی گھر چھوڑ کر ایسے ہی بھاگ جائے گی' جیسے اس کی ماں چلی گئی۔" اعظم بھائی کا تلخ لہجہ اس کا دل چیر کر رکھ گیا۔

"وہ کیوں کرے گی ایسا۔" ہاشم نے افسردگی سے کہا۔

"تم نے بھی تو اپنے والدین کی نافرمانی کی تھی' اس کی ماں نے بھی اپنے والدین کا دل دکھایا تھا تو تم کیسے اپنی اولاد سے اس چیز کی توقع نہیں رکھتے۔" اعظم بھائی استہزائیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مزید گویا ہوئے۔ "تمہاری بیٹی کو تو خود غرضی اور نافرمانی جینز میں ملی ہو گی۔"

"میری بیٹی ایسی نہیں ہو گی۔" وہ خوف زدہ نگاہوں سے ننھی زینب کے معصوم چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"سارے والدین کو اپنے بچوں پر ایسا ہی مان اور اعتماد ہوتا ہے' جو تم جیسی اولاد اپنے پیروں میں کچل کر آگے بڑھ جاتی ہے۔" اعظم بھائی آج اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" اسے بھی غصہ آیا۔

"میں یہ بچی تمہارے حوالے نہیں کروں گا' اس کی ماں نے میرے سپرد کیا تھا اسے' اس نے تو اس کے نام کے آگے تمہارا نہیں اس کے دادا کا نام لکھوایا ہے۔"

"وہ کون ہوتی ہے میری بچی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی۔" ہاشم مشتعل ہوا۔

"اس کی ماں ہے وہ' اس نے جنم دیا ہے اسے۔" اعظم بھائی نے یاد دلایا۔

"لیکن میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔" ہاشم ضدی انداز میں بولا۔

"تو ٹھیک ہے اگر اپنی بہن کی تیرہ سال کی بے اولادی پہ تمہیں رحم نہیں آتا تو لے جاؤ چھین کر اس سے۔" وہ ناراض انداز سے گویا ہوئے۔

"تم لوگ کتنے ظالم ہو' میری گود اجاڑو گے' تمہیں شرم نہیں آتی' بڑی بہن ہوں میں تمہاری۔" ہاشم کی بہن خولہ جذباتی ہو کر رو پڑیں۔

"اتنے سے تھے تم' جب سارا سارا دن تمہیں گود میں اٹھا کر پھرا کرتی تھی میں۔ اماں نے کم اور میں نے زیادہ پالا تھا تمہیں' اپنی راتوں کی نیندیں حرام کیے رکھیں تمہارے لیے۔" انہوں نے روتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ ہاشم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"اسے کسی کا بھی احسان یاد نہیں خولہ آپا! کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں آپ۔" اعظم بھائی نے بھی اپنی نم آلود آنکھوں کو صاف کیا۔ ہاشم بالکل ہی ڈھے گیا۔ وہ سر جھکائے کسی مجرم کی طرح بیٹھ گیا۔

"تم اسے لے کر گئے تو قسم اللہ پاک کی خود کشی کر لوں گی میں۔" خولہ آپا نے جذباتی لہجے میں دھمکی دی۔

"تو میں کیسے رہوں گا اس کے بغیر۔" ہاشم کا لہجہ بھیگا۔

"تم تو مرد ہو' گھر میں ڈال کر بھول جاؤ گے اسے' بیٹی کی تربیت کا کہاں وقت ہو گا تمہارے پاس۔" خولہ آپا نے غصے سے کہا۔ اس دفعہ شاید ہاشم کی سمجھ میں بھی بات آ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن' اس کا نام میں رکھوں گا۔" وہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد گویا ہوا۔

"ہاں ہاں رکھ لو' لیکن اسے لے جانے کی بات مت کرنا۔" خولہ آپا کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ہاشم نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کا اپنا چہرہ بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

بختاور کے بعد بیٹی کی جدائی نے اسے بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا' اسی وجہ سے وہ چھ ماہ کے بعد ہی اپنے بزنس پارٹنر کے ساتھ امریکہ شفٹ ہو گیا۔ کچھ سالوں تک تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے آتا رہا اور پھر ایک دن کسی لڑائی جھگڑے میں اس کے زخمی ہونے کی اطلاع آئی اور پھر وہ لاپتا ہو گیا۔ پانچ سال کے بعد اعظم بھائی کے کسی دوست نے ہی بتایا تھا کہ ایک مذہبی بحث میں ہونے والے جھگڑے کے بعد ہاشم کو کسی نے قتل کر دیا تھا لیکن اس کی ڈیڈ باڈی یا باقی معاملات کے لیے کسی نے بھی ہاشم کی فیملی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس کا قتل بھی ایک معمہ بن گیا اور کسی نے بھی اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

عدینہ کن انکھیوں سے ڈاکٹر جلال کو عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جب سے اسے پتا چلا تھا کہ آپا صالحہ کا ان کے ساتھ خونی رشتہ ہے۔ عدینہ کے دل و دماغ میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی لیکن اس بات کو ذرا ٹال ہی جانا ہی مناسب تھا' کیونکہ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ آپا صالحہ کا ذکر اس گھر میں اچھے لفظوں میں نہیں کیا جاتا اور جیتے جی ان کی موت کا اعلان کرنے کے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ تھی۔

لیکن یہ بات اس کے لیے سخت تعجب کا باعث تھی کہ ڈاکٹر جلال جیسی ویل ایجوکیٹڈ فیملی سے تعلق رکھنے والی آپا صالحہ نے مولوی رفیق میں کیا دیکھا اور وہ آپا کو کہاں ٹکرائے' سوالات کی ایک لمبی فہرست تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس بات کے پیچھے کچھ اسرار بھی چھپے ہوئے ہوں گے لیکن آپا صالحہ کی اس خطرناک بیماری نے اسے وقتی طور پر ہر چیز بھلا دی تھی۔

عدینہ اس وقت ڈاکٹر جلال کے کلینک میں موجود

تھی' جو آپا صالحہ کی رپورٹس کو ہاتھ میں پکڑے سنجیدگی سے پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلی تشویش اور سنجیدگی' عدینہ کو خوف زدہ کر رہی تھی۔

"آپ کی والدہ اس وقت کہاں ہیں۔۔۔" ڈاکٹر جلال نے ایک لمبا سانس لے کر اپنا نفیس چشمہ میز پر رکھا اور عدینہ کا پریشانی میں ڈوبا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔

"وہ تو گاؤں میں ہیں بڑے ابا۔۔۔" عدینہ ہلکا سا جھجک کر بولی۔

"ان کو فوراً بلوائیں اور پہلی فرصت میں سرجری کروائیں ورنہ۔۔۔" وہ بولتے بولتے رکے۔

"ورنہ کیا۔۔۔؟" عدینہ کا دل بری طرح سے دھڑکا۔

"ایسے حالات میں دیر کرنا دانش مندی نہیں۔" وہ مختصراً بہت کچھ کہہ گئے تھے۔

"لیکن بڑے ابا۔۔۔؟" وہ آنے والے دنوں کا سوچ کر گھبرا گئی۔

"میں آپ جیسی بہادر اور سمجھ دار لڑکی سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ان حالات میں اوریدا کی طرح ری ایکٹ کرے گی۔" وہ ان کی بات پر ایک دم شرمندہ ہوئی لیکن وہ انہیں بتا نہیں سکی کہ ماں ایک ایسا رشتہ ہے جس کے سامنے بڑے بڑے سرپھرے بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔ ماں کی تکلیف کو اپنی آنکھوں کے سامنے برداشت کرنا کسی پل صراط پر چلنے کے مترادف تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں عدینہ۔۔۔" بڑے ابا کی بات پر وہ جبراً" مسکرائی' اسے اس وقت ایسے ہی کسی والے کی ضرورت تھی۔

"تھینک یو۔۔۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"پھر آپ کب لا رہی ہیں انہیں۔۔۔؟" انہوں نے آپا صالحہ کی فائل بند کی۔

"جب آپ کہیں' لیکن اس سے پہلے مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا تھا۔" وہ کشمکش کا شکار ہوئی۔

"ہاں ہاں پوچھیں۔۔۔" انہوں نے اپنا چشمہ دوبارا لگا لیا تھا۔

"اس پروسیجر پر کتنے اخراجات ہوں گے۔۔۔؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل پوچھا۔

"اخراجات کی تم ٹینشن مت لو' یہ سرجری تو ہمارے اسپتال میں ہو جائے گی' میں اپنے کولیگ سے کہہ دوں گا۔" انہوں نے اس کا مسئلہ سمجھتے ہوئے اپنی طرف سے بہترین حل نکالا۔

"لیکن پھر بھی پتا بھی تو چلے۔۔۔" وہ اس دفعہ پورا زور لگا کر زبردستی مسکرائی۔

"بیٹیاں ایسی باتیں کرتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔" انہیں اس کی خودداری اچھی لگی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بڑے ابا! لیکن میری مدر ایسے آپریشن کروانے کے لیے ہرگز راضی نہیں ہوں گی۔" عدینہ نے انہیں اصل مسئلہ بتایا۔

"دیکھیں بیٹا! یہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے' ہم لوگ مہینے میں دو تین سرجریز مفت میں کر رہے ہیں اور ویسے بھی آپ اوریدا کی فرینڈ ہیں اور میں آپ کو ہمیشہ اس کی طرح سمجھتا ہوں' ہم لوگ کیسے آپ سے فیس وغیرہ چارج کر سکتے ہیں' اٹس کمپلی امپاسبل۔۔۔" بڑے ابا کا نرم لہجہ عدینہ کے دل میں اتر ما جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن شاید سورج مغرب ہی سے نکلا تھا۔

آغا جی نے انتہائی غصے سے ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھولا اور پوری قوت سے بند کیا۔ ان کا چہرہ سرخ اور کنپٹیاں غصے کی زیادتی سے پھڑک رہی تھیں۔ ڈائننگ روم میں کھڑی بینش نے تعجب سے اپنے باپ کا چہرہ دیکھا۔

"کدھر ہے یہ ارحم' کیا تماشا بنا رکھا ہے اس نے" خلاف معمول اور خلاف عادت آغا جی ایک دم ہی بھڑکے۔

"کیا ہوا آغا جی۔۔۔" وہ بوکھلا کر فریج کا دروازہ بند کرنا بھول گئیں۔

"ناک کٹوا کر رکھ دی ہے اس لڑکے نے اور۔۔۔" غصے کی زیادتی سے وہ اپنا فقرہ مکمل نہیں کر سکے۔

"کیا ہوا آغا جی۔۔؟" ہزاروں اندیشوں نے ایک ساتھ بینش کا دامن پکڑا۔ بھلا آغا جی کب ارحم کے لیے ایسا لہجہ استعمال کرتے تھے۔

"تمہیں پتا نہیں ہے موصوف نے کیا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔" انہوں نے صدمے سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"آپ بتائیں گے تو پتا چلے گا ناں۔۔؟" ان کا دل بے ربط انداز میں دھڑکا۔

"پروفیسر راضیہ جیلانی نے کال نہیں کی تمہیں؟" انہوں نے جانچتی نگاہوں سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"نن۔۔ نہیں تو۔ کیا انہوں نے بات کرنی تھی مجھ سے۔" وہ پریشان ہو کر ان کے قریب چلی آئیں۔

"ویسے یہ ارحم ہے کہاں۔۔؟" انہوں نے ان کی بات کا جواب دیے بغیر اگلا سوال کیا۔

"ابھی گھر نہیں آیا۔" بینش نے فوراً جواب دیا۔

"اور آج آئے گا بھی نہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"ہوا کیا ہے آغا جی! کچھ تو بتائیں کیوں میری جان نکال رہے ہیں آپ۔" وہ خوف زدہ انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"تھرڈ پروف میں دو سبجیکٹس میں فیل ہو گیا ہے تمہارا چہیتا بیٹا۔" آغا جی نے ان کے اعصاب پر وہ بم گرا ہی دیا جسے سن کر وہ خود حواس باختہ انداز میں گھر کی طرف بھاگے تھے۔

"یہ کیسے ممکن ہے آغا جی! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں بھی نہیں مانا تھا خود پروفیسر راضیہ جیلانی سے پیپرز نکلوا کر دیکھے ہیں میں نے اس کے۔"

"تو۔۔؟" بینش کا دماغ چکرانے لگا۔

"انہوں نے تو پھر بھی لحاظ کر کے چند نمبر دے ہی دیے "اگر میرے یا تمہارے پاس آتا اس کا پیپر تو ہم اتنے بھی نہ دیتے۔" آغا جی کے تلخ انداز سے بینش کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود اس وقت کس سچویشن سے گزر رہے تھے۔

"لیکن ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا آغا جی۔۔" بینش کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"مجھے جنرل پیتھالوجی کے پروفیسر عبیدالرحمن نے بتایا ہے کہ اس سال بہت مایوس کن رہی ہے اس کی پرفارمنس۔" آغا جی نے بینش کے غبارے میں ایک اور سوئی مار کر رہی سہی کسر بھی نکال دی۔

بینش کا دل پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا جا رہا تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح مدد لینے کے لیے بڑے ابا کے پاس پہنچیں جنہوں نے بہت سپاٹ انداز سے ان کی ساری بات سنی کیونکہ اوریدا والے معاملے کے بعد ارحم ان کے پسندیدہ افراد کی لسٹ سے باہر نکل چکا تھا اور بینش اس بات سے بے خبر تھیں۔

"تمہیں خود دھیان دینا چاہیے تھا اس پر۔۔" انہوں نے خلاف توقع سارا ملبہ بینش کے سر پر ڈال دیا۔ واش روم سے باہر نکلتی بڑی اماں ڈریسنگ میں ہی کھڑی رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کے میاں اپنی لاڈلی بھتیجی سے بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔

"تایا ابا! آپ خود بتائیں کیا ارحم جیسے بچوں کو بھی کسی کی ہیلپ کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ جھنجلا گئیں۔

"جب بچوں کا دھیان پڑھائی سے ہٹ کر اوٹ پٹانگ چیزوں کی طرف لگ جائے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔" بڑے ابا کی بدلی نگاہی پر وہ چونکیں۔

"تایا ابا! ارحم ایسا بچہ نہیں ہے" آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔۔" انہوں نے ناراضی سے یاد دلایا۔

"سارے والدین کو اپنے بچوں کے بارے میں ایسی ہی خوش فہمی ہوتی ہے تم ذیزی کا حال بھول گئی ہو۔" وہ تلخ لہجے میں گویا ہوئے۔ "مجھے کب امید تھی کہ وہ ایسا قدم اٹھائے گی۔"

"تایا ابا! برا مت مانیے گا ذیزی اور ارحم میں زمین

و آسمان کا فرق ہے' میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔" بینش کے زعم بھرے انداز پر بڑے ابا طنزیہ انداز میں مسکرائے۔ بینش نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا۔

"ارحم اور ویزی میں کوئی فرق نہیں' اس نے بھی وہی حرکت کرنے کی کوشش کی' جو میری بیٹی نے کی تھی۔" بڑے ابا کی بات پر بینش کو زوردار جھٹکا لگا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔؟"

"اس نے اوریدا کو کورٹ میرج کرنے کی آفر کی اور جب اس نے انکار کیا تو اس سے خفا ہو گیا۔ بولو کیا فرق ہے میری بیٹی اور تمہارے بیٹے میں۔" بڑے ابا نے آج وہ بات اگل ہی دی جسے وہ کئی ماہ سے اپنے دل میں چھپائے بیٹھے تھے۔ ڈریسنگ روم میں کھڑی بڑی اماں کے پیروں کے نیچے سے بھی زمین کھسکی۔

"میں نہیں مان سکتی' میرا بیٹا ایسا نہیں کر سکتا۔" بینش ایک دم بھڑک کر کھڑی ہو گئیں۔

"اس نے ایسا ہی کیا تھا' اسی ناراضی کی بنا پر اس نے اس کی منگنی کی تقریب کا بائیکاٹ کیا تھا۔" بڑے ابا نے ایک اور راز فاش کیا۔

"لیکن۔۔۔" بینش کا وجود زلزلوں کی زد میں آیا۔

"یقین نہیں آتا تو بلواؤ اسے' میرے سامنے پوچھو' میں دیکھتا ہوں وہ کیسے انکار کرتا ہے۔" ڈاکٹر جلال اپنے مخصوص جلالی انداز میں بولے۔

"اسے اوریدا نے ورغلایا ہو گا۔" وہ خود کو سنبھال کر تنفر انداز میں بولیں۔

"بس کر دو بینش! بس کر دو' مان لو' تمہارا بیٹا کوئی فرشتہ نہیں ہے' اس کی تربیت میں کہیں نہ کہیں تم سے بھی کوتاہی ہوئی ہے' اس سے تو اچھی تیمور کی بیٹی نکلی' بن ماں کی بچی' اس کو کس نے سکھائی ہو گی اچھائی اور برائی کی تمیز۔؟" وہ جھنجلا کر گویا ہوئے' اب اس سے زیادہ بڑی اماں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ڈریسنگ میں کھڑی رہتیں۔

"آج تو یقین آ گیا ناں' میں نے ویزی کی تربیت ایسے نہیں کی تھی' کون ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد ایسا قدم اٹھائے۔" وہ رنجیدہ انداز میں بینش کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"شیطان کے شر اور برے وقت سے پناہ مانگنی چاہیے' جو انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔"

وہ خاموشی سے آ کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے یا لہجے میں کوئی طنز کی آمیزش نہیں تھی' صرف اور صرف دکھ اور غم کی شدت تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا عدینہ' ارحم کا اتنا برا رزلٹ کیسے آ سکتا ہے۔" اوریدا نے لب سے نکلتے ہوئے افسردگی کے عالم میں کہا' اسے کالج پہنچتے ہی یہ بری خبر ملی تھی۔ ارحم کے کلاس فیلوز سخت حیران و پریشان تھے کہ اس جیسا لائق فائق اسٹوڈنٹ فیل کیسے ہو سکتا ہے۔

"اس نے پیپر بھی تو خاصی ٹینشن میں دیے تھے' یاد نہیں' اس کی پھپھو آئی ہوئی تھیں' آسٹریلیا سے۔"

عدینہ نے اسے یاد دلایا۔

"وہ جتنا بھی ڈسٹرب ہو' ایسا رزلٹ تو کبھی بھی نہیں آیا اس کا۔" اوریدا سخت افسردہ تھی۔

"ہاں' کم از کم ارصم سے اس چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔" عدینہ نے بھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"بڑے ابا' بڑی اماں اور حتی کہ پاپا بھی شاکڈ ہیں ابھی تک۔" اس نے چلتے چلتے اپنے گھر کی سچویشن بتائی۔

"بات بھی تو چھوٹی نہیں ہے۔" عدینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"بڑے ابا تو بہت ہی خفا ہیں اس سے۔"

"اور اس کی ممی کا کیا حال ہے؟ کیا کہتی ہیں وہ؟" عدینہ کو ایک دم ہی تجسس ہوا۔

"ان کا حال تو مت ہی پوچھو۔" اوریدا چلتے چلتے بوگن ویلیا کی بیل کے نیچے رک گئی۔

"پھر بھی بتا۔ تو چلے۔"

"وہ تو صدمے سے بیمار پڑ گئی ہیں' پچھلے تین دن سے ہوسپٹل بھی نہیں گئیں اور آغا جی کو بھی اتنے غصے میں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔" اوریدا نے اسے مزید بتایا۔

"اور خود ارصم کا کیا کہنا ہے؟" عدینہ نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

"وہ تو آج کل ہمیں بھی دکھائی ہی نہیں دیتا' نہ گھر میں اور نہ کالج میں۔ پتا نہیں کر کیا رہا ہے۔" اوریدا اس کے لیے ٹھیک ٹھاک پریشان تھی۔

"تمہیں اس سے بات کرنی چاہیے اوریدا! اسے تمہاری ضرورت ہو گی اس سچویشن میں۔" عدینہ کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

"میں کیسے بات کر سکتی ہوں اس سے۔؟"

"کیوں' تمہیں کیا پرابلم ہے؟" عدینہ نے حیرانی سے اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"پتا تو ہے' تمہیں' کافی عرصے سے بات چیت بند ہے ہماری' اور سچ پوچھو تو اب پہلے جیسی بے تکلفی سے بات ہو بھی نہیں سکتی۔" اوریدا نے اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔

"لیکن اوریدا' اس وقت اسے کسی نہ کسی کی ضرورت ہو گی' اگر یہ بات ہمارے لیے پریشان کن ہے تو اس کے لیے تو بہت بڑا شاک ہو گا۔" عدینہ کی پریشانی بھی کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"کیا کر سکتے ہیں ہم' پیپرز اس نے دیے ہیں' اسے آل ریڈی اس رزلٹ کا پتا ہو گا۔" اوریدا نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ دونوں چلتے چلتے پارکنگ میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ اچانک عدینہ کی نظر سامنے کھڑی گاڑی پر پڑی۔

"یہ ارصم ہے ناں۔؟" عدینہ کو ایک دم دھچکا لگا' اس کی نظروں کے تعاقب میں اوریدا نے دیکھا تو اسے بھی شاک لگا' ارصم اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسموکنگ کر رہا تھا۔

"یہ اسموکنگ بھی کرتا ہے کیا۔؟" عدینہ نے حیرانی سے اوریدا کا پریشان چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔" اوریدا کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"اسٹائل تو ایسا ہے جیسے کوئی چین اسموکر ہو۔" عدینہ کو اس کا سگریٹ پینا بالکل اچھا نہیں لگا تھا اس نے کھل کر ناگواری کا اظہار کیا۔

"تم رکو' میں پوچھتی ہوں اس سے۔" اوریدا جلدی سے اس طرف بڑھی جہاں ارصم نے اپنی گاڑی کھڑی کر رکھی تھی۔ اسی لمحے ارصم نے بھی اوریدا کو دیکھ لیا' اس نے جلتا ہوا سگریٹ گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے پھینکا اور فوراً گاڑی اسٹارٹ کی' اس سے پہلے کہ اوریدا اس تک پہنچتی' وہ بہت تیزی سے گاڑی پارکنگ سے نکال کر لے گیا۔ اوریدا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرمندگی کے گہرے احساس کے زیر اثر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆ ☆ ☆

"میرا دل نہیں چاہتا پڑھنے کو۔" ارصم کی بات پر بینش کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلی۔

انہیں زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہو رہا تھا کہ اپنی

سب سے قیمتی متاع حیات کو برباد ہوتے دیکھنا کتنا اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔ انہیں قطرہ قطرہ زہر اپنی رگوں میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ ارصم آج کل ان کے ساتھ خوب آنکھ مچولی کھیل رہا تھا' وہ سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا اور کالج میں بھی اس کی حاضری نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس دن بینش نے قسم کھالی تھی کہ وہ اس سے دو ٹوک انداز میں بات کرکے ہی سوئیں گی۔ وہ رات کے تقریباً" دو بجے گھر لوٹا تو لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی بینش کو دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔

"کہاں سے آرہے ہو اس وقت...؟" انہوں نے کڑی نظروں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا' جو ان کے لیے آج کل امتحان بنا ہوا تھا۔

"کیوں کررہے ہو تم ایسا...؟" بینش کے انداز میں جھنجلاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

"مجھے خود پتا ہوتا تو آپ کو بھی بتا دیتا۔" اس کے چہرے کے تاثرات بینش کو اپنا مذاق اڑاتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"تم کالج کیوں نہیں جارہے' اور اسٹڈیز کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے۔" انہوں نے اپنے اندر سے اٹھتی اشتعال کی لہر کو بمشکل دبا کر اس سے پوچھا۔

"کہا ناں' اسٹڈیز سے دل اچاٹ ہوگیا ہے میرا..." وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے بینش کے ہوش اڑا گیا۔

"دو سال رہ گئے ہیں بیٹا' تمہارے ڈاکٹر بننے میں۔" انہوں نے اس وقعہ دنیا جہان کی نرمی بمشکل اپنے لہجے میں سمو کر کہا۔

"لیکن مجھے ڈاکٹر نہیں بننا..." ارصم کا لہجہ بے لچک اور انداز میں بغاوت تھی۔ بینش نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر برس پڑیں۔

"دماغ تو نہیں خراب ہوگیا تمہارا' ڈاکٹر نہیں بنو گے تو اور کیا کرو گے...؟"

"میں نے ابھی خود اس... بارے میں نہیں سوچا۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"پتا ہو گیا ہے تمہیں' یہ خناس کس نے بھرا ہے تمہارے ذہن میں' کیوں اپنی ماں کو اذیت دے رہے ہو۔" وہ گلا پھاڑ کر چیخیں۔

"آپ نے بھی تو ساری زندگی دوسروں کے ساتھ یہی کیا ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"کیا کیا ہے میں نے...؟" وہ بھڑک کر بولیں۔

"سب پتا چل گیا ہے مجھے' آپ کی ڈائری نے سارے راز فاش کردیے ہیں آپ کے۔ ساری اصلیت کھول کر رکھ دی ہے۔" ارصم کے زہریلے انداز پر ان کا دل دھک کرکے رہ گیا۔

"میری ڈائری' کون سی ڈائری...؟" وہ بوکھلا گئیں۔

"وہ جو شادی سے پہلے آپ باقاعدگی سے لکھا کرتی تھیں' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ممی! آپ کے اندر اتنا زہر بھرا ہوگا۔ اب پتا چلا ہے مجھے' آپ نے بڑے ابا کے گھر میں کیسے دراڑ ڈالی' انہیں اپنے ہی بچوں کے خلاف کیسے کیا؟ کیا ملا آپ کو یہ سب کرکے۔" وہ متنفر انداز میں کہتے ہوئے بینش کے وجود کے پرخچے اڑا رہا تھا۔ بینش کو ایسا لگا جیسے ان کی سماعتیں دھوکا دے رہی ہوں انہیں۔

"آخر کیا بگاڑا تھا انہوں نے آپ کا۔ کس چیز کے بدلے لیتی رہیں ان سب سے...؟" وہ متنفر لہجے میں بولا۔ "اپنی جلائی ہوئی خود ساختہ حسد کی آگ میں کتنے لوگوں کو جلا کر بھسم کردیا آپ نے' طیبہ پھپھو کی زندگی کا غلط فیصلہ کرواکر کتنے نفلوں کا ثواب ملا آپ کو؟"

ارصم کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے زہر آلود جملوں کے تیر بینش کی روح تک کو زخمی کررہے تھے۔

"دیکھو بیٹا! تمہیں کچھ نہیں پتا..." انہوں نے گھبرا کر اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"ممی! بس کریں پلیز' آپ ابھی بھی کہتی ہیں' مجھے کچھ نہیں پتا؟" اس کا مشتعل انداز بینش کو خوف زدہ کرگیا۔ جوان اولاد کے سامنے اس طرح کی جواب دہی کا تو انہوں نے کبھی گمان تک نہیں کیا تھا۔

"تو تم ان لوگوں کے بدلے لوگے مجھ سے...؟" ان

کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔
"میں کون ہوتا ہوں بدلے لینے والا...؟" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ "وہ جو اللہ پاک کی ذات ہے ناں' اس نے سارے حساب قیامت کے دن پر نہیں چھوڑے' کچھ گناہوں کی سزا وہ دنیا میں بھی دے دیتا ہے۔ آپ ڈریں اس لمحے سے' جب مکافات عمل کے شکنجے میں پھنسیں گی آپ۔"
"میں نے جو کچھ کیا اس کی ایک وجہ تھی...." انہوں نے گھبرا کر کہا۔
"کوئی بھی وجہ اتنی بڑی نہیں ہوتی کہ آپ کسی کے مستقبل سے کھیل جائیں اور کسی سے اس کی اولاد کی شکل تک نہ دیکھنے کی قسم اٹھوالیں۔" اس نے شکوہ کناں نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا۔
"تو میرے ساتھ کون سا اچھا کیا تھا تیمور نے...." ان کی زبان لڑکھڑائی۔
"کبھی آپ نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ انکل تیمور نے آپ کو کیوں چھوڑا؟ کون اپنی ڈاکٹر کزن کو چھوڑ کر ایک بی اے پاس معمولی سی لڑکی سے شادی کرتا ہے؟ کبھی نہیں خیال آیا آپ کے ذہن میں؟ کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کی ہوگی۔ ہے ناں۔" وہ بول نہیں رہا تھا بلکہ زہر اگل رہا تھا۔
"ارحم...!" بینش پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں' ان کو ایسا لگا جیسے ان کا دل پھٹ جائے گا۔ ارحم لاؤنج سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا لیکن جاتے جاتے بینش کا سکون بھی غارت کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن نیلی کوٹھی میں کہرام مچا ہوا تھا....
ایک تو بختاور کی موت کی اطلاع اور دوسرے تیمور اور بندیا کے انگلینڈ چلے جانے کی خبر نے ڈاکٹر جلال کو چراغ پا کر دیا تھا۔ وہ پورے گھر میں آگ بگولہ ہوئے پھر رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کچھ کر گزرتے۔ وہ دوسری طرف بینش کی حالت دیکھ کر ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔
"ہونہہ... بہت چاؤ سے رکھا تھا ناں تم نے اپنی بیٹی کا نام بختاور' وہ بختاور نہیں بدبخت تھی' دیکھ لو اس کا انجام۔" ڈاکٹر جلال کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔
"اور وہ تمہارا بیٹا' تیمور' اپنے منشی کی بیٹی کو لے کر بھاگ گیا... لعنت ہو تمہاری تربیت پر...." ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔
"اس میں میرا کیا قصور ہے...." شائستہ بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔
"جس طرح تمہاری بیٹی کا دردناک انجام ہوا ہے ناں' دیکھ لینا' یہ تیمور اس سے بھی بدترین حالات سے گزرے گا۔" ڈاکٹر جلال کی بددعا پر شائستہ بیگم کا دل کانپ گیا' انہوں نے خوف زدہ انداز میں اپنے شوہر کو دیکھا' جو آج کسی کو بھی بخشنے کے موڈ میں نہیں تھے۔
دوسری طرف بینش نے اپنے پورشن میں طوفان کھڑا کر رکھا تھا۔ اپنے کمرے کی ڈریسنگ کا شیشہ' کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس' اور جو جو چیز اس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے تباہ و برباد کر ڈالی۔
"تیمور نے اس دو ٹکے کی لڑکی کو مجھ پر فوقیت دی۔" سوجن زدہ آنکھیں' سرخ ناک... ننگے پاؤں کمرے میں ٹہل رہی تھی۔
"جب انسان کی عقل ساتھ چھوڑ جائے تو وہ ایسے ہی فیصلے کرتا ہے۔" آغا جی نے اپنی بیٹی کا بازو پکڑا جو حرارت سے جھلس رہا تھا' اور زبردستی اسے بیڈ پر بٹھایا۔ اس کا چہرہ کسی ان دیکھی آگ کی حدت سے دہک رہا تھا۔
"آپ بلوائیں منشی کو اور پوچھیں' اس گھٹیا کام کے لیے بھجوایا تھا اپنی آوارہ بیٹی کو۔" وہ گلا پھاڑ کر چیخی' اس کی حالت دیکھ کر آغا جی کا دل ڈوبنے لگا۔
"بیٹا! اس میں اس کے والدین کا کیا قصور ہے...." انہوں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کی۔
"تو پھر آپ کا قصور ہے' جو اس غلیظ پوٹلی کو اٹھا کر گھر

لے آئے' کم ذات تھی ناں' اپنی اوقات دکھا ہی دی اس نے۔" بینش کے اعصاب تن گئے۔

"ہاں۔ اس میں میرا ہی قصور ہے' اسے پہچان نہیں سکا۔" آغاجی کے بوڑھے کندھے جھک گئے۔

"میں چھوڑوں گی نہیں تیمور کو۔" بینش اپنے باپ کے سامنے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"بیٹا! حوصلہ کرو' دنیا ایک شخص پر ختم نہیں ہو جاتی۔" آغاجی نے اسے دلاسا دیا۔

"میری دنیا ختم نہیں ہوئی آغاجی! اس نے مجھ سے میری ذات کا غرور چھین لیا' لوگ کیا کہیں گے؟ اتنی قابل لڑکی کو چھوڑ کر اس کے منگیتر نے ایک غریب منشی کی بیٹی سے شادی کرلی' کسی کو لانا ہی تھا میرے مقابل تو برابری کا تو خیال رکھتا۔" بینش کو دکھ سے زیادہ ہتک کا احساس ستا رہا تھا۔

اور اسی وجہ سے رات کو اس کا ہلکا سا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ جس نے سارے گھر والوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر جلال' اپنی بیگم کے ساتھ فوراً" ہی اسپتال پہنچے۔

کئی گھنٹوں کے بعد اسے ہوش آیا تھا' اور اپنے سامنے ڈاکٹر جلال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسو بہنے لگے' اپنی اکلوتی بھتیجی کی یہ حالت دیکھ کر ڈاکٹر جلال کو ایک دفعہ پھر تیمور پر بے تحاشا غصہ آیا۔ ان کے ساتھ ــــ شائستہ بیگم بے بس انداز سے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ ویسے بھی تایا اور بھتیجی کی موجودگی میں وہ ہمیشہ پس منظر میں چلی جاتی تھیں۔

"وہ بے وقوف تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔" وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر کر بولے۔

"تایا ابا! کیا کمی تھی مجھ میں۔۔؟" بینش ایک دفعہ پھر رو پڑی۔

"کمی تم میں نہیں' اس میں تھی اور وہ بھی عقل کی۔" وہ متنفر لہجے میں گویا ہوئے۔

"اس نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔" بینش کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں تھا' بار بار تصور میں بندیا کا ہنستا ہوا چہرہ اسے اپنا منہ چڑاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا تھا۔

"تم دیکھنا تو سہی' اب میں کیا حشر کروں گا اس کا" ڈاکٹر جلال نے اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"آپ وعدہ کریں مجھ سے۔" بینش نے صدمے بھرے انداز میں ڈاکٹر جلال کا ہاتھ پکڑا' شائستہ بیگم نے ہراساں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ تیمور سے کبھی بات نہیں کریں گے۔" بینش کی اس فرمائش پر شائستہ بیگم کا رنگ فق ہوا۔

"اسے ساری زندگی اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دیں گے۔" بینش کی اگلی فرمائش پر بڑی اماں کا دل اتنی تیزی سے دھڑکا کہ انہوں نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"میں اس خبیث کو ساری زندگی منہ نہیں لگاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

ڈاکٹر جلال کے لہجے میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اس قدر نفرت اور بیزاری تھی کہ شائستہ بیگم کی ٹانگیں بری طرح کپکپانے لگیں۔ انہوں نے التجائیہ نگاہوں سے بینش کی طرف دیکھا' جس نے غصے سے منہ پھیر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

انڈیا کی کیرالہ اسٹیٹ میں واقع جامعہ دارالہدیٰ اسلامک یونیورسٹی میں ڈاکٹر رضا کا آج آخری لیکچر تھا۔

پورا آڈیٹوریم اسٹوڈنٹس سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کوئی سیٹ خالی نہیں تھی' کچھ اسٹوڈنٹس جگہ نہ ملنے کی وجہ سے آڈیٹوریم کی سیڑھیوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور پورے ہال میں اتنا سناٹا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی نہ دیتی۔

ڈاکٹر رضا موجودہ دور کے مسائل کا حل قرآن پاک کی روشنی میں بتا رہے تھے۔ ان کا انداز اتنا متاثر کن تھا کہ لوگوں کا پورا وجود مجسم سماعت بنا ہوا تھا۔ لیکچر کے

بعد پورے دو گھنٹے کا سوال و جواب کا سیشن تھا' وہ انتہائی مشکل سوالات کے جوابات قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں دے رہے تھے۔ اس سیشن کے بعد طلبہ نے انہیں گھیر لیا۔ وہ اب آٹوگراف اور تصاویر میں گھن چکر بن کر رہ گئے تھے۔

"اس شخص کے پاس معلومات کا ایک سمندر ہے۔" ایک اسٹوڈنٹ نے لیکچر کے اختتام پر کھل کر تبصرہ کیا۔ اس وقت اسٹوڈنٹس کا ایک پورا گروپ ہال کے باہر کھڑا عقیدت بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں' دلائل کا ایک سمندر ہے جو ان کی گفتگو میں بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔" دوسرے اسٹوڈنٹ نے بھی کھل کر انہیں سراہا۔

"میں تو آج پانچ گھنٹے کا سفر کرکے پہنچا تھا ان کے لیے' لیکن ایک تصویر بنوانے کا موقع نہیں مل رہا۔" ایک اور نے حسرت بھری نگاہوں سے ڈاکٹر رضا کو دیکھا جو اب ایڈمنسٹریشن کے لوگوں کے ساتھ کانفرنس ہال کی طرف جا رہے تھے۔

"ان کا نیکسٹ لیکچر کہاں ہے اب۔۔۔؟" گروپ میں سے کسی نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"وہ تو اب جا رہے ہیں ہمیشہ کے لیے پاکستان۔۔۔" کسی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"پاکستان۔۔۔؟" بہت سی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"کس نے بتایا۔۔۔؟" کچھ اسٹوڈنٹس کو بالکل یقین نہیں آیا۔

"پروفیسر فاروق گیلانی نے۔۔۔" وہی لڑکا دوبارہ بولا۔

"اوہ نو۔۔۔" مایوسی میں ڈوبی ہوئی کچھ آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر پروفیسر فاروق نے اطلاع دی ہے تو یہ غیر مصدقہ نہیں ہوگی۔

"اب ہم ان کو کیسے سنیں گے۔۔۔؟" کسی نے مایوس لہجے میں کہا۔

"ڈونٹ وری' ان کے سب لیکچرز یوٹیوب پر موجود ہیں۔" ایک اسٹوڈنٹ نے تسلی دی۔

"لیکن اس میں وہ مزا کہاں' جو سامنے بیٹھ کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال جواب میں ہے۔" ایک شرارتی لڑکے کے جملے پر سب لڑکے بے ساختہ ہنس پڑے۔ جامعہ دارالہدیٰ میں اپنا آخری لیکچر دے کر ڈاکٹر رضا ایئرپورٹ کی طرف نکل چکے تھے لیکن وہ دارالہدیٰ کے اسٹوڈنٹس کے دلوں پر اپنا ایک انمٹ نقش چھوڑ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آپا صالحہ کی طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال یہ تھی کہ وہ کسی صورت بھی سرجری کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھیں' کوئی خوف تھا جس نے آکٹوپس کی طرح ان کے وجود کو جکڑ لیا تھا۔

"آپا! اوریدا کے دادا کہتے ہیں ہمیں فوراً" سرجری کروانی چاہیے۔" عدینہ نے انہیں دوائی کھلاتے ہوئے فکرمند انداز سے کہا۔

"مجھے نہیں کروانی۔۔۔" انہوں نے جھٹ سے انکار کیا۔

"لیکن کیوں۔۔۔؟" عدینہ نے حیرانی سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے' میں آپریشن تھیٹر سے زندہ واپس نہیں آؤں گی۔۔۔" انہوں نے عدینہ کی بے تحاشا ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر اصل بات اگل دی۔

"آپا! زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔" عدینہ جھنجلا گئی۔

"میں تمہیں ڈاکٹر کے روپ میں دیکھے بغیر نہیں جا سکتی۔" وہ بچوں کی طرح ضد کرتے بولیں۔

"اگر وقت پر سرجری نہ ہوئی تو۔۔۔" عدینہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی بات مکمل کر سکے۔

"کچھ نہیں ہوگا مجھے۔۔۔" آپا نے بڑی سرعت سے اس کا ذہن پڑھا۔

"بے بے! آپ سمجھائیں ناں انہیں' اچھی خاصی

پڑھی لکھی ہوتیں آپ کی اور بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہیں۔" عدینہ جھنجلا کر خاصا غلط بول گئی۔

"تمہیں کس نے کہا میں ان ایجوکیٹڈ ہوں۔۔؟" آپا نے ہراساں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لیے کہ کوئی ان پڑھ خاتون "ایجوکیٹڈ" لفظ استعمال نہیں کر سکتی۔" عدینہ نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"پتر! بات مان لے عدینہ کی' آپریشن کروا لے' اس میں تیرا ہی فائدہ ہے۔" بے بے نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا۔ عدینہ نے سکون کا سانس لیا۔

"بے بے! ڈاکٹرز چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے مجھے۔ لاش ہی واپس آئے گی میری۔" انہیں بھی غصہ آ گیا۔

"آپا! آپریٹ نہیں کروانا تو مت کروائیں' لیکن یہ مرنے مارنے والی باتیں مت کریں۔" عدینہ ناراضی سے کہتی ہوئی بولی۔

"ٹھیک ہے' نہیں کرواتی ہوں لیکن ایک شرط ہے میری بھی۔" ان کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ دوڑی۔

"کیا مطلب آپا۔۔ شرط"

"میں اس جمعہ کو تمہارا اور عبداللہ کا نکاح پڑھوانا چاہتی ہوں۔" آپا کی بات پر عدینہ کو شاک لگا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔؟" وہ بوکھلا گئی۔

"کم از کم آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے مجھے یہ تسلی تو ہو گی' میری بیٹی کا مستقبل محفوظ ہے۔" ان کے لہجے میں چھپے وہم اور اندیشے کو وہ سمجھ سکتی تھی' لیکن یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی' ایک لمحے کو تو عدینہ کا ذہن ہی بھک کر کے اڑ گیا۔

"یہ تو بڑا ہی نیک کام ہے اور نیک کام میں دیر کیسی۔" بے بے اپنے پوپلے منہ کے ساتھ مسکرائیں۔

"وہ سن کر پھر بھاگ جائے گا کہیں اور۔۔" عدینہ ابھی تک عبداللہ سے خفا تھی۔

"اب وہ نہیں بھاگے گا' کیونکہ اس بار اس نے خود کہا ہے مجھ سے۔" آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کا منہ حیرت سے کھلا اور بند ہونا بھول گیا۔ دو دن کے بعد نکاح نامے پر دستخط کرتے وقت بھی عدینہ بے یقین تھی اور آپا صالحہ اب مطمئن ہو کر سرجری کروانے پر تیار ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اپنے کزن کی شادی اٹینڈ کرتے ہی "فوراً" واپس آجانا۔" شانزے' رباب کے ساتھ راولپنڈی ایئرپورٹ پر موجود تھی' رباب کو اپنے چچا زاد کزن کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے کراچی جانا تھا اور شانزے اسے ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئی تھی' فلائیٹ ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ وہ دونوں ایئرپورٹ لاؤنج میں کرسی پر بیٹھی تھیں پاس ہی رباب کا چھوٹا سا ہینڈ کیری رکھا ہوا تھا۔

"میں تو واپس آجاؤں گی' تم اپنی سناؤ' کب ملو گی ان سے۔۔؟" رباب نے اسے چھیڑا۔

"چھوٹی سی بات کی ہے۔" شانزے نے چاکلیٹ کھاتے ہوئے مزے سے بتایا۔ وہ اس وقت بلیو جینز پر وائٹ ٹی شرٹ پہنے' اونچی سی پونی میں بالکل ایک معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی۔

"بہت تیز ہو' مجھے کیوں نہیں بتایا۔۔؟" رباب برا مان گئی۔

"بتا تو رہی ہوں یار' ابھی شام میں تو بات کی ہے ان سے۔۔" وہ گاڑی کی چابی لاپروائی سے گھماتے ہوئے بولی۔

"اچھا' پھر کیا کہا انہوں نے۔۔؟" اسے تجسس ہوا۔

"آ رہی ہیں وہ نیکسٹ ویک اسلام آباد۔۔" شانزے نے مسکرا کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"وری گڈ' اس کا مطلب ہے کہ مجھے نیکسٹ ویک واپس آنا ہو گا۔" رباب کے بے ساختہ انداز پر وہ چونکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا' تم جھوٹ بول رہی تھیں مجھ سے' زیادہ دن رہنے کا ارادہ تھا تمہارا۔۔" شانزے

نے ہاتھ میں پکڑا کلچ زور سے اس کے کندھے پر مارا۔ وہ جو اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی بوکھلا کر رہ گئی۔

"ارادہ تو کچھ یہی تھا لیکن اب مجبوری ہے۔" رباب نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔

"ایک ہفتے سے ایک دن بھی اوپر کیا تو میں کراچی پہنچ جاؤں گی۔" وہ اپنا کی چین گھماتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں بولی' اور اس کا کی چین ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا' وہ جلدی سے اٹھانے کے لیے آگے بڑھی اور سامنے سے آتے ہوئے شخص سے ٹکرائی' جو انٹرنیشنل فلائیٹ سے ٹرالی میں اپنا کافی سامان رکھے باہر آرہا تھا' اس کے ہاتھ میں قرآن پاک کی انگلش میں تفسیر تھی۔

"او آئی ایم سوری انکل۔" شانزے بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

لائیٹ گرے پینٹ کوٹ میں موجود شخص کا نفیس سا چشمہ دور جا گرا' اس کی کنپٹیوں پر موجود سفید بال اس کے وقار میں اضافہ کررہے تھے' وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے اپنے سامنے موجود لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جو ان کا چشمہ اٹھا کر ان کی طرف بڑھا رہی تھی۔

"بختاور...!!" اس شخص کے منہ سے بے اختیار پھسلا' شانزے کو جھٹکا لگا۔ اس نے ہکا بکا انداز میں اپنے سامنے موجود اس شخص کو دیکھا جو اپنے حلیے سے کوئی اسلامی اسکالر لگ رہا تھا۔ اس کی ٹرالی میں کتابوں کا ایک کارٹن رکھا ہوا تھا۔

"انکل! میرا نام بختاور نہیں ہے۔" وہ پریشان ہوئی۔

"تو پھر یقیناً" آپ کا نام شانزے ابراہیم ہے۔" وہ پُراعتماد انداز میں گویا ہوئے۔

"آپ نے میرا ڈراما دیکھا ہے کیا...؟" شانزے کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔

"آپ ٹی وی ایکٹریس ہیں کیا...؟" اس شخص کا چہرہ تاریک ہوا۔ شانزے نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سوری... میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔" وہ خود کو سنبھال کر سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"تو پھر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں...؟" وہ الجھن کا شکار ہوئی۔

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اعظم ابراہیم کی بھتیجی اور خولہ ابراہیم کی بیٹی ہیں۔" شانزے کو شاک لگا۔

"آپ کیسے جانتے ہیں میری فیملی کو...؟" شانزے حیرانی سے دو قدم پیچھے ہٹی۔

اس نے اپنے سامنے کھڑے پچاس باون سالہ شخص کو غور سے دیکھا جس کے چہرے پر نرمی اور شفقت کا ایک دریا بہہ رہا تھا۔ شانزے کو اس کے نقوش جانے پہچانے سے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں جھماکا ہوا اور وہ اپنے لبوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف' حیرت اور بے یقینی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

نایاب جیلانی
پگھلا ہوا موسم
Downloaded From
Paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

کمرے میں دھندلا سا عکس تھا۔ ملگجے اندھیرے میں نظر بھی کیا آتا؟

لیکن اس نے دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ پھر اسے اپنی کوشش میں کامیابی بھی ہوئی۔ وہ جو اس کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ اس کا شوہر ہی تھا۔

ملگجے اندھیرے میں آنکھیں اس عکس کو ڈھونڈ چکی تھیں اور اس کی سماعت میں چند الفاظ پگھلے سیسے کی مانند گر رہے تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے؟ زہر میں بجھے اذیت کی انتہا پہ لٹکاتے ہوئے۔ ایک پھندا سا اس کے گرد کستے ہوئے۔

"میں اسے لے آؤں گا۔ میں اسے گھر لانا چاہتا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے۔ اور ان "دونوں" کے لیے اسے گھر تو لانا ہی ہو گا۔ تو تم اپنے دل کو تھوڑا وسیع کر لو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ بول رہا تھا۔ اور یہ جیسے مفلوج ہو رہی تھی۔ منجمد ہو رہی تھی۔ سن ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

"میں اسے لینے جا رہا ہوں۔"

"میں اسے لینے جا رہا ہوں۔"

اس کے الفاظ ہتھوڑے تھے۔ جس کی ضرب اسے لہولہان کر رہی تھی۔

وہ بے بس ہو چکی تھی۔ لاچار ہو چکی تھی۔

اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس کے قریب سے اٹھ رہا تھا۔ وہ اس سے دور جا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے اندھادھند لپکی تھی۔ بھاگنے لگی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی تاکہ وہ شام روپ کو اس کے سامنے کبھی نہ لائے۔

آج صبح سے ہی موسم خشک اور سرد تھا۔

فضا میں خنکی تھی اور دور دور تلک دھند کی دبیز چادر تنی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سر شام ہی کہر کی چادر تن جاتی تھی۔

وہ اپنے اے ای او کے دفتر کی تنگ و تاریک سیڑھیوں سے اتر کر نیچے تنگ سی گلی میں آئی تو جگہ

مکمل ناول

جگہ پانی کھڑا دیکھ کر کچھ حیران ہوئی یوں لگ رہا تھا جیسے بارش ہوئی ہو۔

اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش بے سود سمجھ کر گہرا سانس لیا۔

اس نے ایک نگاہ دروازے کے ساتھ آویزاں گہرے نیلے بورڈ پر کندہ نام پہ ڈالی تھی۔ تازہ تازہ حروف میں لکھا تھا "ڈپٹی اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر"

اس نے گہری سانس بھری اور اپنے بیگ کی تلاشی لینی شروع کردی۔

آج الجھے ذہن کے ساتھ تحصیل بھر کی ہیچرز کو اکٹھا کرکے میٹنگ رکھی تھی۔ پورا دن اسی بیچ بیچ میں نکل گیا۔

ویسے بھی سردیوں کے دن تھے۔ ادھر چڑھتے تھے، ادھر ڈھل جاتے۔ دھوپ آتی اور سمٹ جاتی۔ ان دنوں تو دھوپ کے درشن خواب و خیال ہو چکے تھے۔ کیونکہ دسمبر جا رہا تھا۔

وہ عموماً" چار بجے تک فارغ ہو جاتی تھی۔ لیکن آج میٹنگ کے بعد فائل ورک مکمل کرتے کرتے پانچ بج چکے تھے اور ابھی اسے تین چار میل پیدل چل کر فرید کی "صدیق آئرن" تک جانا تھا۔

ماموں کے وقتوں کی بنائی ہوئی دکان تھی۔ ساڑھے نو مرلہ جگہ پر بنائی گئی۔ پورے بازار میں سب سے بڑی دکان تھی۔ اور سب سے زیادہ چلتی بھی یہی دکان تھی۔ کبھی "صدیق آئرن فیکٹری" کے نام سے مشہور و معروف۔ اب تو اس نام پہ ایک دھبے کے سوا کچھ نہیں تھی۔

کبھی ماموں کا بڑا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ ٹی آر، گارڈر' لوہے کی بنی بنائی تیار چھتیں۔ لوہے کے گیٹ' دروازے' کھڑکیاں غرض ہر قسم کا لوہے کا سامان موجود تھا۔ اور کچھ ماموں کے ہاتھ میں برکت بہت تھی۔ یوں ان وقتوں میں ماموں پہ دھن برستا تھا۔ رزق میں برکت تھی۔ کیونکہ ماموں محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ نیت کے بھی کھرے تھے۔

اور یہ تو ان دنوں کی بات تھی جب ماموں زندہ تھے۔

اب نہ ماموں تھے اور نہ ہی وہ ہرے بھرے دن تھے۔

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور دفتر کی گلی میں پانی سے بچتی بچاتی چلنے لگی۔ اس کے نئے نکور برانڈڈ کورٹ شوز گلش لش کر رہے تھے۔ برانڈڈ نفیس سوٹ ملگجے اندھیرے میں بھی اپنی قیمت بتا رہا تھا۔ اس نے کلائی موڑ کر نفیس سی گھڑی پہ وقت دیکھا تو دوسرے ہاتھ میں موجود خوب صورت نگینوں سے سجا بریسلیٹ خود بخود توجہ کھینچنے لگا۔ ہر جونیئر' سینئر ٹیچر نے بطور خاص اس سے بریسلیٹ کی قیمت اور صرافہ کی دکان کا پوچھا تھا۔ پورے ڈیڑھ لاکھ میں لیا تھا۔ یہ بریسلیٹ اور تین انگوٹھیاں ابھی پچھلے مہینے تو خریدی تھیں۔ اس کی کولیگز اور ماتحت خواتین کو بڑی ہی کھد بد ہوئی۔

"لگتا ہے میم کے ہزبینڈ نے سالگرہ کا تحفہ دیا ہے۔" یہ شوخ سا فقرہ کسی ٹیچر کی طرف سے آیا تھا اور اسما کے ہنستے مسکراتے لب خود بخود سمٹ گئے تھے۔

"ہزبینڈ اور ایسے چونچلے؟ کیا مذاق تھا یہ۔۔۔" اسما نے دل ہی دل میں بیزاریت سے سوچا اور بظاہر مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

وہ تلخی سے سوچوں کا دامن جھٹکتی گلی سے باہر نکل آئی۔

مغرب کی اذان کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا۔

اسما کے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔ اسے جلد از جلد فرید کی دکان تک پہنچنا تھا۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ دکان سے کچھ فاصلے پہ کھڑی ہو کر موبائل سے مس کال دیتی اور فرید دکان کا شٹر گرا کے تالا لگا کر باہر آجاتا۔ واپسی ان دونوں کی بائیک پہ ہوتی تھی۔

یہ بائیک بھی فرید نے قسطوں پہ لی تھی۔ اپنی لش لش کرواتی بیچ کر۔۔۔ ہاہ' کبھی فرید کے پیروں تلے کرولا ہوتی تھی اور وہ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔

فرید ہی کیا؟ اس کی چاروں بہنیں بھی۔

کیا نخرے ہوا کرتے تھے ان کے اور کیا غرور تھا کبھی۔

اسما کی سوچیں لمحہ بھر میں ہی بکھر گئیں۔۔۔ فرید دکان

کے باہر ہی کھڑا تھا۔ بائیک قریب تھی۔ اور وہ شاید اسما کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

ہمیشہ کی طرح تیوری پہ بل پڑے تھے۔ سحر طراز سی آنکھوں میں غصہ ہی غصہ تھا۔ اسما نے ایک اور ٹھنڈی آہ بھری۔

"کاش کہ فرید کا یہ غصہ کبھی باہر بھی آجاتا۔" بس یہ غصہ اس کی ذات تک محدود تھا۔ وہ کبھی بول کر اپنے لفظوں کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ جانے اس میں اتنی برداشت اور ضبط کہاں سے آگیا تھا۔

اسما نے دور سے کھڑے کھڑے دکان کا اندر تک جائزہ لیا تو دھک سے رہ گئی۔ دکان یہاں سے لے کر وہاں تک خالی پڑی بھاں بھاں کر رہی تھی۔ اکا دکا نی آر تھے۔ اکا دکا گارڈر تھے۔ جہیں زنگ آلود کھڑکیوں کے چوکھٹے اور جالی دار دروازے پڑے تھے۔ اور باقی دکان۔

اسما کا مارے حیرت سے منہ کھل گیا۔

دکان تک آنے کا تو کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ چالیس قدم دور ہی کھڑی ہو جاتی تھی کہ فرید نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی۔ دکان کے قریب بھی نہیں آنا۔

سو طرح کے لوگ ہوتے تھے اور سو طرح کے گاہک۔ ویسے بھی ارد گرد کی دکانوں والے اکثر اوقات فرید کے پاس آجاتے تھے۔ مالکوں کے نکمے سے بیٹے وقت گزاری کے لیے اور جنہیں کبھی فرید نے منہ نہیں لگایا تھا۔ اب ان کی فضول باتوں کو چپ چاپ برداشت کرتا تھا۔

فرید چپ چاپ دکان کو تالا لگا کر بائیک پہ بیٹھا اس کے قریب آگیا تھا۔

اسماء نے ایک اور ٹھنڈی آہ بھری اور محتاط انداز میں بائیک پہ بیٹھ گئی۔

جیسے ہی بائیک چلی اسے شدید کپکپی کا احساس ہوا تھا۔ سردی تو پہلے ہی قیامت تھی لیکن بارش نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔

اور وہ اپنی قیمتی گرم، نفیس شال گھر میں ہی بھول آئی تھی۔ وہ شال جسے دیکھ کر فرید کی چوتھے نمبر والی

بہن سائرہ کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اور اسماء نے مروتاً" بھی اسے آفر نہیں کی تھی کہ وہ یہ شال لے سکتی ہے۔ اب اس شال کے نہ ہونے کی وجہ سے ٹھنڈ ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔ فرید نے بائیک کی رفتار کم کرتے کرتے اچانک روک دی۔

کچھ ہی دیر میں اس نے اپنی جیکٹ اتاری تو اسما کو لا محالہ بولنا پڑا۔

"اس کی ضرورت نہیں فرید! تمہیں ٹھنڈ لگے گی۔ میں نے کوٹ تو پہن رکھا ہے۔" اسما نے جیکٹ لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ فرید نے گردن نہیں موڑی تھی۔ بس ہاتھ پیچھے کر کے جیکٹ اس کے اوپر گرادی۔ اب چار و ناچار اسے جیکٹ پکڑ کر پہننا پڑی تھی۔ لیکن اسے پورے رستے فرید کو شدید ٹھنڈ لگنے کے احساس نے پریشان رکھا تھا۔

جیسے ہی بائیک ماموں کے پرانے طرز پہ بنے دو منزلہ مکان کے گیٹ پہ رکی تھی۔ اسما نے سرعت سے اتر کر جیکٹ اتاری اور فرید کے کندھوں پہ ڈال دی۔ وہ لحظہ بھر کے لیے چونکا تھا۔ پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید وہ اسما کے اس عمل کے پیچھے چھپی وجہ کو سمجھ گیا تھا۔

فرید کی جیکٹ پہن کر اسما اندر جانے کا گناہ کر لیتی تو بخشش کیسے جاتی؟ مامی نے تو مختصر کو ریفری نما ذیو ڑھی بھی پار کرنے نہیں دینی تھی اور شروع ہو جانا تھا۔ فرید بغیر جیکٹ کے دیکھ کر تو ان کی جان پہ بن آتی۔ مختصر کر فرید آیا تھا اور کانپنے مامی نے لگ جانا تھا۔ ثریا مامی کی تو فرید میں جان تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے ہی اندر آئے تھے۔ جب اچانک ہی رک گئے۔ مختصر سے لاؤنج میں مامی کے ساتھ سائرہ بیٹھی تھی۔ اور انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ اسما اپنے کمرے میں جانے کے بجائے سیدھی انگیٹھی میں آگ تاپنے بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی مامی نے فوراً" ٹوک دیا تھا۔

"پہلے یہ لباس فاخرہ بدل لو۔ سات ہزار کا جوڑا ہے۔ کوئی چنگاری گر گئی تو بے کار ہو جائے گا اور ہاں دیکھو تو

فرید کا چہرہ کتنا سرخ ہو رہا ہے۔ ناک ایسی لال جیسے زکام ہونے والا ہو۔ ٹھنڈ لگ گئی میرے بچے کو تمہارے لیے ہوئی نا آج بھی دیر۔ تم اپنی "استانیاں" بھگتاتی رہو۔ افسر لوگ ہو۔ اپنی مرضی کے مالک۔۔۔ پتا بھی تھا۔ ماں موئی سے اٹھا نہیں جاتا۔ سائرہ کے دن پورے۔ اللہ خیر سے فارغ کرے۔ فرید بھی صبح کا بھوکا۔ خود تو "دعوت شیراز" اڑائی ہو گی۔۔۔ ہمارے تو معدے بھی جواب دے گئے۔"

ماں کی لمبی تقریر کا لب لباب سمجھتے ہوئے اسما نے گہرا سانس کھینچ لیا۔

گو کہ ٹھنڈ اور تھکن سے انگ انگ سن ہو رہا تھا۔ لیکن چولہا ٹھنڈا دیکھ کر اسے سب سے زیادہ فرید کی فکر ستائی تھی۔ وہ باہر سے چائے تک نہیں پیتا تھا۔ کھانا تو بہت دور کی بات تھی۔

پہلے تو اکثر ماں کھانا دوپہر میں بنا لیتی تھیں لیکن جب سے انہیں گھٹنوں کی تکلیف ہوئی تھی تب سے گھر کے کاموں سے انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ پھر سرما میں تو تکلیف اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

ان دنوں سائرہ رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس کے پہلے پہلے بچے کی ولادت تھی۔ سائرہ فرید سے بڑی تھی لیکن زیادہ نہیں۔۔۔ سو ایک دوسرے کے نام ہی لیتے تھے۔

اسما جب کمرے میں آئی تو فرید الماری کھولے کھڑا تھا۔ ابھی تک اس نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلا گیا تو اسما نے بھی کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔

جب وہ باہر آئی تو فرید کمرے میں نہیں تھا۔ اسما گہرا سانس بھرتی کچن میں آ گئی۔

کچن صاف ستھرا تھا۔ برتن بھی دھلے ہوئے۔ سائرہ سے جتنا کام ہو سکتا تھا اتنا کر ہی دیتی تھی۔ آٹا بھی گندھا ہوا تھا۔ لیکن سبزی ندارد۔۔۔ فرج کھولا تو پورا فریج بھاں بھاں کر رہا تھا۔ اوپر نیچے کچھ بھی نہ تھا۔ آلو کی ٹوکری میں چار آلو پڑے تھے۔ ایک چھوٹی سی پیاز تھی۔ یعنی راشن ندارد۔ فرید کو پتا بھی تھا بلکہ یہ کام اسی کے ذمہ تھا۔ راشن لانا' وہ بھاں بھاں کرتے فریج کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ کبھی یہی فرج اور ڈیپ فریزر لبالب بھرا ہوتا تھا۔

لیکن اب؟ ضرورت کا سامان بھی ندارد تھا۔ اس کا دل برا ہونے لگا۔

اب باہر یہ اطلاع کون دیتا؟ کچن میں سبزی نہیں تھی۔ کوئی دال نہیں تھی۔ وہ اپنا کلیجہ بھونتی کیا؟ تب ہی فرید کی آواز سنائی دی تھی۔

"تم یاد تو کروا دیتیں میں کچھ پکانے کو لے لیتا۔ بندہ ہزار پریشانیوں میں جکڑا ہوتا ہے۔ سو طرح کے سیاپے ہوتے ہیں' نہیں یاد رہتا۔" اس نے آدھی بات منہ میں اور آدھی دل میں کی تھی۔ ایسا تو ممکن نہیں تھا فرید اپنے اندر سے بھاپ نکال دیتا۔

"میں کچھ لے آتا ہوں۔ پھر جمعہ کو لاؤں گا راشن ۔۔۔ کوئی دن فارغ نہیں ملتا۔" وہی منہ ہی منہ میں کہی جانے والی بات۔ اسما کو خود بخود اس کی ہر بات سمجھنا ہوتی تھی۔

"فرید! اب رہنے دو۔ سردی ہے باہر' میں کچھ نہ کچھ کر لیتی ہوں۔" اس نے آلو کاٹنے شروع کیے اور ساتھ دو انڈے بھی نظر میں آ گئے۔ چلو ابھی کا وقت تو گزر جاتا۔

وہ اک نظر دیکھ کر باہر نکل گیا تھا۔ کہا کچھ بھی نہیں۔

اسما جلدی جلدی آلو انڈے اور چپاتیاں ڈال کر لے آئی۔ اب اتنی جلدی میں یہی غنیمت تھا۔ ویسے بھی یہاں مہینے میں زیادہ تر دال اور سبزی پکتی تھی۔

تازہ پھلکے اور گرما گرم سالن تھا تو مزے دار۔۔۔ مگر ماں کے چہرے پہ ہلکی سی ناگواری در آئی تھی۔ جسے انہوں نے چھپانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ سائرہ اور فرید چپ چاپ کھانا کھا رہے تھے۔

جب اسما پانی لینے کے لیے اٹھی تب تک فرید بھی کھانا کھا کر اندر جا چکا تھا۔ فرید کے اٹھتے ہی ماں زیر لب بڑبڑائیں۔

"سائرہ کا وقت قریب ہے۔ یہ آلو اور دالیں اسے

میکے میں کھاتی تھیں تو سسرال کیا برا تھا؟ یہ سب کچھ تو ادھر بھی میسر تھا۔" مامی کے الفاظ اسما کے کانوں میں بھی پڑے تھے۔ وہ کسے سنا رہی تھیں کیا اسما کو؟

اس نے سر جھٹکا۔ یہ بات فرید کو سنائیں تب نا۔ راشن پانی کی ذمہ داری ان کے بیٹے کی درد سری تھی۔ اس کے سامنے بولی نہیں تھیں۔ اب دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

"امی! آپ کو پتا بھی ہے۔ پھر کیوں روزانہ دہراتی ہیں۔ فرید سے جتنا ہو سکتا ہے وہ کرتا ہے۔ اتنے لوگ، اتنی ذمہ داریاں ہیں اس پہ۔ گھر کی بجلی کے بل، گیس کے بل، پانی کے بل، فون کے بل، دکان کے بجلی، گیس کے الگ سے بل۔ پھر چار چار بہنوں کی ذمہ داریاں۔ کبھی ایک بہن نے بچہ پیدا ہو گیا۔ دوسری بہن کے بچے کا عقیقہ آ گیا۔ پھر تیسری کے بچے کی سالگرہ اور کبھی کسی بہن کے بچے کی منگنی، امتحانوں میں کامیابی۔ عیدیں، شبراتیں، یہ تو فرید ہے۔ ایک دکان سے اتنے لوگوں کے خرچے نکال رہا ہے۔ ہر مہینے ایک بھاری رقم اس کے اوپر کے خرچوں میں نکل جاتی ہے۔ اور آفرین ہے میرے بھائی پہ۔ جس نے کبھی ماتھے پہ بل ڈال کر جتایا نہیں۔ آپ فرید کو کچھ مت کہا کریں۔ ہمارا ایک بھائی ہے۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا اور جہاں تک دال سبزی کی بات ہے تو مجھے یہ بھی قورمے بریانی سے کم نہیں۔"

سائرہ نے دبی آواز میں اتنے مدلل انداز میں ماں کو سمجھایا کہ مامی چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔ واقعی یہ چاروں بہنیں فرید کے معاملے میں ایسی تھیں۔ اپنی طرف سے حتی الامکان کوشش کرتی تھیں کہ فرید پہ بوجھ نہ ہی پڑے مگر فرید خود تنگی دیکھ لیتا تھا لیکن بہنوں کی ان کے سسرال میں سبکی نہیں ہونے دیتا تھا۔

"میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ پورا مہینہ ہو چلا ہے۔ کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں پکی۔ جب سے تم آئی ہو تب سے تو زیادہ ہی باورچی خانے پہ زوال ہے۔" مامی کا لہجہ دبا دبا سا تھا۔ سائرہ نے گہرا سانس لیا۔

"امی! مہینے کا وسط ہو رہا ہے۔ فرید کی آدھی رقم تو

"بلوں" پہ اٹھ گئی تھی۔ پھر پچھلے مہینے دانیہ (بھانجی) کی سالگرہ پہ بھی تو اتنا خرچا ہو گیا تھا۔ فرید کے پاس گنجائش نہیں ہو گی۔ ورنہ اس نے کوئی کمی تو کبھی نہیں چھوڑی۔ ابو کے بعد ابو جتنا نہ سہی پھر بھی ہمارا سائبان بن گیا۔ اس کے حالات بھی تو۔۔" سائرہ کی دھیمی آواز اسما کے کانوں میں پڑی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کی بجائے ارادتاً" رک گئی تھی۔

"حالات کیسے اچھے ہوں۔ میاں' بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تعاون سے گاڑی چلتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی گاڑی۔۔ اور ہماری بہو نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ کبھی جو فرید کا بوجھ بانٹا ہو۔۔ اتنی بھاری بھرکم تنخواہ ہے مگر۔" مامی کچھ کہنا چاہتی تھیں جب اچانک سائرہ نے انہیں روک دیا تھا۔

"امی! کیسی بات کرتی ہیں آپ۔۔ اسما کی تنخواہ پہ اسی کا حق ہے۔ یاد نہیں' ابو نے کیا کہا تھا۔ پہلے دن سے ہی اسما کی تنخواہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ بخوشی جہاں مرضی خرچ کرے۔ اس گھر میں کبھی یہ معاملہ زیر غور نہ آئے' نہ اسما کی تنخواہ کے بارے میں سوال کیا جائے۔"

سائرہ نے مامی کو چار سال پہلے کی بات یاد دلا کر چپ کرا دیا تھا۔ اور ماموں کے "حکم" پہ آج تک فرید سمیت اس کی چاروں بہنیں کاربند تھیں۔ سوائے والدہ ماجدہ کے جو کبھی کبھار فرید کا ہاتھ زیادہ تنگ دیکھ کر خاموش نہیں رہتی تھیں۔

اسما' سائرہ کے جواب پہ مطمئن ہو کر کندھے جھٹکتی کچن میں آگئی تھی۔ ایک بوجھ ساتھا جو ہٹ گیا۔ واقعی اس گھر کی ساری ذمہ داری فرید کے سر تھی۔ وہ ہی اس گھر کا کفیل تھا۔ اور اسی کے ذمے سب کا خرچا تھا۔ اسما کا نان نفقہ بھی۔۔ جس میں سوائے تین وقت کھانا کھانے کے۔۔ اس نے بھی اضافہ نہیں کیا تھا۔ گرمی سردی کا ایک ایک جوڑا مامی خرید کر لاتی تھیں۔ چاروں بیٹیوں' ان کے بچوں کے ساتھ ساتھ اسما کے لیے بھی آجاتا تھا۔ وہ بھی اتنا ہلکا کہ نگاہ میں جچتا ہی نہ۔۔

ایسے کپڑے تو کبھی ایک زمانے میں وہ عیدوں پہ پہنا کرتی تھی امی سے زبردستی ہو کر۔ اب تو سستا پڑا بھاتا نہیں تھا۔

شادی سے پہلے لگنے والی گورنمنٹ جاب کے ساتھ ہی اسما کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے لائق ہو چلے تھے۔ کہاں تو ایک جوڑا آٹھ آٹھ سیزن پہنا جاتا تھا۔ اپنی اصلی رنگت' شکل اور ہیئت تک بدل دیتا تھا۔

اور کہاں اب اسما کی ساری تنخواہ جوتوں' کپڑوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ کچھ پہننے اوڑھنے کا شوق بھی تھا۔ کچھ نوکری کے تقاضے بھی تھے۔

کبھی فرید اتنا خوش لباس ہوا کرتا تھا۔ ہر روز نیا جوڑا پہنتا۔ بنتا' سنورتا اور بہنیں دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ فرید کی خوش لباسی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ کچھ وجاہت بھی بے پناہ تھی۔ رنگت انتہائی گوری۔۔ ہر رنگ رچ کے جچتا تھا۔ بہنیں جوتے چمکا چمکا کے رکھتیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک سوٹ دھلا دھلایا تیار لٹکا ہوا ملتا۔ فرید دن میں دو دو جوڑے بدلتا۔ برانڈڈ کپڑے پہنتا۔ بہترین جوتے' بہترین پرفیومز۔

اور پھر جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔

کہاں اسما اپنے ماموں کے بچوں جیسے لباس پہننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اپنی مفلسی اور بدحالی سے ناآسودہ تھی اور کہاں اب اسما ایک سے بڑھ کر ایک اعلا' قیمتی اور نفیس لباس زیب تن کرتی تھی۔

اور اس کے ماموں کے بچے؟ یعنی فرید؟

شاید ہی سال میں اس نے کبھی کوئی نیا لباس بنایا ہو۔ مامی ہی عید کے عید جوڑا بناتی تھیں یا اس کی بہنیں بھائی کی محبت میں تحفے اٹھا اٹھا کر لاتی تھیں۔ لیکن فرید کا رویہ اس معاملے میں بڑا دو ٹوک تھا۔ اس کا ایک ہی جواب بہنوں کے منہ بند کرا دیتا۔

"بھائی' بہنوں سے لیتے نہیں' دیتے ہیں۔" اور اس لیے وہ پورے کا پورا اصدیق ماموں کی کاپی لگا کرتا تھا۔ اس وقت بھی سوچیں جانے کہاں سے کہاں چلی گئی تھیں۔

وہ پانی لے کر واپس آئی تو "موضوع" بدل چکا تھا۔

ماہی اور سائرہ دانیہ کی سالگرہ کے متعلق بات کر رہی تھیں۔ اسما نے برتن سمیٹے' قہوہ بنایا اور جب وہ دوبارہ آنے لگی تب اچانک ہی ماہی کو یاد آیا۔

"ارے سائرہ! ان کو دیکھا ہی نہیں؟ ہائے' بھوکے سو چکے ہوں گے۔ کیسی بھول ہو گئی۔" ان کا دل جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ اور اس ذکر پر اسما کا دل لحہ بھر کے لیے سکڑ کر سمٹ گیا تھا۔ اسے لگا' دن بھر کی بوجھل کیفیت' بے زاری کی وجہ سامنے آگئی ہے۔

دراصل "ان دونوں" کا "ذکر خیر" ہی اسما کی تمام تر جھلاہٹ اور بیزاری کا سبب تھا۔

"گویا اصل اور حقیقی سبب۔"

☼ ☼ ☼
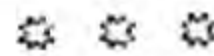
اسما کھڑے کھڑے عجیب سے تاثرات کا شکار ہو چکی تھی۔

دل میں ڈھیروں تلخی بھرے اس نے بظاہر عام انداز میں ماہی کو قہوہ اور سائرہ کو دودھ کا گلاس تھمایا تھا۔ جسے اس نے سوچوں میں گم ہی تھام لیا تھا۔ ماہی البتہ بغور اس کا تپا تپا لال انگارہ سا دودھیا چہرہ دیکھنے لگیں۔ مگر جیسے اندھیرے میں بھی اسما کا حسن اتنا مکمل اور تابناک سا تھا جو ماہی کی نگاہ سے بچ نہیں پائی تھی۔ انہوں نے جلدی سے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

وہ بیٹھنے کے بجائے باہر نکلنے لگی تب ماہی نے کچھ جھجک کر دھیمی آواز میں کہہ ہی دیا۔

"وہ دونوں بھوکے سو گئے۔ اتنی لمبی رات ہے۔ آدھی رات کو بھوک لگی تو؟ جگا کر کھانا کھلا دو۔" ان کا لہجہ بھی ساتھ ایک جھجک سی تھی۔

اسما کے اندر جھنجلاہٹ بڑھنے لگی۔ اور صبح کا بوجھل پن دگنا ہو گیا تھا۔

"ہونہہ! جیسے نوکر ہوں نا ان کی۔ نواب زادوں کی خدمت کروں۔" اس نے دل ہی دل میں کڑھ کر سوچا اور بظاہر اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

لاؤنج سے نکل کر اس کا ہرگز بھی ارادہ نہیں تھا کہ وہ گیلری کے آخری سرے پہ بنے اس اسٹور نما کمرے کی طرف جائے گی۔ وہ کمرہ جو فالتو کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ تاریک گیلری کے آخری سرے پہ۔

لیکن جیسے ہی وہ لاؤنج سے نکلی تو قدم خود بخود ہی اندھیرے میں ڈوبی گیلری کی طرف بڑھ گئے تھے۔

وہ چونکی تو تب جب اس نے اپنے کشادہ بیڈ روم کے بجائے "ان دونوں" کے کباڑ سے بھرے ٹھکانے میں قدم رکھا تھا۔

زیرو پاور کا بلب روشن تھے اور وہ دونوں چارپائیوں میں کمبل اوڑھے نیند میں بے سدھ تھے۔ زرد روشنی میں بھی اسما کو ان دونوں کے چہروں پہ خوف سا نظر آیا تھا۔ وہ بے ارادہ ہی انہیں تکنے لگی۔

پھر اس نے نگاہ ہٹا کر اردگرد کی چیزوں کا جائزہ لیا تھا۔

اسٹور روم میں اتنا سامان اور عجیب سی باس رچی تھی۔ جس کی وجہ سے دم گھٹ سا رہا تھا۔ اسما سے وہاں کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اتنا ڈھیر سامان پرانے کپڑوں کی گانٹھیں' صندوق' پیٹیاں اور ٹوٹا پھوٹا فالتو سامان۔ توبہ۔ طبیعت اوب سی گئی تھی۔

وہ ان دونوں کی نیند خراب کرنے کا ارادہ ترک کرتی جلدی سے باہر آگئی تھی۔

اندھیرے میں ڈوبی گیلری اور اس تنگ سے اس کمرے کی وحشت سے گھبرا کر اس نے جلدی سے اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔

جیسے ہی دروازہ کھولا اچانک خیال آیا۔ فرید کو قہوہ تو دیا نہیں تھا۔ وہ الٹے قدموں پھر سے کچن میں آگئی تھی۔ تازہ قہوہ بنا کر جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تب اسے سو فیصد یقین تھا اب تک فرید سو چکا ہو گا۔ لیکن اندر آکر اس کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا تھا۔

وہ نہ صرف جاگا ہوا تھا بلکہ کسی حساب کتاب میں الجھا ہوا بھی تھا۔ یعنی حساب میں جو اس کا ایک زمانے میں پسندیدہ مضمون تھا۔ تبھی تو اس نے شوق نہ رکھتے ہوئے بھی صرف حساب کی وجہ سے ایم اے کر لیا تھا۔ ریاضی میں ایم اے۔ اور ایک زمانہ تھا۔ یہی کوئی آٹھ نو سال پہلے جب پورے محلے کے لوگ فرید کے

پیچھے پڑے رہتے تھے کہ ان کے بچوں کو حساب کے سوال سمجھا دے۔ جن کے بچے تین تین سال سے دسویں میں اٹکے تھے۔ فرید کے اس "کمال" کی وجہ سے ایف اے اور بی اے تک کر گئے تھے۔

اور اسی "حساب" کی وجہ سے ہی فرید عمر بھر کے لیے سود و زیاں کے لامتناہی حساب سے دوچار ہو گیا تھا۔ اسی حساب میں کمال حاصل ہونے کی اعلا خوبی کے باعث۔

یہ حساب ہی تو تھا جس کی وجہ سے فرید عمر بھر کے خساروں میں گھر گیا تھا۔ اسی حساب نے فرید کی زندگی کو آزمائش اور پھر امتحان بنا دیا تھا۔

اور پھر وہ زندگی کے تلخ ترین حساب و کتاب میں الجھ گیا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

اسما کا دل بھر آیا تھا۔ وہ دبے قدموں سے فرید کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر کیلکولیٹر پہ نگاہ جما دی تھی۔ یعنی فرید کو کیلکولیٹر کی ضرورت بھی آن پڑی؟ کیا وہ اتنا ہی الجھا ہوا تھا یا اس کے ذہن میں یکسوئی نہیں تھی؟ نہیں دھیان بھٹک بھٹک کر اسٹور روم کی طرف تو نہیں جا رہا تھا؟ یہ کیسے ممکن تھا بھلا یہ کیونکر ممکن تھا؟

وہ شدید ڈسٹرب ہو چکی تھی۔

اسے اپنے سر پہ سوار دیکھ کر فرید نے نرمی سے کہا تھا۔

"یہاں رکھ دو۔" اس نے ـــــ تپائی پہ رجسٹر رکھا اور قہوے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اسما نے قہوے کی پیالی تپائی پہ رکھ دی تھی۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کر پلنگ پہ اپنی جگہ کی طرف آ گئی تھی۔ لیکن سنگھار میز سے کلینزنگ کی بوتل اٹھانی نہیں بھولی تھی۔

اس نے لیٹنے سے پہلے اپنا "شغل" پورا کیا تھا۔ ہاتھوں پیروں کا مساج کرنے کے بعد ہاتھ دھوئے، نائٹ لوشن لگایا۔ بالوں میں برش پھیرا اور آرام سے پلنگ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

فرید نے گہرا سانس کھینچ کر ہمیشہ کی طرح اس کے "شغل" اور مصروفیت کو خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

اسما کو ان سہاروں کی بھلا کیا ضرورت تھی! فرید کو یہ معمہ کبھی حل ہوتا نظر نہ آیا تھا۔ لیکن وہ روزانہ اسے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ برباد کرتا ضرور دیکھتا تھا۔

اس نے کام ختم کر کے قہوہ اٹھا کر گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا تو اسما کی آواز اس خاموش ماحول میں گونج اٹھی تھی۔ فرید کو لامحالہ توجہ دینا پڑی۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فرید نے سمجھا شاید کوئی پریشانی ہے۔ خود سے تو اس نے پوچھنا نہیں تھا۔ اسما خود ہی بتا دیتی۔ جیسے اس نے ابھی بتایا تھا۔

"فرید! جمعہ کو فارغ ہو؟" شاید بات کرنے کے لیے تمہید ضروری ہوتی ہے۔ سو اسما نے تمہید کا سہارا لیا تھا۔

"میں...؟" وہ ایسے چونکا تھا جیسے اس کا نام فرید نہیں تھا اور اسما کسی اور سے ہی مخاطب تھی۔

"ہاں تم۔" اسما نے تحمل سے کہا۔ ورنہ غصہ تو جی بھر کے آیا تھا۔

"کب فارغ ہوتا ہوں۔ اکثر جمعہ کو مال بھی آتا ہے اور گھر کے بھی ضروری کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ راشن بھی تقریباً" ختم ہے۔ اس جمعہ کو تو وقت نہیں۔" فرید نے اپنی مصروفیت کی وجوہات بتائی تو اسما گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

"یعنی تم نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ کی طرح۔" اسما نے آخری الفاظ دل میں کہے تھے۔ فرید اب کے چونکا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" سادہ سا سوال ابھرا۔

"میری کولیگ کے بھائی کا ولیمہ ہے۔ شادی میں نہیں جاؤں گی مگر ایک فنکشن تو اٹینڈ کرنا ہی ہے۔" اسما نے جتا کر کہا تھا۔ فرید گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"تم چلی جانا میں چھوڑ دوں گا۔ ڈے فنکشن ہے نا۔"

"ہاں۔" اسما نے بتایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ چلو بات ختم۔" فرید نے مطمئن

ہو کر قہوہ ختم کیا اور اسما پہ بلاوجہ ہی جھنجلاہٹ سوار ہو چکی تھی۔ یہ جھنجلاہٹ تو پچھلے تین ماہ سے اسما کے سر پہ سوار تھی۔ طبیعت بیزار، غصہ، چڑچڑاہٹ اور نجانے کیا کیا۔ پچھلے تین مہینوں سے۔ جس دن سے وہ دونوں یہاں تھے۔

اور اسما جانتی تھی ساری جھنجلاہٹ، بیزاری غصے اور اکتاہٹ کا ہر سرا کہیں نہ کہیں سے ان دونوں کے وجود اور ذات سے ہی جڑا ہوا ہے۔

اور ایک مرتبہ پھر دونوں کے درمیان دبیز خاموشی کی چادر تن گئی تھی۔ یہ تو کئی سالوں سے تھا۔ عموماً" اسما ہی اس خاموشی کو بے ضرر گفتگو کے ذریعے توڑتی رہتی تھی۔ فرید نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کسی بھی معاملے میں نہیں بولتا تھا۔ اس کی بہنوں کے مسائل کا کوئی قصہ ہوتا۔ انہیں "دینے لینے" کا کوئی معاملہ ہوتا۔ فرید نے کبھی اسما سے ڈسکس نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسما بھی سارا کچھ فرید پہ ڈال کر پہلو تہی کرتی تھی۔ انہیں دینے دلانے میں بھی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔

اور اس وقت بہت چاہنے کے باوجود بھی اسما کا دھیان "ان دونوں" سے نہیں ہٹ پا رہا تھا۔ بار بار سوچوں کا پنچھی اڑ اڑ کر ان کی طرف لپکتا۔ وہ کہاں تک ضبط کرتی۔ بالآخر جھنجلا سی گئی تھی۔

فرید اس کی الجھی سوچوں سے قطعاً" بے نیاز کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اتنا مطمئن اور پرسکون۔ جیسے تین ماہ پہلے ان کی زندگی میں کوئی طوفان نہ آیا ہو۔ یہ اتنا لاپروا، بے نیاز اور لاتعلق کیسے ہو سکتا تھا؟

اسما کو جی بھر کے غصہ آیا تھا۔ یعنی اس کی زندگی میں جھنجلاہٹ، بے چینیاں اور بے سکونی بھر کے وہ اتنا پرسکون کیسے ہو سکتا تھا۔

اسما نے اندر کی بے چینیوں سے گھبرا کر بے ارادہ ہی فرید کو پکار لیا۔ آخر وہ جاگ رہی تھی تو فرید کیوں پرسکون ہو کر سو رہا تھا۔

"فرید!" نیم تاریکی میں اس کی آواز ابھری تو فرید چونک سا گیا۔ یعنی وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ تو کیا وہ بھی سوچ رہا تھا۔ سوچوں میں گم تھا۔ انہی سوچوں میں جو اسما کو بے یقینی کے منجدھار میں ڈبو رہی تھیں۔

"ہوں۔ کیا ہوا؟" اس نے بغیر کروٹ لیے نرمی سے پوچھا۔

"ایسے ہی نیند نہیں آرہی۔" اسما سے بات نہیں بن پائی تھی۔

"تو چائے نہ پیتیں تم۔ اب جاگتی رہو گی۔ صبح دفتر بھی جانا ہے۔" فرید کی آواز دوبارہ ابھری تھی۔ اسما نے گہرا سانس لیا۔ نیم تاریکی میں اسے ہر چیز اجنبی سی لگ رہی تھی۔ حتیٰ کہ فرید بھی۔

"یہ اتنا انجان کیوں بن رہا ہے؟ کیا یہ جانتا نہیں، میں کیوں بے چین ہوں؟" اسما پہ جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ اس نے تنگ آکر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"فرید! کیا تم جانتے نہیں۔ میں اس قدر ڈسٹرب ہوں۔ تم اتنے پرسکون کیسے ہو سکتے ہو۔ میری تو نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔"

اس کے تلخ لہجے میں ایسا کچھ تھا ضرور۔ جس نے فرید کو ٹھٹکا دیا۔ وہ نہ صرف چونکا تھا بلکہ اس نے کروٹ بھی بدل لی تھی۔ پھر اس نے ذرا سی گردن اونچی کرکے اسما کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر ٹکی تھیں اور آنکھوں کے کنارے نم معلوم ہوتے تھے۔ کیا وہ رو رہی تھی؟ اور اس کی آنکھوں میں کتنی ویرانی بھری تھی۔ فرید بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

"ایسا کیوں ہے؟" فرید نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اسے اپنی ہی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"کیا تم نہیں جانتے؟" اسما کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ وہ اس کی اذیت سے اتنا بے خبر کیوں تھا؟ آخر کیوں؟ یا وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"میں کیا نہیں جانتا؟" فرید نے الجھ کر پوچھا۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے۔ اسما کا دل چاہا اپنا ہی سر کسی چیز پہ مار کر پھاڑ لیتی۔

"فرید! تم۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ آنکھیں بند ہیں تمہاری کیا؟ تمہیں نظر نہیں آ رہا کیا؟ میں "ان

چیختے پڑے رہتے تھے کہ ان کے بچوں کو حساب کے سوال سمجھا دے۔ جن کے بچے تین تین سال سے دسویں میں اٹکے تھے۔ فرید کے اس "کمال" کی وجہ سے ایف اے اور بی اے تک کر گئے تھے۔

اور اسی "حساب" کی وجہ سے ہی فرید عمر بھر کے لیے سود و زیاں کے لامتناہی حساب سے دوچار ہو گیا تھا۔ اسی حساب میں کمال حاصل ہونے کی اعلا خوبی کے باعث۔

یہ حساب ہی تو تھا جس کی وجہ سے فرید عمر بھر کے خساروں میں گھر گیا تھا۔ اسی حساب نے فرید کی زندگی کو آزمائش اور پھر امتحان بنا دیا تھا۔

اور پھر وہ زندگی کے تلخ ترین حساب و کتاب میں الجھ گیا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

اسما کا دل بھر آیا تھا۔ وہ دبے قدموں سے فرید کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر کیلکولیٹر پہ نگاہ جما دی تھی۔ یعنی فرید کو کیلکولیٹر کی ضرورت بھی آن پڑی؟ کیا وہ اتنا ہی الجھا ہوا تھا یا اس کے ذہن میں یکسوئی نہیں تھی؟ کہیں دھیان بھٹک بھٹک کر اسٹور روم کی طرف تو نہیں جا رہا تھا؟ یہ کیسے ممکن تھا بھلا یہ کیونکر ممکن تھا؟

وہ شدید ڈسٹرب ہو چکی تھی۔

اسے اپنے سر پہ سوار دیکھ کر فرید نے نرمی سے کہا تھا۔

"یہاں رکھ دو۔" اس نے ـــــ تپائی پہ رجسٹر رکھا اور قہوہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اسما نے قہوے کی پیالی تپائی پہ رکھ دی تھی۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کر پلنگ پہ اپنی جگہ کی طرف آ گئی تھی۔ لیکن سنگھار میز سے کلینزنگ کی بوتل اٹھانی نہیں بھولی تھی۔

اس نے لیٹنے سے پہلے اپنا "شغل" پورا کیا تھا۔ ہاتھوں پیروں کا مساج کرنے کے بعد 'ہاتھ دھوئے' نائٹ لوشن لگایا۔ بالوں میں برش پھیرا اور آرام سے پلنگ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

فرید نے گہرا سانس کھینچ کر ہمیشہ کی طرح اس کے "شغل" اور مصروفیت کو خاموشی سے دیکھا تھا۔ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

اسما کو ان سہاروں کی بھلا کیا ضرورت تھی! فرید کو یہ معمہ کبھی حل ہوتا نظر نہ آیا تھا۔ لیکن وہ روزانہ اسے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ برباد کرتا ضرور دیکھتا تھا۔

اس نے کام ختم کر کے قہوہ اٹھا کر گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا تو اسما کی آواز اس خاموش ماحول میں گونج اٹھی تھی۔ فرید کو لامحالہ توجہ دینا پڑی۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فرید نے سمجھا شاید کوئی پریشانی ہے۔ خود سے تو اس نے پوچھا نہیں تھا۔ اسما خود ہی بتا دیتی۔ جیسے اس نے ابھی ابھی بتایا تھا۔

"فرید! جمعہ کو فارغ ہو؟" شاید بات کرنے کے لیے تمہید ضروری ہوتی ہے۔ سو اسما نے تمہید کا سہارا لیا تھا۔

"میں۔؟" وہ ایسے چونکا تھا جیسے اس کا نام فرید نہیں تھا اور اسما کسی اور سے ہی مخاطب تھی۔

"ہاں تم۔" اسما نے تحمل سے کہا۔ ورنہ غصہ تو جی بھر کے آیا تھا۔

"کب فارغ ہوتا ہوں۔ اکثر جمعہ کو مال بھی آتا ہے اور گھر کے بھی ضروری کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ راشن بھی تقریباً" ختم ہے۔ اس جمعہ کو تو وقت نہیں۔" فرید نے اپنی مصروفیت کی وجوہات بتائی تو اسما گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

"یعنی تم نہیں جاؤ گے ـــ ہمیشہ کی طرح۔" اسما نے آخری الفاظ دل میں کہے تھے۔ فرید اب کے چونکا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" سادہ سا سوال ابھرا۔

"میری کولیگ کے بھائی کا ولیمہ ہے۔ شادی میں نہیں جاؤں گی مگر ایک فنکشن تو اٹینڈ کرنا ہی ہے۔" اسما نے جتا کر کہا تھا۔ فرید گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"تم چلی جانا میں چھوڑ دوں گا۔ ڈے فنکشن ہے نا۔"

"ہاں۔" اسما نے بتایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ چلو بات ختم۔" فرید نے مطمئن

ہو کر قہوہ ختم کیا اور اسما پہ بلاوجہ ہی جھنجلاہٹ سوار ہو چکی تھی۔ یہ جھنجلاہٹ تو پچھلے تین ماہ سے اسما کے سر سوار تھی۔ طبیعت بیزار، غصہ، چڑچڑاہٹ اور تجانے کیا کیا۔ پچھلے تین مہینوں سے۔ جس دن سے وہ دونوں یہاں تھے۔

اور اسما جانتی تھی ساری جھلاہٹ، بیزاری غصے اور اکتاہٹ کا ہر سرا کہیں نہ کہیں سے ان دونوں کے وجود اور ذات سے ہی جڑا ہوا ہے۔

اور ایک مرتبہ پھر دونوں کے درمیان دبیز خاموشی کی چادر تن گئی تھی۔ یہ تو کئی سالوں سے تھا۔ عموماً" اسما ہی اس خاموشی کو بے ضرر گفتگو کے ذریعے توڑتی رہتی تھی۔ فرید نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کسی بھی معاملے میں نہیں بولتا تھا۔ اس کی بہنوں کے مسائل کا کوئی قصہ ہوتا۔ انہیں "دینے لینے" کا کوئی معاملہ ہوتا۔ فرید نے کبھی اسما سے ڈسکس نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسما بھی سارا کچھ فرید پہ ڈال کر پہلو تہی کرتی تھی۔ انہیں دینے دلانے میں کبھی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔

اور اس وقت بہت چاہنے کے باوجود بھی اسما کا دھیان "ان دونوں" سے نہیں ہٹ پا رہا تھا۔ بار بار سوچوں کا پنچھی اڑ اڑ کر ان کی طرف لپکتا۔ وہ کہاں تک ضبط کرتی۔ بالآخر جھنجلا سی گئی تھی۔

فرید اس کی الجھی سوچوں سے قطعاً" بے نیاز کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اتنا مطمئن اور پرسکون۔ جیسے تین ماہ پہلے ان کی زندگی میں کوئی طوفان نہ آیا ہو۔ یہ اتنا لاپروا، بے نیاز اور لاتعلق کیسے ہو سکتا تھا؟

اسما کو جی بھر کے غصہ آیا تھا۔ یعنی اس کی زندگی میں جھنجلاہٹ، بے چینیاں اور بے سکونی بھر کے وہ اتنا پرسکون کیسے ہو سکتا تھا'

اسما نے اندر کی بے چینیوں سے گھبرا کر بے ارادہ ہی فرید کو پکار لیا۔ آخر وہ جاگ رہی تھی تو فرید کیوں پرسکون ہو کر سو رہا تھا۔

"فرید!" نیم تاریکی میں اس کی آواز ابھری تو فرید چونک سا گیا۔ یعنی وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ تو کیا وہ بھی سوچ رہا تھا۔ سوچوں میں گم تھا۔ انہی سوچوں میں جو اسما کو بے یقینی کے منجدھار میں ڈبو رہی تھیں۔

"ہوں۔ کیا ہوا؟" اس نے بغیر کروٹ لیے نرمی سے پوچھا۔

"ایسے ہی' نیند نہیں آرہی۔" اسما سے بات نہیں بن پائی تھی۔

"تو چائے نہ پیتیں تم۔ اب جاگتی رہو گی۔ صبح دفتر بھی جانا ہے۔" فرید کی آواز دوبارہ ابھری تھی۔ اسما نے گہرا سانس لیا۔ نیم تاریکی میں اسے ہر چیز اجنبی سی لگ رہی تھی۔ حتیٰ کہ فرید بھی۔

"یہ اتنا انجان کیوں بن رہا ہے؟ کیا یہ جانتا نہیں' میں کیوں بے چین ہوں؟" اسما پہ جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ اس نے تنگ آکر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"فرید! کیا تم جانتے نہیں۔ میں اس قدر ڈسٹرب ہوں۔ تم اتنے پرسکون کیسے ہو سکتے ہو۔ میری تو نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔"

اس کے تلخ لہجے میں ایسا کچھ تھا ضرور جس نے فرید کو ٹھٹکا دیا۔ وہ نہ صرف چونکا تھا بلکہ اس نے کروٹ بھی بدل لی تھی۔ پھر اس نے ذرا سی گردن اونچی کر کے اسما کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر ٹکی تھیں اور آنکھوں کے کنارے نم معلوم ہوتے تھے۔ کیا وہ رو رہی تھی؟ اور اس کی آنکھوں میں کتنی ویرانی بھری تھی۔ فرید بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

"ایسا کیوں ہے؟" فرید نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اسے اپنی ہی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"کیا تم نہیں جانتے؟" اسما کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ وہ اس کی اذیت سے اتنا بے خبر کیوں تھا؟ آخر کیوں؟ یا وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"میں کیا نہیں جانتا؟" فرید نے الجھ کر پوچھا۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جاتا۔ اسما کا دل چاہا اپنا ہی سر کسی چیز پہ مار کر پھاڑ لیتی۔

"فرید! تم۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ آنکھیں بند ہیں تمہاری کیا؟ تمہیں نظر نہیں آ رہا کیا؟ میں" ان

دونوں" کی بات کر رہی ہوں؟ وہی دو جو تین مہینے سے ہماری زندگیوں پہ زبردستی مسلط کر دیے گئے۔" اسما کا سانس پھول گیا تھا۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اور تنفس تیز تر۔ فرید الجھی الجھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"کون؟ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" فرید کے الفاظ نے تو اسما کو سر سے لے کر پیروں تک سن کر دیا تھا۔ فرید کیا "حالت نیند" میں تھا! اس کا دماغ چل گیا تھا! یا اس کی یادداشت کھو گئی تھی؟

"فرید...!" اب کے اسما کو شدید شاک لگا تھا۔ اس کا لہجہ تیز ہوا تو جیسے فرید کو بھی بھولی بسری ایک کہانی کا کوئی کردار یاد آ گیا تھا اور اس کردار کے دو اور حصے۔ جو اس وقت کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی کسی ٹھوس حقیقت کی طرح ان کے سروں پہ مسلط تھے۔

فرید جیسے اندر تک ہل گیا تھا۔ اس کی شیشے جیسی شفاف آنکھوں میں چمکیلا پانی تیرنے لگا۔ یا اسما کو ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ گم سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی اور فرید ایسے ساکت تھا جیسے دوبارہ کبھی بولے گا ہی نہیں۔ اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔

"وہ تم پر زبردستی مسلط نہیں ہوئے۔ تمہیں اختیار دیا گیا تھا اور فیصلہ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ تم جو چاہے کر لیتیں۔ ٹھکرا دیتیں، دھتکار دیتیں یا اپنا لیتیں۔ تم تب کیوں خاموش ہو گئی تھیں؟ غلطی کس کی ہے بھلا؟ اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" پہلی مرتبہ فرید نے اتنی لمبی بات کی تھی اور اسما کا دل چاہا وہ زور زور سے رونا شروع کر دے۔ فرید کی باتوں پہ وہ پھٹ پڑی تھی۔

"تو کیا کرتی؟ امی نے بندوق میرے کندھوں پہ رکھ دی تھی اور تم بھی ایسے بے نیاز ہو کر چل دیے تھے۔ جیسے تمہارا ان سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو۔ امی کو سارا "بار" دوسروں پہ ڈال کر ٹارگٹ اچیو کرتا آتا ہے۔ ہاتھ جھاڑ کر ایسے بری الذمہ ہو گئیں۔ جو کرے گی اسما کرے گی اور اسما کیوں سارا گناہ اپنے سر لیتی؟"

اسما کا لہجہ تلخ ترین ہو چکا تھا اور فرید دوسری طرف ایسے ہی تھا۔ ٹھنڈا، نرم اور خاموش۔ وہ اس کے غصے اور تلخی پہ بھی کچھ نہ بولا۔ گو کہ اسے غصہ آ رہا تھا اور ماتھے پہ ایک دو بل بھی غصے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ لیکن اسے ہمیشہ اپنے جذبات کو خود تک محدود رکھنے کی عادت تھی۔

"تم ہانتی ہو نا... اگر تم خاموش نہ رہتیں تو سارا گناہ تمہارے سر آتا۔ تمہارا کوئی بھی فیصلہ تمہیں گناہ گار بنا دیتا؟ تو پھر یہ غصہ، یہ جھنجلاہٹ، یہ تلخی کیوں؟" فرید کی کچھ دیر بعد نرم سی آواز ابھری تھی۔ وہ اپنے غصے پہ قابو پا چکا تھا... ان دو انسانوں کو پچھلے تین مہینوں میں وہ یکسر بھول چکا تھا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کوئی اور بھی اس کے گھر کی چھت تلے موجود تھے۔ جن کی ذمہ داری اللہ نے اس پہ ڈال رکھی تھی۔

اسما نے - چنگاری کو ہوا دے دی تھی۔ اس کے اندر دور تک آگ ہی آگ پھیلنے لگی تھی۔ ہر طرف تپش ہی تپش تھی۔

اور ادھر اسما کی کیفیات بھی فرید سے مختلف نہیں تھیں۔

"اس لیے کہ زبردستی کے بوجھ میری اوقات اور برداشت سے باہر ہیں۔" اسما کا لہجہ دوٹوک تھا۔ گویا اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس پہ قائم رہنا چاہتی تھی۔

فرید لمحہ بھر کے لیے اس کی بات اور لب و لہجے کی گہرائی کو ناپتا رہا۔ پھر اس نے سرخ آنکھوں پہ بازو رکھ کر کروٹ بدل لی تھی۔ لیکن اس کے الفاظ پہلی مرتبہ اسما کو منجمد کر چکے تھے۔

"تمہیں کس نے کہا ہے برداشت کرو...؟" ٹھنڈا ٹھار چابک اسما کے وجود پہ پڑا تھا۔ اور وہ بلبلا بھی نہیں سکی تھی۔

"تو کیا کروں؟" اس نے غصے میں جھنجلا کر کہا۔

"انہیں گھر سے نکال دو..." فرید کا وہی ٹھنڈا انداز۔ دوٹوک، ٹھوس اور بے لچک قسم کا۔ اسما کو یوں لگا جیسے کمرے کی پوری چھت ملبے سمیت اس کے سر پہ آ گری ہے۔

اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس رکنے لگا۔ دل کٹنے لگا۔
"انہیں گھر سے نکال دو۔"
"انہیں گھر سے نکال دو۔" کمرے کی ایک ایک چیز چلا چلا کر اعلان کر رہی تھی۔ چیخ چیخ کر جتلا رہی تھی اور نہایت تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
"کیا اسما ایسا کر سکتی تھی!"

☼ ☼ ☼ ☼

اور سرما کی صبح بھی ویسی ہی تھی۔ کہر میں لپٹی ہوئی، دھند زدہ سی۔
سورج آج بھی آسمان پہ کہیں نہیں تھا۔ بدلیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ یا سردی کی شدت سے بیزار سا منہ چھپا کر بیٹھا تھا۔
اسما کی صبح کا آغاز بہت سویرے ہوتا تھا۔
وہ اٹھتی تو فرید کو بھی نماز کے لیے جگا دیتی تھی۔ فرید نماز کے لیے مسجد جاتا تھا۔ پھر کافی دیر کے بعد ہی واپس آتا۔ چاہے گرمی ہو چاہے سردی۔ فرید، ماموں کے ساتھ بچپن سے ہی صبح کی سیر کا عادی تھا۔ اب یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ چھوٹتی ہی نہیں تھی۔ چاہے موسم کیسا ہی کیوں نہ ہوتا۔ وہ واک کے بعد ہی گھر آتا تھا۔ واپسی پہ اکثر چھوٹا موٹا ناشتے کا سامان بھی لے آتا تھا۔ سبزی، دال یا نان خطائی وغیرہ بھی۔
آج بھی اسما جب بن سنور کر کچن میں آئی تو فرید سلیب پر انڈے، ڈبل روٹی اور جیم رکھ رہا تھا۔
یہ ریڈی میڈ ناشتہ اسما کی پسند بھی تھا اور مرغوب بھی۔ باقی سب تو آملیٹ پراٹھا کھانے کے عادی تھے۔ اسما سلائس لیتی تھی۔ اکثر لنچ کے لیے سینڈوچ بھی بنا لیتی۔ دفتر میں کم کم ہی بازار کا کھانا منگواتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے جلدی جلدی فریج سے آٹا نکال کر پراٹھے بنانے شروع کیے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کن اکھیوں سے فرید کو بھی دیکھ رہی تھی۔ جو اسٹول پہ بیٹھا گھونٹ گھونٹ پانی پی رہا تھا۔
رات کی باتوں کا اس کے چہرے پہ شائبہ تک نہیں تھا۔ اسما حیران رہ گئی۔ اسے اپنے تاثرات چھپانے میں

کتنی مہارت تھی۔
اس نے پراٹھے تلے تو وہ اٹھ کر کپڑے بدلنے چلا گیا
تھوڑی دیر بعد ہی اس کی واپسی ہو گئی۔ اسما نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی تھی۔
نیلی جینز پہ سفید ہائی نیک پہن رکھی تھی۔ بڑے دنوں بعد شیو بھی بنائی تھی۔ تازہ تازہ شیو کی نیلاہٹیں کتنی بھلی لگ رہی تھیں اور آفٹر شیو لوشن کی بھینی بھینی سی مہک اردگرد بھٹکنے لگی۔
وہ پہلے کی طرح ہی بھرپور، دلنشین اور وجیہہ تھا۔ اسما نے نگاہ بھر کے دیکھا تو وہ بھی چونک گیا۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اس کا انداز سادہ تھا۔ اسما نے گہرا سانس بھرا۔ پراٹھا اور آملیٹ ٹرے میں رکھ کر اس کے سامنے کیا۔
"بس ایسے ہی۔" اسما تھوڑی خفیف سی ہوئی تھی۔ جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔
"کیا بہت اچھا لگ رہا ہوں؟" آج خلاف معمول کچھ بات ہو رہی تھی؟ اسما حیران ہوئی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں پہلے سی سادگی نہیں تھی۔ ہلکا سا تجسس دکھائی دیتا تھا۔ جیسے وہ اس کا جواب جاننا چاہتا ہو۔ اسما نے سلائس کترتے ہوئے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔
"تم ہمیشہ اچھے لگتے ہو۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی تھی۔ وہ کافی دیر تک منتظر نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے مایوسی سے نگاہ ہٹالی تھی۔
اسما نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی۔
"امی اور سائرہ کب تک اٹھیں گی؟" اس نے طویل ہوتی خاموشی سے گھبرا کر پوچھا تھا۔
"سائرہ اٹھ گئی ہے۔ امی نماز کے بعد سو جاتی ہیں۔ اٹھ کے ناشتہ کریں گی۔" اسما نے چائے پیتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ منتظر تھی شاید وہ کسی اور کے بارے میں بھی ضرور پوچھے گا۔ سوال کرے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ شاید رات کے غصے کو ایک مرتبہ پھر بھول چکا تھا۔ جیسے گیارہ سالوں سے بھولا ہوا تھا۔
اس نے سرہلا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شادی کے لیے کتنے پیسے چاہئیں؟" یہ وہ ضروری کام تھا جو فرید کے ہی ذمے تھا۔ خاندان ہو ملنے والے یا اسماء کے حلقہ احباب میں ہونے والے فنکشنز' دیگر تقریبات۔ دینے دلانے کی ساری ذمہ داری فرید کے سر تھی۔ وہ خود بخود ضرورت پوری کر دیا کرتا تھا۔ چاہے اس کے پاس کچھ نہ ہوتا۔ اور اسماء کا پرس نوٹوں سے بھرا ہوتا۔ وہ اس معاملے میں جان بوجھ کر پہلوتہی سے کام لیتی تھی۔

"دو ہزار۔" اس نے اندازاً" بتایا تو فرید نے اسی وقت جیب سے دو ہزار نکال کر سلیب پہ رکھ دیے تھے۔ اسما نے دو پراٹھے ہاٹ پاٹ میں رکھے اور اپنے لیے سینڈوچ بنا کر اٹھ گئی تھی۔

فرید بھی ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ انہیں کام پہ جانے سے پہلے خدا حافظ کہنے کے لیے۔ اس نے ہاٹ پاٹ پہ اک نگاہ ڈالی اور اپنا لنچ باکس اٹھا لیا۔

اس نے آج بھی دو ہی پراٹھے بنائے تھے۔ ایک ماں کے لیے اور ایک سائرہ کے لیے۔

اور ان دونوں کے لیے؟ اس نے گہرا سانس لیا اور کچن سے باہر آگئی۔

اس کے دل میں ان دونوں کے لیے اتنی ہی تنگی تھی۔ وہ اپنے دل کو اس معاملے میں کشادہ نہیں کرپائی تھی۔ کیونکہ اس نے کبھی ایسی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

اس نے سر جھٹکا' اور ایک آخری نگاہ اندھیرے میں ڈوبی ڈیوڑھی کے آخری سرے پہ بنے اسٹور روم پہ ڈالی تھی۔ وہ دونوں ابھی تک اسٹور روم میں بند تھے۔ اور اسما جانتی تھی جب تک وہ اور فرید گھر پہ تھے۔ ان دونوں نے اپنی کچھار سے باہر نہیں آنا تھا۔

پچھلے تین مہینوں سے ان دونوں کا یہی معمول چلتا آرہا تھا۔ جس میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن اگلی صبح کچھ مختلف تھی۔ بہت مختلف۔

☆ ☆ ☆

آج دفتر میں سارا دن مصروفیت کی نذر ہو گیا تھا۔ ڈپٹی ایجوکیشن کا دورہ تھا۔ تحصیل بھر کے چیدہ چیدہ اسکولوں کا وزٹ کرنا تھا۔ اسما کو بھی لامحالہ ان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ پورا دن سفر میں ہی گزر گیا۔ کبھی ایک اسکول تو کبھی دوسرے اسکول۔

چند دن پہلے کچی بستی میں بھی ایک نئے پرائمری اسکول کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تھا۔ اس کی افتتاحی تقریب بھی ہونا تھی۔ ابھی تک کوئی دن طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ یوں یہ معاملہ بھی التوا میں تھا۔

اسما آج جلدی گھر جانا چاہتی تھی لیکن فرید فارغ نہیں ہو رہا تھا۔ یوں اس نے فرید کو میسج کیا وہ رکشہ پہ گھر چلی جائے گی وہ آرام سے فارغ ہو کر آجائے۔

وہ دفتر سے نکلنے لگی تو اس کی پرانی یونیورسٹی فیلو کنول اچانک ہی ٹکرا گئی۔ بڑے سالوں بعد اس سے اچانک ملاقات ہوئی تھی۔ اسما کو ان بوجھل کثیف اور بیزار دنوں میں اس کی آمد ہوا کے جھونکے کی مانند لگی تھی۔ کنول سدا کی باغ بہار طبیعت کی مالک تھی۔ آتے کے ساتھ ہی اسما کو پرانے دنوں میں لے گئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں یوں لگا تھا جیسے بیچ کے سال آئے ہی نہیں تھے۔

کنول شادی کے بعد اٹک چلی گئی تھی۔ بہت عرصے بعد اپنے شہر آئی تو اسما سے ملنے کو بے چین ہو گئی تھی۔ اُدھر اُدھر کی بے شمار باتوں کے بعد کنول کو ہی خیال آیا تھا۔

"اسما! تم نے بتایا ہی نہیں۔ کیسی گزر رہی ہے؟ بچے کتنے ہیں؟" کنول نے مسکرا مسکرا کر اپنے بچوں کی سیلفیاں دکھاتے ہوئے اچانک پوچھا تو اس کے مسکراتے لب ایک دم سکڑ گئے تھے۔

کنول کو سوال پوچھ کر جواب جاننے کا کم ہی خیال آتا تھا۔ کیونکہ وہ باتونی بہت تھی۔ ایک قصہ ختم کرتی تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ ابھی بھی اسما کو جواب دینے کی اذیت سے بچا کر وہ کسی اور بات میں مشغول ہو چکی تھی۔

اور اسما کے اندر ایک چبھن دیتا احساس دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمی سب سے بڑا خلا۔

اندر جیسے سناٹے اتر آئے تھے۔ ہر طرف سکوت ہی سکوت پھیل گیا تھا۔

کنول کتنی ہی دیر بیٹھی رہی مگر اسما سے کوئی بھی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اس کا فون نمبر اور گھر کا پتا لے کر چلی گئی تھی۔ اور اسما کے اندر ڈھیر سارے سوالیہ نشان چھوڑ گئی تھی۔

وہ بڑے ہی بوجھل دل کے ساتھ گھر واپس آئی تھی۔

گھر میں معمول کا سناٹا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا۔ اس گھر میں تین، چار نفوس موجود ہیں۔ ماں لاؤنج میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھی تھیں۔ سائرہ کچن میں تھی۔ اسے آتا دیکھ کر باہر نکل آئی۔ اسما نے پرس میز پہ رکھا اور ماں کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

"آج بہت دیر کر دی؟" انہوں نے گردن موڑ کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھا تھا۔ شاید فرید کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اسما ان کی نگاہوں میں اتری بے چینی پا گئی تھی۔

"فرید نہیں آیا۔" اسما نے بتایا۔

"کیوں؟" وہ متفکر ہو گئی تھیں۔

"کوئی کام تھا۔" اسما نے کنپٹیاں دباتے ہوئے جواب دیا تھا۔ سائرہ بھی تب تک قریب آگئی تھی۔

"کھانا لاؤں؟"

"نہیں۔۔ فرید تو آجائے۔ کیا پکایا ہے؟" اس نے بے ارادہ ہی پوچھ لیا تھا۔

"وہی دال کیا پکانا تھا۔۔ فرید کل جائے گا تو سودا آئے گا۔" سائرہ کے بجائے ماں نے جواب دیا تھا۔ ان کی نگاہیں اس کے سجے ہاتھوں اور کلائیوں پہ جمی تھیں۔ جگر جگر کرتا بریسلیٹ اور انگوٹھیاں۔

"ہاں' ان فضول چیزوں کے لیے بہت پیسہ ہے۔ اتنا نہیں' شوہر کا ہاتھ بٹا دے۔" انہوں نے کلس کر سوچا تھا۔

"جانے کون سی بیویاں ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں کے آدھے بوجھ بانٹ لیتی ہیں۔" ان کا جی بہت برا ہو رہا تھا۔

"مجال ہے جو اس پہ اثر ہو۔ گھر میں اتنے دن سے دال' آلو پک رہے ہیں۔ نند مہمان گھر میں آئی ہے۔ نہ دودھ نہ گوشت نہ فروٹ۔ بھاں بھاں کرتا فریج۔ ذرا شرم نہیں۔ بھرے بازار سے اٹھ کر آتی ہے۔ اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ کسی ریڑھی سے پھل خرید لائے۔" وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں اور یہ کڑھنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خود یہ جی بھر کے پیسہ لگانے والی کو اپنے سے وابستہ لوگوں کی ضروریات کا کبھی احساس نہیں ہوتا تھا۔

اسما کپڑے بدلنے کی غرض سے اٹھی تو پیچھے سے سائرہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"انہیں کھانا کھلا دیا ہے۔ دونوں جلدی سونے کے عادی ہیں۔ بہت ہی صابر ہیں امی! نہ کوئی ناز نہ کوئی نخرہ۔ روکھا پھیکا جو بھی ملے صبر شکر سے کھا لیتے ہیں۔ ایک بات سوچ رہی تھی امی! ہم پانچوں بہن بھائی کوئی ایسے تھے؟ ہم میں تو اتنے نخرے تھے۔ ابو نے ہمیں کتنے ناز سے پالا تھا۔ ہماری ہر فرمائش کو بن کہے پورا کیا۔ ہمیں ہر بہترین چیز مہیا کی۔ بہترین تعلیم دلوائی۔ اور ہم اپنے بچوں کو کیا دے رہے ہیں؟ بے یقینی؟ خوف؟ تکلیف؟ رشتوں کا مبہم احساس اور تحفظ؟ امی! یہ سب کیا ہے؟ میری برداشت سے بہت اوپر' آپ نے دیکھا نہیں۔ اسما اور فرید کا رویہ؟ وہ ہاتھ آئی نعمتوں کو کس انداز میں نظرانداز کر رہا ہے؟ کس انداز میں جھٹلا رہا ہے؟"

سائرہ اتنے دنوں سے جو دیکھ رہی تھی۔ اسی کے زیر اثر پھٹ پڑی تھی۔ ماں گم صم سی بیٹی کو دیکھتی رہ گئیں۔ کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھی۔ لیکن ان کے اختیار میں کیا تھا؟

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ میری کون سنتا ہے؟ سارے فیصلوں کا اختیار ان کے پاس ہے جو خود مختار ہیں۔ اور در گزر سے کام نہیں لیتے۔ میں فرید سے کیسے کہوں؟ اسے تو یاد بھی نہیں۔۔ اس گھر میں تین

مہینوں سے کوئی اور بھی رہ رہا ہے۔ اس نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ یاد بھی نہیں اسے۔ ایسی حقارت؟ ایسی شقاوت۔"

ماہی بھرائی آواز میں بولتی گئیں اور اسما سے مزید سننا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گئی تھی کہ سچ سننا بہت ہی کٹھن ترین مرحلہ ہوتا ہے اور سچ کا بار کوئی کوئی اٹھا سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

فرید کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کام پہ نہیں جا سکا۔ اب بیمار شوہر کو چھوڑ کر اسما دفتر چلی جاتی تو اس کی گلو خلاصی ناممکن تھی۔ ماہی نے تو اس جرم کو کسی بھی صورت میں معاف نہیں کرنا تھا۔

اس لیے اسما کو بھی چھٹی کرنا پڑی تھی۔

جب وہ ناشتہ بنانے کچن میں آئی تو ماہی اور سائرہ بھی اٹھ چکی تھیں۔

اس نے آلو ابال کر آمیزہ بنایا۔ ارادہ تھا۔ آلو کے پراٹھے بنالے گی۔ وہ اس کام میں لگی ہوئی تھی۔ جب سرخ آنکھیں لیے فرید بھی آگیا۔ اس کا گلا خراب تھا۔ آواز بھاری تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ بھی بخار کی حدت سے دہک رہا تھا۔

اس نے کرتے قمیص شلوار پہ گرے ہائی نیک پہنی ہوئی تھی۔ اسے تیار دیکھ کر اسما حیران ہوئی۔

"کہیں جانا ہے کیا؟"

"منڈی سے تازہ سبزی اور پھل لے آؤں۔ گوشت بھی صبح کے وقت ملتا ہے۔ اسی لیے جا رہا ہوں۔ تم لسٹ بنا دو۔ کچھ اور چاہیے تو۔" فرید کا انداز مصروف سا تھا۔ وہ ہمدردی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر نرمی سے بولی تھی۔

"آج ضروری تھا کیا؟ سودا پھر آجاتا۔ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔" اسما نے چائے دم پر رکھی اور بل دار پراٹھے بنانے شروع کیے۔

"سائرہ اتنے دن سے آئی ہوئی ہے۔ گھر میں کچھ بھی نہیں۔ اتنی شرمندگی ہو رہی تھی مجھے۔ کیا سوچتی ہوگی

میری بہن۔ میں اپنی مہمان بہنوں کو دو وقت اچھا کھلا بھی نہیں سکتا۔" وہ آہستہ سے بولا تو اسما چپ رہی۔ اس ساری بات میں بہن کے لیے تو فکر تھا اور کسی کے لیے فکر کی پرچھائی تک نہیں تھی۔ سائرہ کے علاوہ بھی تو دو اور لوگ تھے۔ جو فرید کو یاد تک نہیں تھے۔ اسما کو ایک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔

"یہ تو ہے۔" اس نے دل ہی دل میں تسلیم کیا۔ پھر کچن سے متعلق ایک لمبی لسٹ بنا کر فرید کو تھما دی تھی۔

"پہلے ناشتہ کرلو۔" اسما نے ٹرے فرید کے سامنے رکھی۔ تبھی سائرہ بھی آگئی تھی۔ اور سائرہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے دو شرمائے گھبرائے سے وجود بھی تھے۔

اسما کے ہاتھ سے آٹے کا پیڑا گر گیا تھا اور اسی طرح فرید کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ بھی رک گیا۔ حیرت سی حیرت تھی۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سائرہ ان دونوں کو نکال کر باہر لے آئے گی۔ وہ بھی فرید کے روبرو۔

اسما کا تنفس جیسے رک رک کر چلنے لگا تھا۔ اس کا دل پوری شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ فرید کے سامنے تھے۔ سر جھکائے ہوئے اور فرید انہیں یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ جیسے حالت نیند میں ہو' اور اس کی نیند ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔

اس کے چہرے پہ ناقابلِ یقین قسم کے تاثرات تھے۔

بے یقینی' حیرت' استعجاب' ترماہٹ اور پھر اچانک در آنے والی بیزاری' نفرت اور حقارت۔ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ فرید کو دیکھا اور سن ہو گئی تھی۔

وہ ابھی تک پلک جھپکے بغیر ان ہی دو کمزور سے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایک ہی عمر کے۔ ایک ہی شکل کے دس سالہ بچے۔

اعتماد سے عاری' سہمے سہمے' خوف زدہ' گھبرائے ہوئے چہرے مہرے سے فرید کا عکس لیے۔ خوب

صورت ' دل موہ لینے والی صورتیں ۔ اور جھجکی آنکھوں میں تیرتی نمی۔

فرید کے ہاتھ سے نوالہ گر پڑا تھا۔ پھراس نے میز کو پیچھے کھسکایا' اسٹول گھسیٹا اور ایک ہی جھٹکے کے ساتھ باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ یوں کہ سائرہ ہکابکا رہ گئی تھی۔

"فرید۔" اس کے الفاظ اور پکار بھی منہ میں دب سی گئی۔ وہ خفیف سی کھڑی رہ گئی۔ جبکہ اسمانے اپنے تاثرات فوراً" چھپالیے تھے۔

تو وہ گھڑی آہی چکی تھی جب سائرہ ان دونوں کو ڈیوڑھی کے اسٹور سے نکال کر باہر لے آئی۔ اس گھر میں ان کا حق ملکیت جتانے۔

آج پورے تین ماہ بعد اسمانے بھی انہیں بغور دیکھا تھا۔

وہی پرانے بدرنگ کپڑے پہنے ہوئے۔ جگہ جگہ سے ادھڑے سویٹر' پرانی جرابیں اور ٹوٹی پرانی جوتیاں۔ عنید اور فضہ۔

ایک بھولا ہوا بوسیدہ قصہ اور اس کے بے ضرر کردار۔

فرید کی ضد کا انجام۔

اس کا عشق' جنون' ضد اور پھر انتقام۔

آہ ایک گرد آلود زندگی کا بے رنگ اختتام۔

اسما کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوچکا تھا۔

اس نے بے دلی سے فرید کی ٹرے کو دیکھا تھا۔ وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ عنید اور فضہ کی وجہ سے۔ اس نے انہیں دیکھنا تو دور کی بات محسوس کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ عنید اور فضہ کو جس طرح سے وہ نفرت بھری نگاہ سے دیکھتا باہر نکل گیا تھا۔ اسما کے اندر ایک کمینی سی خوشی نے انگڑائی لی تھی۔

جس طرح سے فرید نے ان دونوں کو نظرانداز کیا تھا' اسی طرح اسما بھی ان سے لاتعلق ہوگئی۔ سائرہ نے بہت شدت کے ساتھ اس کا رویہ محسوس کیا تھا۔

پھر اس نے دونوں بچوں کو چھوٹے اسٹول پہ بٹھا دیا۔ وہ بہت ڈرے سہمے سے جھجک کر اسما کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ تب سائرہ نے ان دونوں کے سامنے پراٹھے رکھے۔ ان دونوں نے سر جھکا کر ناشتہ کرنا شروع کردیا تھا۔ اسی خاموشی کے ساتھ۔ اسی جھجک کے ساتھ۔ پسند تھا یا نہیں۔ خواہش تھی یا نہیں۔ ہر چیز سے قطعی بے نیاز۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالے لینے کے بجائے بڑے بڑے پراٹھے کے ٹکڑے کھارہے تھے۔ سائرہ کو بیچ میں ٹوکنا پڑا تو وہ دونوں ایک دم سہم گئے تھے۔ جیسے ان کے سامنے سے "روٹی" اچانک اٹھالی جائے گی۔

سائرہ نے خود پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر باری باری دونوں کے منہ میں ڈالے تو انہیں تھوڑی سی تسلی ہوگئی تھی۔ اسما سے یہ "چونچلے" برداشت نہ ہوئے تو چولہا بند کرکے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

جب وہ باہر نکلنے لگی تو پیچھے سے سائرہ کی آواز آئی تھی۔

"عنید اور فضہ اب سب کے ساتھ کھانا کھایا کریں گے۔ ناشتہ بھی کچن میں کریں گے۔"

اس کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ ان دونوں بچوں کی حیثیت کو اسما اتنی آسانی کے ساتھ نظرانداز نہ کرے۔ اسمانے چپ چاپ سائرہ کا اعلان سنا تھا۔ پھر وہ کلستی ہوئی باہر نکل آئی۔

"میری بلا سے' فرید کے بند روم میں ان کا خوان لگوادو۔ تمہاری ساری کوششیں بے کار ہیں۔ فرید کے دل میں ان دونوں کے لیے تم محبت نہیں جگا سکتیں۔ وہ جس نفرت کی انتہا پہ ہے۔ ہرگز بھی انہیں قبول نہیں کرے گا۔ چاہے تم چاروں بہنیں جتنا مرضی زور لگالو۔ کم از کم فرید کے دل میں ان کے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ گھر میں تو مہمانوں' مسافروں اور لاچاروں' لاوارثوں کو بھی عارضی طور پہ ٹھہرا لیا جاتا ہے۔"

وہ جلتی کلستی مختلف سوچوں میں ڈوبی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی اور دروازہ "ٹھاہ" کے ساتھ بند کردیا۔ یوں کہ ماں اور سائرہ نے بہت چونک کر فرید

کے کمرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر ان کی آنکھوں میں مایوسی سی اتر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سائرہ کے بیٹے کی ولادت کے ساتھ ہی گھر پہ اتنے دنوں سے چھایا جمود ٹوٹ گیا تھا۔

ایک دم مہمانوں کا تانتا بندھا اور فرید کی بڑی تین بہنیں بھی اپنے اپنے بچوں کے ہمراہ میکے میں چھٹیاں گزارنے پہنچ گئی تھیں۔

مہمانوں کی یلغار کے ساتھ ہی فرید کے ہاتھ سے بجٹ پھسلتا چلا گیا تھا۔

پہلے سائرہ کے بچے کی ولادت کا خرچا' پھر اس بچے کے لیے کی جانے والی شاپنگ اور پھر مہمانوں کی آمد و رفت۔ وہ حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ بھانجے' بھانجیوں کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دے۔

وہ روزانہ ڈھیر سارا پھل گھر آتا تھا۔

یوں دنوں میں ہی اچھا بھلا قرضہ چڑھ گیا۔

اسما کی بلا سے۔ وہ اپنی بہنوں کے لیے چاہے کانیں خرید کر لے آتا۔ یہ فرید کی دردِ سری تھی۔ اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔

بہنوں کا پانچ دن کا پروگرام اگلے دس دن پہ محیط ہو چکا تھا۔ یوں وہی ہوا' جس کا پہلے سے اندازہ تھا۔ فرید کی جیب ایک دم خالی ہو چکی تھی۔ قرضہ الگ چڑھ گیا۔ اور کچن کے کیبنٹ کے ساتھ فریج بھی خالی ہوتا چلا گیا تھا۔ بچے تھے بلا کے ندیدے اور چٹورے۔۔۔ انہوں نے گھر سر پہ اٹھالیا تھا۔

اسما بھانت بھانت کا شور سنتی اور کان دبا لیتی تھی۔

اس لمحے اسے اپنا وقت بھول جاتا تھا۔ جب ماموں کے گھر آنے سے پہلے وہ کس قدر بے تاب ہوا کرتی تھی اور ماموں ان کے آنے سے پہلے پورا کچن نعمتوں سے بھر دیتے تھے۔ مامی بھی دل کھول کر خرچا کرتی تھیں۔ اکثر کبھی کاروبار میں مندی کا سامنا ہوتا تب مامی اپنی خفیہ تجوری کھول کر نند اور اس کے بچوں کا دل سے استقبال کرتی تھیں۔ کبھی جو انہوں نے تیور بگاڑے ہوں۔ جب وہ لوگ تین تین ماہ یہاں گزار کر اپنے گھر جاتے تب بھی مامی بے انتہا تحائف ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔

اسما کو اچانک وہ وقت یاد آیا تو تھوڑی سی پشیمانی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی بھی اپنی نندوں کا اس انداز میں استقبال نہیں کیا تھا۔ وہ ان سے ایک عرصہ تک اکھڑی اکھڑی رہی تھی۔ مامی' ماموں' فرید اور اس کی بہنوں سے۔

یوں لگتا تھا' اسے رشتوں کے نام پر بلیک میل کیا گیا ہے۔ اس کی اماں کو ورغلا کر انہیں مجبور کر کے اسما کی گردن میں ان چاہا طوق ڈال دیا ہے۔ وہ کتنا ہی عرصہ اپنے ماموں کے پورے خاندان سے خود ساختہ ناراض رہی تھی۔

حالات کو دیکھ کر بہنوں نے جلدی کوچ کا پروگرام بنا لیا تھا۔ جاتے سمے مامی کا بہت دل تھا۔ بیٹیوں کے لیے نہ سہی تو اسے نواسیوں کو کچھ دے دلا کر بھیجیں۔

فرید سے کہنا تو بے کار ہی تھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ بغیر کہے ہی لے آتا۔ اسما نے جان کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ حالانکہ یہی نندیں کبھی خالی ہاتھ نہیں آتی تھیں۔ اسما کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتیں۔ جسے وہ اپنا حق جان کر وصول کر لیتی تھی۔

حالانکہ محبتیں صرف وصول ہی نہیں کی جاتیں' جواباً "لوٹانا بھی ضروری ہوتا ہے۔" کہ یہی محبت کا اصول ہے۔ لیکن اتنے پڑھے لکھے لوگوں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اور اسما تو کسی اور ہی کیٹگری سے تھی۔ ہر ایک سے خفا' ناراض' خود ساختہ بدگمانیوں میں جلتا۔ یہ دو بچے جو اس پہ اچانک مسلط ہو گئے تھے۔ یہ بھی تو ان ہی نندوں کی کرامات تھی۔ جو اس وقت ان دونوں کی سب سے بڑی ہمدرد بن کر آن وارد ہوئی تھیں۔

جس صبح انہوں نے جانا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے شام کی بات تھی۔ فرید اپنی دکان پہ تھا۔ یوں موقع غنیمت جان کر ان سب بہنوں نے اسے گھیر لیا۔

اتنے دنوں سے وہ اسما کی لگی بندھی روٹین دیکھ رہی

تھیں اور جو اس کا بچوں کے ساتھ رویہ تھا۔ ان سب چیزوں نے ان کی آنکھوں کے سامنے نئی سوالیہ نشان کھڑے کر دیے تھے۔

"دیکھو اسما! تین ساڑھے تین مہینے ہو چکے ہیں۔ بچوں کا خوف' جھجک اور سہم کم نہیں ہوا۔ وہ اس گھر میں اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں اور اس اپنائیت کی ہم فرید سے تو توقع نہیں رکھتے۔ وہ شاید اتنی جلدی انہیں قبول نہ کرے۔ لیکن تمہیں تو احساس ہونا چاہیے۔ تم اتنا تو کر سکتی ہو فرید کو اس کی غلطی کا احساس دلاؤ۔ وہ ان بے قصور بچوں کو اپنی نفرت کی بھینٹ کیوں چڑھا رہا ہے؟ یہ تو حالات کے ستائے ہوئے بچے ہیں۔ کتنی اذیت سے گزر کر یہاں آئے ہیں۔ کہاں ہے ان کا معصوم بچپن؟ اور خدا کو گواہ بنا کر کہو۔ کیا یہ تمہاری ترسی ہوئی ممتا کو آسرا نہیں دے سکتے۔ انہیں پا کر تمہارے وجود کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

کیا یہ قدرت کی طرف سے تمہارے لیے تحفہ نہیں؟ تمہارے ادھورے وجود کی تکمیل نہیں؟ تمہاری زندگی کے خلا کو بھر نہیں سکتے۔ یہ خود دروازے پہ چل کر آئے؟ کیا تم لوگ انہیں سینے سے نہیں لگا سکتے؟ یہ جو در در بھٹکتے رہے ہیں۔ جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی۔ یتیموں سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تم نے اور فرید نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ہمارے باپ کی نسل کا خاتمہ قریب ہے؟ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو فرید کا نام ہی ختم ہو جاتا۔ اس عظیم "نعمت" کا شکر ادا کرنے کے بجائے منکر ہو بیٹھی ہو۔"

زائرہ اور عائلہ نے جو مدلل بیان جاری کیا تو اسما کا دل اور سر تک جھک گیا۔ اسے اندازہ تو تھا ہی۔ وہ فرید کو تو نہیں البتہ اسے کٹہرے میں ضرور کھڑا کریں گی۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا۔ فرید پہ ان کا زور نہیں چلتا تھا اور اسما کو چاروں طرف سے گھیر کر بے بس کر لیتی تھیں۔

"میں جتنا کر سکتی ہوں۔ اتنا کروں گی۔ جب ان کی نانی انتہائی خستہ حالت میں انہیں چھوڑ گئی تھی یہاں۔ جب ماں نے فیصلہ میرے اختیار میں دے دیا کہ میں چاہوں تو انہیں اس گھر میں اپنی چھت تلے رکھ لوں اور چاہوں تو کسی بھی طرح دھتکار دوں۔ میں نے تب بھی بڑے ظرف کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان بچوں کو در در بھٹکنے سے بچا لیا۔ گو کہ ہمارے اس اقدام پہ ان کو دنیا میں لانے کا موجب بننے والا کئی ہفتوں تک ہر شے سے ناراض' خفا اور بے نیاز ہو گیا تھا۔"

اسما نے دل میں اٹھتے طوفان کو دباتے ہوئے بمشکل بڑے رسان کا مظاہرہ کیا تھا۔ یوں کہ اس کی چاروں نندیں نہال ہو گئی تھیں۔

"میری جان! تمہاری وسیع القلبی نے ہی تو یہ دن دکھایا ہے۔ ورنہ تو ہم فرید کے بچوں کے لیے عمر بھر ترستے۔ کیا ہمارا دل نہیں کرتا تھا ہمارے باپ کے اس آنگن میں بچے کھیلتے۔" زائرہ نے آنکھوں میں آئی نمی کو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اللہ کی طرف سے ہی ایسا ہوا۔ ورنہ کس عورت کا دل نہیں کرتا کہ وہ ماں نہ بنے۔" اسما کی آواز میں کانچ سے چٹخنے لگے تھے۔ عائلہ نے اس کے کندھے پہ اپنا ہاتھ نرمی سے رکھا۔

"تمہارا دل نہ دکھے' اس خیال سے ہم نے آج تک اپنی خواہش دل میں ہی دبائے رکھی تھی۔ اب قدرت نے ہماری خواہش کو پورا کر دیا ہے۔ فرید کے بچے ہیں۔ چاہے اس قابل نفرین عورت سے ہی سہی... لیکن ہم نے تو فرید کے بچوں کو ہی دیکھنا ہے۔ وہ جیسی بیچ ذات تھی۔ اپنا نیچ پن دکھا گئی۔ یہ تو اللہ کا انعام ہے۔ جو ان کی نانی کو رحم اور عقل آ گئی اور ان بچوں کو ہمارے سپرد کر دیا۔"

سائرہ نے بھی نہایت رقیق لہجے میں آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس کے اندر حتی المقدور خوف خدا اور ممتا کے جذبات جگانا چاہتی تھی۔

"اسما! دیکھو' اللہ نے تمہیں اس طرح سے ہے۔ تمہاری گود بھی بھر گئی' گھر بھی بھر گیا۔ تو بھلا وہ جو بھی ہوا۔ تمہارا اس سے واسطہ بھی نہیں پڑا۔" زائرہ نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے تھپتھپایا۔ وہ جیسے لمحہ

بھر کے لیے جھنجلا گئی تھی۔

"لیکن فرید تم اس کو کیسے سمجھاؤں۔ وہ ابھی تک کچھ نہیں بھولا۔ ابھی تک گیارہ سال پہلے کی شام میں اٹکا ہوا ہے۔" اس کے اندر تلخی سی تلخی بھر گئی تھی۔

"تم کس لیے ہو اسما! تم نے اسے اپنی طرف مائل کیوں نہیں کیا؟ تم میں کیا کمی تھی؟ وہ چمارن تو تمہارے حسن کا چوتھائی حصہ بھی نہیں تھی۔" عائلہ کا انداز اسے جھنجوڑنے والا تھا۔ اسما کا اندر تک آگ سے بھر گیا تھا۔

"آپ کو نہیں پتا' یہ میں ہوں جو عائلی زندگی کی گاڑی اپنے حسن عمل سے گھسیٹ رہی ہوں۔ ورنہ فرید کتنی کوشش کرتا ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔ وہ فرید کی زندگی سے نکل کر بھی اس کی زندگی میں موجود ہے۔" اسما کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔

"یہ تم غلط کہہ رہی ہو اسما!" کب سے خاموش بیٹھی زنیرا بھی بول پڑی۔

"فرید تم سے مخلص ہے اور تم سے کتنا لگاؤ رکھتا ہے' یہ کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ تم نے خود کیا عمل روا رکھا؟ یہ تم سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ شادی کے پہلے چار سال تم فرید سے کس انداز میں پیش آتی تھیں۔ کیا ہم نہیں جانتے؟ پھوپھو نے تمہاری شادی زبردستی فرید سے کی۔ تم ایک مدت تک پھوپھو سے بھی ناراض رہی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ ہم سب سے بھی۔ یہ بات کون نہیں جانتا؟ تم نے خود اپنی اور فرید کی شادی کے تیسرے دن ہی اس بات کا اعلان کیا تھا۔

پھر جب چار سال بعد ڈاکٹر نے تمہیں بتایا کہ تم ماں نہیں بن سکتیں۔ تب تمہارا رویہ فرید سے قدرے بہتر ہوا تھا۔ تب تم نے احسان جانا تھا فرید کا۔ جس نے ایک دن بھی تمہیں نہیں جتایا۔ نہ اولاد کی خواہش کا اظہار کر کے عام مردوں کی طرح تنگ کیا۔"

زنیرا سے چپ رہنا محال ہو گیا تھا۔ وہ عائلہ کے اشاروں پہ بھی نہیں رکی تھی۔ بولی تو پھر بولتی ہی چلی گئی تھی۔ اسے آئینہ دکھانا خوب آتا تھا۔ بات اتنی سچ تھی کہ اسما سے جواب ہی نہیں بن پڑا تھا۔ وہ بہت دیر تک چپ رہی۔

"جو چیز میرے اختیار میں نہیں۔ اس پہ کیا زور لگاؤں۔" اس نے ساتوں پرانی بات پھر سے دہرائی۔

"تو پھر ان مظلوم بچوں کو انسانیت کے ناتے ہی سنبھال لو۔ وہ اتنے مفلوک الحال ہیں۔ جیسے کسی فقیر کے گھر میں رہتے ہوں۔ نہ اچھی خوراک ہے' نہ لباس اور نہ ہی تعلیم کی طرف دھیان۔ پچھلے تین مہینوں سے تم لوگوں نے سوچا ہی نہیں۔ وہ کس اسکول میں جائیں گے۔ ان کی کتابیں' ان کے کپڑے' ان کا معیار زندگی۔ وہ تو ایسے بچے ہیں جو اجڈ' دیہاتی اور کسی جاہلانہ ماحول سے اٹھ کر آئے ہیں۔ انہیں تو قدم قدم پہ رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور کچھ نہیں تو ترس کھا کر ہی۔" زائرہ کی آواز بھرا گئی تو وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ بمشکل ان لوگوں کی تسلی دینے کے بعد وہ ان سب کے درمیان سے اٹھ کر باورچی خانے آ گئی تھی۔

"اف' اتنی ہمدرد ہیں تو بھائی کی اولاد کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ انسانیت کے ناتے ہی سہی میں نوکر ہوں ان کی۔ سب کی چاکری کروں اور وہ بدچلن یہ عذاب میرے سر پہ مسلط کر کے خود مر کھپ گئی۔" وہ رات تک کھولتی ہوئی بڑبڑاتی رہی۔

"میں ہی ان کا خیال رکھوں' احساس کروں۔ تعلیم کا سلسلہ شروع کرواؤں۔ اور ان کا باپ؟ وہ کس مرض کی دوا ہے؟ جو ان پہ ایک نگاہ نہیں ڈالتا۔ پھوپھیوں کا پیار امڈا پڑ رہا ہے اور باپ انہیں اپنی اولاد ہی تسلیم نہیں کرتا۔" اس کا مارے جھلاہٹ کے برا حال تھا۔

"اس شام روپ کے بچوں کو؟ وہ جو سارے جگ کی خاک سروں میں ڈال کر چلی گئی۔ بدچلن' بدکردار' ہونہہ۔" اسما نے حقارت سے سر جھٹکا تھا۔

"آجائے فرید تو بات کرتی ہوں۔ مجھ سے کوئی توقع مت رکھیں۔ میں کسی کی اولاد کو پال پوس کے جوان کرنے کا میڈل نہیں لے سکتی۔ نہ مجھے کوئی شوق ہے۔ نہ ارمان ہے' اگر بچوں کی پھوپھیاں اتنی ہمدردی رکھتی ہیں تو دونوں کو ساتھ لے جائیں۔ میری

بار سے ”اگر ایسا نہیں کر سکتیں یہ سب تو۔ تو پھر ایک آپشن تو ہے ہی۔ کسی دارالاطفال میں چھوڑ آئیں یہ“

اس نے انتہائی سفاکی کے ساتھ سوچا اور مطمئن ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح ساری بہنیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ جاتے سے اسما کو ڈھیروں محبت بھری نصیحتیں کرنے کے بعد اپنے تئیں بڑی مطمئن گئی تھیں۔

ان کے جاتے ہی اسما نے آزادی بھرا سانس لیا تھا۔ اب وہ اتنے لوگوں کی سوال کرتی نظروں سے تو بچ گئی تھی۔

مہمانوں کے جاتے ہی زندگی بھی معمول پہ آگئی تھی۔ اسما کے سر سے جیسے بوجھ اتر گیا تھا۔

لیکن اس دفعہ یوں ہوا تھا کہ ماں بیٹیوں اور نواسے نواسیوں کے چلے جانے سے ڈسٹرب نہیں ہوئی تھیں۔ اس مرتبہ وہ تنہائی اور اکیلے پن کی اذیت سے بچ گئیں۔

یہ تو اسما کو ایک ہفتے بعد ہی پتا چل گیا تھا۔ ان دونوں کے گھر سے نکلتے ہی عہد اور فضہ اسٹور روم سے ماں کے پکارنے پہ باہر آجاتے تھے۔ پھر ان دونوں کے آنے سے پہلے تک لاؤنج میں ہی رہتے۔ بعد میں اسٹور روم میں چلے جاتے اور رات کا کھانا بھی وہیں اسما پہنچا دیتی تھی۔

اس کی حتی المقدور کوشش ہوتی تھی دونوں بچے فرید کے سامنے نہ ہی آئیں۔ جانے اس معاملے میں وہ اتنی خود غرض کیسے ہو گئی تھی؟

ایسے ہی کچھ دن دبے پاؤں گزر گئے۔ اسما کی دوبارہ فرید سے بچوں کے موضوع پہ گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ فرید بچوں کے معاملے پہ بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اسما ایک لحاظ سے مطمئن تھی۔

دن پر دن گزر رہے تھے۔ انہی دنوں میں تحصیل بھر کے اسکولوں کی ہنگامی میٹنگ دوبارہ بلائی گئی تھی۔ ایسی میٹنگز تو معمول کا حصہ تھیں۔

وہ دن بڑا ہی مصروف گزرا۔ بھانت بھانت کی ٹیچرز سے مغز ماری کے بعد وہ مغرب سے کچھ پہلے فارغ ہوئی اور اپنا پرس لے کر دفتر سے نکل آئی۔ کوریڈور سے گزری تو کلرک کے کیبن میں دو تین ٹیچرز محو گفتگو تھیں۔ اسما سر جھٹک کے گزر ہی جاتی مگر اچانک ہی اپنا نام سن کر رک گئی تھی۔

وہ تین چار گوسپ کی شوقین خواتین تھیں جو اسما کی تعلیم، وقار، لباس اور بے مثال شخصیت کو ڈسکس کر رہی تھیں۔ اپنی تعریف پہ اسما کی گردن تھوڑی سی تن گئی تھی۔

”میڈم بہت خوب صورت ہیں۔“

”ڈریسنگ بھی کمال کی کرتی ہیں۔“ کسی اور نے بھی رشک بھرے لہجے میں کہا۔ اسما کے ارد گرد ایک احساس تفاخر بکھر گیا تھا۔

”اور خوش قسمت ایسی کے کیا بتاؤں؟ بہت شان دار ہزبینڈ ہے اس کا۔“ پہلی والی نے تھوڑے حاسدانہ لب و لہجے کا مظاہرہ کیا تھا۔

”سسرال بھی کمال کی ہے۔ حسن و خوب صورتی اپنی جگہ۔ مگر ہری بھری بیل بھی پھولوں سے سجی اچھی لگتی ہے۔ ایسی چمکتی کی مورت کا کیا فائدہ! جسے شوپیس کی طرح گھر میں سجایا جائے۔ ارے ’عورت تو بال بچوں کے ساتھ سندر لگتی ہے۔ ہری بھری اور خوب صورت۔ اس چمک دمک کا کیا فائدہ؟“

اس کے اگلے الفاظ نے اسما کو سراپا منجمد کر دیا تھا۔ اسما کا سارا تفاخر جیسے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اتنے سفاک الفاظ تو آج تک اس کی ساس، نندوں نے بھی نہیں کہے تھے۔ انہوں نے تو کبھی ذکر تک نہیں کیا تھا، مبادا اسما کا دل... نہ دکھے اور آج ان اجنبی عورتوں نے کیسے اسما کے وجود کو تار تار کر دیا تھا۔ کیسے اس کی ذات کو بے مول کر دیا تھا۔ کیسے اس کے بخیے ادھیڑ دیے تھے۔

"چاہے جتنی بھی بن سنور لے' رہے گی تو بانجھ عورت نا۔ شاخیں پھولوں سے سجتی ہیں۔ بڑا حوصلہ ہے اس کے شوہر اور سسرالیوں کا۔ کیسی ہمت سے برداشت کیا ہوا ہے۔ آج کل تو لوگ پتا چلتے ہی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔"

یہ اس کی کولیگ تھی شائستہ۔ اور اس وقت تمام تر شائستگی کو بھلا کر اسما کے وجود کی دھجیاں بکھیر رہی تھیں۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ جسم بری طرح سے کپکپانے لگا۔ وہ سیڑھیوں کی ریلنگ نہ تھامتی تو یقیناً چکرا کر گر پڑتی۔

اور آج اسما کو پتا چل رہا تھا کہ بلندی سے گرنا کیا ہوتا ہے۔ پستی کی طرف آنا کیا ہوتا ہے؟ ذلت سہنا کیا ہوتا ہے؟ اپنے ہی وجود کے پرخچے اڑتے دیکھنا کیا ہوتا ہے؟

وہ عورتیں اب اس پہ ترس کھا رہی تھیں۔

"آہ۔ بیچاری اسما۔"

"چچ چچ۔ بے چاری' اے 'ای' او۔ اتنی اچھی پوسٹ پہ۔ کبھی سینکڑوں لوگوں پہ حکم چلاتی اسما کتنی ادھوری اور کھوکھلی ہے۔" پورے دفتر کی ایک ایک اینٹ جیسے اس پہ ترس کھا رہی تھی۔ ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اور اس کا خوبرو شوہر' اسے کیا کمی ہے عورتوں کی۔ بے چارا کب تک بے اولاد رہے گا۔ تم نے ڈپٹی صاحب کا قصہ نہیں سنا۔ دس سالہ ازدواجی زندگی اور محبوب بیوی کو طلاق دے کر دوسری لے آئے۔ آخر کب تک کھوکھلی عورت کے ساتھ نباہ کرتے۔ بال بچوں کی کسے خواہش نہیں ہوتی؟"

"لکھوا لو مجھ سے' اور ایک آدھ سال میں ہم بھی سنیں گے۔ اے 'ای' او صاحب کے شوہر نے دوسری شادی رچا کر انہیں فارغ کر دیا۔ آخر وہ بھی انسان ہے فرشتہ تو نہیں۔" اسی کرخت آواز والی سپروائزر نے اپنے تجربے کی روشنی میں بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔ باقی دونوں بھی اس سے متفق نظر آئی تھیں۔

ہر طرف سے ایک ہی صدا آ رہی تھی۔

"بانجھ عورت۔"

"بانجھ عورت۔"

اسما تیز قدموں سے چلتی ہوئی گلی عبور کرتی سڑک پہ آ گئی۔ لیکن یہ کانوں کے پردے چیرتی آواز ابھی تک اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

اسما نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ وہ گم صم سی چلتی جا رہی تھی۔ اپنے دھیان گیان میں' کسی بھی طرف دیکھے بنا۔ کسی طرف توجہ کیے بغیر۔

اور اسے خبر ہی نہیں تھی۔ وہ فرید کی دکان سے کتنا آگے نکل چکی تھی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا۔ کوئی اسے آوازیں دیتا' پکارتا پیچھے آ رہا ہے۔

شاید فرید' ہاں وہ فرید ہی تھا۔ جس نے اسما کو آگے جا کر بمشکل بازو سے پکڑ کے زبردستی روکا تھا۔ اور اسما ایسی حواس باختہ سی رکی جیسے کسی نے اسے پتھر اوپر ہو۔

فرید اس کا چہرہ اور انداز ..... دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اور جو اسے اس طرح سڑک پہ بھاگتے دیکھ کر فرید کو غصہ آ رہا تھا۔ اب اس غصے کی جگہ تفکر نے لے لی تھی۔

"اسما کیا ہوا ہے! اس طرح کیوں بھاگ رہی تھیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟" فرید نے اسے شدت سے روتے دیکھ کر جھنجوڑ دیا۔ لیکن اسما سن کہاں رہی تھی' وہ دیکھ کہاں رہی تھی۔ وہ بری طرح پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی۔ اور فرید مزید پریشان ہو رہا تھا۔

"اسما! ہوا کیا ہے؟ بتاتی کیوں نہیں ہو کچھ؟ کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟" فرید نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔ اسما نے غائب دماغی سے روتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"شاید ہاں۔" وہ ابھی تک کانپ رہی تھی۔ فرید نے اسے بمشکل بائیک پہ بٹھایا تھا۔ پھر وہ گھر جانے کے بجائے اسے ڈاکٹر کے کلینک لے آیا تھا۔ وہ بے انتہا ذہنی اور اعصابی دباؤ کا شکار تھی۔

گھنٹے بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی تو اسما کی طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔ لیکن وہ بے انتہا خاموش تھی۔ گھر آ کر بھی اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ سائی کو

ہول اٹھ رہے تھے۔ باربار فرید سے پوچھتی تھیں۔
"اسما کو کیا ہوا؟ کیا حالت بنالی؟ صبح تو اچھی بھلی گئی تھی۔"
فرید نے جانے ان کی کیسے تسلی کرائی تھی۔ لیکن وہ مطمئن نہیں لگ رہی تھیں۔
"ارے کیسی گلابوں سی تھی۔ گیندے کا پھول بن کر آگئی۔ کیا ہو گیا اسے؟ تم نے تو کچھ نہیں کہہ دیا فرید۔" وہ متفکر سی باربار فرید سے پوچھتیں۔
"میں نے کیا کہنا تھا امی! جانے کس بات کی ٹینشن سوار کی ہے اس نے سر پر... صبح تو ٹھیک ہی تھی۔" فرید خود بھی متفکر سا تھا۔ اسے بھی اسما کے ڈپریشن کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔
"آں... ہاں، نہیں ایسا تو نہیں، ان بچوں کی وجہ سے اس نے ٹینشن لے لی ہو؟" ماں کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ فرید تک بھی آواز پہنچ گئی۔ وہ بچوں کے نام پہ چونک گیا تھا۔
"بچوں کی کیسی ٹینشن؟ کیا ان لوگوں نے کچھ کہا ہے۔" اس کے ماتھے پہ بل پڑگئے تھے۔ لوگوں سے مراد شاید یہ بچے ہی تھے۔
"نہیں، انہیں ان بچوں نے کیا کہنا ہے۔ وہ معصوم تو بولتے ہی نہیں۔" انہوں نے بمشکل بات بنائی تھی۔
"تو پھر؟" وہ تیکھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"پھر تم خود پوچھو نا آخر شوہر ہو۔ وہ تمہیں تو بتادے گی۔" انہوں نے اپنی گلوخلاصی کروائی تھی۔ فرید کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
اس لمحے فرید نے کونے میں چپ چاپ کھڑے ان بچوں پہ اک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی۔ اگر لحظہ بھر کے لیے رک کر دیکھ لیتا ان آنکھوں کی حسرتوں کو تو عمر بھر کے لیے آگے نہ بڑھ سکتا۔

⁂ ⁂ ⁂

آج موسم بہت اچھا تھا۔
بڑے دنوں بعد دھوپ نکلی تھی۔ سنہری دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ ماں ناشتے کے بعد صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھی تھیں۔
وہ دونوں بھی دبے قدموں سے اسٹور روم کے حصار سے نکل کر ماں کے پاس پچھلے صحن میں چلے گئے تھے۔ ماں نے چہرے سے دوپٹہ ہٹا کر دیکھا اور پاس پڑی لڈو عنید کی طرف بڑھادی تھی۔
عنید اور فضہ نے کچھ جھجکتے ہوئے لڈو پکڑلی تھی۔ اب وہ دونوں کھیل میں مصروف ہو چکے تھے۔ ماں انہیں محبت سے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں دونوں کے لیے نرمی اور محبت بھری ہوئی تھی۔
اسما نے تھکی تھکی نگاہوں سے باہر کے منظر کو دیکھا تھا اور کھڑکی کے دونوں پٹ بند کردیے۔ اسی لمحے فرید بھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دوائیوں والا لفافہ تھا۔ وہ نسخہ صبح ساتھ ہی لے گیا تھا۔ اب دکان سے اٹھ کر محض دوائیاں دینے گھر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو لفافے اور بھی تھے۔ جنہیں اس نے میز پہ رکھ دیا تھا۔
"یہ فروٹس ہیں۔ انہیں دھو کر فریج میں رکھنے کے لیے نہیں لایا۔ کبھی کھانے کی زحمت بھی گوارا کر لیا کرو۔" اس کے لہجے میں بہت نرمی تھی۔ اسما نے زخمی سی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی۔
"اس سے کیا فرق پڑے گا؟ میرے اندر کی کمی دور ہو جائے گی؟" اس کے لہجے میں کچھ تو تھا جس نے فرید کو ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ جاتے جاتے پلٹ آیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ پھر جیسے اس نے اسما کی بات سمجھ لی تھی۔ وہ گہرا سانس کھینچتا اس کے قریب آگیا۔
وہ بکھری بکھری سی پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ بال کمر پہ منتشر تھے۔ اس کا لباس بھی سلوٹ زدہ تھا۔ وہ ایسی بالکل نہیں تھی۔ وہ تو بڑی تیار رہا کرتی تھی۔ کچھ بھی ہو جاتا۔ کپڑوں کے معاملے میں کبھی کمپرومائز نہیں کرتی تھی۔ بن سنور کے رہتی۔
پھر اب کیا ہوا تھا۔
فرید اس کے قریب بیٹھ گیا۔
"اسما! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں اتنی ڈسٹرب ہو؟" اس نے ملائمت سے پوچھا تھا۔ اسما کی آنکھیں ڈبڈبا

گئی تھیں۔

"فرید! ایسا کیوں ہوا؟ میرے اندر ہی خالی پن کیوں آیا؟ میری زندگی میں اتنی بڑی کمی کیوں لکھ دی گئی؟" وہ اپنے ڈپریشن کی حقیقت بتا رہی تھی۔ اس پہ اکثر ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے۔ فرید نے ہمیشہ کی طرح اسے تسلی دینی چاہی۔

"جس چیز پہ ہمارا اختیار ہی نہیں۔ اس پہ خود ترسی کا شکار ہو کر دُور رنج کیوں ہونا؟ جب خدا کی یہی رضا ہے تو تم کیوں نہیں حقیقت کو تسلیم کرتیں؟ مجھے اپنی زندگی میں کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔" وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔

"تمہیں تو میری کمی بھی کبھی محسوس نہ ہوئی۔ تم کسی کی کمی محسوس نہیں کرتے۔ تم مان جاؤ فرید! تم "بے حس" ہو چکے ہو' اب سے نہیں' گیارہ سالوں سے۔ جب سے وہ عورت تمہاری زندگی سے گئی ہے۔" اسما کے اندر پکنے والا لاوا اچانک پھٹ پڑا تھا۔

فرید لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اسما اسے گیارہ سال پہلے کا کوئی طعنہ دے گی۔

"اس کا یہاں کیا ذکر؟" اس نے بمشکل اپنے غصے کو باہر نکلنے سے روکا تھا۔

"اب بھی اس کا ذکر نہیں ہو گا۔ وہ اپنی اولادیں تو اپنی صورت میں تمہارے منہ پہ مار گئی ہے۔ کیا ابھی تک وہ اپنے نام سمیت ڈسکس نہیں ہوئی؟" وہ جیسے پھاڑ کھانے کو دوڑی تھی۔ فرید کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ سی پھیلنے لگی تھی۔

"اگر ایسی بات ہے تو ان اولادوں کو کسی یتیم خانے بھجوا دیتا ہوں۔ اگر ان کے آنے سے تم ڈپریسڈ ہوتی ہو یا وہ عورت موضوع گفتگو بن کر میری زندگی میں ایک مرتبہ پھر آگ لگانا چاہتی ہے تو پھر یوں ہی سہی۔ یہ تمہیں کل کے بعد نظر نہیں آئیں گے۔ میں ابھی مال لینے جا رہا ہوں۔ کل شام تک لوٹوں گا۔ تب تک انہیں برداشت کر لو۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا' پھر ان کے چلے جانے کے بعد وہ عورت' اس کا نام بھی تمہارے لبوں پہ نہیں آئے گا۔ کیونکہ میں نے اس عورت سے محبت تو بہت دور نفرت کا تعلق بھی نہیں رکھا۔ سنا تم نے۔ میری اور تمہاری زندگی میں کسی تیسرے کی کوئی گنجائش نہیں' نہ آج' نہ کل' نہ کبھی۔ اور تم آئندہ کبھی اس بات پر صف ماتم بچھا کر نہیں بیٹھو گی۔ مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ میری زندگی کسی بھی بچے کے بغیر بڑی مطمئن ہے۔" فرید بولا تو پھر بولتا چلا گیا تھا۔ اسما ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

شام کو پورے گھر میں عجیب سی ویرانی اتر آئی تھی۔

فرید "مال" لینے چلا گیا تھا۔ ماسی سہ پہر سے گم صم تھیں۔ بچے اپنی کچھار میں دبکے بیٹھے تھے۔ اسما کو تو بعد میں ماسی کی بیزاری اور غصے کا پتا چلا تھا۔ وہ اتنی آکھڑی آکھڑی کیوں تھیں۔

فرید جانے سے پہلے انہیں بتا گیا تھا۔ وہ عنید اور فضہ کو کسی دارالاطفال بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ماسی نے سنا تو دل تھام لیا۔ فرید کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں تھی۔ بعد میں کتنی ہی دیر وہ اپنا غصہ نکالتی رہیں۔

"ایسا سنگ دل اور ظالم باپ نہیں دیکھا۔ کیسے پھول سے بچوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال رہا ہے۔ ظالم ان معصوموں کا بھلا کیا قصور؟ اتنی سی جگہ نہیں تمہارے دل میں فرید! اور اسما بال یہ اسما کی پڑھائی پٹی ہو گی۔ ان بن ماں کے بچوں ساتھ بیر لگا رکھا ہے۔ اتنی نفرت! اتنی تنگ دلی۔ تب ہی اللہ نے اس کی گود بھی تنگ کر دی۔" وہ شام تک ہاتھ ملتی رہی تھیں اور بڑبڑاتی تھیں۔

اسما کے اپنے دل کو کسی بھی طرح سے چین نہیں تھا۔

کیا وہ واقعی ان بچوں کے اس گھر میں ہونے کی وجہ سے پریشان تھی؟

کیا وہ واقعی اپنے بانجھ پن کی وجہ سے غمگین تھی؟ آخر کیوں؟ کیا اس بات پہ کہ وہ فرید کی سیکنڈ

چوائس بھی نہیں تھی۔ اس کی دوسری بیوی کیوں تھی، پہلی کیوں نہیں تھی؟ کیا صرف اسی بات پہ کہ فرید نے شام روپ کے بعد اپنے دل کے سارے دروازے بند کرلیے تھے؟ اسما کے لیے بھی نہیں کھول سکا۔

وہ شام روپ کے بعد اسما کے لیے بھی اپنے دل کا قلعہ نہ کھول سکا۔ وہ اس کے دل کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہ گئی تھی۔ کیا اس بات پہ شہر دل کی گلیوں میں ویرانی سی ویرانی تھی؟

شاید ہاں۔

اور وہ اپنے دل کے جواب پہ تھک کر نڈھال ہو چکی تھی۔

جیسے سارے جواب مل چکے تھے۔ جیسے سارے جواز مل چکے تھے۔

ساری حقیقت کھل چکی تھی۔ ساری حقیقت عیاں ہو چکی تھی۔ اب کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا بالکل بھی مسز انجم کے بھائی کا ولیمہ اٹینڈ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

لیکن اچانک کنول کی کال آگئی۔ وہ بھی اس شادی میں مدعو تھی۔ اور چاہتی تھی کہ اسما بھی شادی میں شرکت کرے۔ یوں بادل نخواستہ اسما کو بھی شادی میں جانے کے لیے تیار ہونا پڑا۔

ماسی کو بتا کر اس نے پہلے شاور لیا پھر پیچ کلر کا انتہائی نفیس سوٹ زیب تن کرلیا۔ بالوں میں برش کرنے کے بعد اس نے کلپ لگایا تو اچانک لائٹ چلی گئی۔ ابھی ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرنا تھا۔ وہ جھلاتے ہوئے میک اپ کا سامان اٹھا کر باہر تخت پہ آبیٹھی تھی۔ پھر سوچا آئینہ تو لائی نہیں۔ جب وہ تمام چیزیں اٹھا کر باہر آئی تو تب تک ماسی بھی برآمدے میں آچکی تھیں اور ان کے ساتھ عنیدا اور فضہ بھی تھے۔

وہ دونوں ماسی کے پیچھے تقریباً" چھپے ہوئے تھے۔ اسما نے جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کیا اور اپنا کام کرنے لگی۔ وہ اپنی نوک پلک سنوار رہی تھی جب اسے یوں محسوس ہوا کوئی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بے ارادہ ہی گردن موڑی تو ماسی کے پیچھے سے جھانکتی دو شائق سی آنکھوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

فضہ کی آنکھوں میں شوق اور اشتیاق کا ایک جہاں آباد تھا۔ اور گہری جھیل سی آنکھوں میں ستاروں سی چمک تھی۔

اسما کے دل کو اس محویت پہ کچھ ہونے لگا۔

"کیا بات ہے؟" اسما کا لہجہ تھوڑا ساسخت اور اجنبی سا تھا۔ فضہ اور گھبرا گئی تھی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔" اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

"تو پھر؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ اتنی پتھر پھاڑ لگا ہوں سے؟" اس نے سابقہ بیزار طبیعت کے باعث نخوت سے پوچھا تھا۔ فضہ کے چہرے پہ خوف کی زردی چھا گئی تھی۔

"نن۔۔۔ نہیں، نہیں۔" فضہ نے گھٹی گھٹی آواز میں بمشکل کہا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔" اس نے رخ موڑ کر لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی۔

پھر اس نے آنکھوں میں کاجل لگایا تو سنگھار مکمل ہو گیا۔ مخروطی نازک انگلیوں میں انگوٹھیاں پہلے سے سجی تھیں اور گوری کلائی میں بریسلیٹ دمک رہا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت ہی جگمگاتا سا لگا۔

آئینے میں ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر اس نے دوپٹہ سیٹ کیا اور ماسی کے آنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ جبھی معاً" ہلکی ہلکی سسکیوں نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ جو اپنے دھیان میں مگن تھی۔ اچانک چونک اٹھی۔ ایک دم اپنے پیچھے دیکھا تو فضہ کو کھڑے پایا۔

"کیا مصیبت ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ میں نے پتھر تو نہیں مار دیا؟ حد ہے کس مصیبت میں پھنس گئی۔" وہ جھلا کر چیخی۔ فضہ کی زرد رنگت کچھ اور زرد پڑ گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا کر گھڑی دیکھی۔ کنول آنے ہی والی تھی اور وہ اس مصیبت سے پیچھا چھڑانا

چاہتی تھی۔
اس نے بیزاری نگاہ فضہ کے کملائے چہرے پہ ڈالی تھی اور پیروں میں سینڈل پہن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جیسے ہی اس نے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ اچانک اس کا دوپٹہ کہیں اٹک گیا۔ وہ مڑی تو کیا دیکھا۔ اس کے دوپٹے کا کونا فضہ کے ہاتھ میں تھا۔ اسما کو بے طرح ہی غصہ آگیا۔ اس کا مہین سا قیمتی دوپٹہ اس کھنچاؤ سے اگر پھٹ جاتا؟

اسما نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ فضہ کے منہ پہ تھپڑ دے مارا تھا۔

"نجانے کہاں سے جانور اٹھ کے آگئے ہیں میرے سر پہ سوار ہونے کے لیے۔" اس نے انتہائی کرختگی سے بھنچی آواز میں فضہ کو جھڑکا۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تھا۔

اسما نے بے زاری سے اپنا پلو اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور اچانک باہر سے آتی گاڑی کی آواز پہ چونکنا ہو گئی۔ یقیناً کنول اسے لینے کے لیے آچکی تھی۔

اس نے خوں خوار نظروں سے فضہ کو دیکھا اور چیخی۔

"اب اندر دفع ہو جاؤ۔ میری مہمان پہنچ گئی ہے۔"

وہ نہیں چاہتی تھی کہ کنول فضہ یا عنید کو دیکھ کر کوئی سوال اٹھائے۔

فضہ گال پہ ہاتھ رکھے ابھی تک جیسے "شاک" میں مبتلا تھی۔

اسما نے اس پہ لعنت بھیج کر قدم باہر کی طرف بڑھائے پھر جیسے ہی وہ باہر کی طرف لپکنے لگی' ایک مرتبہ پھر فضہ کے ننھے سے ہاتھ نے اسما کا دوپٹہ تھام لیا۔ اب کی دفعہ اس کا ہاتھ نہیں اٹھ سکتا تھا کیونکہ فضہ کے اگلے الفاظ نے اسما کو بت بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔

"امی! آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے آپ کو دیکھتی رہوں۔۔۔ آپ بہت اچھی ہیں امی!"

کمزور سی بھیگی آواز نے اسما کو ساکت کر دیا۔ اسما کا اپنی جگہ سے ہلنا محال ہو چکا تھا۔ اور لفظ "امی" تو اس پہ قیامت بن کے ٹوٹا تھا۔

"امی؟" وہ جیسے کسی کھائی میں اوندھی گری بڑبڑائی تھی۔

"یہ تم نے کیا کہا؟ کس نے تمہیں یہ سکھایا؟" اس کے لہجے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"دا۔۔۔ دادی امی نے۔۔۔" فضہ نے کپکپاتے لہجے میں بتایا۔ وہ خوفزدہ تھی اور اسما سر سے پیر تک جھنجھنا گئی۔ تو رشتوں میں اتنی ترقی ہو چکی تھی۔

پھوپھو' دادی امی؟ امی اور اس سے آگے' اسما کو لگا وہ کھڑے کھڑے پورے قد سے ڈھے جائے گی۔ وہ بچے آہستہ آہستہ اپنی حیثیت منوانے کے قریب تھے۔ رشتوں کو لڑی میں پروتے جا رہے تھے۔

ماسی سے اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ ماسی سے سخت کبیدہ خاطر ہوئی۔ تب ہی کنول اندر آگئی تھی۔

وہ کنول پہ کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ نہ فرید کے ماضی کی اس بڑی نادانی کو ان بچوں کی شکل میں دکھانا چاہتی تھی۔ اسے اپنا "وقار" اور "بھرم" بڑا عزیز تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کنول کا خیر مقدم کیا۔ کنول اپنی باغ و بہار شخصیت کی بدولت لمحوں میں ماسی سے بے تکلف ہو گئی۔ اسما نے زبردستی چائے بنوا کر لی۔ حالانکہ اسما برابر اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ کیونکہ انہیں ولیمہ میں بھی پہنچنا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ فضہ' عنید کنول کی نگاہوں میں نہ ہی آئیں۔

اور ابھی وہ ان کے لیے مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھی' جب ماسی نے بڑے فخر کے ساتھ دونوں بچوں کا تعارف کروایا۔ کنول نے ایسے تعارف سمجھ کر سر ہلایا جیسے ان دونوں کو برسوں سے جانتی ہو۔ اس نے کمال محبت سے دونوں کو پیار کیا پھر اسما کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بچے نہیں جائیں گے ساتھ؟"

"ان کا بھلا کیا کام ہے وہاں؟" وہ جزبز سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"حد ہے یار' بچے تو انجوائے کرتے ہیں۔" کنول

نے خفگی سے کہا۔ پھر وہ مای سے بولی۔

"یہ تو ایسی ہی ہے۔ شروع سے بچوں کی کمپنی سے الرجک۔ میں نے سوچا بدل چکی ہو گی۔ جب اپنے بچے ہوں گے۔ لیکن یہ تو اپنے بچوں کے ساتھ بھی ویسی کی ویسی ہے۔ دیکھیں خود تو لشکارے مار رہی ہے اور بچوں کی حالت؟ یہ تمہارے بچے ہیں اسما! یقین نہیں آتا۔ اتنی ویل ڈریس لے ای اوکے اپنے بچے۔ اتنے بدحال؟" بچوں کا حلیہ دیکھ کر جو کنول نے بے لاگ تبصرہ کیا۔ شروع سے ہی کنول اتنی منہ پھٹ تھی۔ وہ اسما کی کلاس لے رہی تھی۔ ان بچوں کو اس کے حقیقی بچے سمجھ کر۔

"چلو' پھر تیار ہو جاؤ۔ آج تمہاری خالہ تمہیں انجوائے کروائی ہے۔" وہ کنول ہی کیا جو کسی کی سن لیتی۔ شتم پشتم اس نے بچوں کو تیار کروایا۔ مای بھی پرجوش تھیں۔ جانے کہاں سے نئے نکور کپڑے نکال لائیں۔ یقیناً" بچوں کی پھپھیاں لائی تھیں جنہیں اس سے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ جو بھی تھا فی الوقت اس کی عزت رہ گئی تھی۔ ورنہ کنول بھلا کیا سوچتی؟ بچوں کے پاس پہننے کے لیے ایک بھی ڈھنگ کا کپڑا نہیں تھا۔

یوں کنول کی زبردستی اور اصرار کی وجہ سے عنبد اور فضہ بھی مسزانجم کے بھائی کا ولیمہ اٹینڈ کرنے جارہے تھے۔

کنول ہی سارے راستے بچوں کے ساتھ چہکتی رہی۔ باتیں کرتی رہی۔ ہنستی رہی اور ساتھ ساتھ بے لاگ تبصرہ بھی جاری تھا۔

"تمہارے بچے بہت کم گو ہیں اسما! بس یہ چلے گئے' بولتے ہی نہیں۔ دس باتیں پوچھو تو آدھی کا جواب دیتے ہیں۔" اللہ اللہ کر کے ہوٹل پہنچے تو کنول کا بھی بچوں سے دھیان ہٹ گیا۔ اسما نے اطمینان کا سانس لیا۔

لیکن یہ اطمینان تب رخصت ہوا جب کھانا شروع ہوا۔

کھانا لگتے ہی بچے بوفے ٹیبل کی طرف یوں بھاگے کہ اسما مارے خفت کے سرہی نہ اٹھا سکی۔ اور نہ ہی اپنی کولیگز اور ماتحت خواتین سے نظر ملا سکی۔ جو منہ پہ انگلیاں رکھے ہکا بکا سی تبصرے کرنے میں مشغول ہو چکی تھیں۔ کہیں تو دبی دبی ہنسی شروع تھی اور کہیں بے لاگ تبصرے۔

گھر میں دبک کر بیٹھے رہنے والے بچے شادی کا کھانا دیکھ کر ایسی پھرتی دکھائیں گے یہ اسما نے سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ تو کنول تھی جو انہیں کھانا کھلانے کا کام بڑے حوصلے کے ساتھ کرواتی رہی۔ ورنہ اسما کا تو بس نہیں چل رہا تھا۔ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ جاتی۔ اتنی شرمندگی اور خفت اس نے عمر بھر نہیں اٹھائی تھی۔

اسما اٹھی تو کنول بھی دونوں بچوں کو اٹھا کر باہر لے آئی۔ اسما کا موڈ سخت آف تھا اور کنول شدید حیران۔ اپنی حیرانی کو اس نے چھپانے کی قطعا" کوشش نہیں کی تھی۔

"اسما! لگتا ہے تم بس جاب کی ہو چکی بچوں پہ کوئی توجہ نہیں' یار! ایسی نوکری کا کیا فائدہ! تمہارے بچے تمہاری پہلی ترجیح ہونے چاہئیں۔" وہ بولتی رہی اور اسما سنتی رہی۔ وہ اس کی غلط فہمی دور نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن ایک کہانی تو بن سکتی تھی۔ ایسی کہانی جس میں جھول ہوتا بھی تو تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ بچے پیدائش کے فورا" بعد فرید کی پھوپھو نے گود لے لیے تھے۔ کچھ پرابلمز ایسی تھیں۔ میں بیمار تھی اور ماموں انتقال کر گئے یوں بچوں کی ذمہ داری فرید کی پھوپھو نے اٹھائی۔ جو میری بڑی خالہ تھیں۔ بس ان کے دیہی ماحول میں بچوں کی ٹھیک سے تربیت نہیں ہو سکی تھی۔"

اسما نے کہانی گھڑ کر سنادی تھی۔ اور کنول نے ایسے یقین کر لیا جیسے اس سے بڑا کوئی سچ نہ ہو۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کہا۔

"تمہارے بچے ہیں اسما! اب تو تمہارے پاس ہیں۔ تمہارا فرض ہے ان کو تمیز' تہذیب' سلیقہ سکھاؤ۔"

اس نے بڑی نرمی اور ہمدردی سے سمجھایا تو اسما نے کوئی بحث نہیں کی۔ بلکہ اثبات میں سرہلا دیا تھا۔ لیکن

اس کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔
کنول انہیں ڈراپ کرنے کے بعد اسے بچوں سمیت اپنے گھر آنے کی پرزور دعوت دے کر رخصت ہوئی تو اسما کو بھی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

اس نے پرس پٹخا' جوتے اتارے اور جیولری نوچتے ہوئے ماں کے سر پہ کھڑے ہو کر چلانے لگی۔
"ان ندیدوں کو ساتھ بھجوا کر ٹھنڈ پڑ گئی آپ کو؟ میری اتنی انسلٹ کروائی آپ نے۔ ان جانوروں کو ذرا سی تمیز نہیں۔" وہ پوری روداد سناتی ہوئی چلا رہی تھی۔ ماں پہلے تو ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر بات سمجھ میں آئی تو گہرا سانس بھر کے رہ گئیں۔ سہمے سہمے بچے تخت کے قریب دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ وہ حق دق خوب صورت سی امی کو چنگھاڑتے دیکھ رہے تھے۔
"کیا پہلی مرتبہ اچھا کھانا نصیب ہوا تھا؟ مجھے اتنا ذلیل کروایا۔" وہ چلاتی رہی۔
اور ماں چپ چاپ سنتی رہیں۔۔۔ جب اس کا غصہ اتر گیا اور دل کی ساری بھڑاس نکل گئی تب ماں نے بڑے رسان کے ساتھ لب کشائی کی تھی۔
"تو بیٹا! ان جانوروں کو انسان کس نے بنانا ہے؟ وہ کس ماحول سے اٹھ کر آئے ہیں؟ کیسے حالات کا شکار تھے کیا تم نہیں جانتیں؟ دو وقت کی روٹی کے ٹکڑوں کو ترستے یہ دونوں بچے کہاں سے تربیت یافتہ ہو سکتے تھے؟"

ماں کے جواب نے لمحہ بھر کے لیے اسما کو چپ کروا دیا تھا۔ اندر ہی اندر اسے پشیمانی بھی ہوئی تھی۔ لیکن فطری رقابت کے زیر اثر اس کے دل میں ان کے لیے ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی۔
"سب میرے فرائض ہیں؟ فرید کی کوئی ذمہ داری نہیں۔" وہ جیسے تڑخ کر بولی تھی۔
"فرید تو ان کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔ ذمہ داری اٹھانا تو دور کی بات ہے۔ اگر تم فرید کو سمجھاؤ' اسے احساس دلاؤ تو وہ تمہاری بات ضرور سنے گا۔ کیونکہ وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالتا۔" ماں نے لجاجت سے کہا۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر باقی تھی۔ لیکن اسما ان کی جذباتیت سے قطعاً" متاثر نہیں ہوئی تھی۔
"مجھ سے کوئی امید مت رکھیں ماں! میں انہیں اس گھر میں برداشت کر رہی ہوں۔ اسی کو غنیمت جانیں۔" اس نے انتہائی کرختی سے جتلایا اور تن فن کرتی اندر چلی گئی تھی۔ جبکہ ماں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔ پھر انہیں اچانک ہی عنید اور فضہ کا خیال آیا۔ وہ دونوں ابھی تک دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ انہوں نے بے ساختہ بانہیں پھیلا کر دونوں کو اپنے قریب آنے کا اشارہ دیا تھا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے ان کی کھلی بانہوں میں سما گئے۔ ماں نے دونوں کی باری باری پیشانی چومی تو فضہ نے سسکتے ہوئے کہا۔
"امی کو کس بات پر غصہ آیا ہے دادی امی!" اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ماں کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔
"بس ایسے ہی بیٹا۔۔۔ تم دل پہ نہ لو۔" انہوں نے فضہ کو ٹالنا چاہا۔ لیکن وہ خاصی سمجھ دار اور حساس بچی تھی۔
"امی کو اس لیے غصہ آیا۔۔۔ ہم دونوں نے شادی میں بدتمیزی کی۔" فضہ کی آواز میں ندامت تھی۔ تب پہلی مرتبہ عنید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔
"پر دادی امی! انہیں پتا نہیں تھا۔ نانی تو کہتی تھیں۔ جب بھی شادی میں جاؤ۔ کسی کی پروا کیے بغیر اپنی پلیٹ بھر لو۔ ورنہ کھانا ختم ہو جائے تو ملتا نہیں۔" عنید کا سر جھکا ہوا تھا۔ ماں نے دونوں کو بانہوں میں بھینچ لیا۔
"دادی صدقے جائے۔۔۔ اب ایسا نہیں کرنا میری جان! چاہے کھانا ختم بھی ہو جائے۔ اپنا گھر جو ہے۔ گھر سے آکر کھا لینا تھا۔ ہمیشہ ایسی تقریبات میں تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہیں تاکہ لوگ تعریف کریں' کیسے سمجھ دار اور اچھے بچے ہیں۔" ماں کے سمجھانے پر دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اب امی کا غصہ کیسے اترے گا دادی امی!" دونوں کا تفکر کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے ان دونوں کو پچکارا۔

"اتر جائے گا صبح تک۔ تم پریشان نہ ہو۔ اور دیکھو' جب تمہارا باپ گھر آئے تو اندر مت گھس جایا کرو۔ باپ کو سلام کیا کرو۔ اس کے سامنے آیا کرو۔ سن رہے ہو نا میری بات۔" ماں نے دونوں سے باری باری پوچھا تو دونوں نے ذرا سہم کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ دیر بعد عنید، ماں کی اتری صورت دیکھتے ہوئے بولا۔

"پردادی امی! ہمیں ابو سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے اپنے گھبرانے کی اصل وجہ بتادی تھی۔ ماں گہرا سانس بھر کے رہ گئی تھیں۔

"باپ ہے تمہارا۔ ڈر کاہے کا میرے بچو۔"

فضہ اور عنید ٹکر ٹکر ماں کی صورت دیکھنے لگے۔

پھر فضہ نے خاصے مدبرانہ انداز میں پوچھا تھا۔

"دادی امی! ابو ہم سے ناراض کیوں ہیں؟"

اتنی سی بچی کے منہ سے اتنا بڑا سوال سن کر ماں لمحہ بھر کے لیے تو چپ ہی رہ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے بڑی مشکل سے سنبھل کر کہا۔

"نہیں میرے بچو! وہ تم دونوں سے ذرا بھی ناراض نہیں۔" ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں کو کس طرح سے بہلائیں۔ انہیں فرید پہ بڑا ہی غصہ آیا تھا۔

"تو پھر وہ ہم سے پیار کیوں نہیں کرتے؟" فضہ نے آزردگی سے ہونٹ کاٹے تو ماں کے دل پہ آرے چل گئے تھے۔

"کرتا ہے پیار کیوں نہیں کرتا میری جان۔۔۔ بس اس کی طبیعت ہی ایسی ہے۔" انہوں نے بات بنائی تھی لیکن عنید کے اگلے سوال نے انہیں لمحہ بھر کے لیے منجمد کردیا تھا۔

"اور امی کی طبیعت بھی ایسی ہے؟ وہ بھی ہم سے پیار نہیں کرتیں۔" دونوں کے چہروں پہ کیسی حسرت تھی۔ ماں کا دل چاہا تھا فرید کو گریبان سے پکڑ کر کٹہرے میں لا کھڑا کریں۔ آخر ان دونوں کو کس بات کی سزا دے رہا تھا اور اسما ان کا دل بہت ہی کڑھتا ہوا۔

"ایسا کچھ نہیں' تم دونوں محسوس نہ کیا کرو۔ وہ بہت پیار کرنے والی ہے۔ آج کل ذرا مزاج برہم ہے۔"

ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کے تسلی دی' دونوں ہی اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگئے تھے۔ یہ تو دادی تھیں جن سے اتنی طویل گفتگو آسانی کرلیا کرتے تھے۔ ورنہ اسما اور فرید کو دیکھ کر تو ان دونوں کی سٹی گم ہوجاتی تھی۔

اور اس وقت وہ فرید سے دوٹوک بات کرنے کا ارادہ باندھ کر بچوں کو ان کے کمرے میں چھوڑنے کے لیے اٹھ گئی تھیں اور اپنے کمرے میں کھڑی اسما کھڑکی کا پٹ بند کرکے بیڈ پہ ڈھے گئی۔

اس نے دادی اور دادی کے پوتے پوتی کے سارے مکالمے سن لیے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح سے صورت حال کچھ تبدیل تھی۔ جانے ماں کے سمجھانے کا اثر تھا یا کیا۔ وہ دونوں ناشتے کے وقت اپنے کمرے سے خود بخود باہر نکل آئے تھے۔

اسما اپنے ہی دھیان میں مگن ناشتہ بنارہی تھی جب ان دونوں کی کھسر پھسر پہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔

عنید اور فضہ نے کمال بے تکلفی سے چوکیاں گھسیٹیں اور اسما کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

اسما نے نگاہیں موڑ کر ناشتے کی طرف دھیان لگالیا تھا۔

"امی۔۔؟" فضہ نے ہلکی آواز میں پکارا تو اسما کے ہاتھ سے پیڑا گرتے گرتے بچا تھا۔ حالانکہ یہ طرز تخاطب اب نیا تو نہیں تھا۔ پھر بھی اسما کو بہت ہی اجنبی لگا تھا۔

"امی! آپ ناراض ہیں ابھی تک' ہمیں معاف کردیں امی!" اب کے دونوں نے ایک ساتھ کورس میں التجا کی تھی اور کانوں کو ہاتھ بھی لگالیا۔ لگ رہا تھا ماں نے خوب پریکٹس کروا کے بھیجا تھا۔ اسما کے اندر دور تلک تلخی بھر گئی تھی۔ وہ خاموش رہی' وہ کچھ دیر منتظر نظروں سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ پھر دھیمی آواز میں بولے۔

"امی! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" دونوں کی آواز بھرا

گئی تھی۔ یقیناً" اس کی بے رخی اور تلخ رویے کی وجہ سے۔

"آئندہ تو ایسا تب ہوگا۔ جب میں تمہیں نہیں لے کر جاؤں گی۔" اس نے دل ہی دل میں جلبلا کر کہا۔ پھر دونوں کے سامنے ناشتہ رکھ کر خود فرید کا ناشتہ ٹرے میں سجا کے اندر چلی گئی تھی۔

ماہی کی ایک کوشش تو ناکام بنا ہی دی تھی۔ فرید کو بچوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے کمرے میں ہی ناشتہ دے کر جب وہ اندر آئی تو فرید باہر نکلنے کے لیے تیار تھا۔ اسے ٹرے اٹھائے دیکھ کر حیران ہوا۔

"میں آتو رہا تھا۔ تم نے کیوں تکلیف کی؟" اس کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے وہ نرمی سے بولا تھا۔

رات وہ بہت دیر سے مال لے کر آیا تھا۔ یہ مال بھی اس نے ادھار پہ خریدا تھا۔ رات وہ آتے ساتھ ہی سو گیا تھا اور اس وقت دکان پہ جانے کے لیے تیار تھا۔ اسما کو گھریلو حلیے میں دیکھ کر کچھ حیران ہوا۔

"تم نے دفتر نہیں جانا؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ متفکر سا ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ ویسے ہی چھٹی کا ارادہ ہے۔" اسما نے آہستگی سے کہا تھا۔ فرید چپ چاپ ناشتہ کرنے لگا۔

اسما صرف چائے پی رہی تھی اور ساتھ فرید کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ وہاں پہ کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ سادگی اور خاموشی کے سوا۔۔۔ اور جو دو دن پہلے اس نے دعوا کیا تھا۔۔۔ ان بچوں سے گلوخلاصی کا۔ "شاید اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اس کے اندر اور بھی تلخی بھر گئی تھی۔

وہ اس کی محویت پہ اچانک چونک گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو اسما!" فرید نے اس کی محویت پہ ٹوکا تو وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

"اچھا لگ رہا ہوں نا؟" وہ جانے کیا سمجھ کر مسکرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ اتنی پیاری تھی کہ اسما لمحہ بھر کے لیے کھو سی گئی تھی۔ وہ کہاں مسکراتا تھا۔ عید کے عید بھی نہیں اور اس وقت مسکرا رہا تھا۔ اسما کو نرمی سے دیکھتا ہوا۔ اسما کا دل جیسے بھر آیا۔ اس کی نگاہوں میں اترا مس بڑا اچھوتا اور منفرد سا تھا یا شاید اسما کو ہی لگا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت۔" اسما نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا اور پوری سچائی سے اظہار کر دیا۔ فرید کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

"کیا؟ اے اللہ یہ خواب تو نہیں تم میری تعریف کر رہی ہو اسما!" فرید کو جیسے یقین ہی نہیں آیا۔

"اتنے حیران کیوں ہو جو قابل تعریف ہوتا ہے اسی کی تعریف کی جاتی ہے۔" وہ مسکرا دی تھی۔

"اور تم ہمیشہ سے بہت اچھے لگتے ہو خوب صورت اور باوقار۔" اس کے اگلے الفاظ پہ فرید نے چائے کا کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا تھا۔ پھر اٹھ کر اس کے قریب آبیٹھا۔ پھر بڑے غور سے اسما کو دیکھنے لگا۔ اس کی محویت نے اسے تھوڑا جھنجلایا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو اسما!" اس نے باقاعدہ اسما کی کلائی تھام کر ٹٹولی تھی۔

"یہ میرے سوئے نصیب کیوں جاگ رہے ہیں۔ فرید کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا۔ حیرانگی، تحیر، بے چینی، تڑپ، حسرت؟ اسما کی بے رخی پہ اٹھنے والا شکستہ سا تاثر؟

وہ تو جانتی ہی نہیں تھی۔ اس کا کترایا رویہ، بیزاری اور رنجش ابھی تک فرید کے دل کو چبھن دیتی تھی۔ وہ بیزاری جو فرید سے شادی کے وقت اسما کے وجود پہ چھائی تھی۔ جو چار سال تک چھائی ہی رہی۔ جس کا اثر تب بھی ختم نہ ہوا جب اسما نے اپنے بانجھ پن کی خبر سنی تھی۔ وہ تقدیر سے، حالات سے اپنی ماں سے اور حتیٰ کہ پوری دنیا سے ناراض اور شکوہ کناں ہی رہی۔

"کیوں تمہیں کیا لگتا ہے۔۔۔ میں ابھی تک اسی موڑ پہ اسی شام پہ کھڑی ہوں۔" فرید کے تاثرات دیکھ کر اسما نے بڑے ٹھہرے لہجے میں گفتگو کو دوسری طرف موڑنا چاہا تھا۔ فرید اسے یک ٹک دیکھتا رہا۔

"اس شام پہ۔ جو مجھے بدنام کر گئی کیا تم یہی کہنا چاہتی ہو؟" فرید کی آواز میں ٹوٹے کانچ چبھنے لگے تھے۔ اسما کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس کے لفظوں کی گہرائی میں اتنی آسانی کے ساتھ اتر جائے گا۔

"تو کیا تم اس شام کو بھول چکے ہو۔" اسما نے بے قراری بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ فرید نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"اگر میں کہوں ہاں تو کیا تم یقین کرو گی؟"

"تم یقین دلا سکتے ہو۔" اسما بھی یہ قیمتی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ایک پھانس جو چار مہینے پہلے ان دونوں کے درمیان آموجود ہوئی تھی۔ اسے تو نکالنا تو کرنا ہی تھا۔

"کیسے یقین دلاؤں؟ جب میں نے اپنے ماضی کا ایک ایک ورق پھاڑ کر دریا برد کر دیا۔ پھر بھی تم اس شام پہ آکے اٹک جاتی ہو۔ میری زندگی میں کہیں کوئی شام نہیں نہ کسی شام کا روپ نہیں صرف تمہارا سویرا ہے۔ تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔" فرید کی آواز نرم اور بوجھل تھی۔ کمرے کی فضا بھی بوجھل اور کثیف ہو چکی تھی۔ اسما کا دم الجھنے لگا۔

"تو پھر اس شام روپ کے بچوں کی اس گھر میں کیا حیثیت ہے؟ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اسی کا گم شدہ وجود منوانے کے لیے۔" اسما کچھ اور کہنا چاہتی تھی اور منہ سے کچھ اور ہی برآمد ہوا اور جب وہ بات کر چکی تب احساس ہوا تھا کہ تیر کمان سے نکل جانا کیا ہوتا ہے۔

فرید کا رنگ بدل گیا تھا۔

"یہ ہی ایک پھانس ہے نا نکل جائے گی۔ بہت جلد نکل جائے گی۔ ان بچوں کے وجود سے تمہارا گھر پاک ہو جائے گا۔ کیا تمہیں میری بات پہ یقین نہیں؟" فرید کے لہجے میں پتھروں سی سختی محسوس کر کے اسما بھی پتھرا سی گئی تھی۔

اسما کا دل ڈوب کر ابھرا۔

کیا فرید بچوں کو نکالنے والا تھا۔

کیا بچے چلے جائیں گے؟ اسما کے اندر سناٹے ہی سناٹے اتر آئے تھے۔ خاموشی ہی خاموشی بکھر گئی تھی۔ دل پہ سکوت طاری ہو چکا تھا۔

کیا وہ ایسا ہی چاہتی تھی؟ ان بچوں کو اس گھر سے نکلوانا چاہتی تھی۔

تاکہ شام روپ کے بچوں کا فرید پہ سایہ بھی نہ پڑے۔ اسے کیا ڈر تھا کون سا خدشہ تھا کہ ان بچوں کے توسط سے شام روپ ایک مرتبہ پھر ان کے درمیان آ کھڑی نہ ہو۔

اور اگر شام روپ واپس آجاتی تو اسما کہاں جاتی؟ اس کی حیثیت پھر کیا ہوتی؟ اور فرید شام روپ کو اپنے سامنے دیکھ کر خود پہ چڑھائے سارے بے حسی کے خول اتار کر شام روپ کا پھر سے دیوانہ ہو جاتا۔

بالکل ایسے ہی جیسے سالوں پہلے ایک اکیلی سی شام اس ناگن کا اسیر ہوا تھا۔

اسما کے اندر ریا ہر سناٹوں کی بارات اتر آئی تھی۔ پھر اسما اس خوف کی قید سے نکل ہی نہ سکی اور یہاں تک کہ وہ کچھ ہو گیا جو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

ناشتہ جوں کا توں رکھا ٹھنڈا ہو گیا۔

فرید نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ چائے تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اسما کو احساس ہوا تو اٹھی۔

"میں چائے گرم کر لاتی ہوں۔" اس نے کپ اٹھا کر اٹھنا چاہا تو فرید نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"رہنے دو طلب نہیں اب تم یہیں رہو میرے پاس، تھوڑی دیر کے لیے۔" فرید کے الفاظ نے اسما کو لحہ بھر کے لیے بھونچکا کر دیا تھا۔ وہ گومگو سی کیفیت میں بیٹھ گئی۔ فرید الجھا ہوا بھی تھا اور پریشان بھی۔ اسما کو ندامت سی ہوئی تھی۔ اس نے فرید کو پریشان کر دیا تھا۔ رات کو ہی تو وہ تھکا ہارا آیا تھا۔ اور صبح اٹھ کر اس نے شام روپ کا قصہ کھول لیا۔

"تم ٹھیک ہو فرید!" اس کی کیفیت پہ اسما نے گھبرا کر پوچھا تھا۔ اسما کا دل گھبرانے لگا۔

"میں ٹھیک ہو سکتا ہوں اسما؟" اس نے بچھر کر نہیں بہت تسلی کے ساتھ پوچھا تھا۔ "میں کیسے ٹھیک ہو سکتا ہوں؟ کیا تم ٹھیک رہنے دو گی۔ میں نے کہا تھا

پرانے حوالوں اور پرانے زخموں کو مت ادھیڑنا۔ تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ الٹا خسارے میں رہو گی۔" وہ بہت آزردہ لگ رہا تھا۔ بہت بکھرا بکھرا لگ رہا تھا۔ اسما کا دل ہولنے لگا۔

"فرید۔!" اس نے گھبرا کر کچھ کہنا چاہا تو فرید نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبا کر کچھ بھی بولنے سے روک دیا تھا۔

"جو تم چاہتی ہو وہی ہو گا۔ لیکن اتنا تو کرو۔ کم از کم مجھ پہ اعتبار کرو۔" اس کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔ اسما کا دل بھر آنے لگا۔ آنکھ بھرنے لگی۔

"تم میرے پاس ہو کر بھی پاس نہیں ہو اسما! مجھ سے زیادہ میرے ماضی میں تم جی رہی ہو۔ حالانکہ میرے ماضی کا تم سے کوئی واسطہ بھی نہیں تھا۔ جو کچھ میری زندگی میں ہوا۔ اچھا یا بُرا تمہارے آنے سے پہلے ہوا۔ تمہارے آنے سے پہلے ہر باب بند ہو گیا تھا۔ پھر بھی تم پرانے اوراق کھول کر بیٹھ جاتی ہو۔ آخر کیوں تمہیں مجھ پہ رحم نہیں آتا؟ میں نے کب تم سے محبت کی طلب کی ہے؟ کیا تم مجھ پہ ترس بھی نہیں کھا سکتیں۔" وہ بولا تو ساون کے بند توڑ دیا۔ اسما کو یوں لگا وہ اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکے گی۔

"میں بہت بُرا ہوں اسما! ایک کھوٹی عورت کے پیچھے خود کو خوار کیا۔ تم نے پھوپھو کے مجبور کرنے پہ میری زندگی میں آنے کا فیصلہ کیا۔ میں کچھ نہیں بھولا اسما تمہاری ایک ایک قربانی یاد ہے مجھے اور تم کیا سمجھتی ہو۔ میں تمہیں شام روپ کے حوالے سے اذیت دوں گا' چاہے مجھے زندگی سے بھاری قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔ میری زندگی میں شام روپ کے نام اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے ان بچوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر مجھے کوئی پتھر کہتا ہے تو کہتا رہے۔ کوئی سنگ دل کہتا ہے تو کہتا رہے۔ میں اپنے فیصلے سے ایک انچ نہیں ہٹوں گا اور ہاں۔ صرف تم ہو جو میرے ارادوں کو توڑ سکتی ہو۔ تمہارا کہا میں نے آج تک نہیں ٹالا۔ لیکن پلیز تم میرا یقین تو کرو۔"

اس کی لہو رنگ آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگے تھے اور اس کے ہاتھ کی گرفت اسما کے ہاتھ پہ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ شاید اس وقت اسما کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆
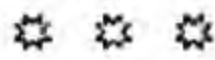
دن بہت ہی روکھے اور ویران تھے۔ فرید ان دنوں بہت ہی مصروف ہو چکا تھا۔ بس رات کو ہی گھر آتا تھا۔ اسما تو اس سے بات کرنے کو ترس چکی تھی اور امی بیٹے کی صورت دیکھنے کو۔ کیونکہ جب وہ سو رہی ہوتیں تب وہ گھر سے چلا جاتا تھا اور جب وہ رات کو سو جاتی تھیں تب وہ گھر آتا تھا۔

اس صبح بھی وہ ناشتے کے بغیر گھر سے نکلنے والا تھا جب اچانک ہی امی نے اسے گھیر لیا۔

"کہاں گم گیا ہے میرا بچہ' نظر نہیں آتا؟ ماں بھی بھول گئی کیا؟" امی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تو وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں امی! کیا مائیں بھی بھولنے کی چیز ہیں؟" اس کی آنکھوں میں شکوہ سا اترا۔

"آج کا دور ہی ایسا ہے بیٹا! نہ ماں باپ کے قلب میں گرماہٹ رہی ہے اور نہ ہی اولاد کے سینوں میں گرمی۔" ان کا جواب بھی خاصا چبھن دینے والا تھا۔

"آپ کو کچھ کام تھا کیا؟" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"بغیر کام کے تمہیں نہیں بلا سکتی فرید۔!"

"کیسی باتیں کرتی ہیں امی!" فرید نے تڑپ کر کہا تھا۔

"اب تو ایسی ہی باتیں کروں گی جو تمہیں بری لگیں گی۔" امی نے اسے گھیر لیا تھا۔

"ایسا کبھی ہوا ہے پہلے؟ آپ کی باتیں بری لگیں مجھے کبھی۔" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"شکوہ نہیں کر رہی میری جان! پر تم اپنی "لاڈلی" کی آنکھوں سے دیکھتے ہو اور اسی کے کانوں سے سنتے ہو۔ اسے کہاں تکلیف میں دیکھ سکتے ہو۔ ماں چاہے تڑپتی رہے۔" انہوں نے بڑے سبھاؤ سے کہا تو وہ ان کے

انداز پہ بھونچکا رہ گیا تھا۔

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں آپ کو تکلیف میں دیکھ سکتا ہوں؟" فرید کو شدید صدمہ ہوا تھا اور ماہا کو مزید چوٹ کی۔

"دیکھ تو رہے ہو۔" انہوں نے بھرائی آواز میں کہا تھا۔

فرید نے جیسے تھک کر گہرا سانس خارج کیا۔ وہ ان کی گفتگو کا پس منظر سمجھ گیا تھا۔

"ان باتوں کا بھلا کیا فائدہ ہے؟"

"کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ تمہاری نظر میں تو بالکل بھی نہیں۔ بس اتنا بتادو۔ ان کو کس بات کی سزا دینا چاہتے ہو؟" ہی نے کھل کر فرید کو گھیرا تھا۔ وہ احتجاج بھی نہ کر سکا۔

"میں نے کسی کو کیا سزا دینی ہے؟" وہ جز بز سا ہوا تھا۔

"تو کیا کر رہے ہو اتنے مہینوں سے؟ تم اپنے بچوں کے ساتھ نوکروں سے بھی برا سلوک کرتے ہو؟ آخر وہ تمہاری اولاد ہیں۔۔۔ تم کیوں نہیں اپنے دل کو ان کی طرف موڑتے۔"

اب کے ماہی نے لجاجت کا مظاہرہ کیا تو فرید کے اندر باہر شر بھر گیا۔ پھر وہی موضوع، وہی باتیں وہ بری طرح سنگ اٹھا تھا۔

"کیسے موڑوں آپ ہی بتائیں جب میں ان کی ماں سے سارے تعلق توڑ چکا تھا تو ان بچوں سے تعلق کیوں رکھتا؟ جب وہ بد چلن عورت میری نہیں ہو سکی۔ تو اس کی اولاد کیا میری ہو گی؟ ان پہ اپنا پیار لٹاؤں ان کو اپنا وقت دوں نام دوں، مقام دوں، تاکہ اپنی ماں کی طرح میری محبت اور عزت کا جنازہ نکال کر مجھے پورے زمانے میں رسوا کر کے چلتے بنیں آپ چاہتی ہیں۔۔۔ میں ایک مرتبہ پھر اسی درد اور اسی ذلت سے گزروں؟"

فرید کے لفظوں سے اس کا دکھ جھلک رہا تھا ماہی جیسے لمحے بھر کے لیے لاجواب ہو گئی تھیں پھر دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو؟ ان کے وجود میں تمہارا خون بھی تو دوڑ رہا ہے۔ فرید! تو اس حقیقت کو مان کیوں نہیں لیتا۔ وہ بدبخت ہمیں اتنی "انمول" خوشی دے گئی۔ ورنہ تو تمہاری نسل کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔" ماہی کی آواز بھرا گئی تو لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ فرید جیسے تھک کر ٹوٹ گیا تھا۔

"بس ایک یہی بات ہے آپ کے پاس۔۔۔ لاکھوں لوگ بے اولاد دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ایک میں بھی سہی۔" ماہی اسے تاسف سے دیکھنے لگیں۔

"یہ ہماری قسمت میں لکھے تھے۔ جو خود چل کر آ گئے۔ ان کی نانی جانے کیسے ہمارے حوالے کر گئی۔ کس عذاب سے گزر کر ہماری امانتیں ہمیں لوٹا گئی۔ میں تو احسان سمجھتی ہوں اس عورت کا۔ فرید! تم کچھ بھی کہہ لو۔۔۔ جتنا مرضی انکار کرو۔ یہ تمہارے بچے ہی کہلائیں گے۔ تسلیم کرو یا نہ کرو۔" انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ فرید جیسے ہار گیا۔

"تو آپ کیا چاہتی ہیں۔۔۔؟"

"بس اتنا کہ اپنے بچوں کو اپنا لو۔۔۔ انہیں اپنی شفقت سے محروم نہ رکھو۔ یہ ماں اور باپ کی محبت کو ترسے ہوئے ہیں۔ ان کے حال پہ رحم کرو میری جان!" ماہی کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

"میں اس معاملے میں خود کو بے بس پاتا ہوں۔ آپ میرے ضبط کا امتحان مت لیں۔" فرید نے بے بسی سے کہا تھا۔

"تو اتنا سنگ دل نہیں تھا فرید!" ماہی جیسے رو پڑی تھیں۔

"مجھے سنگ دل کر دیا گیا ہے۔۔۔ میں اور ذلت برداشت نہیں کر سکتا امی!" اس کا لہجہ چٹانوں کی طرح سخت تھا۔

"اور اس معاملے میں آپ مجھے مجبور نہیں کریں گی۔" وہ ان پہ اپنے ارادے واضح کر رہا تھا۔ ماہی لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھیں۔

"میرا دل مت دکھاؤ فرید! سنا تم نے، اب میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ بس اتنا رحم کرو کہ ان کے اسکول کا بندوبست کر دو۔ باقی میری ذمہ داری۔ تم

دونوں ان کی ذمہ داری سے آزاد ہو۔" انہوں نے غصے کے عالم میں کہا اور رخ بدل کر بیٹھ گئیں۔ یہ ان کی ناراضی کا واضح اظہار تھا۔

"ٹھیک ہے۔" فرید نے آرام سے کہہ دیا تھا۔ یوں کہ ماں کے ساتھ ساتھ باہر کھڑی اسما بھی ٹھٹک گئی۔ فرید اتنی آسانی سے کیسے مان سکتا تھا؟ دونوں کو ہی یقین نہیں آیا تھا۔

"کسی اچھے اسکول میں بات کرنا۔ میں چاہتی ہوں ان بچوں کو کوئی کمی نہ ہو۔ بہترین ماحول میں تعلیم پا سکیں۔ پھر دیکھنا، کتنی جلدی ان میں تبدیلی آئے گی۔" ماں بے ساختہ خوش ہو کر بولی تھیں، تاہم اسما فرید کے تاثرات دیکھ کر الجھ گئی تھی۔ اس کے تاثرات سخت الجھن میں ڈالنے والے تھے۔

"جہاں جائیں گے، ادھر اسکول تو ہو گا ہی۔" فرید کا انداز پرسوچ سا تھا۔ ماں بات کرتے کرتے ٹھہر سی گئیں۔

"جہاں جائیں گے؟" ان کے چہرے پر استعجاب تھا۔ ان کا سوال سن کر فرید نے نگاہیں چرالی تھیں۔

"کیا تم ان معصوم جانوں کو ہاسٹل بھیجو گے؟" وہ شدید اکھڑے تیور لیے پوچھ رہی تھیں۔ فرید سر نہیں اٹھا سکا تھا۔

"ہاسٹل ہی سمجھ لیں۔" اس کا انداز مبہم تھا۔ اتنا مبہم کہ نہ ماں کی سمجھ میں آیا نہ باہر کھڑی اسما کو۔ آخر فرید نے کیا سوچ رکھا تھا؟ کیا وہی جس کا اس نے ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"میں ان کو دارالاطفال بھیج رہا ہوں۔" فرید نے مدہم آواز میں جیسے دھماکا کیا تھا۔ اسما تو اسما ماں سے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ ان سے بات کرنا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔

"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو فرید!" کتنی دیر بعد انہوں نے سنبھل کر چیختے ہوئے کہا تھا۔

"اسے میری سنگ دلی نہیں، مجبوری سمجھ لیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا تو ماں نے بے ساختہ چیختے ہوئے اسے روکا تھا۔

"تو سن لو۔ سن لو فرید! میری زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم اور تمہاری مجبوریاں سلامت رہیں، میں ان بچوں کے ساتھ بہت دور چلی جاؤں گی۔ جہاں پہ تمہاری مجبوریوں کا سایہ تک نہ پڑے۔"

ماں کی اس بھیانک دھمکی نے اسما اور فرید دونوں کو ہی ساکت کر دیا تھا۔ یوں کہ فرید "بے بس" سا اٹھ کر چلا گیا۔ خاموشی کے ساتھ۔ جیسے ہار گیا ہو اور وہ تو ہمیشہ سے ہارتا آیا تھا۔ کبھی اپنوں کے ہاتھوں، کبھی غیروں کے ہاتھوں۔ کبھی محبت کے ہاتھوں، کبھی نفرت کے ہاتھوں۔ کبھی زیست کے ہاتھوں، کبھی نصیب کے ہاتھوں۔

اور اس وقت تو ماں نے اسے ایک ایسی بات بھی جتائی تھی۔ جس کے بعد فرید پہلے والا فرید نہیں رہ سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

باہر موسم سرد تھا۔ اور اندر بھی ماحول سرد تھا۔ بے جان اور برفیلا۔

دو چارپائیوں پہ نحیف سے دو وجود دبکے پڑے تھے۔ لحافوں میں چھپے ہوئے۔ دونوں کے چہروں پر سراسیمگی تھی۔ خوف، ڈر تھا، سہم تھا۔

پھر اس تاریک ماحول میں کمزور سی آواز ابھری تھی۔

"فضہ! تم جاگ رہی ہو؟" عنیقہ نے سہمی آواز میں بہن سے پوچھا تھا۔ جواباً" وہ جلدی سے لحاف کھینچ کر بولی۔ جیسے بھائی کے بولنے کی ہی منتظر تھی۔

"ہاں۔۔۔!"

"ڈر لگ رہا ہے فضہ!" عنیقہ نے بمشکل ڈر چھپا کر پوچھا تھا۔

"بہت۔" وہ دھیمی آواز میں سسکیاں دبا کر بولی تھی۔

"امی اور ابو ہم سے پیار نہیں کرتے۔" اس کے لب و لہجے میں حسرتوں کی ریت اڑ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی سی بھر گئی۔

"تو کیا ہوا ہم سے تو کوئی بھی پیار نہیں کرتا تھا۔ نہ نانی' نہ ماموں' نہ خالہ اور نہ ہی کوئی رشتہ دار یہاں تو اتنے لوگ ہم سے پیار کرتے ہیں۔ دادی امی ساری پھوپھیاں پھر کیا جو ابو اور امی پیار نہیں کرتے۔" فضہ نے بڑی بردباری کے ساتھ جواب دیا تھا۔

"لیکن امی ابو کیوں ہم سے خفا ہیں فضہ!" عنید نے بچوں والی ضد سے مجبور ہو کر پوچھا تھا۔

"ہم تو بدتمیزی بھی نہیں کرتے۔ شور بھی نہیں کرتے' تنگ بھی نہیں کرتے۔" وہ بولتا جا رہا تھا اور باربار بھرتی آنکھوں کو پونچھتا بھی جا رہا تھا۔

"دادی امی کہتی ہیں ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔" فضہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔ عنید نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اور اچانک ہی باہر درختوں کی سرسراہٹ ہونے لگی۔ جیسے آندھی کی آواز ہو۔ پھر اچانک ہی۔ کی گرج' چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

فضہ اور عنید اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

باہر طوفان تھا۔ آندھی تھی' غبار تھا' بارش تھی۔ اندر تنہائی تھی' خاموشی تھی' ڈر تھا' خوف تھا۔ اچانک بادل زور سے گرجے تو عنید فضہ کا ہاتھ پکڑ کر چیختا ہوا باہر نکل کر آ گیا تھا۔

پورا لاؤنج اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ اور باہر سے خوفناک آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں۔ کھڑکیوں کے پٹ مسلسل ہل اور بج رہے تھے۔ بادلوں کی گرج چمک میں شدت آتی جا رہی تھی۔ ان دونوں نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔

معاً کچن کا دروازہ کھلا اور چائے کا کپ لیے کچھ حیران سا فرید باہر نکلا۔ رونے کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا سوئچ بورڈ تک آیا تھا پھر اس نے کئی بٹن دبا کر لاؤنج میں اندھیرے کو مٹایا۔ منظر واضح ہوا تو اسے سہمے سہمے دو بچے ایک دوسرے سے چمٹے دکھائی دے گئے تھے۔ فرید نے گہرا سانس کھینچا اور اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

سامنے ہی موجود تھے۔ روتے ہوئے' ڈرتے ہوئے سہمے سہمے سے پھر جیسے ہی فرید کو دیکھا۔ بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے تھے اور یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ فرید سنبھل بھی نہ سکا۔ بلکہ وہ ہکا بکا سا بچوں کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس لمحے فرید کے دل کی کیفیات عجیب تر تھیں۔ وہ ان کیفیات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ "ابو ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں آپ کے پاس سونا ہے۔"

وہ اپنے وجود کا احساس دلاتے اپنا آپ منواتے ہوئے فرید سے لپٹ کر کھڑے تھے اور فرید خود میں اتنی طاقت نہیں پا رہا تھا کہ ان دونوں کو زبردستی خود سے الگ کر دے۔

وہ انہیں دھتکار نہیں سکا تھا۔ جھٹلا نہیں سکا تھا۔ کیونکہ وہ ان ننھے بچوں کی سسکیوں اور آنسوؤں سے ہار گیا تھا۔ اور وہ فرید صدیق تھا۔ جو ہمیشہ محبتوں اور رشتوں سے ہارتا آیا تھا۔ آج بھی ہار گیا تھا۔

اس نے ان دونوں کو اپنے سینے میں سمو لیا۔ خود میں سمیٹ لیا۔ اپنی شفقت اور محبت کے حصار میں قید کر کے ان کا ڈر اور خوف دور کر دیا۔

فرید انہیں لے کر بیٹھک میں آ گیا۔ ان کے بستر بھی اٹھا لایا اور پھر ان دونوں کو اپنے دائیں بائیں سلاتے ہوئے وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ یہ دونوں بچے شام روپ کے بچے تھے۔ جس سے فرید کو انتہائی نفرت تھی۔

اور وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے اسما سے کیا وعدہ نبھانا ہے۔ بچوں کو دارالاطفال چھوڑنے کے لیے جانا ہے۔

وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ یہ دونوں خوف کے مارے' بے یقینی کی منجدھار میں پھنسے' رشتوں اور محبتوں کو ترسے بچے اس کے وجود کا حصہ تھے۔ اس کی توجہ' محبت اور شفقت کے حق دار تھے۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا لیکن اس کے پیچھے آتی اسما کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔

اسے یاد تھا' فرید کا وعدہ اور دعویٰ۔

اس کے اندر باہر آگ جلنے لگی۔ آگ سلگنے لگی۔

بچے فرید کے اتنا قریب تھے۔ فرید کے دل میں ان کے لیے جگہ بن گئی تھی۔ اور وہ فرید کے بازوؤں پہ سر رکھ کر سو رہے تھے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

ایک طوفان باہر تھا۔

ایک طوفان اندر اٹھ رہا تھا۔

ایک اور طوفان صبح آنے والا تھا۔

***

صبح اسما کے لیے انتہائی عجیب تھی۔ وہ ساری رات کھوتی رہی، جلتی رہی، سو بھی نہیں پائی تھی۔ یوں رات کے تیسرے پہر آنکھ لگی تو صبح بمشکل اٹھ سکی۔ پھر اس نے لحاف پیچھے ہٹایا اور جلدی سے فریش ہو کر باہر آگئی تھی۔

لیکن باہر کے منظر نے اسے سر تا پا کھولا دیا تھا۔

لاؤنج میں ایک بھرپور منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ تخت پہ ناشتہ چنا ہوا تھا۔ حلوہ، پوری، چنے اور گرما گرم چائے۔ ماسی تخت پہ بیٹھی تھیں، دائیں طرف عنید اور فضہ تھے۔ جبکہ پائنتی کی طرف فرید بیٹھا تھا۔ اخبار دیکھتا ہوا... تاہم اس کا دھیان اخبار کی طرف نہیں تھا۔ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ کیونکہ اسما ابھی تک اٹھی نہیں تھی۔

"اسے کچھ احساس ہوا تو اخبار پیچھے ہٹا کر دیکھا...

اس کی نگاہ جیسے ٹھہر گئی تھی۔ اسما اس سے کچھ فاصلے پہ کھڑی تھی۔ چپ، سلگتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی۔ فرید نے بے ساختہ نگاہ چرائی۔ وہ اسما سے آنکھ ملانے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔

ماسی نے بھی اسے دیکھ لیا۔ تبھی بڑے بشاش لہجے میں بولی تھیں۔

"اسما! آجاؤ، ناشتہ کرلو۔ فرید باہر سے لے آیا۔ تم سو رہی تھیں۔ میں نے کہا، جگاتا نہیں۔"

اسما ان کی بات سننے کے لیے رکی ہی نہیں تھی۔ فوراً "پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دھاڑ کی آواز سے دروازہ بند کر دیا۔ فرید اور ماسی کے ساتھ ساتھ بچے بھی گھبرا کر سہم گئے تھے۔

"امی کو کیا ہوا...؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

فرید نے گردن موڑ کر ان کے فق چہرے دیکھے اور نرمی سے کہا۔

"کچھ نہیں، تم دونوں ناشتہ کرو۔ میں دیکھتا ہوں اسے۔ اور ماسی! آپ ان کو تیار کروا دیں۔ میں ان کا اسکول میں ایڈمیشن کرواتا ہوں۔"

فرید کے اگلے الفاظ سن کر ماسی کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ انہوں نے خوشی خوشی بچوں کو ناشتہ کروایا اور انہیں تیار کرنے کے لیے اٹھ گئیں۔ بچوں کی خوشی کا بھی کوئی انت نہیں تھا۔

فرید چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ وہ جانتا تھا اندر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔

وہ اسے کیسے قائل کرتا؟ وہ اسے کیا بتاتا؟ کیا سمجھاتا؟

کہ وہ ہار گیا تھا اپنے بچوں کے ان آنسوؤں کے قطروں کی شدت سے ہار گیا تھا؟ ان کے زرد چہروں پہ بکھرے خوف سے ہار گیا تھا؟ ان کی آنکھوں میں اتری وحشت کے خوف سے ہار گیا تھا وہ اپنے بچوں کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے خوف سے ہار گیا تھا۔

وہ اسما کو کس طرح سے قائل کرتا؟

جب وہ اندر آیا تو اسما سامنے پلنگ پہ بیٹھی نظر آئی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھیں خشک اور سرد تھیں۔ وہ فرید کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرید اس کے قریب آیا تو وہ اچانک چیخ پڑی تھی۔

"کیا کہنے کے لیے آئے ہو فرید؟ یہی ناکہ تمہارے بچے ہیں۔ ان کے سامنے بے بس ہو گئے اور بے بس تو تم ماسی کے سامنے بھی ہو چکے تھے۔ اسی وقت مجھے سمجھ جانا چاہیے تھا۔ جس طرح تم شام روپ کے سامنے "زیر" ہوئے تھے اسی طرح اس کے بچوں کو سامنے پا کر زیر ہو چکے ہو۔ تو جاؤ تم آزاد ہو۔ جا کر اپنی شام روپ کو بھی لے آؤ۔ ان بچوں کی ماں کو۔ جس نے اسی مقصد

کے تحت ان بچوں کو تمہارے پاس بھیجا ہے۔" اسما چیختی ہوئی اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ فرید نے اپنا سر تھام لیا۔

"میری بات تو سنو اسما! تم غصہ کیوں کرتی ہو؟ مجھے بولنے کا موقع تو دو اور پلیز' اس عورت کا ذکر مت کرو۔"

جیسے فرید بے بس سا ہو کر کرلا اٹھا تھا۔

"اس عورت کا ذکر نہ کروں! جس کے بچوں کو سینے سے لگا چکے ہو۔ کل کو وہ عورت بھی کسی ماں کے ساتھ تمہارے سامنے آکھڑی ہوگی۔ پھر اسے بھی اپنا لینا۔ جو تمہارے منہ پہ جوتا مار کر چلی گئی تھی۔" اسما غصے کی انتہا پہ شائستگی کا چولا اتار چکی تھی۔

"اس نے تمہیں ذلیل و خوار کیا۔ تمہیں گلی گلی بدنام کر دیا۔ تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا تو اب تم اسی عورت کو اپنا لینا۔ شرعی لحاظ سے حلالہ تو اس کا ہو چکا۔ بیوی بھی بنا لینا اسے۔ تاکہ بچوں کو ان کی حقیقی ماں مل سکے۔" وہ نفرت اور غصے کی انتہا پہ تھی۔ فرید کی طرف نہ دیکھ رہی تھی۔ نہ اس کی بات سن رہی تھی۔

"اور میں اپنی حیثیت سے تو واقف ہی ہوں۔ آخر ایک بانجھ اور ناکارہ عورت کی تمہاری زندگی میں کتنی گنجائش ہو سکتی ہے؟ میں سمجھ چکی ہوں۔ تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسما تم چلی جاؤ۔ میں شام روپ کو واپس لانا چاہتا ہوں۔"

وہ بدگمانی اور غصے کی انتہا پر کھڑی تھی۔

"اور تم اب بھی شام روپ کے "بھیانک روپ" اور سیاہ سائے جیسے وجود کے اسیر ہو۔ میرے ساتھ نباہ تو تمہاری مجبوری ہے۔ کیا میں نہیں جانتی۔"

رو رہی تھی۔ اور فرید کے دل کا خون کر رہی تھی۔ اور اس وقت اس کا سارا غصہ' سارا تنفر' ساری تپش شام روپ کے گرد گھوم رہی تھی۔ جس کا فرید نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

فرید تھک ہار کر اپنا سر تھام کے بیٹھ گیا۔۔ اس کی خاموشی نے وہ دن اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور نہ ہی اسما نے ایسا کبھی سوچا یا چاہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور پھر وہ سب ہوتا چلا گیا تھا جو فرید کی بہنیں اور اس کی ماں چاہتی تھیں۔

بچے نہ کسی دارالاطفال گئے اور نہ ہی کسی ہوسٹل۔ بلکہ شہر کے مہنگے ترین اسکول میں ان کا ایڈمیشن ہو گیا۔ ان بچوں کی قسمت کا ستارہ ایسا تھا یا پھر فرید کے ہی نصیب نے کروٹ بدل لی تھی۔ اس نے قرضہ لے کر جو مال ڈالا تھا۔ تو منافع پہ منافع ملتا چلا گیا۔ کاروبار نے ترقی کا رستہ کیا دیکھا۔ دنوں میں ہی گھر میں خوشحالی اتر آئی تھی۔

فرید کی ساری بہنیں ایک ہفتہ رہنے کے لیے چلی آئیں۔ خوش و خرم بچوں کو نعمتوں میں پروان چڑھتا دیکھ کر ان کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر فرید کا رویہ بچوں سے بدل گیا تھا۔ وہ ان کو وقت بھی دیتا تھا۔ پیار بھی کرتا تھا اور بھانجے بھانجیوں کے ساتھ تفریح بھی کرا لاتا۔ انہیں شاپنگ' ہوٹلنگ اور پارکوں میں گھما پھرا لاتا۔

اب انہیں ایسی ہی ایک اور طوفانی رات کا انتظار تھا۔

ایسے ہی بادل گرجتے' درخت اکھڑتے' اولے گرتے اور امی بھی اس طوفانی رات میں بدل جاتیں۔ ابو کی طرح ان سے پیار کرنے لگتیں۔

پھر ایک اور طوفانی رات ان کی زندگیوں میں چلی آئی۔

اس رات وہ دونوں اسی کمرے میں سوئے تھے جو پھپھو نے ان کے لیے سیٹ کرایا تھا۔ نئے بستر' اور کھلونوں سے سجا کمرہ۔ ایک طرف میز اور کرسیاں کتابیں' بیگ اور کمپیوٹر جس پہ طرح طرح کی گیمز بھی تھے۔

وہ دونوں بہت دل سے اسکول جاتے' واپس آتے' ہوم ورک کرتے' دادی امی سے سیپارہ پڑھتے' کچھ دیر کھیلتے' مزے مزے کے کھانے کھاتے اور کبھی کبھی ابو

کے ساتھ گھومنے بھی چلے جاتے۔۔۔ اور ابو تو باقاعدہ اسکول بھی چھوڑتے' لے بھی آتے۔

ہاں' تب سے امی اپنے دفتر رکشہ پہ جانے لگی تھیں بعد میں انہوں نے وین لگوائی۔ ابو اور دادی امی کے ہزار اصرار' منتوں اور ضد کے باوجود بھی۔ جانے امی ان کی بات کیوں نہیں مانتی تھیں؟ اور انہیں کس بات پہ غصہ تھا۔ وہ فضہ اور عنید سے نہیں بولتی تھی۔ بلکہ کسی سے بھی کلام نہیں کرتی تھیں۔

اس دن ڈھیر سارا مینہ برستا رہا۔ آندھی اور طوفان آیا۔ درخت ہلتے رہے۔ پتے گرتے رہے اولے پڑتے رہے۔ باہر غضب کی ہوا بپھرتی رہی۔ اور اندر ـــــ ایک قیامت اٹھتی رہی۔۔۔ ایک قیامت سلگتی اور ایک قیامت بھڑکتی رہی۔

☆ ☆ ☆
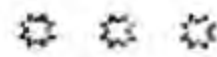
اور وہ اس کے قریب ہی تو بیٹھا تھا۔ اور کمرے میں واقعی بہت اندھیرا تھا۔ پھر بھی اسما نے اسے پہچان لیا۔۔۔ اور پہچانتی کیوں نا۔ اس کی خوشبو تو اسما کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی۔

وہ فرید ہی تھا۔

ہمیشہ کی طرح چپ اور خاموش۔

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ یوں چہرے کے تاثرات تو نظر نہیں آتے تھے۔ اسما نے اٹھ کر دیکھنا چاہا تھا مگر اٹھ نہ سکی۔ بولنا چاہا تو بول نہ سکی۔ کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔

لیکن فرید کہہ کیا رہا تھا؟

اس نے کان لگا کر سنا اور پتھرا گئی تھی۔

"میں شام روپ کو لانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں اسے گھر لے آؤں گا۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے اسما! تم اپنے دل کو کچھ وسیع کر لو۔ اپنے ظرف کو وسیع کر لو۔" فرید بول رہا تھا۔ اور اسما پتھر ہو رہی تھی۔ فرید اپنا فیصلہ سنا کر چلا گیا۔ روٹھ گیا۔ اس سے دور ہو گیا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔۔۔ شاید عمر بھر کے لیے۔

کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا؟ کیا ایسا بھی ممکن تھا؟

"ہرگز نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔" اسما نے چیخنا چاہا' فرید کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ اور فرید اس سے عمر بھر کے لیے دور چلا گیا تھا۔ شام روپ کا جادو ایک مرتبہ پھر چل گیا تھا۔ اسما دنگ رہ گئی۔

اور پھر جیسے منظر بدل گیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ روشنی میں سارے منظر واضح ہوتے چلے گئے تھے۔ وہ کمرے میں اکیلی تھی اور فرید اپنا فیصلہ سنا کر چلا گیا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ کیا شام روپ کو لینے؟ کیا واقعی اسے لینے؟

اسما کو زماں و مکاں بھول گئے تھے۔ وہ اندھادھند باہر کی طرف بھاگی تھی۔

اسے فرید کو روکنا تھا۔ لیکن فرید کہیں نہیں تھا۔ فرید اس "بلا" کو لینے چلا گیا تھا۔ اپنے بچوں کے لیے وہ اس کے بچوں کی ماں تھی۔ ان ہی بچوں کی وجہ سے وہ واپس آ رہی تھی۔

یہ بچے جو چھ ماہ پہلے ایک عورت لائی تھی۔ جو اس کے سر پہ مسلط ہو چکے تھے۔ اور اب اسے اس گھر سے نکلوا کر اپنی ماں کو لانا چاہتے تھے۔

اسے خیال گزرا۔ اسے فرید اور شام روپ کے آنے سے پہلے ان "بلاؤں" کو اپنے گھر سے نکالنا چاہیے تھا۔ وہ چڑیل ان ہی بچوں کی وجہ سے واپس آ رہی تھی۔

اسے ان بچوں کو اپنی زندگی سے نکال دینا چاہیے تھا۔ یہ فیصلہ وہ اسی وقت کر لیتی۔ تو آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔

اس نے ایک ہی لمحے میں سوچا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی اس کمرے کی طرف آئی جو آج کل فضہ اور عنید کا مسکن تھا۔ پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ان کے منہ پر تھپڑوں کی برسات کر دی۔ پھر انہیں گھسیٹتی ہوئی باہر صحن میں لے آئی۔ رات کے دوسرے پہر' کالی رات میں' جب آسمان بپھر رہا تھا۔ باہر طوفان تھا۔ آندھی تھی۔ اولے گر رہے تھے۔ ایک قیامت کا سماں تھا۔

اس نے روتے چلاتے ہوئے بچوں کو صحن میں دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔

"یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ کبھی واپس مت آنا۔ نہ تم رہو گے۔ نہ وہ چڑیل واپس آسکے گی۔ خبردار' جو مجھے دکھائی دیے۔ ورنہ میں۔" اسما کسی خونخوار بلا کی طرح غرا رہی تھی۔ صحن پانی سے بھر رہا تھا۔ آسمان برس رہا تھا۔

اور بچے خوف' ڈر اور صدمے کے زیر اثر تھرا رہے تھے۔

یہ ان پر پھر سے کون سی قیامت ٹوٹی تھی۔

وہ پاگل ہوتی اسما کو دیکھتے رہے۔

"سن رہے ہو۔ اپنی ماں کو بتا دینا۔ کبھی تمہیں دوبارہ سازش کر کے واپس نہ بھیجے۔ اگر تم دوبارہ مجھے دکھائی دیے تو دیکھنا۔ اس چھری سے تمہیں ذبح کر دوں گی۔ اور اگر تم اس گھر سے نہ گئے تو میں خود کو ذبح کر لوں گی۔"

اسما نے فرش پہ گملے کے پاس پڑی چھری اٹھا کر اپنے بازو پہ کٹ لگایا تو دونوں بچے مارے خوف کے چلا اٹھے۔

"نہیں امی! آپ خود کو نہ کاٹیں۔ آپ کا خون نکل آئے گا۔ امی! ہم چلے جاتے ہیں۔ بہت دور چلے جاتے ہیں۔ امی! آپ خود کو مت ماریں۔" تڑپتے ہوئے بچے اس پاگل ہوتی عورت کے جنون سے گھبرا کر پانی میں بھاگتے ہوئے گیٹ تک گئے اور پھر زور سے بجلی ایک دم کڑکی۔ دوسرے ہی لمحے وہ گھر کی دہلیز پار کر چکے تھے۔ بجلی رات بھر کڑکتی رہی' چمکتی رہی۔ آندھی بپھرتی رہی۔ درخت اکھڑتے رہے' گرتے رہے۔ پوری رات طوفان غراتا رہا۔ آسمان برستا رہا۔ اور اسما وہیں صحن میں برآمدے کے قریب گر کے بے ہوش ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات گزر گئی اور صبح ہو گئی۔

ویسی ہی صبح جو طوفان گزرنے کے بعد طلوع ہوتی ہے۔

ماں نے بھی صحن کی کھڑکیاں کھول کھول کر دیکھا۔

باہر کئی گملے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کئی پودے جڑوں سے اکھڑے ہوئے تھے اور کئی چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔

لیکن یہ تو معمولی نقصان تھا۔ اصل نقصان کا پتا تو تب چلا۔ جب اسما دکھائی نہیں دی تھی۔ انہوں نے سارے کمرے جھانکے مگر اسما اور بچے کہیں نہیں تھے۔

ماں پاگلوں کی طرح پورا گھر دیکھتی اس وقت صدمے سے پاگل ہو گئیں جب اسما کو برآمدے میں بے ہوش پڑا دیکھا۔ اور اس کے ہاتھ میں وہی چھری' کلائی سے بہتا لہو۔ ماں کے دل پہ تو قیامت گزر گئی تھی۔ اسی وقت فرید کو فون کر کے گھر بلایا۔ وہ رات سے دکان پہ تھا۔ رات کو نیا مال آنا تھا۔ سو وہ گھر ہی نہ آیا۔ اور پیچھے سے ایسی قیامت آئی کہ سب کچھ بہا کر لے گئی۔

فرید آیا اور اسما کو پڑوسیوں کی کار میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ فرید کی ساری بہنیں بھی پہنچ گئیں۔ اسما بھی بروقت طبی امداد سے ہوش میں آگئی۔ گھر والوں کو کچھ اسما کی طرف سے سکون ہوا تو بچوں کی غیر موجودگی کا بگل بج گیا۔ ماں کو غش پہ غش آرہے تھے۔ اور ساری بہنیں صدمے سے نڈھال تھیں۔

آخر بچے کہاں گئے؟ زمین کھا گئی تھی یا آسمان نے اٹھا لیے تھے؟

راتوں رات کہاں چلے گئے تھے؟ گھر سے کیسے نکل گئے تھے؟

ایک قیامت تھی۔ آہ و بکا تھی۔ رونا تھا۔ فرید ایسا غم زدہ' پریشان حال' ویران۔ جیسے عمر بھر کی پونجی لٹ گئی ہو۔

"آخر کہاں چلے گئے تھے بچے یوں اس کے دل میں اپنی ہڑک بیدار کر کے۔ اس سے بہتر تھا۔ اس کی زندگی میں آتے ہی نا۔ وہیں رہتے۔ جہاں دس سالوں سے رہ رہے تھے۔ ایسا جدائی کا چرکا لگا کر کہاں چلے گئے تھے؟"

فرید پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

مسجدوں سے اعلان کروایا گیا۔ پولیس میں رپورٹ ہوئی۔ حتیٰ کہ مقامی اخباروں میں بھی "تلاش گم شدہ" کے اشتہار لگوائے۔ لیکن بچوں کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔

اور ماں؟ ان کی تو حالت ہی غیر تھی۔ بچوں کی جدائی نے انہیں بستر پہ ڈال دیا تھا۔ اتنا تو انہوں نے اپنے عزیز شوہر کا غم نہیں کیا تھا۔ جس قدر بیٹے کی اولاد نے انہیں صدمے سے ادھ مؤا کر دیا تھا۔

اس سارے ماحول میں ایک اسما تھی' ابھی تک گم صم' پریشان اور حیرت کی انتہا پہ۔

اسے بار بار اس طوفانی رات کا خیال آتا۔ آخر اس طوفانی رات اسما باہر کیوں نکلی تھی؟ اس نے اپنی کلائی کیوں زخمی کی؟ اور اسی رات دونوں بچے بھی لاپتا ہوئے تھے۔

اس نے کئی بار اسما سے پوچھا تھا لیکن وہ گم صم اسے دیکھتی رہتی۔

اب وہ کچھ بہتر ہوئی تو فرید نے اس سے براہ راست پوچھ گچھ کی تھی۔ اسما اس سے جھوٹ نہ بول سکی تھی۔ اس کے ضمیر پہ پہلے ہی بہت بوجھ تھا۔

اس نے فرید کو سب کے سامنے سچ بتا دیا۔

اپنا بھیانک خواب... ہاں' وہ خواب ہی تھا۔ جس نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ اسی خواب کے زیر اثر اس پہ پاگل پن سوار ہوا تھا اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو چکی تھی۔ اسی خوفناک خواب سے ڈر کر اس نے بچوں کو رات کے اندھیرے میں اس طوفانی رات گھر سے نکال دیا تھا۔

سچ بہت تلخ تھا۔ بے پناہ خوفناک تھا۔ اس سچ کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اسما کو مزید جھوٹ نہیں بولنا تھا۔ اس نے بالآخر اپنے ضمیر کا بوجھ اتار دیا... یہ اور بات تھی کہ پوری حقیقت جان کر فرید کی بہنوں نے دل پکڑ لیے تھے اور ماں غم سے اور نڈھال ہو چکی تھیں۔ اور فرید کو ایسی چپ لگی کہ پھر کبھی وہ بولا ہی نہیں... حالانکہ اسما اپنی صفائیاں دے دے کر تھک چکی تھی۔ لیکن ہر کوئی اسما سے نالاں تھا۔ گو کہ یہ ان کی اعلا ظرفی تھی جو یہ لوگ اسے جتاتے نہیں تھے۔

نہ کوئی طعنہ دیا' نہ غصہ کیا... بس ان کی شکوہ کناں آنکھیں ہی کافی تھیں۔ جو اسما کا سر اٹھنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شام روپ کے بعد اس کی چھوڑی ہوئی ملکیت کا بھی قصہ تمام ہو گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بچے ان کی زندگی میں آئے ہی نہیں تھے... کسی خواب یا خیال کی طرح لگتے تھے۔

پھر دن پر دن گزرتے چلے گئے تھے۔ موسم بھی بدل گیا تھا۔ اسما نے بھی دفتر جانا شروع کر دیا۔ فرید بھی کام میں لگا رہتا۔ ان کی زندگیاں ایک مرتبہ پھر جمود کا شکار ہو چکی تھیں۔

یوں ایک دن اسما نے اس خوفناک سناٹے سے عاجز آ کر فرید سے کہہ ہی دیا۔ وہ فرید کی خاموشی سے لہولہان ہو کر بے بس ہو چکی تھی۔ اور اسما کا شکوہ سن کر اس کی التجا پہ بھی وہ خاموش ہی رہا۔ بولا کچھ نہیں بس شکوہ کناں نگاہ ڈال کر چپ ہو گیا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا فرید! وہ ایک خواب تھا جس نے میرے شعور کو زنگ لگا دیا۔ میں غلط اور صحیح کی تمیز بھول گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو فرید!" وہ سسکنے لگی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور بس اتنا کہا۔

"مجھے کسی بات کا دکھ نہیں اسما... میرے نصیب میں وہ تھے ہی نہیں... جو اندھیری رات میں آئے اور اندھیری رات میں چلے گئے... وہ تابع تھے' ورنہ کسی بزدل کا در کھٹکھٹا سکتے تھے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے تم مجھ پہ اتنا سا بھی اعتبار نہیں کر سکیں۔ تم نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا' کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔ بس فرد جرم عائد کر دی۔ تم نے کہا میں شام روپ کو واپس لے آؤں گا۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟ کیا میں ایسا بے غیرت ہوں؟ اسے واپس لے آتا؟ ٹھکرائی ہوئی عورت کو؟ بھاگی ہوئی عورت کو؟ میں نے اس سے نفرت تک کا رشتہ نہیں رکھا۔ اس کی ماں میرے بچوں کو واپس لائی تو امی' بہنوں اور اپنے ہی ضمیر کی آواز پہ خاموش ہو گیا۔ ان بچوں کو دھتکار نہیں سکا۔ شاید میں اس

عورت کی طرح پتھر دل نہیں تھا۔ جو اپنی اولاد کو پھینک گئی۔ اور اسما! تم نے سوچا بھی کیسے؟ میں اسے واپس لاؤں گا؟ کیا قبر سے نکال کر؟ اور اگر وہ زندہ بھی ہوتی۔ میرے پیروں میں بھی گرتی تب بھی میرے لیے وہ شجر ممنوعہ تھی۔

اب تو اسے مرے ہوئے بھی کئی سال گزر چکے۔ حالانکہ میرے لیے تو وہ اسی شام — مرگئی تھی جب وہ میری زندگی سے نکل گئی۔"

فرید کی سرخ لہو رنگت آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اسما پہ انکشافات کے تیزابی چھینٹے گرتے رہے۔ وہ دم بخود سن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼ ☼

یہ ان دنوں کی بات تھی جب ماموں پہ ہن برس رہا تھا۔

ماموں اس کے اکلوتے ہی ماموں تھے ... بہت پیارے، بہت چاہنے والے۔ اپنی دونوں بہنوں سے بہت محبت کرتے تھے ... اور امی سے تو بڑا ہی انس تھا ... امی کے بچوں میں اسما ہی ان کی زیادہ لاڈلی کیونکہ اس کے بعد آنے والے بھائی پھر ساتویں آٹھویں سال میں وفات پاگئے تھے۔

لیکن جب بھی وہ تینوں ماموں کے گھر جاتے ماموں کے گھر جیسے عید آجاتی تھی۔

اسما کو ماموں کے گھر چھٹیاں گزارنا ہمیشہ سے پسند تھا۔ بچپن سے لے کر لڑکپن اور پھر جوانی تک۔

وہ چھٹیوں میں ماموں کے گھر بس عیاشی کرنے جاتی تھی۔

ماموں کے پانچ بچے تھے ... چار بیٹیوں کے بعد آنے والا بیٹا۔ جو سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بہت ہی پیارا، سجا سجایا، خوشبوؤں میں بسا رہتا۔

امی کی اپنے بھتیجے میں جان تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ شاید انہوں نے فرید کے حوالے سے بہت اونچے اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔ جو اچانک ہی زمین بوس ہوگئے تھے۔ ٹوٹ گئے تھے۔ ریزہ ریزہ ہوگئے تھے۔ ہاں، اسما کو یاد تھا۔ جب ایک شام ماموں جھکے سر سمیت شادی کا سندیسہ لے کر پہنچ گئے تھے۔

شادی؟ بھلا کس کی شادی؟ ماموں نے تو چاروں بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔ اور فرید تو ابھی چھوٹا ہی تھا۔ امی تو ایسی سکتے میں تھیں جیسے کسی کے مرگ کی اطلاع مل گئی ہو۔

کیونکہ خبر ہی ایسی تھی۔ فرید کی شادی ... وہ فرید جو ابھی انٹر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بھلا فرید کی شادی بھی ہو سکتی تھی؟ بہت ہی پڑھاکو اسما کے لیے بڑی دلچسپ خبر تھی۔

تاہم امی کے لیے بڑی تکلیف دہ خبر تھی۔ ماموں کو شادی کی مبارکباد دے کر امی کو ایسی چپ لگی کہ پھر ٹوٹی ہی نہیں تھی۔

اسما کو امی کے "صدمے" کی پروا نہیں تھی۔ لیکن اس نے شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھرپور تیاری کرلی تھی۔ آخر اس کے ماموں کا اکلوتا بیٹا تھا ... وہ کیوں نہ جاتی؟

اور گئی تو امی بھی تھیں ... مگر وہاں پہنچ کر جیسے دھچکا لگا تھا۔ وہ گھر شادی والا تو نہیں 'مرگ والا' ضرور لگتا تھا۔

فرید کی شادی پہ صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ مامی امی کے گلے لگ کر ایسے بین کر کر کے روئیں کہ اسما گھبرا گئی۔ ماموں کی بیٹیوں کے منہ بھی اترے ہوئے تھے۔ ماموں بھی پریشان اور خاموش تھے۔

پھر اس شادی کا پس منظر جلد ہی معلوم ہوگیا تھا۔

فرید کی بنگالن چمپا کی بیٹی سے شادی تھی۔ خالصتاً" فرید کی ضد، جنون اور منہ زور جذبوں کی بنا پہ۔

مامی نے روتے ہوئے پورا قصہ سنا ڈالا تھا۔

"بنگالن جانے کہاں سے اٹھ کر آئی تھی۔ اللہ جانے کس گھر کی باسی تھی۔ ہمیں تو اس کا کچھ اتا پتا معلوم نہیں۔ ہمارے محلے کے پیچھے جو کچی بستی کو جاتی سڑک ہے۔ اسی سڑک کے آخر میں اس کا گھر تھا۔ محلے میں لوگوں کے گھر لحاف سیتی اور سلائی کا کام کرتی تھی۔ بس اسی کی چڑیل بیٹی میرے ہیرے سے بچے کو

اڑا کر لے گئی۔ ایک دن منہ اٹھا کر فرید کے ابو کی منت کرنے لگی۔ آپ کا بیٹا حساب میں بہت قابل ہے۔ میری بچی کو حساب کے پرچے کی تیاری کروا دے۔ دو مرتبہ م بخت فیل ہو چکی تھی۔ بس تمہارے بھائی کی خدا ترسی نے یہ دن دکھایا۔ اس جادوگرنی کو فرید کے سامنے لا بٹھایا۔ بس وہ دن اور آج کا دن۔ فرید کو کچھ سوجھتا نہیں۔ چھ مہینے اسے حساب پڑھاتے پڑھاتے عشق کے حساب بھی پڑھنے لگا۔

پاگل کر دیا اس نے فرید کو۔ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کہتا ہے 'اسی سے بیاہ کرے گا۔ ہم نے سمجھا بجھا کر دیکھ لیا۔ چمپا 'لڑکی کو کہیں بیاہنے لگی تو معاملہ خراب ہوا۔ فرید کا جنون سر چڑھ کر بولنے لگا۔ کہتا 'ابھی کے ابھی نکاح پڑھوائیں۔ اس کی ضد پہ تمہارے بھائی نے سر جھکا دیا۔ بنگالن کے گھر رشتہ والا تو وہ خوشی کے مارے ہمارے پیر پکڑنے لگی۔ کم بختوں کے نصیب جاگ گئے تھے۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔'

مامی کی آنسوؤں میں بھیگی داستان نے اسما کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ اسے تو فرید کی پسند دیکھنے کا شوق تھا۔ اور جتنا شوق چڑھا تھا۔ اتنی جلدی اتر بھی گیا تھا۔ وہ شام روپ کے سانولے روپ کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔

کیونکہ فرید کی پسند مانو سیاہ رات کی مانند تھی۔

گہری سانولی' درمیانہ سا قد اور بس مناسب نقوش۔

ہاں 'اس کی آنکھیں کسی بھی ہوش مند کو دیوانہ بنا سکتی تھیں۔ اور اس کے سیاہ بال۔ اسما کو یقین ہو گیا تھا کہ فرید کو ان پاگل کر دینے والی آنکھوں نے دیوانہ بنایا ہو گا۔

یوں شادی بخیر و خوبی نمٹ گئی اور اسما امی کے ہمراہ واپس اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔

فرید کی شادی کا قصہ ٹھنڈا پڑا تو اسما اپنی پڑھائی میں گم ہو گئی۔ لیکن پورے چھ مہینے بعد ایک مرتبہ پھر فرید کے ہی قصے نے اسما تو کیا امی کو بھی "ہلا" کر رکھ دیا تھا۔

"فرید کی بیوی گھر سے بھاگ گئی تھی۔"

اس خبر نے تو امی کا سکون تلپٹ کر دیا۔ امی راتوں رات ماموں کے گھر چلی گئیں۔ وہاں پہ بھی ایک قیامت منتظر تھی۔ شام روپ فرید کے عشق 'جنون اور دیوانگی پہ لعنت صرف چھ مہینے بعد ہی بھاگ گئی تھی۔ کہاں گئی تھی؟ اس کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

سب سے بڑی بات جو امی اور ماموں کو مارے ڈال رہی تھی یہ۔ اس کی کوکھ میں ان کا خون پل رہا تھا۔ مامی اور ماموں تو مارے شرمندگی اور صدمے کے سر نہیں اٹھا پاتے تھے اور فرید کی حالت تو بہت خراب تھی۔

شام روپ کے گھر سے بھاگنے کے کچھ ہفتوں بعد ہی عدالت کی طرف سے ایک نوٹس مل گیا تھا۔ جلد ہی حقیقت کھل گئی تھی۔

پتا چلا کہ بلوچستان کے کسی شخص پہ فریفتہ تھی۔ اس کی ماں چمپا 'بیٹی کے عشق سے خوف زدہ ہو کر اپنا شہر ہی چھوڑ آئی۔ یہاں آکر بیٹی کو اسکول میں داخل کروایا۔ بنگالن محنت مزدوری کرنے لگی اور ماموں کی منت کی تاکہ شام روپ دسویں کا امتحان پاس کر کے کسی نوکری سے لگ جائے۔

اس کے بعد کا قصہ تو معلوم ہی تھا۔ جانے کیسے وہ اپنے شام جیسے روپ سمیت فرید کے دل میں سما گئی تھی۔ ادھر چمپا کو اپنے سر سے بلا اتارنی تھی۔ بیٹی کے عشق کا بھوت اتارنے کے لیے رشتے ڈھونڈتی پھر رہی تھی جب صدیق ماموں نے اپنے بیٹے کا رشتہ پیش کر دیا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ فوراً "ہاں" کے ساتھ ہی نکاح کر دیا۔ اور اپنے تئیں بیٹی کا مستقبل محفوظ کر دیا۔ لیکن اس کا عاشق صادق اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آ گیا۔ پچھلے رابطے بحال ہوئے تو شام روپ نے نہ شوہر کی پروا کی نہ عزت دار سسر اور محبت کرنے والی ساس کو دیکھا۔ ایک رات چپکے سے مختصر خط لکھ کر بھاگ گئی تھی۔ اس خط میں اس نے گلفام خان سے محبت کا اقرار کیا اور فرید کے نام معذرت لکھی۔

گلفام خان کی مدد سے ہی وہ انتہائی دیدہ دلیری سے کورٹ میں پہنچ گئی تھی۔ اور ماموں کو پہلا نوٹس بھی کر رہی

دل ہار بیٹھے تھے۔ پھر تو فرید نے بھی طلاق دینے میں لمحہ نہیں لگایا اور عدالت کی پہلی پیشی میں ہی فیصلہ ہو گیا۔

فرید کے اندر سے شام روپ کے نام کا چراغ بجھ گیا تھا۔ اس محبت کے نام پہ اس نے اتنی ذلت 'خواری اور رسوائی اٹھائی تھی کہ محبت کے نام سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔

پھر کتنا ہی عرصہ وہ لوگوں کی باتوں 'طعنوں اور طنزیہ گفتگو' تبصروں سے چھپتا رہا تھا۔ دل چاہتا تھا خود کو ختم کرلے۔ لیکن مرنا بھی آسان کہاں تھا؟ اپنے ماں باپ اور بہنوں کے لیے جینا تھا۔ اس نے پہلے ہی ان سب کے بہت دل دکھائے تھے اب اور کیسے پریشان کرتا۔

شام روپ اپنے نام کے ساتھ ہی اس کی زندگی سے ڈھل گئی تو ابو اور امی کے مجبور کرنے پر اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرلیا۔

یوں لگتا تھا۔ ماضی کے چھ مہینے زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔ اس نے خود کو پڑھائی میں مصروف کرلیا تھا۔ لیکن دل کے اندر ایک عرصے تک حشر ہی بپا رہا۔ اسے شام روپ کے جانے کا غم نہیں تھا۔ اس ذلت' رسوائی اور جگ ہنسائی کا صدمہ نہیں تھا۔ دکھ تو اپنی محبت اور پسند پہ تھا۔ اس نے کس انگارے کو ہیرا سمجھ کر چھو لیا تھا۔ جس نے اس کے پورے وجود کو جلا کر راکھ کر دیا۔

گو کہ صدمہ بہت بھیانک تھا لیکن آہستہ آہستہ اپنی وقعت کھو گیا۔

اس کا حساب میں ایم اے ہوا تو ابو کی دکان کا حساب اس کے سر آ گیا۔ اسے اپنی زندگی کی ہر وہ شام بھول چکی تھی جس میں کہیں بھی شام روپ کا کوئی عکس تھا۔ یوں زندگی کا کھویا ہوا تسلسل بحال ہوتا چلا گیا۔

عشق کا خمار اتر گیا۔

ایک دن ابو نے اس سے شادی کی بات کی تو وہ ان کے سامنے انکار نہ کرسکا۔ گو کہ شادی کی خواہش تو نہیں تھی لیکن وہ کسی بے وفا عورت کی خاطر اپنی زندگی کو کیوں ویران کرتا' اپنوں کو اور دکھ کیوں دیتا۔

سو اس نے شادی کے لیے اقرار کیا تو ابو' امی نے پھوپھو کی چوکھٹ پکڑلی' یوں اسما کو اس کی زندگی میں شامل کرکے ہی سانس لیا تھا۔

یہ تو فرید کو بعد میں ہی پتا چلا۔ اسما اس شادی پہ سخت ناخوش تھی اور اسے پھوپھو نے بہت مجبور کرکے فرید سے بیاہا تھا۔ فرید کے لیے ایک اور صدمہ اور احساس زیاں تیار تھا۔

بس یہ اس کے نصیب کا ہی ہیر پھیر تھا۔ اسے دو بیویاں ملیں۔۔۔ اور دونوں کی محبت نہ مل سکی۔ گو کہ وہ دونوں کے ساتھ ہی مخلص رہا تھا۔

فرید کے لیے یہ معمولی غم نہیں تھا۔ اسما کے اکھڑے تیوروں کے ساتھ نباہ کرنا بھی معمولی نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنے حسن عمل سے ازدواجی زندگی کی گاڑی کو گھسیٹ ہی لیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ مزید جگ ہنسائی نہیں چاہتا تھا۔ یوں فرید کی وسیع القلبی کی بدولت اسما کے ساتھ وقت گزرنے لگا تھا۔ بہت اچھا نہ سہی مگر برا بھی نہیں تھا۔ شادی کے چار سال یوں ہی گزر گئے۔ اسما کو اولاد کی بہت چاہ تھی۔ اس نے طرح طرح کے علاج بھی کروائے۔ دم درود بھی' ہر طرح کے ٹوٹکے بھی آزما لیے لیکن من کی مراد بر نہیں آئی تھی۔

فرید نے کبھی اسے روکا نہیں تھا۔ تاہم اس نے کبھی اسے بتایا بھی نہیں تھا۔ شادی کے چند مہینے بعد ہی میڈیکل رپورٹ نے ثابت کردیا تھا کہ اسما ماں نہیں بن سکتی۔ اس کے باوجود فرید نے اور اس کی ماں بہنوں نے اسما کو خبر تک نہیں ہونے دی۔ وہ اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو بھی تھا۔ اسے اسما سے ایسا لگاؤ تھا جو شاید لفظوں میں بیان نہ کیا جاتا۔۔۔ اور کوئی یقین بھی نہ کرتا۔ اسما بھی یقین نہ کرتی۔ فرید کے لیے جو اسما تھی۔ وہ کوئی بھی نہیں تھا۔ شام روپ بھی نہیں۔۔۔ اور شام روپ اسما جیسی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر یوں ہی وقت گزرنے لگا اور ایک دن چمپا امی کے پاس دو بچوں کو بغل میں دبا کرلے آئی۔ وہ بچے کون تھے' اور وہ انہیں کیوں لائی تھی؟ یہ تو پوچھنے کی ضرورت

ہی نہیں تھی۔ وہ بچے اپنے عکس اور نقش سے فرید کا پرتو تھے۔ وہ فرید کے بچے تھے۔ جنہیں ماں نے سینے سے لگایا تھا۔ وہ انہیں دھتکار نہیں سکی تھیں۔ وہ انہیں کیسے دھتکار دیتیں۔۔۔ جب چمپا خود بتا رہی تھیں۔

"وہ بدذات انہیں میرے دروازے پر پھینک کر چلی گئی تھی۔ اندھیری سرد رات تھی۔ ان کی زندگی تھی جو بچ گئے تھے۔ میں غریب بیوہ عورت محنت مزدوری کر کے انہیں پالتی رہی۔ در در دھکے کھاتے رہے۔ بھوکے ننگے رہے، مزدوریاں کرتے، کام کرتے انہیں میری چوکھٹ پہ پھینک کر بھاگ جانے والی اسی رات اندھی گولیوں کا شکار ہو گئی تھی۔ پشاور بائی وے پہ گلفام خان کے چچیرے بھائیوں نے دونوں کو موقع پہ گولیوں سے بھون ڈالا۔ ان کی بہن کو طلاق دے کر جو آیا تھا۔ پھر اس کا انجام تو یہی ہونا تھا۔۔۔ اور میری بدبخت بیٹی کو آپ کے گھر کی عزت نہ راس آئی۔ ذلت کا طوق لے کر ہی لاوارث دفن کر دی گئی۔ مجھے تو اس کی قبر کا بھی نہیں پتا۔ خدا کا واسطہ ہے ان بچوں کو اپنا لیجیے۔۔۔ انہیں ان کی بدبختماں کے کرموں کی سزا مت دیجیے۔"

چمپا نے جو المناک داستان سنائی تو ماں کا پورا وجود کانپ اٹھا۔۔۔ بچے سینے سے لگا لیے اور وہ جیسے پرسکون ہو کر واپس چلی گئی تھی۔ پھر ماں نے بیٹیوں کو تو سارا قصہ سنا ڈالا تھا جبکہ اسما اور فرید سے ہر بات چھپالی تھی۔ وہ فرید کے سامنے اس شام روپ کا نام بھی نہیں لینا چاہتی تھیں۔ مبادا فرید کے زخم نہ ادھڑ جائیں۔

پھر جب فرید نے بچوں کو دارالاطفال بھیجنے کا فیصلہ سنایا تب ماں کو ساری المناک داستان کا لفظ لفظ سنانا پڑا تھا۔ اب فرید ایسا ظالم یا سنگ دل تو نہیں تھا جو اپنے ہی بچوں کو شام روپ کے گناہوں کی سزا کے طور پر ایک مرتبہ پھر دھکے کھانے کے لیے چھوڑ دیتا۔

اس کا دل بچوں کے معاملے میں خود بخود نرم پڑ گیا تھا۔ اور وہ اسما کو بھی سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر اسما ایسی بدگمان تھی کہ کچھ سنتی ہی نہیں تھی۔

اور اسی بدگمانی میں مبتلا ہو کر اس نے اپنا اور فرید کا اتنا بڑا نقصان کر لیا تھا۔

اگر فرید سے کھل کر بات کر لیتی تو کم از کم اتنا ہی جان لیتی۔۔۔ جس شام روپ کی واپسی کے خوف سے اس نے ان ٹوٹے بکھرے بدحال بچوں کو گھر سے نکالا تھا وہ شام روپ تو نو سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسما سے یہ کیسی خطا ہوئی تھی؟ یہ کیسا گناہ ہوا تھا۔

محض اس خوف کے زیر اثر کہ فرید ان بچوں کی وجہ سے ان کی ماں کو واپس نہ لے آئے؟

نفرت اسے شام روپ سے تھی۔ اس کے بچوں سے نہیں تھی۔

اور اب جب فرید ساری حقیقت بتا چکا تھا تو اسما کی سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے اور کس طرح سے اپنے گناہ کی تلافی کرے؟ وہ ان بچوں کو واپس کس طرح سے لائے جو اپنی خاموشی کے باوجود اس کے اندر ممتا کے کئی احساس جگا کر چلے گئے تھے۔۔۔ وہ کہاں چلے گئے تھے؟ کچھ پتا نہ تھا۔

اسما کے آنسو بہے تو پھر بہتے چلے گئے تھے۔۔۔ وہ فرید کے کندھے سے سر ٹکا کر دھواں دھار رونے لگی تھی۔ یہ ندامت کے آنسو تھے۔۔۔ یہ آلودگی دھو دینے والے آنسو تھے۔

اور وہ پاگلوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"فرید! میرے بچوں کو واپس لے آؤ۔۔۔ اللہ کا واسطہ! انہیں واپس لے آؤ۔ ورنہ میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔ میں خود کو ختم کر لوں گی۔ میں اس احساس کے ساتھ نہیں جی سکتی۔ آخر میں نے کس منہ سے انہیں گھر سے نکلنے کے لیے کہا تھا۔ پلیز فرید!"

وہ سسک سسک کر نڈھال ہو رہی تھی۔ فرید نے اس کے بکھرے وجود کو خود میں سمیٹ لیا تھا۔

"میں انہیں ڈھونڈ لوں گا اسما! وہ ہمارے بچے ہیں۔ بھٹک بھٹکا کر بھی ہمارے پاس ہی آئیں گے۔ اگر ہمارے نصیب میں نہ ہوتے تو شام روپ انہیں اپنی کوکھ میں ہی ختم کر دیتی یا وہ کوڑے کے ڈھیر پر ہی سسک سسک کر مر جاتے۔۔۔ انہیں کوئی ہم سے جدا نہیں کر سکتا۔ کوئی دور نہیں کر سکتا۔ تم حوصلہ رکھو' اللہ نے چاہا تو بہت جلد وہ ہمارے پاس ہوں گے۔"

وہ اس کے کانوں میں امرت ٹپکا رہا تھا۔ اس کے دکھے دل پہ پھاہے رکھ رہا تھا۔ اسے حوصلہ اور تسلی دے رہا تھا۔ کیا اسما نہیں جانتی تھی۔ وہ خود کس قدر اندر سے ٹوٹا ہوا ہے۔ بچوں کی گمشدگی اس کے دل کو کیسے کیسے گھاؤ لگاتی ہے۔ وہ پھر بھی ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔۔۔ اور فرید سے بڑھ کر اعلا ظرف اور وسیع القلب کون ہو سکتا تھا اور اب اسما کو فرید کے لیے اعلا ظرف بننا تھا۔ ان بچوں کو ڈھونڈنا تھا۔ اپنی کم ظرفی کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ اور اسما کو بھلا اب بھی یقین نہ آتا؟ فرید اسے شام روپ سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

کیا وہ اب بھی یقین نہ کرتی؟ جب بدگمانی اور تنگ دلی کا موسم گزر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اس زرد سی سہ پہر میں سبزی منڈی سے نکلتے ہوئے بوڑھی چمپا نے فرید کا بازو پکڑ کر روک لیا تھا۔ فرید کو رکتے دیکھ کر اسما بھی رک کر ٹھٹک گئی تھی۔

وہ چمپا ہی تھی۔۔۔ بڑی بدحال سی شکل سے بیمار لگتی تھی۔ اور اس کی بوڑھی آنکھوں میں بے پناہ شکوے نظر آتے تھے۔ فرید اور اسما نے نگاہ چرالی تھی۔ اور اگر اس نے بچوں کا پوچھ لیا تو وہ دونوں اسے کیا جواب دیں گے؟ وہ شرمندہ تھے اور نظر نہیں اٹھا پا رہے تھے۔

لیکن اس نے بچوں کا نہیں پوچھا۔ بس اتنا کہا۔

"رات قیامت کی تھی۔۔۔ گرجتی بجلی اور خوفناک طوفان میں دل میں آگ سی لگی تھی۔۔۔ جانے کیا من میں آئی۔ محلے کے بچے کو ساتھ لیا اور تمہارے گھر کی طرف بھاگم بھاگ چلنے لگی۔ پر اپنے دل میں آگ سی لگی تھی اور آگ ٹھیک ہی لگی تھی۔ وہ دونوں اس رات بھی لاوارث تھے گیٹ پہ بیٹھ کر اپنی پیدا کرنے والی کو روتے ہوئے۔ جسے جہنم کی آگ بھی قبول نہ کرے گی۔ وہ تو کوڑے کے ڈھیر پہ بھی لاوارث پڑے تھے۔ میرے مالک نے انہیں تب بھی زندہ رکھا اور

اس طوفانی رات میں بھی زندہ رکھا۔ میں دونوں کو ساتھ لے آئی تھی۔ رب کی قسم انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا' پر میرا دل گواہی دے رہا تھا۔ تمہارے گھر میں ان کا ٹھکانا نہیں ہے۔ سوچا' کسی کے گھر چھوڑ دوں گی۔ کام کریں گے اور اپنا پیٹ پال سکیں گے۔ مجھ بوڑھی کی اپنی سانسوں کا کیا بھروسا۔"

چمپا کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو گرنے لگے تھے اور اسما نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ چمپا کے الفاظ نے اسما کے منہ پر کوڑے مارے تھے۔ وہ اس کے سامنے گڑگڑانے لگی تھی۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ اماں! مجھے میرے بچوں کے پاس لے چلو۔ میں عمر بھر تمہارا احسان نہ اتار سکوں گی۔ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی ہے۔ خوشیوں کو اپنے اوپر خود حرام کر لیا۔ اپنی جنت کے دروازوں کو خود بند کر لیا۔ اماں! مجھے میرے بچوں کے پاس لے چلو۔" اس کی تڑپ میں کیا کمال تھا۔ جو دور کھڑے مفلوک الحال سے بچے مقناطیس کی کشش سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے آئے اور اسما سے لپٹ گئے تھے۔ یہ منظر دیکھنے والی آنکھوں کو نم کر گیا۔ فرید نے بھی نگاہ چرا کر آنکھوں میں اتری نمی کو چھپا لیا تھا اور اسما نے اپنے آنسو چھپانے کا کوئی تکلف نہیں کیا۔ بچے بے قراری سے اسما کے وجود میں سما گئے تھے۔ اور اسما ان پہ اپنی محبت اور ممتا نچھاور کر رہی تھی۔ بے دریغ چاہت لٹا رہی تھی۔ اس کا دل ان کی محبت سے لبالب بھر گیا تھا۔ بوڑھی چمپا نے گردن موڑ کر اس منظر کو دیکھا اور مطمئن سی ہو کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔ جبکہ فرید اپنے چھوٹے سے قافلے کے ہمراہ ایک نئی زندگی کے چراغ روشن کرتا گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

پھر ایک سال اور گزر گیا۔ خوشیوں اور چاہتوں کے ہنڈولوں میں گھومتا ہوا۔

اور آج فضہ اور عنید کی سالگرہ تھی۔ ان کی ساری پھوپھیاں دعوت میں مدعو تھیں۔ اسما کا پورا دن مصروف گزرا تھا۔ بچوں کے لیے بہترین لباس سے لے کر کھانے کی ذمہ داری تک سب اسما نے اپنے پاس سے کی تھی۔ ذاتی اخراجات کی مد میں۔

اور سب سے بڑھ کر فضہ اور عنید کی سالگرہ کا فنکشن اور عقیقہ ایک ہی دن رکھا گیا تھا۔ عقیقہ کے بعد اسما نے اپنی چاروں نندوں کو ایک ایک سونے کی انگوٹھی "تحفتاً" دی تھیں۔ اسما کی اس عنایت اور محبت پہ جہاں سب نندیں سرشار تھیں وہیں فرید بھی اسما کے اندر ہونے والی تبدیلیوں پہ بہت خوش تھا۔

جہاں تک بچوں کا تعلق تھا تو وہ اپنی امی کے ابو سے بڑھ کر دیوانے تھے اور بچوں کے ابو صاحب ان کی امی کے دیوانے۔ وہ تو اسما کو اکثر ہی اس حوالے سے چھیڑتا تھا۔

"چلو' ایک بات تو کھل کر سامنے آ گئی اسما! خواب میں ہی سہی' شام روپ کی واپسی کے خیال نے تمہارا کیسا میٹر گھما ڈالا تھا۔ گو کہ میرے بچوں کو وقتی تکلیف ہوئی۔ اور تم نے انہیں اسی خوف کے زیر اثر گھر سے نکال دیا۔ لیکن ایک "احسان" تو تم نے مجھ پہ بھی کر ہی دیا۔ کم از کم مجھے اتنا تو بتا دیا کہ تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی ـــــ محبت ہے۔ ورنہ میں تو ساری عمر اسی غم میں سلگتا رہتا تم پہ زبردستی کا مسلط ہوں اور تم مجبوری کے تحت مجھ سے نباہ کر رہی ہو۔ آخر ایک فائدہ تو ہوا نا! تم نے "عملاً" اظہار محبت کر دیا۔"

فرید کے الفاظ اس کی سماعتوں میں امرت بن کر اترتے تھے اور اسما بر امنائے بغیر ہنستی چلی جاتی تھی۔

چلچلاتی دھوپ اور گرمی، اسٹاپ سے پیدل گھر تک آنا آج کوئی آسان تھوڑی تھا۔ آتے ہی اس نے پہلے شاور لیا پھر کچن میں جھانکا۔
گوشی پسینے میں تر تر روٹیاں سینک رہی تھی۔ دوسرے چولہے پہ سالن رکھا تھا۔

سمیرا گل عثمان

ٹوٹے تارے

"کیا پکایا ہے؟" وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"زہر۔" اس نے آخری روٹی توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھی اور ڈھکن بند کر دیا اس کا موڈ زینی کو دیکھ کر ہی بگڑ گیا تھا۔

"زہر تو کافی لذیذ لگ رہا ہے۔" اس نے خود ہی ڈھکن ہٹا کر ہانڈی کا جائزہ لیا چکن کڑاہی کی خوشبو بھوک کو مزید چمکا گئی تھی۔

چمچے میں لے کر ذرا سا چکھا اور حلق میں جیسے مرچوں کا پھندا لگ گیا پانی کا گلاس وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

گوشی نے اپنی مسکراہٹ کو لبوں کے اندر سمیٹا اور ہاٹ پاٹ اٹھا کر کچن سے باہر نکل آئی۔ اب اس کا رخ اماں کے کمرے کی سمت تھا دوپہر کا کھانا وہیں تناول کیا جاتا تھا۔

دسترخوان پہ سب ہی موجود تھے۔ اماں، اسد، عمر، ابا اور عینی۔

"اماں اس نے سالن میں اتنی مرچیں ڈال دی ہیں۔ پتا ہے نا مجھے تیزابیت کا مسئلہ ہے اور دیکھیں ذرا اس نے میری روٹی بھی نہیں بنائی۔" وہ اپنا شکایت نامہ لیے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

"گوشی۔" ابا نے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

گوشی نے اطمینان سے پہلے اپنی پلیٹ میں بوٹیوں کا ڈھیر لگایا پھر مزہ لیتے ہوئے بولی۔

"ابا آج کل میں اسے روٹی پکانے کی پریکٹس کروا رہی ہوں اس نے خود کہا تھا کہ میں اس کی روٹی نہ بناؤں۔"

"میں نے کب کہا تھا؟" اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"تمہیں کوئی بات یاد کب رہتی ہے اور اچھا کیا جو اس نے روٹی نہیں بنائی تو سسرال میں ڈگریاں کام نہیں آتیں۔ اب کچھ گھرداری بھی سیکھو۔" اماں تو تھیں ہی اس کی ہم خیال اس نے کلن لپیٹ کر نکلنے میں ہی عافیت جانی وہ چپ چاپ آکر دوسرے کمرے میں لیٹ گئی۔ ساتھ والے کمرے سے اب باتوں کی،

مکمل ناول

قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کبھی اس محفل کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔

اس کا دم الجھنے لگا تھا اس نے اٹھ کر جوتے پہنے، دوپٹہ ٹھیک کیا اور ساتھ والوں کی پھر اس سے بھی ساتھ والوں کی چھت پھلانگ کر پھوپھو کے گھر چلی آئی۔ سیڑھیوں کا دروازہ کھلا تھا، کچن سے نت نئی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ لاؤنج خالی تھا۔ اس نے پچھلے دروازے سے کچن میں جھانکا۔ زریاب چپس بنا رہا تھا۔ دوسرے چولہے پہ بریانی دم پہ رکھی تھی۔ اس نے چپس کی پلیٹ میں ہاتھ ڈالا اور اگلے ہی پل اس کی چیخ بڑی بے ساختہ تھی، زریاب کے ہاتھ سے کفگیر گرتے گرتے بچا۔ جو ابھی کچھ دیر قبل زینی کے ہاتھ پہ لگا تھا۔

"تم۔" زریاب اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پہ نظر پڑی تو سخت نادم ہوا۔

"سوری یار! میں سمجھا حماد ہے، وہ کب سے یہاں کھڑا میرے چپس ٹونگ رہا تھا۔" وہ بولتے بولتے اب اس کے ہاتھ پہ برنال بھی لگا رہا تھا۔ جو ہمیشہ وہیں کچن کے کیبن میں موجود ہوتی تھی۔ مگر زینی کے آنسو تھے کہ رکنے میں نہیں آرہے تھے۔

"گھر میں بھی کچھ کھانے کو نہیں ملا، یہاں آئی اور ہاتھ جل گیا۔ صبح ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ سوچنا چاہیے تھا مجھے، جب گھر سے کچھ نہیں ملا تو یہاں سے کیا امید لگاؤں۔" زینی کی دہائیاں عروج پہ تھیں۔

"ارے کیسے کچھ نہیں ملے گا، یہ دیکھو چپس، بریانی، سیلڈ اور کولڈ ڈرنکس، بس تم رونا بند کرو اور جلدی سے شروع ہو جاؤ۔"

"بھائی! اس کے آنسوؤں پر مت جائیے۔ یہ سارا ڈرامہ محض آپ کے چپس ہڑپنے کے لیے ہو رہا ہے۔" حماد کا بھی چپس کا ہی رونا تھا جس کی پلیٹ اب زینی کے سامنے تھی۔

"تمیز سے بات کرو، استاد ہوں میں تمہاری۔" زینی نے مصنوعی رعب جھاڑا۔

"عارضی استاد۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"مستقل بھی ہو ہی جاؤں گی۔" کمال بے نیازی سے کہتی اب وہ اپنے پسندیدہ لنچ سے انصاف کرنے لگی تھی۔

"تمہیں اپنے گھر میں کچھ نہیں ملتا۔ جب بھی کچھ اچھا بنا ہو ٹپک پڑتی ہو بن بلائے مہمان کی مانند۔" حماد کے لیے اب صبر مشکل تھا۔

"حماد تمیز سے بات کرو۔" زریاب نے ڈپٹ دیا۔

"جس کی استانی اتنی ال مینرڈ ہو گی وہ اسٹوڈنٹ بھی پھر ایسا ہی ہو گا۔" اس کا منہ پھول گیا۔

"دیکھا! تمہارے بھائی کو ہینڈل کرنا میرا ہی کام ہے۔" اب وہ اس کی اگلی پچھلی ساری بدتمیزیاں دہرانے والی تھی۔ آخر میں زریاب کو اس کا احسان مند ہو جانا تھا۔ حماد برے برے منہ بناتا احتجاجاً وہاں سے واک آؤٹ کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں سالانہ ڈنر تھا اور روروہ نے اس کا پکا لیا ہوا تھا کہ وہ ضرور آئے۔ مگر وہ کیسے آسکتی تھی، نہ تو اس کے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا تھا نہ ہی ابا نے اجازت دینی تھی اور کوشی جو اس سے پہلے مقرر بن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں جانے کی، ایسی تقریبوں میں بے حیائی کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ بس لڑکے اور لڑکیاں سج سنور کر آجاتے ہیں جو بے تکلفی سال بھر ساتھ پڑھنے میں نہیں ہوتی وہ ایک گھنٹے میں پروان چڑھ جاتی ہے۔ یاد رکھو تم یونیورسٹی صرف پڑھنے جاتی ہو اور ابا نے بھی تمہیں اسی شرط پہ اجازت دی تھی کہ تم کوئی فضول فرمائش نہیں کرو گی۔" پچھلے سال ان کا مری کا ٹرپ تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے ابا کو منایا تھا مگر وہ نہ جانے کہاں سے کان لگا کر سن رہی تھی جو اچانک سر پہ آن کھڑی ہوئی۔

"مری۔۔۔ اف ابا جان! ابھی پچھلے دنوں ہی تو میری

ایک دوست مری جا رہی تھی' راستے میں ان کی بس کھائی میں گر گئی تھی اور ایسے حادثے تو روز ٹی وی' اخبار میں دیکھنے سننے کو ملتے ہیں۔ نہ بھئی ہم تو کبھی تمہیں مری نہ جانے دیں۔" اور وہ محض دانت کچکچا کر رہ گئی تھی۔ جانے یہ کون سی خفیہ دوست تھی۔ ایسا کوئی حادثہ اس کے ماضی میں تو کیا ابا کے ماضی میں بھی کبھی کسی کے ساتھ رونما نہیں ہوا تھا۔

اس کا دل چاہا کہہ دے' دوست کے ساتھ تم بھی چلی جاتیں نا۔ بس بھی گری اتنے لوگ بھی' آخر کیا فائدہ ہوا۔

"بیٹا' بڑی بہن ہے تمہاری۔ اسے تمہاری فکر ہے۔" وہ تو پہلے ہی بڑی مشکل سے مانتے تھے مگر اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زینی کا بس چلتا تو اس بڑی بہن کو جادو کی چھڑی سے غائب کر دیتی۔ گوشی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خوب ہنسے' قہقہے لگائے زینی کی ہر خوشی چھین کر اسے ایسے ہی خوشی ملتی تھی۔

اسے زینی سے نفرت تھی' شدید ترین نفرت۔ وہ ابا کی بھتیجی تھی۔ ان کے مرحوم بھائی کی بیٹی۔ وہ جب اس گھر میں آئی تو چار سال کی تھی۔ چچا اور چچی کی اچانک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کے بعد ابا نے چچا کا مکان کرائے پر چڑھا دیا تھا اور اسے گھر لے آئے تھے۔ پہلے تو گوشی کو وہ اچھی لگی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اس سے چڑنے لگی تھی۔ وہ ابا اور اماں کی اکلوتی بیٹی تھی اس سے دو چھوٹے بھائی تھے۔ وہ گھر میں سب سے بڑی تھی۔ ابا اور اماں کی لاڈلی' اسے گھر میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ سب اس کے ناز نخرے اٹھاتے تھے۔ مگر جب سے یہ آئی تھی ہر طرف زینی زینی ہو رہا تھا۔

"گوشی اپنی گڑیا اس کو دے دو' دیکھو وہ چھوٹی ہے نا اور اس کی امی بھی نہیں ہیں۔" رات کو وہ ابا کے پاس

سوتی تھی اور اب ابا اس سے کہتے تھے۔

"گوشی! تم بڑی ہو نا' زینی چھوٹی ہے۔ اس کو ڈر لگے گا تو وہ میرے پاس سو جائے" زینی اور اسد ہم عمر تھے۔

عمر اس سے دو سال بڑا تھا اور گوشی اس سے چار سال بڑی تھی۔ اماں کی طبیعت آج کل پھر سے بے چین رہنے لگی تھی۔ اپنے بچوں کو سنبھالنے سے زیادہ مشکل تھا زینی کی دل جوئی کرنا' وہ بات بات پر رونے بیٹھ جاتی تھی اس کی ایک ہی رٹ ہوتی۔

"مما پاس جانا ہے۔" کبھی بلند آواز سے پکارتی۔

"بابا آجاؤ۔" ایسے میں سب دکھی اور افسردہ ہو جاتے۔ اماں سب کو اس کا خیال رکھنے کو کہتیں "ابا ہر سے چیز لاتے تو سب سے زیادہ زینی کو دیتے" اسے گود میں بٹھا کر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے۔

سب مل کر کرکٹ کھیلتے تو بیٹ زینی کے ہاتھ میں ہی رہتا۔ باقی سب کو ابا بال کروانے میں لگا دیتے اور ایسے ہی کبھی فٹ بال کی شامت آجاتی۔

"سائیکل۔ جھولا بھی بس زینی کو ملے گا۔" ابا ان دنوں گوشی کو بالکل بھول چکے تھے۔ ان کے حواسوں پر ہر وقت بس زینی سوار رہتی کہ کیسے اسے اتنے بڑے غم سے نکالا جائے' کیسے اسے بہلایا جائے کہ وہ یہ سانحہ بھول جائے۔

بالآخر ابا کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ جیسے جیسے وہ ان میں گھلتی ملتی رہی تھی ویسے ویسے گوشی کو لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی ہر چیز پر قابض ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے اس کی گڑیا پھر ابا' اماں' دونوں بھائی اور اب اماں نے اس روئی کے گدے جیسی پیاری سی جاپانی گڑیا کو بھی اس کی گود میں لٹا دیا تھا۔ وہ تالیاں بجاتی' بے تحاشا خوش ہو رہی تھی۔

"یہ میری بہن ہے بس میری' خبردار جو اب اسے ہاتھ لگایا تو۔" گوشی نے عینی کو اس کی گود سے چھین لیا تھا' جس پر وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی تھی۔ اماں کچن سے دوڑی آئیں۔

"کیا ہوا ہے۔"

"عینی کو اٹھاتا ہے۔" وہ پاؤں پٹخ پٹخ کر رو رہی تھی۔

"اماں! یہ عینی کو نیچے گرا رہی تھی اگر میں نہ آتی تو عینی گر جاتی۔"

"اف میرے خدا! اس لڑکی نے تو زندگی عذاب کردی ہے۔ چپ کرو ورنہ واش روم میں بند کردوں گی۔" کاموں میں الجھی لیاں کا پارہ چڑھ جاتا وہ اسے ڈراتی' دھمکاتی' کبھی کبھار تھپڑ بھی لگا دیتیں۔ گوشی کو بھی خوب مزہ آتا تھا۔

وہ اس کی شکایتیں بڑھا چڑھا کر اماں کو بتاتی تھی۔
اس نے اسکول جانا شروع کیا تو گوشی نے اس کے بیگ میں دوسرے بچے کی کاپی ڈال دی پھر روز اس کے بیگ سے کبھی کلر' کبھی پنسل' ربڑ اور کبھی بکس برآمد ہوتیں۔

ایک روز پرنسپل نے اماں کو اسکول بلوالیا اور بتایا کہ آپ کی بیٹی کو چیزیں چرانے کی عادت ہے۔ اس کی تربیت پر توجہ دیں۔

اماں کا شرمندگی کے مارے برا حال تھا۔ غصے میں انہوں نے زینی کا ہاتھ جلا دیا۔ وہ ساری رات روتی رہی۔ اس کی ہتھیلی پر چھالا بن گیا تھا۔ اسے لگتا تھا اب کوئی اس سے پیار نہیں کرتا۔ اسد اور عمر بھی اب اس کے ساتھ نہیں کھیلتے تھے۔ گوشی نے ان کو بھی اس کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔

ساتھ والوں کی گیند ان کے صحن میں گری تو اسد نے چھپالی۔ انکل لینے آئے تو زینی نے بتا دیا تھا کہ بال اسد کے پاس ہے۔ اب اسد اس سے خفا ہو گیا تھا اس نے اماں سے بھی کہا تھا کہ وہ چور نہیں ہے مگر اماں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ گوشی ابا سے جھوٹی شکایتیں نہیں لگاتی تھی۔

"ابا اس کی ٹیچر کہہ رہی تھی کلاس میں سب سے نکمی ہے یہ' اگر آپ نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو اس سال فیل ہو جائے گی۔"

اور ابا نے کہہ دیا تھا کہ آج کے بعد جب بھی دیکھوں تم مجھے پڑھتی ہوئی نظر آؤ۔ اس نے کھیل کود سب چھوڑ دیا تھا اور کتابی کیڑا بن گئی تھی۔ اب وہ ہر وقت پڑھتی رہتی اور گوشی اماں کے ساتھ کام کرواتی' بھائیوں کے ساتھ کھیلتی' عینی کو اٹھا کر سارے محلے میں گھومتی' وہ پھر سے اماں کی فیورٹ بن گئی تھی۔ اسد اور عمر بھی ہر وقت آپا آپا کرتے تھے اور عینی تو تھی ہی اس کی لاڈلی۔

زینی سے اب کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ محدود ہو گئی تھی' خود میں سمٹ گئی تھی اس کی ذات میں ایک عجیب سا احساس کمتری اجاگر ہونے لگا تھا۔ وہ ہر سال اسکول سے انعام لے کر آتی تھی۔ بس ایک یہ دن ایسا ہوتا تھا جب بابا اس پہ فخر کرتے تھے لیکن ابا کے جانے کے بعد گوشی خاندان بھر میں سب کو بتاتی کہ یہ انعام اس کا ہے۔ وہ فرسٹ پرائز لے کر آئی ہے۔ یہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا پھوپھو زریاب کے ساتھ آئی تھیں۔ گوشی انہیں اپنے سارے پرائز دکھا رہی تھی پھوپھو نے "ماشاء اللہ" کہہ کر اسے بے ساختہ پیار کیا تھا۔ ساتھ پانچ سو کا نوٹ انعام بھی دیا۔ وہ مسرور سی ہر طرف اڑتی پھر رہی تھی۔ زینی کا دل عجیب ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر باہر برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد زریاب اس کے پاس آیا تھا۔

"زینی! تمہیں کوئی انعام نہیں ملا۔ گوشی کہہ رہی تھی تم کلاس میں سب سے نالائق اسٹوڈنٹ ہو۔" وہ اس کی جانب فکر مندی سے دیکھ رہا تھا۔ منیر ماموں اس سے بہت پیار کرتے تھے اور ان کی اکلوتی بیٹی اسے بے حد عزیز تھی۔ زینی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی گرنے لگا تھا۔

"یہ سارے پرائز میرے ہیں' گوشی ہر بار اپنے نام لکھوا لیتی ہے۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ زریاب اس انکشاف پر بھونچکا رہ گیا تھا۔

"اٹھو ادھر سے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے گیا تھا جہاں کھانے کے بعد اب چائے کا دور چل رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اماں اپنے پسندیدہ موضوع یعنی کہ گوشی کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔

"بہت کام کرتی ہے۔ ماشاء اللہ سے اس نے سارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔ بہت سگھڑ اور سلیقہ شعار ہے۔ ہر کام میں طاق ہے۔ ایسی بچیاں آج کل کہاں ملتی ہیں۔

بہن بھائیوں کا خیال رکھنا' کھانا بنانا' کپڑے سلائی کرنا' ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لے کر آتی ہے' میں تو کہتی ہوں۔ جس گھر میں جائے گی اسے جنت۔۔"

سب نے بڑے عجیب سے انداز میں روئی روئی سی زینی کا ہاتھ پکڑے زریاب کو دیکھا تھا۔

"گوشی۔۔ گوشی۔" اس نے بلند آواز سے گوشی کو پکارا تو زینی اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے پہلے حیران پھر پریشان لب کھولتی' آنکھیں دکھاتی اسے باز رکھنے کی کوشش میں عجیب ہونق سی ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے زریاب۔" پھوپھو نے ذرا سختی سے پوچھا' اتنے میں گوشی بھی آچکی تھی۔

"گوشی! امی نے جو تمہیں پانچ سو کا انعام دیا ہے وہ زینی کو دو کیونکہ اس انعام پر زینی کا حق ہے۔" اسد اور عمر کو چائے پیتے پیتے اچھو لگا تھا۔ اماں کپ میں چائے ڈالتے ہوئے رک گئیں۔ پھوپھو کی پیشانی پر ان گنت بل نمودار ہوئے۔ زینی کا دل چاہا آنکھیں بند کرے اور کہیں غائب ہو جائے اور گوشی لے تو جیسے کسی نے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ' حواس اڑے اڑے سے عجیب گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"زریاب کیا بد تمیزی ہے یہ۔" سب سے پہلے پھوپھو نے ڈپٹا تھا۔

"امی یہ سارے انعامات زینی کے ہیں۔ گوشی تو بمشکل پاسنگ مارکس لیتی رہی ہے۔" زینی کے اشاروں' ملتجی نگاہوں اور گوشی کے اترے ہوئے چہرے کی پروا نہ کرتے ہوئے بالآخر اس نے سچ اگل دیا تھا۔ پھوپھو تو حیران ہوئیں سو ہوئیں اماں کا خفت کے مارے برا حال ہو گیا۔ وہ پھوپھو سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں اور پھوپھو کی نگاہوں کا سامنا کرنا اب کوئی آسان تھوڑی تھا۔ پھوپھو ان دنوں ہی سے پاکستان نئی نئی شفٹ ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کا یہ جھوٹ انہیں حیران کر گیا تھا۔

"عذرا بھابی! یہ کیا کہہ رہا ہے زریاب۔" وہ اماں سے ہی مخاطب ہوئیں۔

"پھوپھو! آپ یہ شامی کباب کھائیں نا۔" گوشی نے جلدی سے پلیٹ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھمائی۔

"اور یہ زینی توبہ اتنا جھوٹ بولتی ہے۔ اب پتا نہیں زریاب کو کیا الٹی سیدھی پٹی پڑھا دی۔ اس نے کبھی ہمیں اپنا سمجھا ہی نہیں' جانے اس کے دل میں کیا چلتا رہتا ہے۔ اماں تو خود اس کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔ ہر وقت لڑنا جھگڑنا اور فساد ڈلوانا۔ بس اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ ابا تو خود آج کل میں اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانے والے ہیں۔"

گوشی تیز تیز بول رہی تھی مگر پھوپھو نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرے تھے۔ وہ الجھی نظروں سے زینی کو دیکھ رہی تھیں جو گوشی کا تبصرہ آرام سے سن کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"اماں! جب کوئی ہمارے گھر آتا ہے تو اس کو کمرے میں بند کر دیا کریں۔ آج اگر میں بات نہ سنبھالتی تو کتنی بے عزتی کروا دیتی تھی اس نے آپ کی۔ سارا بنا بنایا امیج ایک پل میں خراب کر دیا۔۔ ہمیشہ سے ہی میری خوشیوں کی دشمن ہے۔" پھوپھو کے جانے کے بعد گوشی اب خوب جلی بیٹھی تھی۔

اماں کو خود اس پہ غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ سے ہی گوشی کے ساتھ زریاب کو سوچا تھا اور زینی کی اس حرکت سے سب گڑبڑ ہو سکتا تھا۔

✿ ✿ ✿

دوسری جانب پھوپھو کے دل میں بال آ گیا تھا۔ انہیں گوشی کی ساری تعریفیں جھوٹ لگ رہی تھیں۔ انہوں نے زریاب کو زینی کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی اور وہ تو گویا اب زینی کا۔۔ سایہ ہی بن گیا تھا۔

اس کی خبر گیری کرنا' اس کے کام آنا' اس کی ذرا سی تکلیف پہ پریشان ہو جانا' اسٹڈی میں اس کی ہیلپ کرانا' اس کے لیے سبجیکٹ' کالج اور بکس کا انتخاب کرنا زریاب کے ذمے تھا۔ اور زینی سوچتی تھی زریاب بھائی کتنے اچھے ہیں۔ اس کے لیے کتنے فکر مند رہتے ہیں اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ گوشی نے انٹر کے بعد

اوپن یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا جو پچھلے چار سال سے کلیئر نہیں ہو رہا تھا اور آج کل وہ زینی کے سر ہو رہی تھی کہ وہ اس کا انگلش کا پیپر دے دے۔

"تم مجھ سے پڑھ لو۔ اچھی تیاری کے ساتھ ایگزیم دو گی تو پاس ہو جاؤ گی۔" زینی نے تو اپنی جانب سے مخلصانہ مشورہ دیا تھا جو اسے کسی تیر کی مانند لگا۔

"اچھا اب تم میری استانی بنو گی۔" اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

"اوہو! اگر محترمہ کی خود ساختہ آن پہ کوئی حرف آتا ہے تو ٹھیک ہے تم مجھے زینی کہہ لینا۔" ٹانگ جھلاتے ہوئے اس نے مزے سے تیلی لگائی۔

"منہ دھو رکھو۔ اگر مجھے ٹیوشن ہی لینی ہو گی تو میں زریاب سے لوں گی۔"

"شوق سے، پھر وہ بھی تو تمہاری ذہانت سے فیض یاب ہوں گے۔" اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور گوشی تو جیسے جلتے توے پہ بیٹھ گئی۔

"اور جیمز بانڈ کی خالہ تو تم ہی ہو، کشش ثقل تم نے ہی تو دریافت کی تھی، مادام کیوری نے تم سے پوچھ کر ٹیلی ویژن بنایا ہو گا۔"

"تم نہ مانو تو تمہاری مرضی۔" اس نے ہاتھ جھاڑ لیے۔

"تمہیں سالانہ ڈنر پہ جانا تھا میں اس کی اجازت دلوا سکتی ہوں، میرا نیا سوٹ بھی پہن لینا۔" اب وہ خوشامد پہ اتر آئی تھی۔

"تو تیور۔" اس نے دائیں بائیں گردن جھلائی۔

"ابو سے کہوں گی، میں دیکھتی ہوں تم کیسے ایگزام نہیں دیتیں۔" وہ دھمکی دے کر کمرے سے نکل گئی تو عینی نے بڑی معصومیت سے اسے دیکھا۔

"زینی! دے دو نا گوشی آپی کا بی اے کلیئر ہو جائے گا۔ ابا کو کتنا شوق ہے کہ ان کے سارے بچے اعلا تعلیم یافتہ کہلائیں۔"

"تم کیوں نہیں دے دیتیں۔"

"میرا تو اپنا پیپر ہے۔" اس نے منہ بسورا۔

"تو اپنے ساتھ بٹھا لینا۔" زینی کو حیرت ہوئی۔ یہ آئیڈیا گوشی کو کیوں نہیں آیا تھا۔

"گوشی آپی کو نقل کرنی بھی نہیں آتی، مجھے کہتی ہیں خود لکھ کر دو۔ اتنی بار پنسل چبھوتی ہیں، مجھے اپنا بھی بھول جاتا ہے۔"

"ہاہاہا۔۔۔ ڈفر۔"

"اب ایسے تو نہ کہیں۔" عینی نے خاصا برا منایا تھا۔

"گوشی کی چمچی ہو۔" وہ کہہ کر اٹھ گئی۔

"زینی! اپنے نوٹس لے لو۔" دروازے پہ زریاب کھڑا تھا۔ اس کی آواز سن کر گوشی باہر آئی تھی اور اس نے زریاب کو نوٹس کے ساتھ چاکلیٹ پکڑاتے دیکھ لیا تھا۔

"ہمارے لیے تو کبھی نہیں لائے۔" وہ درمیان میں آ کر بولی۔

"تم میں اور زینی میں بڑا فرق ہے۔" وہ بھی زریاب تھا۔ اب گوشی تلملاتی رہے، زینی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ وہ اسی طرح تلملاتے ہوئے اماں کے سر پہ پہنچ گئی۔

"مجھے زینی اور زریاب کے رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں لگ رہے کب کرو گی تم پھوپھو سے بات، جب پانی سر سے گزر جائے گا۔" اور اماں نے تو جیسے دل ہی تھام لیا تھا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ساری بات سن کر وہ کچھ پرسکون ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼
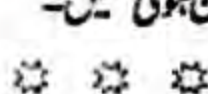
دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔ گھر میں اس وقت وہ اور عینی تھے عینی سو رہی تھی۔ بالآخر اسے ہی اٹھ کر جانا پڑا وہ گوشی کے ایگزیم کی تیاری کر رہی تھی۔ ابا نے رات کو بڑے پیار سے پاس بٹھا کر گوشی کا پیپر دینے کی درخواست کی تھی اور ابا کا کہا وہ کبھی نہیں ٹالتی تھی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں عینی کی فرینڈ۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک قطعی انجان لڑکی اور ایک مرد کھڑے تھے۔

اس نے بتایا کہ اس کی اور عینی کی ایگزیم کے دوران فرینڈشپ ہوئی تھی۔
"اور تم آج گھر تک پہنچ گئیں؟" وہ زیر لب بڑبڑائی عینی کو جگایا اور مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود چھت پر چلی آئی۔ کچھ دیر میں جب وہ واپس جارہے تھے تو وہ منڈیر پہ کھڑی تھی۔ اس آدمی نے پلٹ کر، سر اٹھا کر دو سے تین بار اسے دیکھا تھا۔ اسے بے حد عجیب لگا۔
"بدتمیز۔" وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پائی۔
"اور اگر یہ بدتمیز تمہارا نصیب بن جائے تو۔" عینی جانے کب اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔" وہ اس سے الجھ پڑی۔

☼ ☼ ☼

یہ کیا ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا وہ کمرے میں چکر لگا لگا کر ہلکان ہوگئی تھی۔ زریاب کی وہ مہربان نگاہیں جو ہمیشہ زینی کی جانب اٹھتی تھیں اور ان میں کتنا الگ منفرد اور انوکھا سا تاثر ہوتا تھا۔
"تم میں اور زینی میں بڑا فرق ہے۔" آواز تھی یا کوئی ہتھوڑا، اس کے کان تک چٹخے تھے۔ اسے ڈر تھا کہیں یہ فرق اس کی اور زینی کی قسمت میں حائل نہ ہو جائے۔ وہ کچھ بھی کرلے، یہ بندہ آخر کس مٹی کا بنا تھا جو اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ جیسے پروانے کی طرح اس کے اردگرد چکراتی تھی۔ وہ جب بھی آتا گوشی جیسے ایک ٹانگ پہ کھڑی ہو جاتی مگر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ سے ہی ایک سوال ہوتا تھا۔
"زینی کہاں ہے؟" دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا زینی کی یہ جرأت کہ وہ زریاب کے خواب سجائے۔ اماں تو بہت بھولی ہیں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اور یہ عینی کا بھی رشتہ آ گیا۔ کیسے پینڈو سے لوگ ہیں۔ عینی بھی جانے کیسے کیسے لوگوں سے دوستی گانٹھ لیتی ہے۔" وہ تھک کر بیٹھ گئی۔
"مگر عینی تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔" یکدم اس کی آنکھوں کی چمک بڑھی۔
"عینی چھوٹی ہے تو کیا ہوا، زینی تو شادی کے لائق ہو چکی ہے۔" اس کے دماغ میں کیسے خرافاتی آئیڈیے نے جنم لیا تھا۔
"اماں کو میں منالوں گی اور رہی زینی۔ تو وہ ابا کی بات کیسے ٹالے گی۔"
"عینی تمہاری وہ دوست کیا نام ہے اس کا۔" وہ چھت پر عینی کے پاس چلی آئی تھی۔
"ہاں وہ موموں اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیسی عجیب بات کردی اس نے اماں سے۔ جانے کہاں سے میرے پیچھے پڑ گئی ہے کہنے لگی۔ تم مجھے بڑی پسند ہو۔ بڑی خوب صورت ہو میں تمہیں بھابی بنانا چاہتی ہوں۔ مگر آپی آپا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اماں سے ایسی بات کردے گی۔ اور اس کا بھائی وہ تو اس روز گھور گھور کر زینی کو دیکھ رہا تھا بس اب میں کبھی بات نہیں کروں گی موموں سے۔" وہ بھی خاصا تپ کر بیٹھی تھی۔
"اچھا تو اس کا بھائی زینی کو دیکھ رہا تھا۔" یہ بات تو اس کے دل کو لگی تھی۔
"ہاں۔" عینی نے برا سامنہ بنایا۔
"کل تم میرے ساتھ ان کے گھر چلنا۔"
"میں نہیں جاؤں گی۔ اس نے تو کتنی بار معافی مانگی ہے مجھ سے۔ مگر مجھے نہیں ملنا اب اس سے۔"
"ملنا تو پڑے گا، اب تو ہمیشہ ملنا پڑے گا۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ اگلے روز وہ عینی کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی اور موموں سے گوشی نے کہا تھا۔

"عینی تو بہت چھوٹی ہے۔ ہاں اگر آپ لوگ ہمارے گھر رشتہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو زینی سے کرلیں۔ وہ خوب صورت ہے، پڑھی لکھی ہے۔" جانے کس دل سے مگر زینی کی خوبیوں کا اعتراف اسے کرنا ہی پڑا تھا۔ بات آگے بڑھ کر ایاز تک پہنچی تھی۔ اسے وہ مغرور سی لڑکی یاد آگئی۔
"میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور' وہ کل تین بجے یونیورسٹی سے فری ہوجائے گی۔ تم راستے میں اس سے مل لینا۔ کیونکہ گھر میں تو نہیں مل سکتے۔ ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں میں آپ کی پرابلم سمجھ سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں یونیورسٹی سے باہر ہی مل لوں گا۔"

٭ ٭ ٭

"یہ کیا اتنے رف' بے ڈھنگے سے کپڑے پہن کر روز یونیورسٹی جاتی ہو۔ یہ دیکھو میں نے تمہارے لیے نیا سوٹ خریدا ہے۔ آج تم یونیورسٹی یہ پہن کر جاؤ۔" جوتوں کے اسٹرپ بند کرنے کے بعد اپنا پرس اٹھا کر وہ مڑی ہی تھی جب گوشی اپنا نیا سوٹ نکال کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ زینی کی حیرت قابل دید تھی۔ کہاں تو گوشی اس سے اپنا دوپٹہ تک استری کرواتی تھی اور کہاں یہ بوتیک سے خرید ا گیا نیا سوٹ۔

"لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" زینی کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"میری طبیعت کو کیا ہوتا ہے' تم لیٹ ہو جاؤ گی جلدی سے چینج کرو نا۔" معصومیت کی حد تھی اور کیا لاڈ بھری دھونس تھی۔ زینی کو اس کا خوشگوار موڈ غارت کرنا اچھا نہ لگا اور اس نے سوٹ تھام لیا۔

"پوچھ سکتی ہوں' یہ عنایت کس خوشی میں ہے۔"

"تم نے میرا ایگزیم جو دیا تھا۔ اس بار میں پاس ہو ہی جاؤں گی۔"

"اور اگر نہ ہوئیں تو۔۔۔" زینی کے لبوں سے بے ساختہ پھسلا۔

"تو سوٹ واپس لے لوں گی۔" گوشی نے جوڑا لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ زینی نے ایک بار پھر قدرے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"یہ آج گوشی کو کیا ہوا۔" اور گوشی نے اس کے کپڑے تبدیل کرنے پر شکر ادا کیا تھا۔ ایک مرحلہ تو سر ہوا۔ اب اسے ابا کو منانا تھا۔

٭ ٭ ٭

یونیورسٹی میں معمول کی کلاسز بھگتا کر وہ تین بجے کے قریب فارغ ہوئی تھی۔ آج صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور اب بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ایک کولڈ ڈرنک اور برگر اس نے کینٹین سے لیا تھا' پوائنٹ کے انتظار میں بنچ پر بیٹھی وہ مزے سے برگر کھا رہی تھی جب اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گردن گھما کر دیکھا اور اچھل کر رہ گئی۔

"تم ؟" یہ بدتمیز یہاں کیا کر رہا تھا ؟

"اوہ' تو آپ نے مجھے پہچان لیا۔" وہ خوامخواہ خوش ہو رہا تھا۔

"دو گھنٹے ہو گئے آپ کا انتظار کرتے کرتے شاید میں وقت سے پہلے ہی آ گیا تھا۔" بات کو طول دینے کا آغاز ہوا۔

"تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔" زینی نے آنکھیں پھیلائیں۔

"ارے۔۔۔ میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے تصحیح کی اور زینی کے چہرے پر سیاہ رنگ آ کر اڑ گئے۔ وہ اب اتنی بھی بااعتماد نہیں تھی کہ اس راہ چلتے آدمی سے فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر لڑنے بیٹھ جاتی۔ چار طالب علم اکٹھے ہو جاتے تو اچھا خاصا اسکینڈل بن جاتا تھا اور بات ابا تک پہنچ جاتی تو۔۔۔

یہ الگ بات کہ عین اسی وقت اس سڑک سے گزرتے ہوئے ابا نے اسے دیکھ لیا تھا۔ گوشی بڑی ضد کر کے ابا کو ساتھ لے کر آئی تھی' اس نے سر درد کا بہانہ بنایا تھا اور یہ انکشاف بھی اس پر اسی روز ہی ہوا تھا کہ شاید اس کی آنکھیں کمزور ہیں۔ اب اسے اپنی آنکھیں چیک کروانی تھیں پھر واپسی پر اس نے شور مچا دیا تھا کہ زینی کی چھٹی کا وقت بھی ہو چکا ہے تو اسے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔

ابا نے موٹر سائیکل تو موڑ لی تھی اور اب ساکت و صامت کھڑے تھے۔

"یہ زینی کس کے ساتھ کھڑی ہے۔ اتنی عمر کا آدمی

اسٹوڈنٹ تو نہیں ہو سکتا۔" گوشی نے عقب سے ہو کر جھانکا۔

"ہاں ہاں یہ لڑکا تو مومو کا بھائی ہے۔ ایک روز مومو کے ساتھ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ اچھا! تو یونیورسٹی کے بہانے یہاں یہ چکر چل رہا ہے۔" گوشی کی زبان فراٹے بھر رہی تھی۔ وہ بہت کم وقت میں ایا کو بہت کچھ سنا دینا چاہتی تھی نورالحسن کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ پیشانی سلوٹوں سے اٹ گئی۔

"پوچھ سکتی ہوں کس سلسلے میں آپ یوں خوار ہو رہے ہیں۔"

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ کیا ہم وہاں ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکتے ہیں ورنہ میں آپ کے پیچھے پیچھے گھر تک آؤں گا اور اپنی بات سنا کر ہی دم لوں گا۔" وہ آدمی تو پھیلتا ہی جا رہا تھا اوپر سے دھمکی بھی۔ اس نے سوچا بہتر ہے کہ اس کی بات سن ہی لیتی ہوں۔

جونہی وہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی ایا نے گوشی کو بھیجا کہ اس کو بلا کر لائے گوشی اندر سے ہو کر آگئی تھی۔

"ابا وہ دونوں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کولڈ ڈرنک پی رہے ہیں۔ اب یہاں روڈ پہ کیا تماشا کرنا گھر چل کر ہی بات ہو گی۔" بائیک پہ بیٹھ کر اس نے چلنے کا اشارہ کیا۔ سارا راستہ بے حد خاموشی سے کٹا تھا۔ ابا اسے دروازے پر اتار کر چلے گئے تھے۔

"میری امی آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں۔"

"آپ اپنی امی کو کسی زحمت میں نہ ڈالیں۔ میری ابھی اسٹڈی کمپلیٹ نہیں ہوئی اور ویسے بھی اس حوالے سے آپ مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے بات ختم ہو چکی ہے۔ اب آپ خود کو مزید خوار نہ کریں۔" بغیر کسی لاگ لپٹ کے صاف گوئی سے کہتی وہ اٹھ کر چلی گئی۔

ایاز کو لڑکیاں خاموش فرمانبردار ٹائپ کی اچھی لگتی تھیں مگر یہ تو۔۔۔ اتنی توہین' منہ پہ بے عزتی کر کے چلی گئی۔۔۔ وہ دیر تک بیٹھا سلگتا رہا۔

"اب تو یہ شادی ضرور ہو گی۔" بالآخر اس نے سوچ لیا تھا۔

"دیکھو ذرا اس بدتمیز کی جرأت' گھر جا کر اس عینی کی تو گردن مروڑتی ہوں' اس نے گھر تک آنے کا راستہ دیا تھا۔"

"کیا ہوا اس نے پروپوز کیا۔ تم نے انکار کر دیا۔ بات ختم۔" دل نے ڈپٹ کر خاموش کروا دیا۔ وہ بھی دھیان بٹانے کو ہاتھ میں پکڑی کولڈ ڈرنک پینے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے شاپر سے پھوپھو کا کروشیے والا دوپٹہ نکالا۔ تعلیم سے تو وہ انہیں متاثر نہیں کر سکی تھی اب سوچا ہنر آزما لیا جائے۔ یہ کروشیہ اماں سے سیکھ کر اس نے خود بنایا تھا اس کا رخ اب پھوپھو کے گھر کی سمت تھا جو قریب ہی ساتھ والی گلی میں تھا۔ راستے بھر وہ زینی اور ایاز کے متعلق سوچتے ہوئے آئی تھی۔

"کیا بروقت انٹری دی تھی میں نے۔" ہنستے ہوئے جیسے خود کو داد دی۔ ابا تو اب اس سے متنفر ہو ہی چکے تھے' رہیں اماں۔۔۔ ان کا دل زینی کی جانب سے کبھی میلا نہیں ہوا تھا۔ وقتی غصہ آتا تھا مگر پھر اتر بھی جاتا تھا ان کے اپنی دیورانی کے ساتھ اچھے تعلقات تھے کچھ آخری وعدے کا بھرم تھا۔ انہوں نے بستر مرگ پر اماں کا ہاتھ تھام کر بڑی التجا آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میری زینی کا خیال رکھنا۔" اور سچی بات تو یہ تھی کہ انہیں خود بھی وہ اپنی اولاد جیسی ہی عزیز تھی۔ وہ کبھی زینی کا برا نہیں چاہ سکتی تھیں۔

"اب ایاز رشتہ لے کر آئے گا تو کیا ابا مان جائیں گے۔ کہیں انا' غیرت کو بیچ میں نہ لے آئیں۔" اچانک ایک دوسرے خیال نے اسے پریشان کر دیا۔

"نہیں' ابا کی تو وہ لاڈلی ہے۔ اس کی خوشی کی خاطر دل پہ پتھر بھی رکھنا پڑا تو وہ رکھ لیں گے۔" سر جھٹک کر اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ سامنے ہی پھوپھو کے گھر

کا دروازہ تھا۔ دستک کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔ وہ ایسے ہی اندر چلی آئی اور پھر اندر سے آتی آوازوں پر باہر ہی رک گئی۔

"یہ انگوٹھی دیکھو کیسی ہے۔" پھوپھو کی آواز آئی۔

"آپ کی چوائس ہمیشہ ہی بیسٹ ہوتی ہے لیکن یہ انگوٹھی تو کچھ زیادہ ہی خاص ہے۔" زریاب مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"ہاں بھئی۔ میری بہو بھی تو سب سے خاص ہے۔ بس ایک دو روز میں جاؤں گی بھائی صاحب کی طرف اور زینی کے ہاتھوں میں یہ انگوٹھی پہنا کر ہی واپس آؤں گی۔"

"مما! دیکھیں بھائی تو بالکل لڑکیوں کی طرح بیش کر رہے ہیں۔" حملو کے انداز میں شرارت تھی۔ کلسمی زریاب نے شاید اسے گھورا تھا۔ پھوپھو اب ہنسنے لگی تھیں۔ باہر کھڑی گوشی کے سر پہ تو جیسے آسمان آگرا تھا۔ وہ الٹے قدموں بھاگتی ہوئی گھر لوٹ آئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا شام تک وہ کمرہ بند کیے لیٹی رہی تھی۔ اماں نے کتنی بار فکر مندی سے اسے آکر دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے گوشی! کیوں سر منہ لپیٹے پڑی ہو۔"

"سر میں درد ہے اماں۔ اب کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" اس کی آنکھیں بھی روئی روئی سی تھیں۔ اماں کا دل شام تک ہولتا ہی رہا۔ یعنی وہ تین بار اسے دیکھ کر باہر آگئی۔ شام کے بعد اس کے سیل فون کی بیپ بجی۔ دوسرے جانب ایاز تھا۔

"مجھے آپ کی بہن پسند ہے۔ کب آؤں رشتہ لے کر۔"

"رشتہ سمجھ لو ہو گیا تم منگنی کی تیاری کرو۔" اس نے کہہ کر فون رکھ دیا اب اگلا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔ رات بھر وہ جاگتی رہی، سوچتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"رکو۔" وہ تیار ہو کر یونیورسٹی کے لیے نکل رہی تھی جب ابا کی بارعب آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ وہ مڑی اور ابا کے قریب آکر رک گئی۔ ابا کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں تھی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں جیسے رات بھر جاگتے رہے ہوں اب بھی لگ رہا تھا جیسے خود پہ کڑا ضبط کیے کھڑے ہیں میں اتنی لاعلم کیسے رہی۔ کوئی میڈیسن منگوانی ہو گی مگر یہ اتنے خاموش کیوں ہیں۔ کچھ بولتے کیوں نہیں۔

"رکھ دو کتابیں۔"

"جی۔" وہ کچھ سمجھی نہیں تھی۔

"آج کے بعد تم یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔" کیسا تحکم تھا ان کے لہجے میں، زینی نے بے حد گھبراتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھا اور جیسے جامد ہو کر رہ گئی۔

"مگر ابا۔"

"تو زویا تم نے میرا مان، میرا بھروسہ، وہ جو کوئی بھی ہے اس سے کہو اپنے گھر والوں کو بھیجے چند ہی دنوں میں تمہاری رخصتی ہے۔" وہ فیصلہ سنا چکے تھے۔

"ابا! میری بات سنیے۔"

"ابا! وہ تو رشتہ بھیج چکا ہے۔ کل شام ہی تو آئی تھیں اس کی والدہ اور بہن۔" گوشی جو کمرے کی دہلیز پہ کھڑی تھی۔ اچانک سامنے آکر بولی۔

"اپنی ماں سے کہنا قریب کی کوئی تاریخ رکھ لیں۔" وہ کہہ کر گھر سے چلے گئے۔ زینی کا دل بند ہونے لگا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ عمر اور عباد نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

ان کی بہن پڑھائی کے بہانے کسی لڑکے کے ساتھ گھومتی رہی ہے، سارے شہر میں ان کی عزت نیلام ہو گئی اور وہ بے خبر رہے۔ تف ہے ان پر۔

"گوشی! یہ کیا کہہ دیا تم نے اپنے باپ سے۔" اماں کو زندگی میں پہلی بار گوشی پہ اتنا جلال آیا تھا ورنہ وہ تو سب کا خیال رکھنے والی، اماں کی ہمدرد، غمگسار بھائیوں کے لیے قابل احترام بہنوں کی پیاری سی بڑی آپا تھی۔ وہ بھلا کبھی کچھ غلط کہہ سکتی تھی یا کر سکتی تھی اس پر تو سب آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتے تھے۔

"تو کیا چاہتی ہیں آپ! پھوپھو آئیں اور زریاب کے نام کی انگوٹھی اسے پہنا کر چلی جائیں۔" اس نے انتہائی اطمینان سے پوچھا۔

"کیا کہہ رہی ہے تو۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں نے خود سنا تھا۔" اور پھر اس نے من و عن ساری بات دہرا دی۔ اماں کو سن کر دھچکا تو بہت لگا مگر اب کیا کہہ سکتی تھیں۔

راحیلہ نے ہمیشہ ہی دبے دبے لفظوں میں جتایا تھا کہ ان کی کوئی بیٹی نہیں تو کیا ہوا ان کے بھائی کی بچیاں بھی تو ان کی ہی ہیں اور ایک کو تو وہ ہمیشہ کے لیے گھر لے جائیں گی اور ہر ماں کی طرح انہوں نے بھی پہلے اپنی پہلی بیٹی کا ہی سوچا تھا اور کوثی کی آنکھوں نے بھی تو زریاب کے خواب سجا رکھے تھے۔

"بس پھوپھو کے آنے سے پہلے زینی کی منگنی کر دو' ہمیشہ سے ہی میرا حق چھنتی آئی ہے۔ اس کے ننھیال والے کہاں تھے' وہ پال لیتے اس کو' ابا نے لا کر ہمارے سروں پہ بٹھا دیا اور کوئی جھوٹ نہیں کہہ رہی میں وہ آدمی پسند کرتا ہے زینی کو اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔"

"بے جوڑ رشتہ ہے۔ زینی ایم ایس سی کر رہی ہے اور وہ صرف میٹرک پاس ہے۔ وہ بھی جانے ہے کہ نہیں۔" اماں دوہرے عذاب میں پھنس چکی تھیں۔

"اب تعلیم کون دیکھتا ہے۔ شکل اچھی ہے' زمین دار ہے' بھوکا نہیں رکھے گا تمہاری لاڈو کو۔" اماں کا اعتراض اسے کسی برچھی کی طرح لگا تھا۔ اب بھی وہ اسی کی فکر میں سوکھے جا رہی تھیں' ہاں یہ سچ تھا کہ اماں کو زینی کا بھی احساس تھا' وہ ان کی بیٹی جیسی تھی مگر بیٹی تو نہیں تھی نا۔ اور جو بیٹی تھی آخر اسی کی خوشی کو مقدم رکھنا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ استعجاب و ندامت کے سمندر میں گری ابھی تک ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ یہ ہوا کیا تھا اس کے ساتھ۔ ابا نے آخر اتنی بڑی سزا اسے کیوں سنا دی تھی

کیسا مان۔ کون سا اعتبار' کیسی عزت۔ اس نے تو بڑی محتاط زندگی گزاری تھی۔ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ تک اس نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ پڑھائی میں اچھی تھی۔ اس کے نوٹس سب سے شان دار ہوتے تھے' کبھی کوئی لڑکا اگر اس سے مدد مانگتا تو وہ ایک ہی بات کہتی تھی۔

"کسی لڑکی کو بھیجو۔" اور اب اس سے کیسی بے احتیاطی ہو گئی تھی مگر ابا وہاں کیسے موجود تھے اور یہ کوثی کیا کہہ رہی تھی' کون سی ماں کس کی بہن' کیسا رشتہ وہ بری طرح الجھ رہی تھی۔ کانپ رہی تھی' ابا کی نظروں میں اپنے لیے ایسی بے اعتباری دیکھنا مر جانے کے مصداق تھا۔

"کیا بات ہے زینی باجی! ایسے گم صم سی کیوں بیٹھی ہو۔" حملو جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ہی نقطے پہ نگاہیں مرکوز کیے بالکل ساکت بیٹھی تھی' سانس آ رہا تھا۔ پھر بھی دم گھٹنے جیسی کیفیت سے نبرد آزما تھی۔

"حملو! تم کل آ جانا۔ آج میں پڑھا نہیں سکوں گی۔" وہ بغیر اس کی سمت دیکھے' سپاٹ سے لہجے میں بولی تو حملو جیبوں میں ہاتھ ڈال کر مسکرا دیا۔

"میں آپ سے ٹیوشن پڑھنے نہیں آیا بلکہ آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ امی اور زریاب بھائی آ رہے ہیں آج۔ کچھ خاص پلان ہے ان کا۔ اب میں بھائی کا سرپرائز خراب نہیں کروں گا۔" وہ اسے بولنے پر بوجھنے پر اکسا رہا تھا مگر وہ ویسے ہی خاموش ڈل سی بیٹھی رہی۔ سچ تو یہ تھا اس نے حملو کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ سنی تھی اگر تو سمجھی نہیں تھی۔ سوچنے' سننے' سمجھنے کی کیفیت میں نہیں تھی وہ' لیکن آنکھیں جو کھلی تھیں۔ بھاگتے دوڑتے مناظر اس کی نظروں سے ہو کر گزر رہے تھے۔ کھڑکی کے پاس اس نے اس شخص کو اپنی امی اور بہن کے ساتھ آتے دیکھا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھی رات میں ایک بار پھر ابا سے بات کرے گی۔ ساری بات سن کر وہ مان جائیں گے۔ اس کا اعتبار کریں گے۔

اب جیسے اس کے جسم سے کسی نے روح کھینچ لی تھی۔ عینی نے بتایا تھا کہ اماں نے اس کے نکاح کی تاریخ مقرر کردی ہے۔
گوشی نے اسے سب کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ منسوب کردیا جسے وہ جانتی تک نہیں تھی۔ اس کے کردار پر انگلیاں اٹھیں اور وہ مہر بہ لب تماشائی نظروں سے سب دیکھتی رہی۔ سو وہ اس کی بہن نہیں تھی کبھی بھی نہیں۔ آج ثابت ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

شام کے وقت پھوپھو آئی تھیں زریاب کے ساتھ، اس وقت ابا بھی گھر پہ موجود تھے۔ ماحول کچھ سوگوار اور بجھا بجھا سا تھا۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ زینی کے سوا تمام تر افراد ڈرائنگ روم میں براجمان تھے اور خاموشی ایسی تھی جیسے اگر سوئی بھی گرے تو ہر سمت شور ہی شور ہو گا۔
ہر کوئی پھوپھو کے فیصلے کا منتظر تھا۔ خاموشی کا یہ طویل وقفہ دو افراد پہ خاصا بھاری گزر رہا تھا ایک گوشی اور دوسرا زریاب۔
اس سے قبل کہ پھوپھو زینی کے لیے دست سوال دراز کرتیں عینی چائے کے ساتھ مٹھائی لیے چلی آئی تھی۔
"تمہارے آنے سے قبل یہ مٹھائی کون لے آیا؟" زریاب نے پوری گلاب جامن منہ میں رکھتے ہوئے خاصی شگفتگی سے پوچھا تھا۔
"زینی باجی کی شادی کی تاریخ فائنل ہو گئی ہے۔" اس نے بھی ہنستے ہوئے بتایا اور زریاب پہ تو جیسے ساتوں آسمان آن گرے تھے۔ گلاب جامن کا ذائقہ کسی کڑوے زہر میں بدل چکا تھا۔ جسے نہ نگل سکتا تھا نہ اگل سکتا تھا۔ پھوپھو کی بھی قریب قریب ایسی ہی حالت تھی۔
"مگر یوں اچانک۔" بالآخر وہ سنبھل کر بولیں۔
"ہاں بس ایک دو روز میں ہی فیصلہ ہوا ہے۔" ابا کھنکھارتے ہوئے بددلی سے بولے یوں جیسے اس ذکر سے بھی انہیں تکلیف ہو رہی ہو۔
"لیکن میں تو آج زریاب کے لیے آئی تھی۔" وہ مٹھائی اور پھل ساتھ لائی تھیں۔ انگوٹھی کی ڈبیا ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں تو جیسے یقین تھا کہ بھائی صاحب اپنی بہن کو خالی ہاتھ تو کبھی نہیں لوٹائیں گے۔ وہ تو بڑے مان کی ساتھ آئی تھیں۔
"کیسا مبارک دن نکلا ہے آج، دونوں بچیوں کے فرض سے ایک ساتھ ہی سبک دوش ہو جائیں گے۔ گوشی آج سے تمہاری امانت ہے، جب چاہو آکر تاریخ لے جانا، جاؤ گوشی پھوپھو سے پیار لے لو۔"
اماں نے فوراً" مداخلت کر کے بس ساری بات فائنل کرلی تھی۔ گوشی ماں کے حکم کی منتظر تھی۔ فوراً" اٹھ کر راحیلہ پھوپھو کے پہلو میں جا بیٹھی تھی۔ اب انتظار تھا پھوپھو کب اسے انگوٹھی پہنائیں۔ صورت حال بالکل برعکس ہو چکی تھی۔ انہوں نے بھائی صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زریاب کی جانب دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا ان میں، بڑے ضبط کے ساتھ انگوٹھی باہر نکالی اور گوشی کو پہنا دی پھر اس کا ماتھا بھی چوم لیا۔
"جیتی رہو۔" دعا بھی دے دی۔ زریاب سے وہاں ایک پل بھی رکنا محال ہو گیا تھا۔ اب سب کا منہ میٹھا کروایا جا رہا تھا۔ وہ اٹھا اور بے سمت بائیک دوڑاتا وہاں سے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

پھوپھو گھر آکر کتنی ہی دیر یونہی بیٹھی رہیں انہیں اب ایک ہی فکر تھی کہ ان کا یہ فیصلہ جانے ان کا بیٹا نبھا پائے گا بھی کہ نہیں۔ جانے اس کے دل پہ کیا بیت رہی ہو گی۔ آدھی رات ہونے کو آئی تھی پتا نہیں اس وقت کہاں اور کس حال میں ہو گا۔ دو آنسو چپکے سے پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پہ آن گرے۔
ان کا حساس ذمے دار بیٹا۔ اس کے پاپا تو کاروبار کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم تھے۔ راحیلہ بیگم نے تنہا ہی

دونوں بچوں کو پالا تھا۔
حماد کچھ لاابالی اور کھلنڈرا سا تھا مگر زریاب نے شروع سے ہی ان کا بے حد خیال رکھا تھا۔ تعلیم کا معاملہ ہو یا پھر اندرونی 'بیرونی سرگرمیاں کبھی کسی معاملے میں اس نے راحیلہ کو کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ نو عمری سے ہی اس نے گھر کے تمام کاموں میں راحیلہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ سودا سلف لانا' بل جمع کروانا' حماد کو اسکول چھوڑنا' اسے ٹیوشن پڑھانا' فارغ وقت میں وہ باہر دوستوں کے ساتھ گھومنے کے بجائے راحیلہ بیگم کے کاموں میں ان کی مدد کیا کرتا تھا' کبھی سبزی کاٹ دی' کبھی برتن دھو دیے' چائے بنادی۔
اپنی وارڈ روب صاف کرلی۔ اپنے اور حماد کے کپڑے استری کر دیے۔ رات کو وہ اپنی ماں کے پیر دبا' سونے سے قبل ان کی اور حماد کی میز پہ وہ دودھ گرم کر کے رکھتا وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں' جب تک وہ اپنی موجودگی میں ان کو دوا نہ کھلا دیتا تب تک اپنے کمرے میں نہیں جاتا تھا۔ بہت سال پہلے اس نے راحیلہ بیگم سے فرمائش کی تھی۔
"امی! ہم زینی کو اپنے گھر کیوں نہیں رکھ لیتے۔ آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے' ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔" تب وہ افسردگی سے بولی تھیں۔
"بھائی صاحب سے بات کی تھی میں نے مگر انہوں نے منع کر دیا کہ لوگ باتیں کریں گے کہ میں اپنی اکلوتی بھتیجی کی کفالت نہیں کر سکا' مگر تم بے فکر رہو' وہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ ایک روز میں اسے اس گھر میں لے ہی آؤں گی تمہاری دلہن بنا کر۔" آخر میں انہوں نے شرارت سے زریاب کے بال بکھیرے تو اس نے لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے سر جھکا لیا مگر اس کی آنکھوں کی وہ الوہی سی چمک راحیلہ بیگم سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔
وہ جانتی تھیں کہ زریاب کو زینی سے خصوصی لگاؤ ہے۔ انہوں نے تو فیصلہ وقت پر چھوڑ رکھا تھا۔ زریاب کی تعلیم مکمل کرنے اور نوکری ملنے کے بعد ہی وہ بھائی صاحب سے بات کرنا چاہتی تھیں مگر یہ اچانک

کیا ہو گیا تھا وہ زینی کے بجائے گوشی کو انگوٹھی پہنا آئی تھیں۔
"امی! یہ آپ نے کیا کر دیا۔" حماد کو خبر ہوئی تو وہ ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔
"کچھ وقت لگے گا پھر وہ سنبھل جائے گا۔" انہوں نے حماد سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔
"آپ بھائی کو نہیں جانتیں۔ ان کے لیے زینی نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔"
"اسی لیے میں نے گوشی کو انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ورنہ یہ وقت نکل جاتا تو پھر وہ کبھی بھی کسی کے لیے حامی نہ بھرتا۔ گوشی اچھی سلجھی ہوئی گھریلو سی لڑکی ہے۔ وہ سنبھال لے گی اسے۔" یہ بھی ان کی خام خیالی ہی تھی یا پھر وہ خوش فہم رہنا چاہتی تھیں۔ حماد نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔
"چلیں اٹھیں آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں۔ میں بھائی کا ویٹ کر لوں گا۔" حماد نے زبردستی انہیں وہاں سے اٹھا دیا۔
"وہ آئے تو مجھے جگا دینا۔ آج اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"
"میں خود گرم کر لوں گا آپ بس آرام کریں۔" وہ انہیں سونے کی تلقین کرتا خود لاؤنج میں آبیٹھا۔
صوفے پہ آڑے ترچھے' لیٹے اونگھتے ہوئے کب اسے بھی نیند آنے لگی تھی رات کے قریباً" دو بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ حماد آہٹ پر ہڑبڑا کر اٹھا۔
سرخ آنکھیں' بکھرے بال' ستا ہوا چہرہ وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ مضمحل اور نڈھال سے نظر آنے لگا تھا۔
"بھائی! کھانا لاؤں۔"
"نہیں تم سو جاؤ میں کھا کر آیا ہوں۔" وہ کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ سو کر اٹھی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں سر درد کر رہا تھا' رات اس نے کھانا بھی نہیں کھایا

تھا۔ سب گھر والے گوشی کی منگنی پر بے حد خوش تھے خاص طور پر ابا' زینی نے ان کی آنکھوں میں گوشی کے لیے ایک فخر اور مان دیکھا تھا اور بس یہی وہ لمحہ تھا جس نے اس کو اندر سے انتہائی بے بس اور خالی سا کر دیا تھا۔ اب بھی وہ لان میں پلر سے ٹیک لگائے سیڑھیوں پہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی جب کوئی چپکے سے اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

گوشی اور عینی اپنی چیزیں کھولے دیکھ رہی تھیں۔ "ساری چیزیں قیمتی اور خوب صورت ہیں۔" عینی کا تبصرہ تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" گوشی کی آنکھوں میں بھی ستائش تھی۔

"آپ تو ان کو ایویں پینڈو سا سمجھ رہی تھیں یہ ساری شاپنگ مومونے کی ہے اور میں آپ کو بتاؤں۔ وہ دل سے اس رشتے سے خوش نہیں ہے' بس اس کے بھائی نے جو زینی کو دیکھ لیا تھا۔ پیچھے ہی پڑ گیا تھا ورنہ وہ تو مجھے ہی اپنی بھابھی بنانا چاہتی تھی۔" خوب صورت ملبوسات' جوتے' چوڑیاں اور میک اپ دیکھ کر عینی کو اب ملال ہو رہا تھا کہ کیوں اس کا رشتہ وہاں نہیں ہوا۔

"او ہو! دل چھوٹا نہیں کرتے۔" گوشی نے ڈپٹا' "تم یہ سب رکھ لو' یہ سب تمہارا ہے' وہ یہ سب پہن کر کیا کرے گی۔"

"سچی۔" عینی خوش ہو گئی تھی۔ زینی نے گردن موڑ کر بکھرے بکھرے سے زریاب کو دیکھا تو بے حد پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا' طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" تسلی کے لیے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ کو تو تیز بخار ہے۔"

زریاب دیکھتا رہا کچھ نہیں بولا۔

"ابھی رات کو تو اچھے بھلے تھے پھر ایک دن میں کیسے اتنی طبیعت خراب کر لی۔ آپ بھی نا اپنا بالکل خیال نہیں رکھتے۔" کمرے سے نکلتی گوشی نے یہ منظر بے حد چبھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

"زینی! تم اس رشتے پہ خوش ہو؟ کہیں کوئی زبردستی تو نہیں ہوئی تمہارے ساتھ یا پھر ایموشنل بلیک میلنگ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہرے یقین سے کہہ رہا تھا۔ زینی کے لیے اس کو جھٹلانا مشکل ہو گیا مگر یہ ضروری تھا۔ وہ چہرے پہ مصنوعی بشاشت طاری کرتے ہوئے مسکرائی۔

"ہاں ہاں میں خوش ہوں۔ زبردستی کون کرے گا میرے ساتھ۔ ابا نے مجھ سے پوچھ کر ہی یہ رشتہ طے کیا ہے۔"

"اچھا۔" وہ جیسے ابھی بھی بے یقین سا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زریاب میرا منگیتر ہے۔" وہ کمرے میں آئی تو گوشی تن فن کرتی اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی۔

"تو۔" وہ مڑے بغیر بولی تھی۔

"تو یہ بہتر ہو گا کہ تم اس سے دور رہو' ایک کو رجھا کر جی نہیں بھرا اب کیا اپنی بہن کے منگیتر پہ بھی ڈورے ڈالو گی۔"

"بہن۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "تمہیں تو بہن کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور جس کو تم منگیتر کہہ رہی ہو نا' اس کے ساتھ میرا ابھی کوئی رشتہ ہے۔"

"اچھا بہت خوب' اب اپنا کیچڑ مجھ پہ اچھالو گی اور کیا رشتہ ہے تمہارا زریاب سے' عاشق ہے وہ تمہارا۔"

"گوشی۔" وہ چلائی۔ "اپنی حد میں رہو۔"

"تم متعین کرو اپنی حدود۔ آج کے بعد اس کے آس پاس بھی نظر آئیں تو اچھا نہیں ہو گا۔"

"کیا کر لو گی تم؟"

"ابھی بھی تم سمجھ نہیں پائیں کہ کیا کر سکتی ہوں میں۔"

"گوشی آپی۔" عینی نے پہلے کمرے میں جھانکا پھر اسے اشارے سے بلا کر لے گئی۔ زینی وہیں بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ تو کیا اس شادی کے ساتھ مجھے اپنا سب سے زیادہ عزیز اور پیارا دوست بھی کھونا پڑے گا۔

"پھوپھو! یہ کیا کر دیا آپ نے' کیا زریاب گوشی کو ڈیزرو

کرتا تھا۔ کتنی زیادتی ہوئی ہے زریاب کے ساتھ اور پھر بھی اسے میری فکر ہو رہی تھی۔"

کس کے دل میں ہوں گی اتنی چاہتیں
کون دے گا تم کو یہ محبتیں
کون تم کو پلکوں پہ بٹھائے گا
روٹھ جاؤ گے تو منائے گا

اس کا فون بج رہا تھا۔ اس کے نمبر پر یہ کالر ٹیون بھی زریاب نے ہی لگائی تھی۔ کوئی انجان نمبر تھا اس نے کال ڈس کنیکٹ کردی تھی۔

"گوشی آپی! ایاز کا فون بار بار آرہا ہے' وہ کہہ رہا ہے زینی سے بات کرواؤ اور زینی کال ریسیو نہیں کررہی۔" ساتھ ہی ایک بار پھر کال آنے لگی۔

"ہاں۔ وہ مصروف ہے ذرا' میرا فیانسی ہے نا زریاب' ہماری پھوپھو کا بیٹا۔ اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہے۔ بہت دوستی ہے دونوں میں' اپنے درمیان تو وہ مجھے شامل نہیں کرتے۔ کتنی بار سمجھا چکی ہوں اب تمہاری منگنی ہوچکی ہے اور ایسی دوستیاں تو ویسے بھی معیوب ہی سمجھی جاتی ہے' خیر شادی کے بعد سنبھل جائے گی۔" فون بند کرنے کے بعد اب وہ دونوں منہ پہ ہاتھ رکھے ہنس رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شادی میں چند روز ہی باقی تھے مگر زینی کے سسرال والے آئے روز نت نئے بہانوں سے چکر لگاتے رہتے تھے آج بھی مومو کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی ہارون آیا تھا اس نے پہلے زینی کو نہیں دیکھا تھا اس کی جاب اسلام آباد میں تھی یہ کبھی ہفتے تو کبھی مہینے بعد چکر لگاتا تھا۔

سارے بہن بھائیوں میں وہ پڑھا لکھا اور خوش شکل تھا کچھ پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ بھی تھا اچھی نوکری اور بات کرنے کا اسٹائل' عجیب بارعب سی شخصیت معلوم ہورہا تھا سب گھر والے تو مرعوب تھے ہی مگر عینی کی دھڑکنیں خوامخواہ ہی اتھل پتھل ہورہی تھیں۔

"اتنا ہینڈسم بھائی ہے تمہارا اور تم میرے لیے رشتہ کس کا اٹھا لائی تھیں۔" عینی نے مومو کو چٹکی کاٹی تو وہ ضبط کرتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ درپردہ اس کا اس گھرانے میں رشتہ کرنے کا جو مقصد تھا وہ تو ابھی کسی پہ آشکار ہی نہیں ہوا تھا۔ زینی خاموش سی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ عینی نے سارے لوازمات میز پر سجائے۔

"یہ سب عینی نے بنایا ہے۔ بہت پیاری اور سلیقہ مند بہن ہے میری۔" گوشی ہارون کے سامنے عینی کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی۔ مومو نے بے ساختہ پہلو بدلا۔ آج ابا گھر پہ نہیں تھے۔ گوشی نے زبردستی انہیں کھانے پہ بھی روک لیا تھا اور کھانے کے اختتام تک وہ ہارون سے اچھی خاصی عینک سیک کرچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کھانا بھی نہیں بنایا۔ کیا کرتی ہو سارا دن گھر میں' ایک تو ہم تمہاری خاطر بازاروں میں خوار ہورہے ہیں اور تمہیں پلنگ توڑنے سے اور سوگ منانے سے فرصت نہیں مل رہی۔" گوشی اس کے سر پہ کھڑی بڑبڑا رہی تھی۔ ساری خریداری گوشی کی پسند سے ہو رہی تھی۔ فرنیچر' کراکری' کپڑے ہر چیز بیسٹ کوالٹی کی تھی۔ زینی کو ہر چیز دیکھ کر حیرت کا ایک جھٹکا لگتا تھا مگر پھر اس نے گوشی کی نیکسٹ پلاننگ بھی سن لی تھی۔ وہ اپنے تئیں یہ سب اس کے لیے نہیں عینی کے لیے خرید رہی تھی۔

"اماں' ہارون بہت اچھا لڑکا ہے اگر ہماری عینی کا رشتہ وہاں ہوجائے تو لوگ انگلیاں منہ میں ڈال کر بیٹھ جائیں گے اور پھر سب سے زیادہ فائدہ تو اس میں ہمارا ہی ہے۔ عینی کے لیے الگ سے جہیز بھی نہیں بنانا پڑے گا۔ دونوں بہنیں خوشی خوشی ایک ہی گھر میں رہیں گی۔ مومو اور اس کی امی عینی کو کتنا پسند کرتی ہیں۔ سچ عینی کی تو حکومت ہوگی اس گھر میں' پلکوں پہ بٹھا کر رکھیں گے سب اسے۔ اتنا اچھا رشتہ ہے کہ ہماری عینی کا تو نصیب کھل جائے گا۔" اتنا پیارا اور دلکش

خواب تھا کہ اماں بھی جھٹ سے راضی ہو گئیں اور گوشی کی عقل مندی کی قائل بھی سچ میں اس گھر کا خیال بھی گوشی کو ہی تھا۔ کتنا خیال رکھتی تھی وہ سب کا اماں کا خیال تھا اللہ ایسی بیٹی سب کو دے۔

دوسری جانب ہروقت عینی کی برین واشنگ ہو رہی تھی۔

"زینی کے سسرال والے آئیں تو خوب بج سنور کر ان کے سامنے آیا کرو، مومو سے دوستی میں ذرا محتاط ہو جاؤ اور ہارون کو بھی مٹھی کرنے کی کوشش کرو" کافی باذوق بندہ ہے۔ بس تم آج سے ہی ذرا اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ شروع کردو اور اس کے سامنے بالکل معصوم اور سادہ بن کر رہنا مردوں کو عورتوں میں دو ہی چیزیں اٹریکٹ کرتی ہیں ایک ان کی خوب صورتی اور دوسری ان کی حیا' ان کا کردار' تم ان کے لیے بالکل انجان ہو تمہارا جو چاہے خود کو بنا کر پیش کر سکتی ہو۔"

عینی بس اثبات میں سرہلاتی جارہی تھی ہارون سے ان کی مزید دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ایک دن بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے وہ اچانک مل گیا تھا۔

"عینی کو اپنا جوتا لینا تھا میں نے کہا بھی ابا کے ساتھ جا کر لے آؤ مگر یہ بہت سادہ اور معصوم سی ہے باہر کہیں بھی جانا ہو میرے بغیر کہیں نہیں جاتی اس کو تو اگر چھت پر بھی جانا ہو تو مجھے ساتھ لے کر جاتی ہے۔"

گوشی عینی کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے ہارون کو بتا رہی تھی اور وہ دلچسپی سے عینی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی نظریں اپنے جوتوں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔

دوسری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ وہ اور گوشی ایاز کے کپڑوں کا ناپ لینے گئی تھیں گھر میں اس وقت صرف ہارون ہی تھا۔ آنٹی اور موموروزن کے پاس گئی تھیں اور ایاز اس وقت زمینوں پر تھا۔

"کیا لیں گی ٹھنڈا یا گرم؟" وہ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد اب آداب میزبانی نبھا رہا تھا۔

"میرا تو اس وقت چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔" گوشی نے بغیر کسی جھجک کے کہہ دیا تھا۔

"اچھا۔ میں بنا کر لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کچن میں چلا گیا تھا گوشی نے عینی کو پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔

"لائیں میں بنا دیتی ہوں۔"

"ارے آپ تو مہمان ہیں' مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں مگر موموگھر پہ ہوتی تو اور بات تھی اب ہمارے ہوتے ہوئے آپ چائے بنائیں' مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا۔"

"اچھا چلیں آپ بنالیں میری بنائی ہوئی شاید بس ہی پی سکتا ہوں۔" وہ اب مختلف چیزیں نکال رہا تھا عینی خاموشی سے چائے بنانے لگی فریج سے اس نے شامی کباب بھی نکال لیے تھے یوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو کر کام کرنا عینی کو بہت اچھا لگ رہا تھا ایک لمحے کو اسے خیال آیا وہ اپنا ہاتھ جلا کر ایک افسانوی سچویشن پیدا کر سکتی ہے مگر نہیں' اسے خود کو اس کے سامنے ایک پھوہڑ لڑکی ظاہر نہیں کرنا تھا۔

"آپ کو میری یہاں موجودگی سے کوئی پرابلم تو نہیں ہو رہی۔" ہارون اس کا گریز اور جھجک محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی لائٹ پنک کلر کے سوٹ میں اس کی گندمی رنگت دمک رہی تھی۔ کمر سے نیچے تک جھولتی سیاہ ریشمی بالوں کی چٹیا گہری کالی بڑی بڑی آنکھوں میں بھرا کاجل' عارضوں پہ جھکی پلکیں' وہ واقعی اتنی حسین تھی یا اس سے ہارون کو لگ رہی تھی۔ کچھ لمحے واقعی اثر رکھتے ہیں وہ بھی ان سحر انگیز لمحوں میں جکڑ گیا تھا۔

"اور سنائیں آج کل کیا کرتی ہیں؟" وہ بروقت سنبھل کر بولا۔

"کچھ خاص نہیں۔ گریجویشن کے بعد فارغ ہوں۔"

"آگے اسٹڈی کا کیا پلان ہے؟"

"سوچا ہے ایم اے انگلش کرلوں۔"

"ہٰذ۔" ہارون کو اس کا خیال پسند آیا تھا۔

"اور فارغ وقت میں کیا کرتی ہو؟"

"بکس پڑھنے اور کوکنگ کرنے کا شوق ہے یا پھر پودے لگانے کا' مجھے پھول بہت پسند ہیں۔" شاہی کباب الٹ پلٹ کرتے چائے کپوں میں ڈالتے دونوں مختلف موضوعات پر باتیں کر رہے تھے۔ یہ ملاقات دونوں کے مابین ایک خوشگوار تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
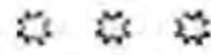
مایوں بیٹھنے سے قبل اپنی کتابوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ شادی کے ایک ہفتے بعد اس کے امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے پیپر تو دے ہی سکتی تھی۔ بہت دنوں سے حملو نہیں آیا تھا اور زریاب تو ایسے غائب تھا جیسے کبھی ملا ہی نہ ہو اس کی زندگی کا اتنا اہم موڑ اور اس کے دوست اس کے پاس ہو کر بھی ساتھ نہیں تھے۔ کل پھوپھو آئی تھیں اسے ساتھ لگا کر کتنی دیر خاموش آنسو بہاتی رہیں۔ زینی نے ان کی آنکھوں میں عجیب سی حسرت دیکھی تھی۔

"پھوپھو! آپ کیوں اداس ہیں؟"

"بس مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے نہ کوئی صلاح نہ مشورہ' جانے کون لوگ ہیں۔ بھائی صاحب نے بہت جلد بازی کر دی۔"

"آپ نے بھی تو جلد بازی کی زریاب کے معاملے میں' کتنا ارمان تھا مجھے کہ زریاب کے لیے تو دلہن میں خود پسند کروں گی اور آپ نے گوشی کے پلے باندھ دیا۔ اب بیچارے دکھی منہ بنا لیا کریں' آپ کو پتا ہے بچپن سے لے کر آج تک ان کی اور میری گوشی سے کبھی نہیں بنی۔" زینی نے بھی آج اندر کا شکوہ کر ہی ڈالا تھا۔ پھوپھو دیر تک اسے دیکھے گئیں پھر یہ کہہ کر چلی گئیں۔

"بہت بھولی ہو تم۔" اور وہ پھوپھو کے بیان پر دیر تک بیٹھی کڑھتی رہی۔

"اب اتنی بھی بھولی نہیں ہوں میں' زریاب اس رشتے پہ خوش نہیں ہیں' جانتی ہوں میں' میرا سامنا کرنے سے اس لیے کتراتے ہیں کہ وہ مجھ سے شرمندہ ہیں کہ میرے رقیب کو انہوں نے اپنا ہمسفر منتخب کیا ہے۔ مگر زریاب اس میں تمہارا کیا قصور' یہ تو پھوپھو کا فیصلہ تھا تم کیوں گلٹی فیل کر رہے ہو یا پھر گوشی نے تم پہ بھی پابندی لگا دی ہے کہ زینی سے بات مت کرنا۔ ہاں اب گوشی کا ہی تو حق ہے تم پہ۔" آخری بات پر وہ جیسے خود سے خفا ہو گئی تھی۔

"زینی! تیار ہو جاؤ آج تمہیں میرے ساتھ بازار جانا ہے' بس تمہارا شادی والا جوڑا رہ گیا ہے۔ اماں کا کہنا ہے کہ وہ تمہاری پسند کا ہی ہو گا۔" گوشی نے اندر آ کر اسے اطلاع دی تھی۔

"جب سب تمہاری مرضی سے ہوا ہے تو ایک جوڑے سے کیا فرق پڑتا ہے' لے آؤ تم ہی۔" اس نے بے دلی سے کہہ کر رخ موڑ لیا۔

"اٹھو زینی! میرا بچہ' ضد نہیں کرتے۔ اب چھوڑ دو غصہ گلہ۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا ویسے بھی نصیب کا لکھا کوئی بدل نہیں سکتا اور پھر جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ تمہارا جوڑا ازل سے اسی کے ساتھ لکھا تھا بس اللہ تمہیں آگے زندگی میں بہت ساری خوشیاں دکھائے' نئی زندگی کا آغاز اب تم کیا اس طرح سے رو دھو کر کرو گی۔ تمہیں پڑھائی چھوڑنے کا غم ہے نا' میں خود ایاز سے بات کروں گی پرچے تو شادی کے بعد ہیں نا' وہ تم پر اس معاملے میں کوئی پابندی نہیں لگائے گا۔ میں چاہتی ہوں میری بیٹی بس پہلے جیسی ہو جائے ہنستی مسکراتی ہوئی۔" اماں اسے ساتھ لگائے ایک ہاتھ سے اس کے بال سنوارتی اس کا منہ چوم رہی تھیں۔ زینی کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امڈ آئے۔

"اماں! میرا اس لڑکے کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں تو اسے جانتی تک نہیں تھی۔ آپ تو میرا یقین کریں۔"

"ہاں میری بچی مجھے تم پر پورا اعتبار ہے۔ اب چلو شاباش منہ دھو لو اور اپنے لیے پیارا سا جوڑا لے کر آؤ۔ گوشی اسے پارلر بھی لے جانا اسکن دیکھو کتنی رف سی ہو رہی ہے۔" اماں کے مان بھرے اعتراف نے اسے

معتبر سا کر ڈالا تھا۔ اس کے دل و دماغ سے ایک بوجھ سا کم ہوا۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابا کو بھی میرا یقین آجائے گا۔" اس نے جیسے خود کو مزید ایک خوش کن سی تسلی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں سڑک پہ کھڑی رکشے کا انتظار کر رہی تھیں جب پھوپھو کے گھر کا گیٹ کھلا زریاب اپنی پراڈو باہر نکال رہا تھا۔ بلیک جینز اور شرٹ میں ملبوس آنکھوں پہ گاگلز لگائے گوشی کو وہ سیدھا دل میں اترتا محسوس ہوا تھا جتنا ہینڈسم اور اسمارٹ تھا اتنا ہی مغرور کیا مجال تھی جو اسے ذرا سی بھی لفٹ کروا دیتا۔ گوشی کو دیکھ کر تو وہ کبھی نہ رکتا مگر زینی کی خاطر اس نے گاڑی روک دی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟" اس کی مخاطب زینی تھی۔ وہی نرم خو سا انداز جو زینی کے لیے مخصوص تھا۔ گوشی کو اپنا نظر انداز کیا جانا سخت گراں گزر رہا تھا۔

"بازار۔" وہ مختصرا" بولی۔

"آؤ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے اگلا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس سے قبل کہ زینی قدم بڑھاتی گوشی نے آگے بڑھ کر سیٹ سنبھال لی تھی۔

"زینی! تم آگے آکر بیٹھو۔" وہ پیچھے مڑکر زینی سے مخاطب ہوا احساس توہین سے گوشی کے رخسار تپ اٹھے۔

"زریاب میں ٹھیک ہوں۔" وہ پیچھے بیٹھ گئی۔

"تم نے سنا نہیں "آگے آؤ۔" وہ بضد تھا گوشی ایک جھٹکے سے اٹھ کر پیچھے چلی گئی۔ زینی کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

"زینی! میں تمہارا شوفر نہیں ہوں۔" وہ جانے کیوں گوشی کو زچ کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ زینی اٹھ کر آگے آگئی۔

"تم یونیورسٹی نہیں جا رہی تھیں' ایگزیم کی تیاری کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"اور بازار سے کیا لینا ہے؟" وہ شاید باتوں کے موڈ میں تھا۔

"برائیڈل ڈریس۔" زینی کے بجائے جواب گوشی سے آیا تھا۔ انداز خاصا جتاتا ہوا اور طنزیہ سے تھا۔ زریاب ایک پل کو بالکل خاموش سا ہو گیا۔ گوشی کے دل پہ جیسے ٹھنڈ پڑی تھی۔ زریاب انہیں ڈراپ کر کے گاڑی پیچھے کر رہا تھا جب زینی نے کھڑکی پہ جھکتے ہوئے کہا۔

"زریاب! تم بھی آؤ نا' مجھ پہ کون سا کلر زیادہ سوٹ کرتا ہے اب یہ تو تم ہی بتاؤ گے نا۔"

"زینی! میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" وہ رسان سے بولا۔

"کوئی نہیں۔ تمہیں آنا ہو گا بس۔" وہ اپنے سابقہ دھونس بھرے لہجے میں بولی تو زریاب گاڑی سے اتر آیا پھر اس نے برائیڈل ڈریس' جوتے' جیولری سب کچھ زریاب کی پسند سے لیا تھا یہ آخری موقع تھا' وہ جی بھر کر گوشی کو جلانا چاہتی تھی رات سونے سے قبل وہ خوش تھی۔ اسے گوشی کا تمتماتا چہرہ ابھی تک مزا دے رہا تھا۔ اور گوشی وہ رات دیر تک جاگتی رہی۔ ایک ایک منظر اس کی آنکھوں میں جم جم کر پگھلتا رہا اور وہ رات بھر سلگتی رہی پھر اس نے کچھ سوچ کر ایاز کا نمبر ملایا۔

"آج میں نے آپ کو بازار میں دیکھا تھا' آپ اپنے منگیتر کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھیں۔ دوبارہ ایسا چانس ملے تو میری فیانسی کو گھر میں ہی چھوڑ کر جایئے گا۔" سلام دعا کے بعد وہ شروع ہو چکا تھا۔

"اطلاعا" عرض ہے' میرا فیانسی تو مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ ہاں سین کچھ ایسا ہے کہ آپ کی منگیتر میرے فیانسی کے ساتھ برائیڈل ڈریس خرید رہی تھی' آخر کو دوست ہیں دونوں' پھر کزن میں بے تکلفی تو ہوتی ہے لیکن زیادہ بے تکلفی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اب جو کام اسے تمہارے ساتھ کرنا چاہیے تھا وہ زریاب کے ساتھ کر رہی تھی لیکن خیر اب شادی ہو رہی ہے نا' ذرا لگام ڈال کر رکھیے گا۔" عام سے لہجے

میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

جمعہ کی مبارک شب زینی کا نکاح تھا۔ موموکی نظریں اس دوران کسی کو تلاشتی رہیں کیسی شاندار سحر انگیز شخصیت تھی اس کی اور وہ تھی عام سے خدوخال کی مالک اک عام سی لڑکی بھلا کیسے اس کی نظروں میں جچ سکتی تھی مگر ان خوابوں کا کیا کیا جائے "اب دل نے چاند کی تمنا کی تھی تو اسے اس چاند کو ہر صورت اپنی مانگ میں سجانا تھا۔ وہ دوبار اس کے پاس سے گزرا تھا۔ ایک بار وہ جان بوجھ کر اس سے ٹکرائی تھی مگر مجال ہے جو وہ متوجہ ہو جاتا۔

"سوری" کہہ کر چلا گیا۔ کیسی پرسوز تھیں وہ آنکھیں "اسے بھلا کیا غم تھا۔" وہ رات دیر تک جاگتی رہی۔ سوچتی رہی۔ دوسری جانب دلہن سے بڑھ کر سنگھار تو مینی نے کر رکھا تھا۔ ہارون بہانے بہانے سے اس کے گرد منڈلا تا رہا۔

وہ ستون کے پاس کھڑی تھی اور ہارون اسٹیج پہ بیٹھا یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا زبیدہ (ایاز کی امی) نے ہارون کی پرشوق نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو ان کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ ان کی ناک کے نیچے کیا چل رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھیں ان کا دل جیسے ہر چیز سے اوب گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حجلہ عروسی میں وہ محو انتظار تھی نئی جگہ 'نئے لوگ' نیا ماحول اس کا دل گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس کا استقبال کچھ اتنا خاص نہیں ہوا تھا ایک دو رسمیں ہوئیں اور اسے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور اب وہ دو گھنٹے سے بیٹھی ایاز کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے ان کپڑوں سے گھنوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا خوب لمبی تان کر سوئے۔ اس کی آنکھیں تھکن سے بند ہو رہی تھیں وہ سونا نہیں چاہتی تھی مگر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئی تھیں۔ کھٹکے سے جب اس کی آنکھ کھلی تو ایاز کمرے میں آچکا تھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ جانے کتنا سوئی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

"میں نے آج تک ایسی دلہن نہیں دیکھی جو حجلہ عروسی میں بیٹھ کر اپنی نیندیں پوری کر رہی ہے۔" وہ با آواز بلند بڑبڑاتا اس کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا زینی کچھ خود میں سمٹ سی گئی۔

"سوری۔ بس یونہی آنکھ لگ گئی۔"

"ہاں مگر اب تمہیں اس کی سزا تو ملے گی۔" تھوڑی سے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بے رحمی سے بولا۔

"اور ویسے بھی تم بھلا میرا انتظار کیوں کرتیں' تمہیں تو میں پسند ہی نہیں تھا تم تو مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتی ہو گی مگر کیا کریں اب میری شکل تو بدل نہیں سکتی۔ سو دن رات تمہیں دیکھنی تو پڑے گی۔ بڑا لمبا ساتھ ہے۔" طنز سے اس کی جانب دیکھتا وہ اس کے دوپٹے کا پلو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"لگتا تو بڑا خوب صورت ہے اور یہ ہار سنگھار مگر۔" ہاتھ بڑھا کر اس نے زینی کا ٹیکہ نوچ لیا پھر چہرے سے رینگتا اس کا ہاتھ گردن پہ جا ٹھہرا تھا اور اگلے ہی پل اسی بے دردی سے اس نے ہار بھی کھینچ لیا تھا۔

"جس کے لیے یہ سنگھار کیا تھا اس نے تو خوب نظر اتاری ہو گی۔ ارے میں بھی کتنا پاگل ہوں' وہ تو اس وقت بیٹھا اپنی گمشدہ محبت کا سوگ منا رہا ہو گا۔" بار کو انگلی پہ گھماتے ہوئے وہ ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ زینی کی آنکھوں میں استعجاب کے رنگ تھے۔ وہ حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اٹھو۔" اس نے اچانک ہی حکم صادر کیا۔

"میں نے کہا اٹھو۔" اب کی بار وہ دھاڑا۔ زینی سہم کر اٹھ گئی۔

"وہاں کھڑی ہو جاؤ۔" بیڈ سے دو قدم کے فاصلے پر وہ کھڑی ہو گئی۔

"اب ساری رات یہیں کھڑی رہو۔" بیڈ پہ نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے سر تا پا کمبل تان لیا تھا۔ زینی کے لیے انتہائی عجیب صورت حال تھی۔

"مگر۔" اس نے کچھ کہنے کو لب وا کیے۔
"باقی باتیں کل ہوں گی۔" اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ زینی نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ زینی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی تھا جسے لب کچلتے ہوئے وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایاز نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پہلو میں گرا لیا۔

"اچھی فرماں بردار بیوی ثابت ہو گی تم۔ ویسے حکم عدولی مجھے پسند بھی نہیں اور اب تو تمہیں میری پسند کے سانچے میں ہی ڈھلنا ہو گا۔" وہ اس کے چہرے سے بالوں کی لٹیں ہٹاتے ہوئے مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے ذرا جگاؤ تو دلہن کو دن چڑھ آیا ہے یہ کوئی طریقہ ہے۔ لڑکی کی خالی ڈگریوں کا کیا کرنا ہے کوئی سلیقہ کوئی تہذیب ہے کہ نہیں۔" وہ سو کر اٹھ چکی تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ اب کیا خود ہی منہ اٹھا کر باہر چلی جاتی اس کی ساس کی پاٹ دار آواز اندر تک آ رہی تھی۔ اس نے بیڈ پہ نیم دراز ایاز کو دیکھا۔
"جاؤ امی کو سلام کر کے آؤ۔" وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔
"گھر میں اتنے مہمان ہیں تمہیں خیال کرنا چاہیے تھا۔ نو بج چکے ہیں اور تم اب کمرے سے نکل رہی ہو یوں اندر کمرے میں گھس کر میاں کی پٹی سے لگے رہنے کو ہمارے ہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا جب سب باہر موجود ہوں تو تم بھی باہر رہا کرو۔" مومو نہایت بدتمیزی کے ساتھ اس سے بات کر رہی تھی۔
"اے بی بی! تمہارے ہاں کچھ رسم و رواج ہیں کہ نہیں۔ ابھی تک تمہارے گھر سے کوئی ناشتہ پانی لے کر نہیں آیا مجھے اور بھی سو کام ہیں۔" اس کی ساس کی تیوریاں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ خوامخواہ میں شرمندہ ہوتی رہی۔ سارا غصہ انہیں خود ناشتہ بنانے پر آ رہا تھا جب تک عینی اور گوشی اس کا ناشتہ لے کر آئیں سب ناشتہ کر چکے تھے۔
"آنٹی آئیں نا۔" وہ اصرار کر رہی تھیں۔
"ہم تو صبح آٹھ بجے تک ناشتہ کر لیتے ہیں یوں دن چڑھے گیارہ بجے کون سا ناشتہ ہوتا ہے۔" آنٹی نے تنک کے جواب دیا۔
"اصل میں فنکشن کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ سی ہو گئی تھی۔ سارا پھیلاوا سمیٹتے سمیٹتے رات دیر سے سوئے تھے تو صبح اٹھنے میں دیر ہو گئی ورنہ صبح ہم بھی آٹھ بجے ہی ناشتہ کرتے ہیں۔" گوشی اب وضاحتیں دے رہی تھی۔
"مومو! تم تو آ جاؤ۔" عینی نے اسے پکارا۔
"میں بھی کر چکی ہوں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔
"ہاں لیکن میں تم لوگوں کو جوائن کر سکتا ہوں۔" تک سک سے تیار ہارون عینی کے عین سامنے والی کرسی پہ آن بیٹھا تھا۔ عینی کی آنکھوں میں بے شمار رنگ اتر آئے۔ زبیدہ بیگم کا دل سلگ کر رہ گیا۔
"زینی! اپنی بہنوں کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ مومو! ان کا ناشتہ دلہن کے کمرے میں بھجوا دو۔" وہ حکم صادر کرتی اٹھ گئیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا وہ ان کا خوبرو پڑھا لکھا بیٹا بتھیانے کے چکر میں تھیں یہاں۔ ان کو ہی سونے چلی آئی تھیں ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ زینی خاموشی سے اٹھ گئی۔ عینی اور گوشی کو بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھانے پڑے۔ ہارون لب بھینچ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کی شام ایک اور بدمزگی ہو گئی تھی افراد زیادہ ہو گئے تھے۔ ایاز اور ہارون انتظامات میں مصروف تھے اور زبیدہ بیگم اپنی کسی دیورانی سے کہہ رہی تھیں۔
"دیکھو۔ کیسے تھڑولے لوگ ہیں۔ سو کے بجائے ڈیڑھ سو بندے لے کر آ گئے ہر عورت کے ساتھ پانچ سات تو بچے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں امی! سب انتظامات ہو گئے ہیں۔" ایاز پیچھے سے آکر بولا مگر امی کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

"اٹھو، تم موموکے پاس جا کر بیٹھو، یہاں میرے دوست بیٹھیں گے۔" ایاز کا موڈ سخت آف تھا۔ اس نے آتے ہی دلہن بنی زینی کو اسٹیج سے اترنے کے لیے کہا تھا۔ اتنی بے عزتی، مارے خفت کے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ پھوپھو نے دیکھا تو آکر اسے اپنی ٹیبل پر لے گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد زریاب آیا تھا گھر کی چابی لینے۔ پھوپھی شاید اسے زبردستی لے کر آئی تھیں۔ کیونکہ وہ کافی افسردہ اور خاموش سا لگ رہا تھا۔

"کچھ دیر تو بیٹھ جاؤ، ابھی کھانا کھا کر ساتھ ہی چلیں گے۔" پھوپھو نے رسان سے کہا تو وہ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے ان ہی کی میز کے گرد بیٹھ گیا۔

"کیسی ہو زینی۔" وہ بلا وجہ ہی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ایاز کے گھٹیا جملے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کے چہرے کی تپش بڑھنے لگی۔ مگر وہ بدقت تمام مسکرائی۔

"اچھی ہوں۔"

"زریاب وہ جھمکے دے دو جو مجھے زینی کو دینے تھے۔" پھوپھو کو اچانک یاد آیا تھا وہ کچھ رنجیدہ سی ہو گئیں۔ ان جھمکوں کو کسی اور نے بھی دیکھا تھا بڑی گہری اور حاسدانہ نظروں سے۔

☼ ☼ ☼

"خوب گفتگو رہی آج تم دونوں کے مابین۔" کمرے میں آتے ہی وہ شروع ہو چکا تھا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی، دور نہ ہم۔"

"کزن تھے۔ دوست تھے ساتھ پلے بڑھے۔ بے تکلفی تو ہوتی ہے نا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"مجھے یہ بے تکلفی بالکل پسند نہیں۔ آج کے بعد تم اس سے بات کرتے ہوئے نظر نہ آؤ۔" اس کا حکم تھا وہ خاموش ہو گئی۔ دو روز بعد پھوپھو نے فون کر کے اپنے ہاں کھانے پہ مدعو کیا تھا۔ ایاز نے صاف انکار کر دیا

"منع کر دو کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔" کتنے بہانوں سے وہ پھوپھو کو ٹال پائی تھی۔

"بہو! تمہارے جھمکے بڑے خوب صورت ہیں کہاں سے لیے۔" کھانے کی میز پر اس کی ساس نے اچانک استفسار کیا تھا۔

"جی میری پھوپھو نے گفٹ کیے ہیں۔" اس نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ پھر بھی ایاز کے کان کھڑے ہو چکے تھے اور وہ خوب تیوتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"امی! مجھے بھی لینے ہیں اس طرح کے جھمکے۔ آپ کو تو پتا ہے، مجھے کتنی مشکل سے کوئی چیز پسند آتی ہے اور یہ تو مجھے پہلی نظر میں ہی اتنے خوب صورت لگے تھے۔ اب تو میں رہ نہیں سکتی۔ آپ آج ہی میرے ساتھ جیولر کے پاس چلیں گی۔" مومو بچوں کی طرح مچل رہی تھی۔

"ارے اگر تمہیں اتنے ہی پسند ہیں تو اپنی بھابھی سے مانگ لو۔ ویسے بھی اس کے گھر والوں نے دیا ہی کیا ہے۔ میں تو کڑوں کی امید لگائے بیٹھی تھی، دنیا دکھاوے کی خاطر یہ چھوٹی چھوٹی بالیاں دے دیں اکلوتی نند تھیں تم۔ کچھ تو تمہارا خیال کرنا چاہیے تھا۔"

"سچ بھابی! اگر میں مانگوں تو آپ دے دیں گی مجھے۔" مومو نے بڑے لاڈ سے کہا تھا۔

"ہاں ہاں ضرور دے گی ویسے بھی اسے کیا ضرورت ہے اس گھر کی نشانیاں سنبھال کر رکھنے کی۔" ایاز نے خوب چبا چبا کر کہا تھا۔

زینی نے سارے اشک کہیں اتھاہ گہرائیوں میں اتارتے ہوئے ڈائمنڈ گولڈ کے وہ خوب صورت ایئر رنگز اتار کر مومو کو دے دیے تھے اس نے جلدی سے لے کر کانوں میں پہن لیے اور اب شیشہ دیکھنے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں آکر اس نے اپنی کتابیں نکالیں کل اس

کا پہلا پرچہ تھا۔ وہ اس کی تیاری میں مصروف تھی' مومو نے کمرے میں جھانکا۔
"بھابی! وہ ایئر رنگز کا جو کیس تھا وہ بھی دے دو۔" زینی نے دراز سے نکال کر اسے تھمادیا وہ اپنے کمرے میں آکر بڑی محبت سے اس کیس پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔
"بس تھوڑا انتظار 'پھر منزل زیادہ دور نہیں۔" وہ بڑی مگن سی خوش کن تصورات میں گم تھی جب اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔
"مومو! چھت پر آؤ' میں تمہارے لیے زنگر برگر لایا ہوں۔"
"اُفوہ۔" وہ جھنجلائی "اس نوبی کے بچے سے تو اب جان چھڑانی پڑے گی۔" اس کی نظروں میں ایک بار پھر سے زریاب کا سراپا گھوم گیا۔ اعلا تعلیم یافتہ 'ویل ڈریسڈ' خوبرو۔ اس کے مقابل اب یہ محلے کا نوبی' ذاتی تو کچھ بھی نہیں تھے لیکن خیر زنگر برگر کھانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ کیس کو الماری میں سنبھال کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی تھی۔
"یہ کیا ہر طرف کتابیں پھیلا رکھی ہیں۔" ایاز کمرے میں آیا اور اسے کتابوں میں گم دیکھ کر اس کی پیشانی سلوٹوں سے اٹ گئی۔
"کل ایگزیم ہے میرا۔"
"اور تمہیں اس کی اجازت کس نے دی۔" وہ برہم ہوا۔
"آپ دیں گے۔" وہ اس کی سمت دیکھ کر بولی۔
"اور جو نہ دوں تو۔"
"ایاز پلیز میں نے اتنی محنت کی ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"ایک اور ڈگری۔" مصنوعی انداز سے اس نے سر کو خم کیا۔ "کیا کرو گی۔ بتاؤ گی سب کو کہ میرا شوہر میٹرک پاس ہے اور میں نے ایم ایس سی کر رکھا ہے۔ خود کو مجھ سے برتر ثابت کرنا چاہتی ہو۔"
"میں کیوں بتاؤں گی سب کو۔"
"مگر لوگ تو پوچھیں گے' وہ کب باز آتے ہیں۔" وہ

اچانک اس کے برابر میں آکر نیم دراز ہو گیا۔
"سمیٹو یہ ساری کتابیں' جتنا پڑھنا تھا' پڑھ لیا۔"
"ایاز مگر۔"
"تو اگر مگر۔" اس نے زینی کی آنکھوں پہ انگلی رکھ دی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔
"بڑی حسین لگتی ہیں مجھے یہ آنسوؤں میں بھیگی آنکھیں۔" وہ ہمیشہ اس پر اپنی حاکمیت جتا کر خوش ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی ساس کو اس کے ہر کام میں نقص نظر آجاتا تھا' اس پر ایاز کی ہدایت کہ ہر کام امی سے پوچھ کر کرنا۔
"امی! بھنڈی گوشت کیسے پکانا ہے' آپ ترکیب بتا دیں۔" بھنڈیاں کاٹ کر رکھ دی تھیں' گوشت بھی دھو دیا تھا۔ اب امی کی عدالت میں کھڑی تھی۔
"میں کیا زبیدہ آپا ہوں' مجھ سے کوکنگ شو کروانا ہے؟" انہوں نے ٹھنکا دیا۔
"بس آج کل کی لڑکیوں کو بیاہ کی جلدی ہوتی ہے۔ دوسروں کے لڑکوں کو تاڑ لیا' ڈورے ڈالنے آجاتے ہیں' ہانڈی میں ڈوئی چلانی نہیں آتی۔" وہ جیسے بھری بیٹھی تھیں' ساری کھولن اس پہ اتار دی۔ زینی کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔
"امی کس کی بات کر رہی ہیں آپ۔" ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔
"لو اور سنو۔ معصومیت اور بھولپن تو تم پہ ختم ہے۔ ایسے ہی تو پاگل نہیں ہوا تھا ایاز۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ' یہ رشتہ تو آپ لے کر آئی تھیں۔" اسے ان کی غلط فہمی ہر صورت دور کرنی تھی۔
"رشتے کی بھی خوب کہی' وہ تو اس موموکم بخت نے میرا پیچھا لیا ہوا تھا کہ بھئی کے لیے مان جائیں' انکار ہوا بات ختم ہو گئی پھر تمہارا چکر نکل آیا' تمہاری بہن خود کہنے آئی تھی کہ ہمارے گھر رشتہ لے کر آئیں' مجھے کیا پتا تھا کہ سارا گھر بھرا ہوا ہے چلتر بازوں سے۔" وہ تو خاصی

خفا لگ رہی تھیں مگر زینی کا ذہن تو "تمہاری" بہن میں ہی اٹک گیا تھا۔

"تو گوشی نے یہاں بھی۔" اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔

"اب کیا کھڑی منہ دیکھ رہی ہو' جاؤ جا کر ہانڈی چڑھاؤ اور نمک مرچ ذرا تیز رکھنا' تمہاری طرح معدے کے مریض نہیں ہیں ہم۔" وہ پھر سے سر منہ لپیٹے لیٹ چکی تھیں۔ زینی کی آنکھوں میں مرچیں چبھنے لگیں۔

"کتنا ارزاں کر دیا تھا گوشی نے اسے سب کی نظروں میں۔"

"کس کا سوگ منا رہی ہو۔" بالوں میں برش کرتے ہوئے اس نے زینی کے اداس' سوگوار سے چہرے کو دیکھا تو طنز کیے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"ہر وقت کمرہ بند کیے پڑی رہتی ہو امی بھی شکایت کر رہی تھیں تمہاری۔ تم الگ تھلگ سی رہتی ہو ان میں گھلتی ملتی نہیں' سو موتو اپنے موڈ کی ہے' تمہیں ہی کا خیال رکھنا چاہیے .... " وہ کہہ کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"آج کل کاروبار کچھ اچھا نہیں جا رہا۔ پچھلے دنوں فصل کا بہت نقصان ہو چکا ہے' میں سوچ رہا تھا وہ جو تمہارا مکان ہے جو تمہارے ابو نے کرائے پر چڑھا رکھا ہے۔ اس کی رجسٹری تو تمہارے نام ہی ہوگی' ایسا کرو کل گھر جا کر مکان کے کاغذات لے آؤ' اس مکان کو بیچ کر وہ رقم میں اپنے کاروبار میں لگاؤں گا' ویسے بھی اب تمہارا سب کچھ میرا ہی تو ہے۔" کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا تھا' زینی کو اس کے اطمینان پر حیرت ہوئی اور اس کی بے تکی فرمائش پر غصہ بھی آیا۔

"مگر وہ تو میرے ابا کی نشانی ہے۔"

"کیسی بیوی ہو تم' تمہارا شوہر پریشان ہے مصیبت میں ہے' بجائے اس کے کہ تم اس مشکل وقت میں میرا ساتھ دو' ایک مرحوم آدمی کی نشانیاں سمیٹ رہی ہو اور میں جو زندہ سلامت تمہارے سامنے موجود ہوں میرا کوئی احساس نہیں ہے۔" وہ تو ایسے شکوہ کناں تھا جیسے دونوں میں بڑے گہرے محبت بھرے مراسم ہوں۔

"تایا ابو سے مشورے کے بغیر ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"تم کل جاؤ گی اور وہ کاغذات لے کر آؤ گی ورنہ یہاں آنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

"بس یہی اوقات' یہی حیثیت ہے ایک عورت کی۔ چاہے اپنا تن' من' دھن وار دے پھر بھی اس کے آشیانے کی مضبوطی ساحل پہ بنے ریت کے گھروندے سے زیادہ نہیں ہوتی۔"

☼ ☼ ☼

اگلے روز اس نے بیگ میں چار جوڑے رکھے اور کمرے سے باہر آ گئی۔ ہارون اس وقت گھر پہ تھا' اسے اکیلے نکلتے دیکھ کر اس کے پیچھے آیا تھا۔

"بھابھی! میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔"

"ہارون۔" ماں کی کڑک آواز نے اسے داخلی دروازے پر ہی رکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں ساتھ جانے کی۔ اس کے میاں نے اسے اجازت دی ہے اور ویسے بھی اسے عادت ہے اکیلے یونیورسٹی تک جا چکی ہے تو گھر تک جانا کون سا مشکل کام ہے۔"

"امی! یونیورسٹی کی بات اور تھی اب یہ ہمارے گھر کی بہو ہیں' اکیلے جاتی کیا اچھی لگیں گی۔" اس نے تحمل سے سمجھایا۔

"ایاز روڈ پہ میرا ویٹ کر رہے ہیں' میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔" اس کی اطلاع پر اماں نے سکھ کا سانس لیا تھا' وہ کسی صورت بھی ہارون کو وہاں جانے سے روکنا چاہتی تھیں' ہارون کا چہرہ اتر گیا' اس نے جب زینی کو تیاری کرتے دیکھا تھا تب ہی عینی کو بتا دیا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ ایاز اسے گیٹ پر اتار کر چلا گیا تھا۔ عینی گیٹ پہ سراپا انتظار تھی لیکن اسے ایاز کے ساتھ گاڑی سے اترتا دیکھ کر برا سا منہ بناتی اندر چلی گئی تھی۔ زینی بجھے دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی' اماں

نے اس کا ر تپاک استقبال کیا تھا۔

"میں قسم اللہ کراں میری بیٹی آئی ہے۔ ایاز نہیں آیا ساتھ' اکیلی کیوں آئی ہو۔" اسے بے تحاشا پیار کرنے کے بعد۔ اب وہ اس کے عقب میں جھانک رہی تھیں۔

"آئے تھے گیٹ پر چھوڑ کر چلے گئے۔"

"زینی! تم بھی حد کرتی ہو' ایسے کیسے جانے دیا تم نے اندر تو لے کر آتیں' داماد ہے وہ اس گھر کا' کھانا وغیرہ تو کھا کر جاتا۔" اماں نے ہلکا سا ڈپٹ کر کہا۔

"اماں وہ ذرا جلدی میں تھے۔" وہ شرمندگی سے بولی۔ شرمندگی اسے اپنی آمد کے مقصد پر ہو رہی تھی کہ وہ کیسے ابا سے یہ بات کرے گی' وہ تو پہلے ہی اس سے خفا تھے۔

"اچھا چلو کوئی بات نہیں' اب واپسی میں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ گوشی! تھوڑا رات کا ڈنر شاندار ہونا چاہیے' ابھی سے تیاری شروع کرو گی تو شام تک۔"

"نہیں میں آج رات یہیں رکوں گی۔" زینی نے اماں کو ٹوکا۔ گوشی کانوں میں ہینڈ فری لگائے اپنا پسندیدہ پروگرام سننے میں مشغول تھی' یہ شغل اس نے زینی کی آمد پہ بھی ترک نہیں کیا تھا البتہ اس کے بیگ پر خوب نظر تھی۔

"کہیں لڑ جھگڑ کر تو نہیں آ گئیں؟" اماں کے جانے کے بعد گوشی نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ انداز طنز بھری ناگواری لیے ہوئے تھا۔ زینی نے بغیر کچھ کہے منہ موڑ لیا' وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ گوشی کو اس کا انداز اندر تک سلگا گیا تھا۔

شام ہوئی' رات آئی پھر اگلا دن نکل آیا' وہ ابا سے بات کرنے کی ہمت — نہیں کر پائی تھی' کیا کہتی ان سے — وہ تو سمجھتے تھے کہ یہ شادی اس کی پسند سے ہوئی ہے اور اب مکان کے کاغذات مانگنا' کتنا عجیب لگتا' کیا اس کی پسند اتنی گھٹیا ہو سکتی تھی۔ گوشی نے اسے ابا سے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور ایاز کا مطالبہ اگر دہرا دیتی تو اس کا سر ہمیشہ کے لیے جھک جاتا۔ اسی کشمکش میں تین سے چار دن گزر گئے تھے' وہ ابھی تک بات نہیں کر سکی تھی' اماں کو اب تشویش ہونے لگی تھی۔ بالآخر اس نے اماں سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اماں ساری بات سن کر خاموش ہو گئیں۔

"ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا شادی کو اور تم آ گئی ہو میکے مانگنے' آئندہ ان مسئلوں کو اپنے سسرال میں حل کرنا۔" یہ عمر تھا۔

"سارے زمانے میں تمہیں یہی ملا تھا جاہل' گنوار' لالچی' بھکاری۔" عباد کیوں پیچھے رہتا۔ یعنی ان کے جلے کٹے جملوں پر جز بز ہوتی گوشی کو اشارے کر رہی تھی۔

"اس کا مکان ہے' اس کی ملکیت ہے۔ اگر وہ کاغذات مانگ رہی ہے تو یہ اس کا حق ہے' تم دونوں کو کیا تکلیف ہو رہی ہے۔" گوشی نے دونوں کو گھور کر خاموش کروا دیا' یعنی کی خاطر اسے اس گھر کا امیج کسی صورت خراب نہیں کرنا تھا' ابا سے بھی مکان بیچنے والی بات چھپالی گئی تھی۔

زینی نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر گوشی کی طرف داری نے اسے حیران کر دیا تھا' ابا نے کاغذات دے دیے مگر اماں کو نئی فکر نے گھیر لیا تھا۔

"گوشی! یہ تو بڑے لالچی قسم کے لوگ ہیں۔"

"اماں! ہارون ایسا نہیں ہے اور یعنی کو کون سا اس گھر میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا ہے' وہ تو اسلام آباد میں ہارون کے ساتھ ہی رہے گی۔" اپنی دانست میں اس نے سب طے کر رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"گڈ۔" وہ کاغذات دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی' چلو آج اس خوشی میں تمہیں ڈنر پر لے کر جاتا ہوں' جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

ایاز تو آج اس پہ مرمٹنے کو تیار تھا' وہ بے دلی سے تیار ہوئی' اس کا دل کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ کیسی زندگی تھی' ان چاہی مجبور سی' اس کے آئیڈیل کا بت آج ٹوٹ کر ہمیشہ کے لیے بکھر گیا تھا' یہ اس کی زندگی

میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ پھر بھی اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

آج اس کی سالگرہ تھی۔ ایاز کو پتا نہیں تھا مگر زریاب کو یاد تھا وہ بھلا اتنے خوب صورت دن کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ اس کی سالگرہ کے دن سب سے پہلے زریاب ہی وش کرتا تھا' زینی کو سال بھر میں ایک ہی تحفہ ملتا تھا۔ جو زریاب اس کے لیے لے کر آتا تھا۔

آج بھی زریاب نے اس کے لیے تحفہ خریدا تھا اور لا کر الماری میں مقفل کر دیا تھا وہ کبھی اس کی دوست تھی مگر آج رشتے بدل چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

گوشی اور عینی اس کی سالگرہ کا بہانہ بنا کر آئی تھیں۔ گھر آکر پتا چلا زینی تو باہر گئی ہوئی ہے۔ آنٹی نے روکھا سا جواب دیا تھا مگر وہ ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہیں۔

"ہم ویٹ کر لیتے ہیں۔" مجبوراً" موموکو ان کے پاس بیٹھنا پڑا' عینی نے نوٹ کیا تھا' موموآج کل اسے کچھ خاص لفٹ نہیں کرواتی — ہارون بھی وہیں چلا آیا تھا۔ اب زبیدہ بیگم کو بیچ میں ہول اٹھ رہے تھے ہارون کے انداز وہ دیکھ چکی تھیں۔ ہر وقت فون سے چمٹا رہتا تھا' کھانا کھاتے' اٹھتے بیٹھتے' ڈرائیونگ کرتے کہیں آتے جاتے ہر وقت موبائل اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور میسج ٹون وقفے وقفے سے بجتی رہتی۔

انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی صورت زینی کو اس گھر میں خوش نہیں رہنے دیں گی تاکہ جب وہ یہاں کی باتیں گھر جا کر ماں کو بتائے گی تو وہ لوگ دوسری بیٹی کا سوچیں گے اور اس طرح ان کی جان چھوٹ جائے گی۔

"مگر ان کو یوں کھلی چھوٹ بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔" عینی اور ہارون کو دیکھتے ہوئے اب وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا تم کھانا نہیں کھا رہیں؟" ایاز نے اسے خالی پلیٹ میں چمچ چلاتے ہوئے دیکھا تو دوسری بار ٹوکا۔

"گھر چلیں۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"کیوں میرے ساتھ آکر تمہیں اچھا نہیں لگ رہا؟ کیا کسی کی یاد ستا رہی ہے؟ یا بچھڑتے ہوئے لمحے یاد آ رہے ہیں۔" اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غیض بھر آیا۔ زینی اپنی جگہ سن سی رہ گئی تھی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اسے بھی غصہ آگیا تھا۔

"اب کیا ریسٹورنٹ میں تماشا لگواؤ گی؟ تمہارے ساتھ تو کوئی رعایت کرنی ہی نہیں چاہیے۔" چمچ پلیٹ میں پٹخ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ احساس توہین سے اس کی آنکھوں میں مرچیں چبھنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"لو بھابھی آگئیں۔" ہارون اسے دیکھ کر چہکا۔

"آپ نے بتایا نہیں آج آپ کی سالگرہ تھی' ہم کچھ اہتمام ہی کر لیتے۔" ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب صوفے پر لا بٹھایا تھا۔

"بہرحال کیک تو کاٹا جا سکتا ہے۔"

"ہیپی برتھ ڈے زینی۔" عینی اور گوشی اس کے لیے کیک اور پھول لائی تھیں۔ مقام حیرت تھا' اس نے سب کے درمیان بیٹھ کر کیک کاٹا۔ ماحول میں عجیب چبھتی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ جیسے سب کو زبردستی کھینچ کر یہاں بٹھا دیا گیا ہو' بس ایک ہارون تھا جو ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ساس قہربار نظروں سے سب دیکھ رہی تھیں' ایاز کا چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں سے جھلکتی سرد مہری وہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے پلیٹ میں کیک ڈال کر ایاز کی سمت بڑھایا۔

"تمہاری سالگرہ ہے' تم ہی کھاؤ۔" اچانک وہ اٹھ کر چلا گیا۔ سب کی نظریں زینی کی سمت اٹھی تھیں۔

"ہمارے گھر میں ایسے ہندوانہ رواج نہیں ہیں۔ اپنی بہنوں سے کیک منگوانے سے پہلے ہم سے پوچھ لینا چاہیے تھا اور آج کے بعد تمہاری بہنیں ہمارے گھر نہ آئیں' مجھے ان کی یہاں آمد بالکل پسند نہیں۔"

ان کے جانے کے بعد زبیدہ بیگم نے اس کی کلاس لے لی تھی۔
ہارون اپنی گاڑی میں انھیں چھوڑنے گیا تھا' ان کا بلڈ پریشر انتہائی بڑھ گیا۔ لیاز ڈاکٹر کو گھر لے کر آیا تھا۔ انجکشن اور دواؤں کے زیر اثر اب وہ کچھ پر سکون تھیں۔

☼ ☼ ☼

"توبہ ہارون! تمہاری امی تو ایک پل کے لیے بھی ہمارے درمیان سے نہیں اٹھیں۔" بینی نے اگلی نشست سنبھالتے ہوئے کوفت سے کہا تھا۔
"یار مجھے لگتا ہے امی کو شک ہو گیا ہے۔"
"تو؟" بینی نے ابرو چڑھائے۔
"تو اب ہمیں تھوڑی احتیاط برتنی ہو گی۔"
"یہ تو اچھا ہی ہے ایک دن تو انہیں پتا چلنا ہی تھا۔" اب کی بار گوشی نے بھی مداخلت کی' اسے بھی آنٹی کے تیور خاصے خطرناک لگے تھے' کیسی ناپسندیدہ نظروں سے وہ انہیں گھور رہی تھیں۔
"ہاں مگر ابھی یہ سب قبل از وقت ہے' پہلے مومو کی شادی ہو گی تو ہی میرا نمبر آئے گا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔
"دیکھنا انتظار کہیں اتنا طویل نہ ہو جائے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔" گوشی نے اسے ڈرایا۔
"اللہ نہ کرے۔" وہ بے ساختہ بولا۔ "آپ ہیں نا ہمارے ساتھ' پھر فکر کی کوئی بات نہیں اور چھوڑیں ان باتوں کو' میں آپ کو مزے دار ساؤز کرواتا ہوں۔" اس نے گاڑی قریبی ریسٹورنٹ کی سمت موڑ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج سالگرہ تھی تمہاری' تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔" کچن سمیٹ کر جب وہ کمرے میں آئی تو اکھڑے تیوروں کے ساتھ وہ نئی عدالت سجائے بیٹھا تھا۔
"مجھے خود بھی یاد نہیں تھا۔" اس نے جان چھڑانے کو کہہ دیا۔
"یاد تو ہر سال زریاب کرواتا تھا تمہیں۔ آج بھی اسی کا انتظار ہو گا' اس نے بھی کوشش تو بہت کی ہو گی مگر میں تمہارا شوہر ظالم سماج بن کر تم دونوں کے بیچ کھڑا ہو گیا۔" اپنے مطلب کی بات بنا کر اب وہ خود ہی ہنس رہا تھا' تمسخرانہ ہنسی۔
"آپ اتنے بدگمان کیوں ہیں مجھ سے۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں وہ بس میرا کزن تھا' میرا دوست تھا اور کچھ بھی نہیں۔"
"اچھا کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انتہائی چبھتے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"میں آپ کے ساتھ وفادار ہوں۔" وہ دیر تک ہنسا' پھر ایک دم سے خاموش ہو گیا۔
"لیاز۔" زینی نے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔
"بے وفا ہو تم۔" اس کا ہاتھ جھٹک کر اس نے کروٹ بدل لی تھی۔
وہ رات بھر جاگتی رہی' سوچتی رہی۔ جب لیاز ڈاکٹر کو لینے گیا تھا تو زبیدہ بیگم نے اس کو خوب سنائی تھیں۔
"تم نے کیا ہمیں کاٹھ کا الو سمجھ رکھا ہے' ایک بیٹے کو تم نے پھانس لیا۔ دوسرے پر تمہاری بہن ڈورے ڈال رہی ہے' کیسا بے غیرت باپ ہے تمہارا' لڑکیوں کا ہوش نہیں کہ وہ کیا گل کھلاتی پھر رہی ہیں۔ ایک تم کیا کم ہو جو اس چنڈال کو بھی بیاہ کر لے آؤں' تمہیں کوئی اور گھر نہیں ملا تھا' گھر برباد کرنے کے لیے۔" وہ ہانپنے لگی تھیں' مومو نے جا کر سنبھالا' پانی پلایا۔ ہر کوئی اس کے پیار کا راگ الاپ رہا تھا اور پیار کہاں تھا۔
"گوشی تم مجھے اور کتنا پستی میں دھکیلو گی' خدا کرے تمہارے من کی مراد بھی پوری نہ ہو' جس کی خاطر تم نے مجھے اتنا بدنام کیا ہے' وہ محبت تمہیں کبھی نہ ملے۔" آج پہلی بار اس کے دل سے گوشی کے لیے بددعائیں نکلی تھیں' جو سیدھی عرش تک جا پہنچی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے کی دیوار پہ اس نے ایک پیارے سے

بچے کی تصویر لگائی تھی۔ وہ دیر تک اسے دیکھتی رہی' خوش ہوتی رہی۔ اس کے وجود کا حصہ' اس کے دل کا ٹکڑا' اس کے خوابوں کی تکمیل۔ جس کے ساتھ زندگی کتنی خوب صورت اور مکمل ہو گی۔

اس کے اندر سے جیسی ساری تشنگی مٹ جائے گی۔ وہ اسے بہت پیار کرے گی۔ اس پہ حق جتا سکے گی۔ وہ اس کی ملکیت ہو گا' اس کا اثاثہ' اس کا سرمایہ' اس کی کل کائنات۔ ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی نوید دی تھی۔ اس کے قدموں تلے جنت رکھی جا رہی تھی۔ کیا وہ اتنی خوش نصیب تھی۔

چندا ہے تو۔

میرا تارا ہے تو۔

وہ دھیمے سروں میں گنگنا بھی رہی تھی۔ تب ہی اس کا سیل بجا تھا۔

"بینی کالنگ۔" اس نے فوراً" ریسیو کی۔

"ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ بھائی اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ہارٹ اٹیک کا خطرہ ہے۔" اس اطلاع نے جیسے اس کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ ایک پل میں ساری خوشی کافور ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا' رنگت کیوں اتنی زرد ہو رہی ہے۔" ایاز اچانک کمرے میں آیا تھا۔ اسے کمرے کے درمیان کھڑے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ آج کل وہ اس کا تھوڑا بہت خیال رکھ رہا تھا۔ آخر اپنی اولاد کی اسے بھی فکر تھی۔

"ابو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے' مجھے جانا ہے۔" وہ رو ہی پڑی تھی۔

"ہاں میں تمہیں لے کر چلتا ہوں' تم زیادہ ٹینشن نہ لو' ٹھیک ہو جائیں گے۔" ایاز نے تسلی دی تو وہ فوراً" چادر اوڑھ کر اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اماں نے صحن میں ہی روک لیا تھا۔

"زینی کو اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

"ایک کام میں اپنی مرضی کر لی تو کیا مطلب ہے کوئی پوچھنے والا نہیں رہا؟ میں کیا اس گھر میں موجود نہیں ہوں؟ یا میری کوئی اہمیت نہیں؟"

"آپ کی اہمیت کیوں نہیں ہو گی' اچھا اب پوچھ لیتا ہوں ہم جائیں؟"

"اور اگر میں کہوں کہ نہیں جاؤ تو رک جاؤ گے۔"

"ہاں رک جائیں گے۔"

"مگر ابا۔" زینی نے لب کھولے۔

"تو پھر نہ جاؤ۔" ان کو بھی ساری آزمائشیں آج ہی مطلوب تھیں۔

"چلو اندر' ہم نہیں جا رہے۔" ایاز کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

"امی! میرے ابو کی طبیعت بہت خراب ہے' پلیز آج جانے دیں۔" اس نے ملتجی لہجے میں ساس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"کوئی ایمرجنسی نہیں لگی تمہارے باپ کو جو تمہارا جانا ضروری ہے۔ اتنے سارے کام کرنے ہیں' صحن کے پودے دیکھو کتنی دھول جمی ہوئی ہے۔ ان کو بھی کبھی دھونے کی زحمت کر لیا کرو' سارے گملے مجھے نکھرے ستھرے چاہئیں' جب سے آئی ہو گھر کا نقشہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

ابا صحت یاب ہو کر گھر آ گئے تھے۔ عمر کو نوکری مل گئی تھی' اماں آج کل اس کے لیے رشتے دیکھ رہی تھیں اور پھر ایک لڑکی انہیں پسند بھی آ گئی۔ ابا اب جلد از جلد تمام بچوں کے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ پھوپھو کو بھی ابا نے تاریخ کا اشارہ دیا تھا مگر زریاب کا "ابھی نہیں" سب کو خاموش کروا گیا تھا' گوشی کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ طرح طرح کے وہم اندیشے اس کا دل دہلائے رکھتے تھے۔

عمر کی رسم کرنے جانا تھا' جب عمر نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔ وہ اپنی خالہ زاد عشمہ کو پسند کرتا تھا اور ابا کی اپنے ہم زلف کے ساتھ بالکل نہیں بنتی تھی۔ خالہ کی وفات کے بعد خالو نے ایک جوان لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ جس پر ابا کو سخت اعتراض تھا۔

"ہاں! وہ آپ کی بھانجی ہے۔" عمر اماں کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا۔

"میری بھانجی ہے' اسی لیے تو منع کر رہی ہوں۔ اللہ بخشے میری آپا کا مزاج ہمیشہ ہی ساتویں آسمان پر رہتا تھا۔ بیٹی بھی اسی کا پر تو ہے۔" اماں کسی طور ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ بہرحال عمر نے اب گوشی کا پیچھا لیا ہوا تھا۔

"باجی تم اماں کو سمجھاؤ' میں بہت پسند کرتا ہوں اسے۔"

"کب سے چل رہا ہے یہ چکر۔" اس کی تفتیش کا آغاز ہوا۔

"بس زینی کی شادی پہ وہ آئی تھی۔" سر جھکا کر اقبال جرم کیا گیا۔

"اچھا کیسے' کیوں' کب۔ مجھے کیوں خبر نہیں ہوئی۔" وہ چونکی ہوئی۔

"اب کیا پوری اسٹوری سناؤں' پلیز باجی' اماں کو مناؤ نا۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"اماں نے جو لڑکی تمہارے لیے پسند کی ہے' وہ ایم بی اے ہے' سلائی کڑھائی میں طاق' کھانا بھی اچھا بناتی ہے' خوش گفتار' ملنسار' فیملی بیک گراؤنڈ بھی مضبوط ہے' گوری چٹی اسمارٹ' ویل ڈریسڈ' تم ایویں ہی اس عشمہ کے پیچھے اپنا ٹائم ویسٹ کر رہے ہو۔" گوشی نے نادیدہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے خوب لتاڑا' مگر وہاں عشق کا بھوت سوار تھا۔

"مجھے عشمہ پسند ہے۔" وہ اٹل تھا۔

"پھر میری بھی ایک شرط ہے۔" اس نے آنکھوں کو گول گول گھمایا۔

"میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

"تم شادی سات ماہ کے بعد کرو گے۔" یہ انوکھی شرط تھی' مگر اس کی مجبوری تھی' سو اس نے مان لیا۔

"ہماری خوشیوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔" وہ دل ہی دل میں زینی سے مخاطب تھی۔

✿ ✿ ✿
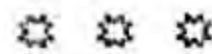
زینی کے ڈلیوری کے دن قریب تھے' جب عمر کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ دل مسوس کر گھر بیٹھی رہی۔ کتنا ارمان تھا اسے عمر کی شادی کا' اس نے کپڑے بھی سلوائے تھے' مگر اب کیا ہو سکتا تھا' اس حالت میں کوئی فنکشن اٹینڈ نہیں کر سکتی تھی۔ مومو کی سج دھج دیکھنے لائق تھی۔ آج کل اس کی ساس کا موڈ بھی بے حد خوش گوار تھا۔

ان کے گھر سے سب شادی میں شریک ہوئے تھے۔ اس نے بس تصور میں بارات کو جاتے دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اماں سے شکوہ کناں تھی۔ انہیں تو زینی کا خیال کرنا چاہیے تھا۔

"بھئی شادی تو موسم کے مطابق ہونی چاہیے' اب اگر تمہارے لیے رک جاتے تو آگے گرمیاں آ رہی ہیں اور خالو اپنی نئی بیوی کو لے کر دبئی جا رہے ہیں۔ جانے سے قبل وہ بیٹی کو رخصت کرنا چاہ رہے تھے۔ اب ہماری مجبوری ہے۔" یہ گوشی کی سنائی ہوئی کہانی تھی جس کی تخلیق کار بھی وہ خود ہی تھی۔

✿ ✿ ✿

فنکشن سے واپسی پر مومو نے اپنا زیور نوچ نوچ کر اتارا تھا۔ دوپٹا ایک طرف پھینک کر اب وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ زبیدہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

"ارے لڑکی باؤلی ہو رہی ہے' بتاؤ بھی آخر ہوا کیا ہے؟" وہ پوچھ پوچھ کر تھکنے لگی تھیں' مگر مومو کا رونا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ فنکشن کے دوران اس کی نظر زریاب پر پڑی' تو اس نے عینی سے کہا تھا۔

"عینی! تمہارا یہ کزن تو کافی ہینڈسم ہے' مگر کافی روڈ ہے۔"

"زریاب بھائی' صرف میرے کزن ہی نہیں' ہونے والے بہنوئی بھی ہیں' گوشی آپا کے فیانسی۔" اور وہ جیسے یہ سب سن کر سکتے میں آ گئی اور اس کا یہ سکتہ اب گھر آ کر ٹوٹا تھا۔

"امی! وہ پہلے سے منگنی شدہ ہے' گوشی کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے اس کی۔" گھنٹہ بھر بعد کہیں جا کر وہ بولی تھی اور زبیدہ بیگم کے تو جیسے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"ٹینی' ہارون کے ساتھ اور گوشی' زریاب کے۔ واہ واہ اتنے خوب صورت گھبرو جوان ایسے تو نہیں لوٹنے دوں گی میں۔"

"میں بتا رہی ہوں امی! اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں خودکشی کرلوں گی' زہر کھالوں گی' جان دے دوں گی اپنی۔" اس قدر خوف ناک عزائم ان کا دل سہم گیا۔

"آئے ہائے مریں تمہارے دشمن۔ کیوں ایسی بدفال منہ سے نکال رہی ہو۔"

"ابھی اور اسی وقت چلتا کروائے ادھر سے۔" اس کا اشارہ زینی کی سمت تھا۔

"ایک پل نہیں رہنے دوں گی اسے اس گھر میں۔" اس کے سر پہ جیسے کوئی جنون سوار ہوچکا تھا۔

"تھوڑا صبر کرو' مجھے کچھ سوچنے دو' کرتی ہوں اس مسئلے کا حل بھی۔" بمشکل ہی سمجھا بجھا کر وہ اسے ٹھنڈا کرپائی تھیں۔

آج کل ان کا لہجہ زینی کے ساتھ اتنا میٹھا اور شہد آگیں ہوچکا تھا کہ زینی کو ان کے اس مصنوعی لگاوٹ بھرے محبت کے مظاہروں پر عجیب سے ہول اٹھتے تھے۔ وہ ایاز پر کسی صورت یہ آشکار نہیں کرنا چاہتی تھیں کہ وہ زینی کو ناپسند کرتی ہیں' ان کی کوشش تھی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب تو بس موقع کا انتظار تھا۔

☆☆☆

زینی نے ایک خوب صورت گول مٹول سے بچے کو جنم دیا تھا۔ ایاز کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے سارے شہر میں مٹھائیاں بانٹی تھیں۔ زینی کے ساتھ بھی اس کا رویہ پہلے سے بہت بہتر ہوچکا تھا۔ وہ اب اس پر اعتبار کرنے لگا تھا۔

زینی کی مصروفیات اب بڑھ گئی تھیں۔ اس کے ذہن سے اب پرانی باتیں' رویے محو ہونے لگے تھے۔ سونو ہی اب اس کی کل کائنات تھا۔ اس کے کام کرتے کیسے وقت گزر جاتا' اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا' امی اور مومو کا رویہ بھی اب اس کے ساتھ کافی اچھا تھا' بلکہ مومو تو آج کل ہر وقت اس کے کمرے میں ساتھ رہتی تھی۔ ابھی بھی اس کا سیل فون مانگ رہی تھی۔

"مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔"

دوسری جانب پھوپھو حماد سے کہہ رہی تھیں کہ زینی کا نمبر ملاؤ' مجھے اسے مبارک باد دینی ہے۔ حماد نے زریاب کے سیل فون سے زینی کو کال کی تھی۔ مومو ابھی نمبر ڈائل کررہی تھی۔ جب سیل پر کال آئی تو اس نے کال ریسیو کرلی۔

"ہیلو زینی۔"

"کس کا فون ہے۔" ایاز اچانک ہی واش روم سے نکلا تھا۔

"کوئی لڑکا تھا' زینی۔ بھابھی سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔" مومو نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے فون اس کی سمت بڑھادیا۔ وہ فون لے کر زینی کی طرف رخ کیا۔

"اس نمبر کو جانتی ہو؟" اسکرین پر کوئی انجان نمبر جگمگا رہا تھا۔ زینی نے نفی میں سر ہلادیا۔ ایاز اب اس نمبر کو ری ڈائل کررہا تھا۔

"ہیلو زینی' لگتا ہے بہت مصروف ہو' اب ہم سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔" دوسری جانب زریاب تھا۔ ایاز نے فون کو زور سے دیوار پہ دے مارا۔ زینی کا حلق خشک ہوچکا تھا۔

"کب سے چل رہا ہے یہ چکر۔" اسے بالوں سے پکڑ کر اب وہ اپنے مقابل کھڑا کرچکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"میں نے تو کبھی اس سے بات نہیں کی۔" زینی کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"جھوٹی' مکار' فریبی' دھوکا دیتی رہی ہو مجھے۔" تابڑ توڑ تھپڑوں نے اس کا چہرہ سرخ کردیا تھا۔

"ایاز میرا یقین کرو۔" وہ اس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

"اسی لیے فون کو سائلنٹ کر رکھا تھا۔"

"وہ تو سونو کی وجہ سے' اس کی نیند۔" اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ ایاز اب اسے دھکے دے رہا تھا۔

"اٹھو نکلو ادھر سے۔" وہ اب اسے گھر سے نکال

رہا تھا اس کے واسطے، منتیں، رونا گڑگڑانا کچھ بھی کام نہیں آیا تھا۔ ایاز نے اسے گھر سے نکال کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں ننگے سر کھلے آسمان تلے کھڑی تھی۔

"امی... مومو... ایاز..." دروازہ بجا بجا کر اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ ارد گرد دروازوں سے چھتوں سے بہت سے چہرے نمودار ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دروازہ بجایا تھا۔ آخر دروازے کے اس پار مومو کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

"یہ لیں آپ کی چپل، اور یہ کچھ پیسے ہیں، گھر تو آپ چلی ہی جائیں گی۔" وہ یہ چیزیں اسے تھما کر واپس پلٹنے والی تھی، جب زینی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"پلیز مجھے میرا سونو لا کر دے دو، وہ ابھی فقط چند دنوں کا ہے، میرے بغیر کیسے رہ پائے گا۔" اس کا انداز منت بھرا تھا۔ مومو کو اس پہ بے تحاشا ترس آیا۔ لب کاٹتے ہوئے بولی۔

"مجھے نہیں پتا آپ کے اور بھائی کے مابین کیا معاملہ ہوا ہے، وہ بہت غصے میں ہیں اور امی تو ویسے ہی آج کل آپ کو اس گھر سے نکلوانے کے منصوبے بنا رہی تھیں۔ بھائی اگر آپ کو واپس اس گھر میں لے بھی آئے تو امی نہیں لانے دیں گی، اب اس گھر میں واپس آنے کا اور سونو سے ملنے کا ایک ہی راستہ ہے۔" تیز تیز بولتے ہوئے وہ بار بار پیچھے بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ڈرامائی وقفے پر زینی نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اگر آپ میری شادی زریاب سے کروا دیں تو ہی آپ دوبارہ اس گھر میں آسکتی ہیں۔" کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"مومو اور زریاب..." زینی کا وجود جیسے ہچکولے کھانے لگا تھا۔ مین روڈ پہ آکر وہ کبھی دائیں، تو کبھی بائیں سمت دیکھ رہی تھی۔ اسے راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ساری چیزیں، باتیں اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ کبھی آگے جا رہی تھی، کبھی پھر واپس آتی، کبھی روڈ پار کرنے لگتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"میرے خدا میں کہاں ہوں، مجھے کہاں جانا ہے، کیوں مجھے راستہ سمجھ میں نہیں آرہا۔" اسے لگ رہا تھا جیسے چاروں جانب صحرا ہو۔

"باجی کہاں جانا ہے۔" ایک رکشے والا اس سے پوچھ رہا تھا اور وہ ہونق بنی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"زینی..." تب ہی کسی نے جیسے بہت قریب سے پکارا تھا۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں..." زریاب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ زینی نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"چلو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو۔" وہ اگلی نشست کا دروازہ کھول کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا، مگر زینی تو اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی۔ وہ پھر گاڑی سے اترا۔

"زینی گاڑی میں بیٹھو۔" زریاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور وہ جیسے کسی بے جان گڑیا کی طرح اس کے ساتھ کھنچی، چلی گئی، اسے گاڑی میں بٹھا کر وہ خود دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا تھا۔ پھر پانی کی بوتل اسے تھمائی۔

"مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، کیا ہوا ہے تمہیں۔ ابھی کچھ دیر قبل میں تمہیں فون کر رہا تھا، امی کو تم سے بات کرنا تھی اور تم یہاں کھڑی ہو؟ سونو کہاں ہے اور ایاز، باقی گھر والے سب..." وہ اتنا سب بول رہا تھا اور وہ بالکل خاموش، ساکت سامنے دیکھ رہی تھی۔

"زینی تمہیں کیا ہوا ہے۔" زریاب نے پوچھا۔ مگر وہ یوں مصر تھی جیسے اب کبھی نہیں بولے گی۔ تھک ہار کر زریاب اسے گھر لے آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر میں سب ہی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوئے تھے۔ ابا نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ عمر اور اسد بے قابو

ہو رہے تھے کہ اس لیاز کی یہ جرأت کہ ان بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرے۔

اماں نے منع کر دیا تھا کہ جب تک زینی ساری بات نہیں بتاتی کوئی اس کے سسرال نہیں جائے گا۔ پہلے معاملہ معلوم ہو تو وہ اسی کے مطابق اگلا لائحہ عمل طے کریں گے' مگر وہ تھی کہ پتھر کے بت کی مانند' ستون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

ایک ایک پل جیسے صدیوں پہ بھاری تھا۔ سونو رو رہا ہو گا۔ اسے بھوک لگی ہوگی' اس کا خیال کون رکھے گا۔ کہیں وہ بیمار نہ پڑ جائے' کون اس کے لیے راتوں کو جاگے گا۔ ان گنت دھڑکے' بے شمار وہم اور ہزار ہا وسوسے' ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی تھی۔

"سونو اور زریاب۔" اس کے دماغ میں بس دو ہی نام گونجا کرتے۔

"یہ کیسے ممکن تھا۔" وہ سوچ سوچ کر ہول جاتی۔ زریاب دو بار اس سے ملنے آیا تھا۔

"اس نے مجھے دل سے' گھر سے' اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔"

"کیا اس نے تمہیں طلاق۔" وہ اتنا ہی بول سکا تھا' زینی نے نفی میں گردن ہلائی تو اس نے جیسے سکون کا سانس لیا۔

"کیوں زینی ایسا کیا کر دیا تم نے جو۔" اور زینی ایک بار پھر خاموش ہو چکی تھی۔

گوشی آج کل بہت خوش تھی' اس کے خیال میں زینی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ زینی کو روتے' تڑپتے' راتوں کو جاگتے دیکھ کر جیسے اس کے دل پہ ٹھنڈی میٹھی پھوار برس رہی تھی۔ مگر عینی۔ اسے ہارون نے بتا دیا تھا۔

"عینی اس سے پہلے کہ بات طلاق تک پہنچ جائے' کچھ کرو۔ کسی بھی طرح ایاز کی غلط فہمی دور کرو' وہ زینی اور زریاب پہ شک کر رہا ہے۔" اور وہ دعا لے کر گوشی کے پاس چلی گئی تھی۔

"گوشی آپا پلیز۔ کچھ کریں۔ اگر ایاز بھائی زینی کو لینے نہ آئے اور انہوں نے کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا تو میرا کیا ہو گا۔ ایا ایسے گھر میں کبھی بھی میرا رشتہ نہیں کریں گے۔" مگر گوشی نے جیسے آنکھیں' کان بند کر لیے تھے۔

"تڑپنے دو' ابھی کچھ روز مزید تڑپنے دو زینی کو۔" وہ مزے لیتے ہوئے بولی۔

آخر وہ ایک دن خود ہی ایاز کے پاس چلی گئی' وہ اس وقت زمینوں پر تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک کی زینی اور گوشی کی لڑائی' ایک دوسرے کی مخالفت' گوشی کی مکاری اور زینی کو برباد کرنے کی اس کی پلاننگ' اس نے ایاز سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ "زریاب کے متعلق وہ آپ سے جو بھی کہتی تھیں وہ سب جھوٹ تھا' پھوپھو تو ہمیشہ سے ہی زینی کو بہو بنانا چاہتی تھیں' اگر زینی کی طرف سے ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ کبھی بھی آپ سے شادی نہ کرتی' وہ آپ کے ساتھ مخلص ہے اور بے وفائی کا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔" عینی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ زینی بے گناہ ہے اور گوشی نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

سوچ سوچ کر ایاز کا دماغ مفلوج ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں شک ڈال کر' اس کی زندگی برباد کر کے اس کا سکون غارت کر کے وہ لڑکی کتنی مطمئن تھی۔

"ایک لڑکی نے تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا' تف ہے تم پر۔" اسے اپنے اوپر غصہ تھا۔ پھر وہ زبیدہ بیگم کو لے کر ان کے گھر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں سب ہی موجود تھے۔

امی' ابا' اسد' عمر' زریاب' عینی' گوشی' ایاز' زبیدہ بیگم اور جس کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا تھا وہ ایک کونے میں سر جھکائے کسی مجرم کی مانند کھڑی تھی۔

"ہم تو آپ کے گھر رشتہ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے' گوشی نے خود ہمارے گھر آ کر کہا تھا کہ ہم زینی کے لیے رشتہ لے کر آئیں۔" زبیدہ بیگم نے زبان کھولی تھی۔

"میں زینی کو پسند کرتا تھا' گوشی نے مجھ سے کہا کہ میں زینی سے کالج کے باہر ملوں اور زینی کا انکار مجھے اپنی

انسلٹ محسوس ہوا تھا' مگر جب میں نے اس سے شادی کی تو اس بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا' مگر گوشی نے ہر روز میرے دماغ میں یہ شک ڈالا کہ زینی اور زریاب کے بیچ کوئی چکر ہے۔"

"اور آپ کی دوسری بیٹی میرے چھوٹے بیٹے کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے' لیکن یہ رشتہ کسی صورت نہیں ہوگا' ہم تو ایک کے بعد ہی پچھتا رہے تھے۔ اب اگر آپ کو اپنی بیٹی کا گھر بسانا ہے تو زریاب کی شادی میری بیٹی صومیہ سے کردیں' ورنہ فیصلہ آپ کو مل جائے گا۔" وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

"زریاب اور مومو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے' وہ تو گوشی کا منگیتر ہے۔" ایاز نے اماں کے سامنے ہلکا سا احتجاج کیا تھا' مگر انہوں نے یہ کہہ کر خاموش کروا دیا۔

"اگر تمہیں اپنی بیوی کو گھر لانا ہے تو مومو کی شادی زریاب سے ہوگی' ورنہ ایک بدچلن' آوارہ لڑکی کی ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" اور یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ مومو' زریاب کو پسند کرتی ہے۔

جس شخص کے لیے تم اپنی بیوی سے بے اعتبار رہے' اسے تمہاری بہن پسند کرتی ہے' اب کیا کرو گے' نکالو اسے بھی دھکے مار کر گھر سے باہر۔ اس کے اندر کوئی جیسے اس پہ ہنس رہا تھا۔

"مومو کی شادی زریاب سے ہی ہوگی' گوشی نے اسی شخص کی خاطر اتنا کچھ کیا ہے نا' اب کچھ سزا تو اسے بھی ملے گی اور شاید یہ میری بھی سزا ہے کہ جس شخص کی میں شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا' اس کے ساتھ اتنا قریبی رشتہ کہ مجھے اس کی باقاعدہ عزت کرنی پڑے گی۔"

☼ ☼ ☼

عینی نے سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کرے گی تو بس ہارون سے' ورنہ کسی سے نہیں۔

گھر کا تناؤ بھرا ماحول' ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہا تھا۔ اماں اس وقت کو کوس رہی تھیں جب گوشی کی باتوں میں آگئی تھیں۔ ایسے ہی ابا کو اپنی اولاد پر اندھا اعتبار تھا اور آج گوشی نے انہیں کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"گوشی کو پتا تھا کہ راحیلہ' زریاب کے لیے زینی کا ہاتھ مانگنا چاہتی ہیں' تو اس نے یہ سارا پلان کیا' پہلے ایاز کے گھر جاکر کہا کہ وہ زینی سے رشتہ کرلیں' ایاز کو کالج بلوایا اور پھر جان بوجھ کر مجھے وہاں لے کر گئی اور زینی کا رشتہ وہاں کروا دیا اور اپنا زریاب سے' مگر اس پر بھی اس کا دل نہیں بھرا تو اس نے زینی کے خلاف ایاز کے کان بھرنا شروع کردیے۔ اس پر تہمت لگاتی رہی' اس کے بعد عینی کو ہارون کے چکر میں الجھایا کہ اس کے گھر میں جاکر زینی کو ہر قدم پہ نیچا دکھانے کی کوشش کرسکے اور عمر کا رشتہ عشعہ سے کروانے کی حمایت سب سے زیادہ گوشی نے کی اور اس کی بیوی کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ زینی کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کرے گی۔"

"درحقیقت اس نے زینی کو ہماری زندگیوں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرلی تھی۔"

"کیوں کیا گوشی نے ایسا۔ وہ تو ہماری سب سے بڑی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔" وہ عذرا بیگم سے کہہ رہے تھے۔

"وہ زریاب کو پسند کرتی تھی۔" انہوں نے شرمندہ سا اعتراف کیا۔

"نہیں' بات یہاں تک نہیں تھی' اس کا مسئلہ زینی کے ساتھ تھا' وہ ہر صورت زینی کو نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔"

"نہیں زینی کے ساتھ تو اس کی کوئی دشمنی نہیں' وہ تو چھوٹی بہنوں کی طرح اس سے پیار کرتی ہے۔" عذرا بیگم نے جلدی سے کہا۔

"میرا دل مطمئن نہیں ہے' یہ آج کی نہیں بچپن کی بات ہے' عینی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے' جب ہم زینی کو اس گھر میں لے کر آئے تو ہماری توجہ زینی کی طرف زیادہ تھی۔ ان دنوں گوشی کو تھوڑا اگنور کردیا تھا۔ بس اس کے دل میں زینی کے لیے غصہ بڑھتا گیا' جس نے بعد میں حسد کی شکل اختیار کرلی اور وہ حسد آج میرے سارے گھر کو کھا گیا۔ پھر ہم نے گوشی کی ہر بات

کا اعتبار کر کے غلطی کی' اسے باقی بچوں پر ترجیح دی۔ سب سے زیادہ پیار دیا اور اس کا صلہ آج یہ ملا کہ وہ سارے فیصلے خود کرتی چلی گئی۔" انہوں نے دلگرفتہ ہو کر کہا' پھر عذرا بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"مگر آج میں زینی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے دوں گا' اب ہر فیصلے کا اختیار زینی کے ہاتھ میں ہے۔"

☼ ☼ ☼

"بند کرو فون اور خبردار جو تم نے دوبارہ اس ورس سے بات کی تو۔" گوشی نے فون پہ ہارون سے بات کرتی عینی کے ہاتھوں سے فون جھپٹ کر دیوار پہ مار کر توڑ دیا۔ عینی کی آنکھیں صدمے سے پھٹ گئیں۔

"کیوں نہ کروں میں بات' زینی کو واپس اس گھر میں جانا ہو گا۔ مومو کی شادی زریاب سے ہو گی اور میری ہارون سے' آپ کے لیے میں قربانی نہیں دوں گی۔ اپنے گناہوں کا کفارہ آپ کو خود ادا کرنا پڑے گا۔"

"تمہاری یہ جرأت' تم مجھ سے زبان درازی کر رہی ہو۔" گوشی نے غصے میں اسے تھپڑ مارنا چاہا' تو عینی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بس بہت ہو گیا' ابا کو میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ سب کی نظروں سے گر چکی ہیں بھائی آپ کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے' ابا کا مان آپ نے توڑ دیا۔ زینی آپ سے نفرت کرتی ہے اور زریاب بھائی کو تو آپ ہمیشہ سے ناپسند تھیں' اماں کو بھی آپ کی باتوں میں آکر اب افسوس ہو رہا ہے' رہ گئی میں تو مجھے اب آپ کی ضرورت نہیں رہی' تو سوچیں اب آپ کہاں ہیں؟ جہاں کبھی زینی تھی۔" وہ مکاری سے ہنسی۔

"تم۔" گوشی نے حیرت و صدمے سے اسے دیکھا۔

"میں زینی کے ساتھ ہوں اور اتنا حیران مت ہوں' یہ مکاری' چاپلوسی' یہ فریب میں نے آپ سے ہی تو سیکھا ہے۔"

"اس کی ماں تمہیں کبھی اپنے گھر کی بہو نہیں بنائے گی۔"

"وہ آپ مجھ پہ چھوڑ دیں' اب تو وہی ہو گا جو زینی چاہے گی۔ ابا نے ہر فیصلے کا اختیار اسے سونپ دیا ہے۔" وہ کہہ کر چلی گئی اور گوشی بے دم سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ اس کے سارے مہرے پٹ چکے تھے۔ زندگی کے کھیل میں آج اسے مات ہوئی تھی۔

"زینی پلیز۔ بس تم ہو جو مجھے بچا سکتی ہو۔" اب یہ آخری حربہ تھا اور قسمت کے رنگ' گوشی آج زینی کے قدموں میں تھی۔

"اپنا آشیانہ جلا کر تمہارے گھر میں روشنی کیسے کروں' تم مجھے اتنا عظیم کیوں سمجھتی ہو' میں انسان ہوں' مجھے انسان ہی رہنے دو۔" زینی کو اسے دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا' مگر وہ اسے سونو سے زیادہ عزیز نہیں تھی۔ وہ اس کی خوشیوں کے لیے اپنے بیٹے کو قربان نہیں کر سکتی تھی۔

"وہ شخص تمہارے لائق نہیں ہے' چھوڑ دو تم

لے۔"

"اور تم زریاب کے قابل نہیں ہو' چھوڑ سکتی ہو اسے۔"

"زینی۔" دہلیز پہ کھڑا زریاب اندر چلا آیا تھا اور اس نے جن نظروں سے گوشی کو دیکھا تھا وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ روح کو کاٹتی' دل کو چیرتی' آنکھوں کو لہو رنگ کرتی خاموشی۔ آج جیسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتنا شور تھا اس خاموشی میں۔ دھڑکنوں کا' ٹوٹے خوابوں کا' کرچی کرچی ہوئے دل کے ٹکڑوں کا۔ اور اس شور میں دبا سکوت اتنا گہرا تھا کہ گوشی کی سانسیں رُکنے لگیں۔ وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ زریاب اس کا نہیں تھا' کبھی بھی نہیں۔

"میں جیتا جاگتا انسان ہوں زینی! تم لوگوں نے مجھے کھلونا کیوں سمجھ لیا ہے میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنے کا حق رکھتا ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے تم نے؟" زینی کی سانسیں رکنے لگیں۔

"میں موموسے شادی نہیں کر سکتا۔ ایسی لڑکی جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی زندگی سے کھیل جائے' میں ایسی خود غرض لڑکی کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا کجا کہ زندگی بھر کا ساتھ۔۔۔؟"

"تو کیا گوشی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" زریاب نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔ "میں امی کے کہنے پر اس وقت خاموش ہو گیا تھا لیکن گوشی کا کردار جاننے کے بعد اب میں یہ رشتہ قائم نہیں رکھ سکتا۔ میں نے کینیڈا کے لیے اپلائی کیا تھا۔ میرا ویزا لگ گیا ہے۔ اگلے ماہ میری روانگی ہے۔"

"زریاب!" وہ اسے دیکھ کر رو پڑی۔

"زینی! میں ہمیشہ سے ہی تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہارا گھر بسا رہے' میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں لیکن ایسا گھر جس کی بنیادیں اتنی کمزور ہیں۔ وہ آج نہیں تو کل ٹوٹ جائے گا۔ وہ شخص جو اپنی بہن کی حماقت پر اپنی بیوی اور بیٹے کو قربان کر سکتا ہے' وہ نہ اچھا باپ ثابت ہو سکتا ہے نہ اچھا شوہر۔ اگر وہ تمہیں صرف اس بنا پر چھوڑ دے تو میرے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں' میں تمہارے بیٹے کے لیے کم از کم ایاز سے تو بہتر باپ ثابت ہوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں جیسے ایک پل کے لیے ستارے چمکے تھے۔ زینی نے ان ستاروں سے نظریں چرالیں۔

اپنا فیصلہ سنا کر وہ رکا نہیں تھا۔ خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

کمرے کے باہر کھڑے ایاز نے یہ ساری باتیں سنی تھیں اور ان کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے اپنا چہرہ بہت تاریک نظر آیا تھا۔ کیا کرنے چلا تھا وہ اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ اپنی بہن کی خواہش پر وہ اپنا گھر برباد کرنے جا رہا تھا۔

زریاب کوئی کھلونا تو نہیں تھا جو اپنی بہن کی خواہش پر اسے تھما دیتا وہ جیتا جاگتا انسان تھا' اس کی اپنی پسند' مرضی اور خواہش تھی اور زینی کا اس سارے کھیل میں کیا قصور تھا جس کی سزا اسے دی جا رہی تھی۔۔۔ اس نے ایک لمحہ میں فیصلہ کیا تھا اور کمرے میں داخل ہو کر روتی سسکتی زینی کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے رخساروں سے موتی چنتے ہوئے پورے یقین سے کہا تھا۔

"میں ان آنکھوں میں اب کبھی آنسو نہیں آنے دوں گا۔"

زینی ایک بار پھر رو پڑی تھی لیکن اس بار یہ خوشی کے آنسو تھے۔

قانتہ رابعہ

کاغان' ناران' سوات اور دوسرے بہت سے خوب صورت پہاڑی مقامات پر دس دن گزار کے ہمایوں انجم واپس گوجرانوالہ پہنچے تو ایم ایس صاحب کے دس پیغامات اور تین مسڈ کالز اسکرین پر موجود تھیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی ہمایوں نے ایم ایس صاحب کو فون کیا۔

"یہ بتائیے! اب آئے ٹور سے؟" تیز تیز لہجے میں ایم ایس صاحب نے کہا۔

"سر! میں گھر میں داخل ہو رہا ہوں۔ کیسے خیریت ہے؟" مودب لہجے میں ہمایوں نے جواب دیا۔

"ہاں بھئی' پہلی فرصت میں بلکہ ابھی اسپتال پہنچو۔ فوراً" ۔ اسٹاف آپ کا ویٹ کر رہا ہے۔" ایم ایس صاحب نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

بیوی بچے لمبے سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ پہاڑی علاقوں سے خریدی گئی اشیا کار کی ڈگی سے نکال کر ملازم کے سپرد کیں اور خود اسی وقت اسپتال روانہ ہو گئے حالانکہ ابھی ان کی دو دن کی چھٹی باقی تھی۔

ہو سکتا ہے کوئی ایمرجنسی ہو' یہ سوچتے ہوئے وہ ایم ایس صاحب کے دفتر میں داخل ہوئے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اندر کیا معاملہ ہو گا۔

جوں ہی انہوں نے ایم ایس صاحب کے دفتر کا دروازہ کھولا' زبردست تالیوں اور تازہ تازہ پھولوں کی تیز خوشبو نے ان کا استقبال کیا۔ ایم ایس صاحب' پانچ چھ سینئر ڈاکٹرز کے ہمراہ موجود تھے' ڈاکٹر ہمایوں کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھے۔

"کانگریچولیشن ڈاکٹر انجم۔ ویل ڈن۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔" ڈاکٹر زبیری' ڈاکٹر حسن' ڈاکٹر اویس بھی ڈاکٹر ہمایوں انجم سے گلے ملے۔

"بہت خوب بھئی' بہت خوب۔"

ڈاکٹر ہمایوں انجم کے چہرے کے سوالیہ نشان کی طرف دیکھ کر ایم ایس صاحب خوشی سے بھرپور انداز میں بولے۔

"بھئی آپ کو ڈبل خوشیاں مل رہی ہیں۔ آپ کی پروموشن بھی ہو گئی ہے اور آپ نے سیمینار کے لیے پچھلے دنوں جو پیپر بھجوایا تھا وہ بھی ہیلتھ منسٹری نے منتخب کر لیا ہے۔ بہت مبارک ہو۔ یو آر لکی۔ لو اب مٹھائی سے منہ میٹھا کرو' کل ہم ان شاء اللہ بھرپور قسم کی پارٹی دیں گے آپ کے اعزاز میں۔" ایم ایس صاحب نے مٹھائی کے ڈبے میں سے گلاب جامن ڈاکٹر ہمایوں انجم کے منہ میں ڈالا۔

"الحمدللہ۔" دونوں خبریں ایک ہی سانس میں سن کر بڑی جان دار سی مسکراہٹ ڈاکٹر ہمایوں کے لبوں پر آئی۔ ڈاکٹر اویس نے کہا۔

"وہ جو کہتے ہیں ناکہ ہر کوئی مقدر کا سکندر نہیں

ہوتا لیکن تم واقعی مقدر کے سکندر ہو۔ دنیا کے غم تم تک پہنچتے پہنچتے خوشیوں میں بدل جاتے ہیں۔ پریشانیاں تمہارے گھر کی دہلیز تک آتے آتے خوشیوں کی نوید بن جاتی ہیں۔ بہت حیران کن بات ہے۔"

ڈاکٹر ہمایوں انجم کی ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود ننھا منا آنسو' ایک سچا موتی بن کر ان کے رخسار پر ٹپک گیا گویا ان کے رخسار کا بوسہ لے رہا ہو۔

"آپ کی ذرہ نوازی ہے سر! میں اپنے اللہ رب العزت کے بعد آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے ہمیشہ مجھ سے تعاون کیا آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔" ہمایوں نے عاجزی سے کہا۔

"نہیں بھئی۔ یہ تو ایک رسمی سی بات تم نے کہہ دی تمہارے آگے بڑھنے میں ہمارا نہیں' کسی غیبی طاقت کا ہاتھ ہے۔" ایم ایس صاحب نے کہا۔

"واقعی میں نے بھی کئی دفعہ یہ سوچا ہے۔ ہم میں سے ہر ڈاکٹر کو کسی نہ کسی مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے' لیکن ڈاکٹر انجم ملازمت کے بارہ سال گزرنے کے باوجود ٹینشن فری ہیں۔ بڑے سے بڑے کرائسز سے یہ مکھن میں سے بال کی طرح نکل آتے ہیں اور ہمیں دیکھو دو سال نہیں گزرتے کہ کسی نہ کسی مقدمہ میں پھنس جاتے ہیں' انکوائریاں بھگتتے ہیں۔ جو معاملہ سلجھا ہوا بھی ہو' کسی نہ کسی طرح الجھ جاتا ہے۔ یاد نہیں دو سال قبل ہیلتھ منسٹر صاحب نے جب ہمارے اسپتال کا وزٹ کیا تھا۔ ہر چیز پاس ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر انجم کو انہوں نے تعریفی سرٹیفکیٹ بھی عطا کر دیا تھا' لیکن اسپتال سے نکلتے نکلتے چکنے فرش پر کیسے سلپ ہو گئے تھے۔ کس مشکل سے ہم نے پریس اور میڈیا والوں کو اس کی کوریج سے روکا تھا۔ کیسے کیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن مجال ہے جو ڈاکٹر انجم کو ایسے کسی سنگین مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا ہو۔"

"ہاں آج اتفاق سے کوئی ایمرجنسی بھی نہیں ہے۔ ذرا پوچھ نہ لیں کہ آخر وہ کون سا بھید ہے۔ ہمیں اپنی ملازمت میں کیا کچھ برداشت نہیں کرنا پڑا۔" ایم ایس صاحب پھس پھسے انداز میں ہنسے۔ "میرے جیسا سینئر کارڈیالوجسٹ' کئی دفعہ دو چار مریض ہی دیکھ پاتا ہے۔ اس کے کلینک پر جاؤ تو لگتا ہے جیسے کسی درگاہ کا منظر ہو یا لنگر تقسیم ہو رہا ہو۔ سچ پوچھو تو اس پر ہاتھ ڈالنے کا شروع میں جب کبھی ارادہ بھی کیا تو اپنے معاملات ہی بگڑنا شروع ہو گئے۔ یہ تو پتا چل گیا کہ "پہنچی ہوئی سرکار" ہے۔ کچھ ہمیں بھی پتا تو چلے۔"

"سر! کچھ بھی نہیں۔ بالکل سادہ سا بندہ ہوں۔" ڈاکٹر ہمایوں نے کہا۔

"اوہو' تو اس سادگی کے طور طریقے ہمیں بھی سکھاؤ۔ کیا والدہ حیات ہیں' جن کی دعاؤں سے ہر چھ ماہ میں کوئی نہ کوئی گڈ نیوز تمہیں ملتی ہے۔ تم سے سالوں پہلے اسپتال جوائن کرنے والے تم سے کہیں پیچھے ہیں۔ آخر پتا تو چلے۔" سر جعفری نے کہا۔

"نہیں سر! میری والدہ میری پیدائش کے چند ماہ بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ والد صاحب معمولی سے زمیندار ہیں' بمشکل گزر اوقات کرنے والے۔"

"اچھا تو پھر کوئی نفلی عبادات' وظیفے وظائف وغیرہ۔" جعفری صاحب ہنسے۔

"سر! بہت گناہ گار بندہ ہوں۔ پنج گانہ نمازیں ادا کرتا ہوں' حقوق العباد کا خیال رکھتا ہوں۔" ہمایوں پُراسرار سی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔

"اوہ یار! اب بتا بھی دو' کہیں کوئی پیر فقیر تو نہیں پکڑا' چلہ شلہ کاٹنے والا۔" ایم ایس صاحب بولے۔

"اور تو کوئی بات ایسی نہیں۔ بس میں نے اللہ کے ایک حکم پر عمل کیا ہے۔"

"وہ کیا۔" دونوں نے بے اختیار پوچھا۔

"سر! میں نے قاری عبدالسلام صاحب سے بچپن میں قرآن پاک پڑھا تھا۔ وہ مجھے آسان سے انداز میں اس کا مفہوم بھی ساتھ ساتھ سمجھا دیتے۔ میرے باپ چاہتے تھے کہ میں ان کی تھوڑی سی زمین پر ہی کاشت کاری کروں۔ یہ قاری عبدالسلام صاحب ہی تھے جنہوں نے ابا سے کہہ کر میڈیکل میں داخلہ دلوایا۔ جب اللہ نے مجھے میرٹ پر میڈیکل فیلڈ دلوائی میں

قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تو انہوں نے بس ایک چھوٹی سی نصیحت کی۔ میں نے ہمیشہ اسی کو آگے رکھا۔ آپ یقین کریں میں نے ہمیشہ مشکل کو اسی نصیحت کی وجہ سے آسان ہوتے دیکھا تاریکی کو روشنی اور پریشانیوں کو خوشی میں بدلتے دیکھا۔

قاری صاحب نے کہا تھا۔

"پتر ہمایوں! ایک بڑا بوڑھا درخت سو بندوں کو سایہ دیتا ہے۔ لیکن اگر اس کی جڑوں کے بجائے اس کے پتوں کو بس پانی میں بھگوئے رکھیں جڑ ہمیشہ خشک رہے تو درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتا ہے' اس کے ہرے بھرے پتے سوکھ کر گر جاتے ہیں' اس کی ٹہنیاں مردہ ہو جاتی ہیں اور وہ درخت ایک بندے کو بھی سایہ نہیں دے پاتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم سایہ دار درخت بنو' تمہاری روزی میں برکت ہو' تم سے سب جڑے رہیں' ہر فرد کی دعا تمہاری بھلائی کے لیے ہو' کامیابیاں تمہارا مقدر بنیں تو اپنے غریب بہن بھائیوں' بھانجے بھتیجوں' رشتہ داروں کی مدد کرنا' صدقہ خیرات' زکوٰۃ' قرض حسنہ کے مستحق سب سے پہلے یہی ہوتے ہیں۔ ان کو تنگی میں دیکھتے ہوئے' جان بوجھ کر۔۔۔ غیروں کی مدد کرو گے تو یہ سب تمہارے لیے حسد کا باعث بنیں گے ان کو عطا کرو گے تو بہت پاؤ گے۔"

"میرے بہن بھائی مجھ سے بڑے ہیں بلکہ ان کی اولادیں بھی میری ہم عمر ہیں۔ میرے رشتہ دار بھی متوسط سے کم درجے ہیں۔ بسا اوقات ان کے پاس ضروریات زندگی کے لیے بھی رقم نہیں ہوتی۔"

مجھے یاد ہے میں نے حیرانی سے پوچھا تھا کہ قریبی رشتہ داروں کو تو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی کجا صدقہ خیرات۔" قاری صاحب قہقہہ لگا کر ہنسے تھے' کہنے لگے۔

"او بھولے پتر! صدقہ خیرات میں پہلا حق تو رشتہ داروں کا ہے۔ صلہ رحمی سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاں زکوٰۃ صرف زیر کفالت افراد کو نہیں دی جا سکتی۔ ہمارا تو دین ہی سوچ کے سوہنا ہے۔ تم ایسے ہی کرنا اور رب کی قدرت دیکھنا' سر آپ حیران ہوں گے' میں ہمیشہ ان سب میں پہلے قریبی رشتہ داروں کو یاد رکھتا ہوں۔ جس دن ان تک رقم پہنچتی ہے۔ اللہ میرے لیے خوشی کا در کھول دیتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے تم اپنے سگوں کو زکوٰۃ صدقات دیتے ہو؟" حیرت سے سب کی آنکھیں پھٹنے کے قریب تھیں۔

"صرف زکوٰۃ صدقات نہیں' قرض حسنہ بھی یا کبھی ویسے ہی مالی مدد بھی۔ پچھلے ماہ میں نے اپنے بھتیجے کو دکان میں سامان ڈالنے کے لیے رقم دی تھی کر۔ آج راستہ میں اس کا فون آیا۔ اس نے کہا چچا! اللہ نے بڑا کرم کیا میری دکان چل نکلی ہے۔ آپ یقین کریں سر! مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ اللہ میرا بھی کام آگے چلائے گا اور دیکھ لیجیے۔"

ایم ایس صاحب کو یاد آیا۔ ان کی سگی بہن بیوہ ہو کے چار بچے دو مرلے کے گھر میں رہ کے پال رہی تھی۔ عیدی میں ان کو نیلے نیلے پانچ سات نوٹ ضرور دیے تھے۔ مگر زکوٰۃ صدقات۔۔۔؟ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اپنوں کی مدد ایسے بھی کی جا سکتی ہے؟

ان کی ماموں زاد' ان کے تایا کی دونوں بیٹیاں بہت عرصہ سے مالی بحران کا شکار رہی ہیں۔ عید بقر عید پر عیدی کے علاوہ کس کو کیا دینا ہے' یہ تو سوچا ہی نہیں۔۔۔ فوراً ہی ان کی نظروں کے سامنے اپنے کچھ عزیزوں کی صورتیں آ گئیں۔۔۔ لاچار' حسرتوں کے انبار تلے' دبی دبی خواہشیں لیے۔۔۔!!!

دل میں اک خیال آیا' وہ ہر سال بیوی کے زیور اور بینک میں جمع رقم کی زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ یہ رقم لاکھوں میں ہوتی ہے اور ان کے اپنے۔۔۔ قریبی لوگ۔۔۔ جو سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہیں' لپٹ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے' جن کی خودداری انہیں ہاتھ پھیلانے سے منع کرتی ہے' ان کے چہروں کی دکھ بھری داستان ہی نہ پڑھ سکے؟ اپنے رب کی بتائی نشانی "تم ان کو ان کے چہروں سے پہچان لو گے" بھی نہ سامنے رکھ سکے۔

ایم ایس صاحب نے جھکا سر اٹھایا تو ایک آنسو ان کی آنکھ سے بھی نکل کر رخسار پر ٹکا ہوا تھا۔ شرمندگی' ناواقفیت کی داستان سناتا اور تجدید کے لیے عزم نو کا اظہار لیے۔

☆

سعدیہ حمید چوہدری

پیلی چاندنی کے ٹھنڈے مرغولوں میں اس نے اپنی ماں کو کھوجا تھا۔ خالی پہلو دل کو سہانے لگا تھا۔ برآمدے میں لگے ستون کے ساتھ، چنبیلی کی بیل اور پیلے پھول توجہ کا مرکز بنے تھے۔ اور پھر اس کی نظر پیلا تخت پہ محو سجدہ وجود پہ مرکوز ہوئی تھیں۔ وہ لپک کے تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔ اکیلے پن کے نوکیلے سے خوف نے اسے ماں کے ساتھ اٹھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ روز اٹھنے لگی تھی۔ وضو کرتی اور نماز کے لیے کھڑی ہو جاتی۔ ساری نماز بسم اللہ کے مخصوص ورد کے ساتھ ختم ہو جاتی۔ ماں جھکتی تو وہ بھی جھک جاتی' وہ کھڑی ہوتی تو وہ بھی کھڑی ہو جاتی۔

یہ نماز نہیں تھی۔ زندگی کے طویل سفر کا آغاز تھا۔ ہمسفری کی ابتدا تھی۔ ماں کی قمیص کا دامن تھام کر اس نے چلنا سیکھا۔ پھرکی کی طرح تیز گھومنے والی ماں کی چال سے وہ اکثر تنگ آ جاتی۔

"امی آہستہ چلا کریں نا۔"

مگر ان کے لیے تیز رفتاری بہت ضروری تھی' شاید وہ زمانے سے پیچھے رہ جانے کے خوف میں مبتلا تھیں۔ وہ ماں سے بچھڑنے سے ڈرتی تھی۔

"امی! مجھے اسکول نہیں جانا' مجھے گھر میں ہی پڑھنا ہے۔"

گھر میں ہی ابتدائی کلاسز کی تیاری کی۔ پھر ان کا ٹیسٹ دیا اور اسکول میں داخل ہو گئی مگر شرط یہ تھی کہ امی دیوار کے اوپر سے مجھے دیکھیں گی۔ اسکول بڑی ظالم چیز لگنے لگا تھا۔

"امی! مجھے ٹیچر مارتی ہیں۔"

"کیوں مارتی ہے۔؟" ایک دم کام چھوڑ کے پوچھنے لگی تھیں۔

"وہ کہتی ہیں کہ تم کسی بڑے بہن بھائی سے کام کرواتی ہو۔ یہ رائٹنگ تمہاری نہیں ہے۔" وہ اتنے بڑے الزام پہ رو پڑتی۔

"تم کہنا تم جھوٹ نہیں بولتیں۔"

"کہا تھا مگر انہوں نے یقین نہیں کیا۔ آپ میرے اسکول میں ٹیچر بن جائیں۔" ایک نئی ضد شروع ہو گئی تھی۔

"میں ٹیچر کیسے بن سکتی ہوں۔ میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔"

"اب آپ کیوں جھوٹ بول رہی ہیں؟" وہ الجھ پڑی۔

"تمہاری نانی اماں کی ڈیتھ ہو گئی تھی' میں بہت چھوٹی تھی۔ بہن بھائی بھی چھوٹے تھے۔ تو گھر کی ذمہ داری میرے اوپر آن پڑی تھی۔ اس لیے نہیں پڑھا۔"

"مگر آپ اخبار پڑھتی ہیں' کتابیں' وہ سب۔" وہ مشکوک سی ہو جاتی۔

"وہ میں پڑھ سکتی ہوں۔ میں نے ساری کتابیں' شوق سے پڑھنا شروع کی تھیں؟ پھر میں کہانیاں لکھا کرتی تھی مختلف اخبارات میں۔"

وہ اس سفر میں تصوراتی طور پر اپنی ماں کے ساتھ ہوتی تھی۔

"میں اسکول نہیں گئی' مگر تم جاؤ گی اللہ بہتر کرے گا۔"

"اللہ کیسے بہتر کرے گا۔" وہ اسکول میں داخل ہونے تک سوچتی رہی تھی۔ کلاس میں داخل ہوئی تو پتا چلا کہ اللہ کیسے بہتر کرتا ہے۔ ٹیچر بدل چکی تھی۔ ایک اور مہربان پری جیسی ٹیچر کھڑی تھی۔

"میری امی ٹھیک کہتی ہیں کہ اللہ بہتر کرتا ہے۔" اس نے اپنے ننھے منے وجود کے ساتھ آسمان کی وسعتوں کو ماپنا شروع کردیا تھا۔

فیصل آباد بورڈ میں پہلی پوزیشن اور اسکالر شپ۔ نہال ہوتی اماں کو دیکھ کر کے اسے لگا تھا کہ اسے ہر کام اپنی ماں کی خوشی کے لیے کرنا ہے۔

"اماں! میں اتنی محنت کرتی ہوں' میری پوزیشن ایک دو نمبر سے رہ جاتی ہے۔" اس کے شکوے بھی ختم نہیں ہوتے تھے۔

"تم اللہ کی رضا میں راضی ہو جاؤ۔ محنت پوری کرو۔ نتیجہ اسی پہ چھوڑ دو۔"

"کتنا مشکل کام ہے یہ۔ کیسے کرلیتی ہیں آپ راضی بہ رضا رہ کے زندگی گزارنا۔"

"جو دے اس کا بھی بھلا' جو نہ دے اس کا بھی۔" وہ آٹا گوندھتے ہوئے ہنس پڑتیں۔

نہ جانے کون سے زمانوں کے دکھ تھے جو ان کی آنکھیں گیلی کرجاتے۔ اور وہ ان کی آنکھوں کی نمی میں الجھ سی جاتی۔

اسی الجھن میں کئی پرانے گانوں اور غزلوں کی لے انہوں نے اس کے دامن میں باندھ دی تھی۔

"منیزہ' بصیر' نسرین' نجمہ ہم لوگ کراچی کی سڑکیں ماپا کرتے تھے۔ اکٹھے شاپنگ' منوڑا سے کشتی کا سفر' میری ایک بہت اچھی دوست تھی۔ وہ میرے لیے مچھلی کا پلاؤ بنا کے لایا کرتی تھی۔" وہ نجانے کون سے زمانوں کا سفر لمحوں میں طے کرجاتی تھیں۔

"آپ مجھے سکھا دیں میں آپ کو مچھلی کا پلاؤ بنا کے کھلاؤں گی۔" وہ انہیں لمحاتی تسکین دینے کی کوشش کرتی۔

"پھر امی! آپ نے گاؤں میں شادی کیوں کی۔ فیوڈل فیملی۔ کیا جوڑ تھا بھلا۔؟" وہ الجھ کے دل دکھانے والے سوال پوچھتی۔

"بس قسمت تھی نا میری۔ اب تو گزر گئی۔ اب تم کہانیاں لکھا کرو۔"

"اچھا۔!" وہ بے دلی سے ہامی بھر لیتی۔ اس کی ہر کامیابی پہ اتنا خوش ہوتی تھیں' جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ باقی بہن بھائی بھی ذہانت اور کامیابی میں کم نہیں تھے۔ مگر وہ اپنی ماں کی لاسٹ وکٹ تھی۔

وہ اسے خود سے جدا کرتے ہوئے ڈرنے لگی تھیں۔ سب کے اپنے اپنے گھونسلے بن چکے تھے۔ وہ اس ٹوٹے پھوٹے شکستہ سے گھونسلے میں ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی تھی۔

"میں تمہیں کہیں دور نہیں جانے دوں گی۔" وہ ایک ہی بات بار بار کرتی تھیں۔ "اسی شہر میں کروں گی تمہاری شادی۔"

وہ ہامی بھرلیتی تھی۔ مگر زندگی کے تھکا دینے والے لمحات میں اسے احساس ہوا تھا کہ شادی تو وہیں ہوتی ہے' جہاں اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ جوڑے بنانے والی ذات تو اللہ کی ہوتی ہے۔

وہ ماں کے چہرے پہ صدیوں کی تھکن دیکھتی تو چپ کرجاتی۔ چہرے پہ جھریوں کا جال بچھنے لگا تھا اور بدن میں جاری کشمکش نے انہیں بے حال کر ڈالا تھا۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں۔ فالج زدہ وجود کے ساتھ انہوں نے اس کی شادی کی ہامی بھری تھی۔ وہ ہر روز تہجد کے وقت اللہ سے ان کی کامل صحت یابی کی دعا مانگا کرتی تھی۔ مگر اس کی دعا کی قبولیت کے راستے میں امی کی بے زبان دعائیں جو صرف دل سے نکلتی ہیں حائل ہو چکی تھیں۔

"یہ رخصت ہو گی تو میں اوپر جاؤں گی۔" انہوں نے شاید اپنے رب سے دعا کی تھی۔ جو قبولیت کے مراحل طے کر گئی تھی۔

اور اس کے سارے سجدے بے ذوق ہو گئے تھے۔ ساری دعائیں ناکام ہو کے پلٹ آئی تھیں۔

کتنی یادوں کے جھکڑ ہوئے کارواں' دل کے زخموں کے در کھٹکھٹا رہے تھے۔

وہ ایک ٹک اس چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس پہ الوہی سی چمک تھی۔ سیاہ چمک دار آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی۔ ہر پل مسکرانے والے ہونٹ سختی سے پیوست ہوچکے تھے۔ بارش رکتی نہیں تھی۔ 29 جنوری کو جو بارش تھی۔ وہ بڑی ظالم تھی "ستم گر سی" ہر بوند اپنائیت سے عاری تھی جیسے جانتی ہی نہ ہو۔ ہر قطرے میں جدائی کی باس تھی۔

اپنی شادی کی شاپنگ کرتے ہوئے اس نے ماں کے لیے بہت خوب صورت رنگوں کے سوٹ خریدے تھے' وہ ہلکے رنگ پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ سارے رنگوں کے خوب صورت سوٹ ان کی الماری میں ان کے منتظر تھے اور وہ سفید کفن پہنے اپنے رب کی رضا میں راضی تھیں۔

وہ اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اللہ دلوں کے بھید اور سانسوں کے راز جانتا ہے۔ وہ جانے سے پہلے اسے کسی کے حوالے کرگئی تھیں۔

چمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ کبھی اسے اور کبھی اس کے ساتھ کھڑے وجود کو دیکھ رہی تھیں' ایک ٹک۔

"تائی اماں! میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اب یہ میری ذمہ داری ہے۔" فیصل کی یقین دہانی پہ انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکالی تھیں۔

پھر اگلی دفعہ وہ انہیں آئی سی یو میں ملنے گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا کہ وہ بے نیاز ہوچکی ہیں۔ ایک بار بھی آنکھیں کھول کے نہیں دیکھا۔ باہر نکلتے ہوئے دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ "اماں! میں نے آپ کو اللہ کے حوالے کیا۔"

28 جنوری کی شام کو بھائی کی ویڈیو کال ریسیو ہوئی تھی۔ سیاہ آنکھوں کی جوت' دل کو اطمینان دلا گئی تھی۔ 6 منٹ 36 سیکنڈز کی کال میں انہوں نے شاید آنکھیں بھی نہیں جھپکی تھیں۔ جیسے اسے آنکھوں میں سمو رہی تھیں۔

اس مرتبہ اپنے دل کی گواہی پہ بڑا مان رکھنے والی نے دھوکا کھالیا تھا۔ اسے گمان تک نہیں ہوا تھا کہ یہ آخری گفتگو تھی۔

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں تک نہ تھا کہ یہ شخص بچھڑنے والا ہے

انہیں صرف اپنی چھوٹی بیٹی جو ان کی سعدی' دیا' شبنم نہ جانے کیا کیا تھی' کے لیے اطمینان درکار تھا۔ وہ ملا تو جانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ صرف 13 دن بعد وہ اپنے رب کے پاس چلی گئیں ہلکی پھلکی مٹی ہوکے۔

وہ بالکل خالی ہاتھ تھیں۔ نہ کوئی بوجھ' نہ قلق' نہ بھاری جائیداد' نہ دولت' نہ بھاری سونا۔ ان کے پاس صرف محبت تھی' جسے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے بانٹا اور سب کو اپنی محبت کا مقروض کرگئیں۔ اپنی اچھی تربیت سے اپنی بیٹیوں کو دوسروں کے لیے صدقہ جاریہ بناگئیں۔

وہ چلی گئیں کہ نفس مطمئنہ اپنے رب سے ایسے ہی ملتا ہے کہ وہ اس سے راضی اور اس کا رب اس سے راضی۔

مگر ہم خاک باز ان اللہ مع الصابرین کی التجائیں کرتے ہوئے بھی اپنے پیارے کو سپرد خاک کرتے ہوئے گڑگڑاتے ہیں۔ دل بھلتا ہی نہیں' مگر راضی برضا رہنا صحیح معنوں میں بندۂ خدا ہونے کی دلیل ہے۔ خدائے ذوالجلال سے دعا ہے کہ ان کا شمار مقربین میں ہو اور سب کو صبر جمیل عطا ہو۔ (آمین)

خاک کرنے والوں کی کیا عجیب خواہش ہے
خاک ہونے والوں کو خاک بھی نہ سمجھا جائے

۞

سرورق کی شخصیت

ماڈل -------	حمیرا مغل
میک اپ -------	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی -------	موسیٰ رضا

محبت کی دوسری طرف

کبھی مجھ میں سمٹ جانے کی خواہش تو
زندہ تھی
سواب میں چاہے جانے اور نہ چاہے
جانے کی حد سے نکل کر
زندگی کی اس طلسم گاہ تک آنکلا ہوں جس پر
کوئی خواہش نہیں ہوتی، کوئی رستہ نہیں ملتا
دریچے بند ہوجاتے ہیں دروازہ نہیں کھلتا
جہاں جذبات کی گرمی سے یادیں جم سی
جاتی ہیں
جہاں ماضی کی یادیں آنے سے دامن
بچاتی ہیں
نہ جانے کس طرف سے اک سرگوشی یہ
کہتی ہے
تمہاری سادگی اور بے نیازی کا بدل ہے یہ
مکافاتِ عمل ہے یہ

محمود عزنوی

اخلاق نہ برتیں گے مداوا نہ کریں گے
اب ہم بھی کسی شخص کی پروا نہ کریں گے

کم گوئی کہ اک وصف حماقت ہے بہ ہر طور
کم گوئی کو اپنائیں گے، چہکا نہ کریں گے

اب سہل پسندی کو بنائیں گے وتیرہ
تادیر کسی باب میں سوچا نہ کریں گے

اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے

کل رات بہت غور کیا ہے سو ہم اے جونؔ
طے کر کے اٹھے ہیں کہ تمنا نہ کریں گے

جون ایلیا

آرائشِ خیال بھی ہو، دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم، ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم!
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو، سخنِ گرم کے لیے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ناصر کاظمی

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا؛
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا؛

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے، یہ کام کس کا تھا؛

وفا کریں گے، نباہیں گے، بات مانیں گے
تمہیں بھی یاد ہے کچھ یہ کلام کس کا تھا؛

رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا!
مقیم کون ہوا ہے، مقام کس کا تھا؛

نہ پوچھ گچھ تھی کسی کی وہاں نہ آؤ بھگت
تمہاری بزم میں کل اہتمام کس کا تھا؛

گزر گیا وہ زمانہ، کہوں تو کس سے کہوں
خیال دل کو مرے صبح و شام کس کا تھا؛

ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا
یہ پوچھے ان سے کوئی وہ غلام کس کا تھا؛

داغ دہلوی

ثبوت

پولیس اہلکار نے ایک صاحب کو نشے کے الزام میں پکڑ کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ نشے میں تھے؟"

"سر! یہ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کرائے کے معاملے پر جھگڑا کررہے تھے۔" پولیس اہلکار نے جواب دیا۔

"لیکن اس بات سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ یہ نشے میں تھے۔" مجسٹریٹ نے اعتراض کیا۔

"مگر سر! وہاں نہ تو کوئی ٹیکسی تھی اور نہ ٹیکسی ڈرائیور۔" پولیس اہلکار نے وضاحت کی۔

فاکہہ سہیل۔۔ کراچی

سیاسی ریوڑیاں

وفاقی وزیر پانی و بجلی نے صدر صاحب کے پاس جاکر کہا۔ "سر! آپ ٹھیک کہتے تھے یہ محکمہ میری سوچ سے بھی زیادہ سخت ہے' سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی' لیکن اب تو خاندان میں قریبی شادی کے پروگرام ہیں اور پھر مجھے فیملی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر بھی جانا ہے۔"

صدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھا! پھر بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟"

"سر! مجھے کچھ ماہ کے لیے امور کشمیر کی وزارت کا قلمدان سونپ دیں۔" وزیر صاحب نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

(یسریٰ ندیم۔۔ میرپور خاص)

مہارت

ایک پروفیسر صاحب نے اپنی بیگم سے کہا۔ "آج کیا پکایا ہے؟"

بیگم نے جواب دیا۔ "کدو۔"

پروفیسر صاحب نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا۔؟ پچھلے سات روز سے اس گھر میں کدو پک رہا ہے' تمہیں کوئی اور سبزی بنانا نہیں آتی؟"

بیگم نے فوراً کہا۔ "بنانا تو آتی ہے' مگر میری امی کہتی ہیں کہ جب تک انسان ایک کام میں مہارت حاصل نہ کرلے تب تک اسے دوسرا کام شروع نہیں کرنا چاہیے۔"

آسیہ قریشی۔۔ لاہور

بے چارگی

ایک صاحب کی ملاقات ایک روز چراغ الہ دین کے جن سے ہوگئی' جس نے کسی بات پر خوش ہوکر ان کو پیش کش کی کہ وہ ان کی کوئی ایک خواہش پوری کرسکتا ہے۔

وہ صاحب فوراً بولے۔ "کراچی کی جن سڑکوں پر ابھی تک فلائی اوور نہیں بنے ہیں' ان سب پر ایک صاف ستھرا چوڑا اور شان دار فلائی اوور بنادو۔ ہر روز کسی نہ کسی سڑک پر میری گاڑی ٹریفک میں پھنس جاتی ہے اور گھر پہنچنے میں بہت دیر ہوجاتی ہے۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے سر۔" جن سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "لاکھوں ٹن سریا' سیمنٹ اور دوسرا میٹریل درکار ہوگا۔ لیبر بھی چاہیے ہوگی۔ لاکھوں رکاوٹیں

ہٹانی پڑیں گی۔ بے شمار محکموں میں کام پھنسیں گے اور ممکن ہے رشوت نہ ملنے پر وہ پل مکمل ہونے کے بعد توڑ ڈالیں۔"

صاحب مایوسی سے بولے۔ "اچھا تو مجھے ایک تفصیلی مضمون لکھ کر لا دو' جسے پڑھ کر میں عورتوں کو مکمل طور پر سمجھ سکوں کہ وہ کیا سوچتی ہیں' کیوں روتی ہیں' کیوں ہنستی ہیں' کیا چاہتی ہیں اور انہیں کس طرح خوش رکھا جائے۔

جن نے ایک بار پھر سر کھجایا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے سر میں شہر کی ساری سڑکوں پر فلائی اوور ہی بنا دیتا ہوں۔"

ملائکہ کوثر۔۔۔ بسم اللہ پور

نور

ایک نوجوان' مولوی صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

"مولوی صاحب ایک مسئلے کا حل پوچھنا ہے۔ اکثر رات کو آفس کا کام کرتے کرتے میں صوفے پر ہی سو جاتا ہوں' رات کو جب میری آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں کہ میری بیوی بیڈ پر سوئی ہوئی ہے اور اس کے اوپر ایک رضائی ہے اور اس رضائی سے نور چھلک رہا ہے۔ تو حضرت' میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کی وہ کون سی ایسی نیکی یا عمل ہے' جس کی بدولت اس کی رضائی میں سے اتنا نور چھلکتا ہے؟"

مولوی صاحب۔۔۔ "ابے گدھے! تو ضرور مرے گا کسی دن' یہ نور نہیں چھلکتا۔ بلکہ تیری بیوی رات میں تیرا موبائل چیک کرتی ہے' پاس ورڈ ڈال کر رکھا کر۔"

افشاں ریحان۔۔۔ کراچی

محبوب کے نام خط

40 کے اخروٹ 80 کے بادام!

پیارے امجد کو میرا اسلام۔

اسلام علیکم!

کل آپ میرے پیچھے آتے آتے گر کیوں گئے تھے۔ پلیز آپ میری خاطر سائیکل آہستہ چلایا کریں۔ آپ کل پیلے شلوار قمیص میں بہت پیارے لگ رہے تھے۔ ویسے تو پورے خیر آباد میں آپ جیسا کوئی نہیں۔

ڈبے میں ڈبا' ڈبے میں کیک
میرا امجد لاکھوں میں ایک

پلیز میری خاطر نسوار چھوڑ دو اور آج دودھ دینے آپ خود آنا۔ آپ مجھے ایک موبائل دے دیں۔ میں بستروں والی پیٹی میں چھپا لوں گی۔ ضرور آنا میں نے آپ کے لیے پھلیاں بھی رکھی ہوئی ہیں۔

نیلی نیلی روشنی کمرے میں بند ہے
میں کیا کروں مجھے امجد پسند ہے

آپ کی جان کوثر

کوثر + امجد = امجد کوثر

ثنا عبدالقیوم۔۔۔ ٹنکسچھا

ایس ایم ایس

ایک آدمی سوات گیا تو جاتے ہی اپنی بیگم کو ایس ایم ایس بھیجا۔ مگر غلط نمبر پھر بھیج دیا۔ جس عورت کو ملا' اس کا شوہر دو دن پہلے ہی فوت ہو گیا تھا۔ ایس ایم ایس پڑھتے ہی عورت بے ہوش ہو گئی۔

لکھا تھا کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ نیٹ ورک بھی موجود ہے' جگہ چھوٹی ہے' مگر شاندار ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں جنت کا مزا دیتی ہیں ڈھول مٹی بالکل نہیں ہے۔ میں نے جو سفید لباس پہنا تھا۔ وہ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ دو چار دن تک تم کو بھی بلا لوں گا۔"

شازیہ گلزار بھٹی۔ ضلع بھکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" ہر بیماری کی دوا ہے، جب وہ دوا پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے شفا ہو جاتی ہے۔"

ہے کوئی مثال ایسی،

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ایک صحابیؓ کا کاروبار یہ تھا کہ وہ خیبر سے شراب لاتے اور مدینہ منورہ میں فروخت کر دیتے۔ اتفاقاً حرمت شراب کے نزول کے وقت وہ خیبر سے شراب لینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے کافی تعداد میں شراب کے مشکیزوں کو اٹھائے ہوئے وہ مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے کہ کوئی صحابیؓ راستے میں مل گئے اور خبر سنا دی کہ اسلام میں شراب کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ شراب لانے والے صحابی جس جگہ تک پہنچے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ اور اس بات کو بھی گوارا نہیں فرمایا کہ شراب کی حرمت سن لینے کے بعد شراب کے مشکیزے کو لے کر ایک قدم بھی آگے بڑھا دیں۔ وہیں قریب میں ٹیلے پر یہ سب مشکیزے رکھ کر حضور اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے اس طرح کی خبر ملی ہے کیا یہ صحیح ہے؟"

آپؐ نے تصدیق فرمائی۔

پھر عرض کیا کہ "مجھے اس بات کی اجازت ہے کہ میں نے جس سے شراب خریدی ہے اس کو واپس کر دوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں! اب اس کا واپس کرنا بھی تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔"

پھر عرض کیا۔ "میں یہ کسی غیر مسلم کو ہدیہ کر دوں، جس کا مجھ پر احسان ہو؟"

فرمایا۔ "یہ بھی نہیں کر سکتے۔"

پھر عرض کیا کہ اس مال میں چند یتیموں کا بھی حصہ تھا، جو میری سرپرستی میں ہیں، اس کا کیا کروں؟"

ارشاد فرمایا۔ "تم یہ شراب ضائع کر دو اور جب ہمارے پاس بحرین سے مال آجائے گا تو یتیموں کے حق کا معاوضہ اس مال سے دے دیا جائے گا۔"

یہ بزرگ حرمت اقدس سے واپس ہوئے اور اسی ٹیلے پر مشکیزے کے منہ کھول دیے۔ جس سے شراب نیچے اس طرح بہنے لگی جس طرح بارش کا پانی ہو۔

اتنی تابعداری کا مظاہرہ، جس کی آج تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ زمین نے وہ انسان چھپا دیے اور اب نہ ہی کرۂ ارض پر ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو کہ صحابہ اکرامؓ جیسے مطیع و فرماں بردار ہوں۔ انہوں نے اپنی مشکل اور پریشانی کو نہیں دیکھا۔ لیکن اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بجا لانا اپنا اولین فریضہ سمجھا۔ کیا کوئی ہے جو اس طرح مطیع و فرماں بردار بن جائے۔

(تجارت رحمت العالمین کی نظر میں۔ صفحہ ۱۶۵)

راہ کے دیپ،

- بعض حقائق کو ماننے کے لیے ہمیں اپنی تمام تر قوت درکار ہوتی ہے۔
- الفاظ کی تفاسیر بدل دی جائیں تو معتقدین بھٹک جایا کرتے ہیں۔
- اپنا آپ چھپانا نہیں چاہیے ورنہ لوگ کھوج میں لگ جاتے ہیں۔
- بداخلاقی دلوں میں سے محبت ختم کر دیتی ہے۔ جس طرح چھتے میں سے شہد نچوڑ لیا جاتا ہے۔
- جو لوگ اپنے وقت کا معاوضہ اپنے وقت میں وصول کرنا چاہتے ہیں وہ اکثر برباد ہو جاتے ہیں۔

یہ زندگی، یہ عمر، یہ زمانہ، یہ وقت کسی اور وقت کے لیے محنت کا زمانہ ہے۔ یہ زندگی کسی اور زندگی کی طرف ایک قدم ہے یہ وقت کسی اور وقت کی طرف رجوع کا وقت ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

کچھ باتیں اچھے لوگوں کی

- ساکھ بنانے میں بیس سال لگتے ہیں اور یہ ساکھ پانچ منٹ میں برباد ہوجاتی ہے۔
(وارن بفٹ)
- جو دوسروں کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حقیقت میں، اپنے کردار کی برائیاں دوسروں میں تلاش کررہا ہوتا ہے۔ (خلیل جبران)
- توبہ انسان کو ہر قصور سے بری کردیتی ہے۔
(الفارابی)
- سیدھی اور صاف بات کرنے سے نقصان بہت تھوڑا مگر فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔
(لارڈ میکالے)
- راز کو راز رکھنا بڑی ذہانت اور عقل مندی کی بات ہے لیکن یہ امید رکھنا کہ دوسرے بھی اس کو راز رکھیں گے۔ سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔
(سموئیل جانسن)
- غصہ ایک چور ہے، جو ہمیشہ انسان کے اچھے لمحات چوری کرلیتا ہے۔ (جو۔این۔لندن)
- جس نے کبھی کسی کو دشمن نہیں بنایا، وہ کبھی کسی کو دوست نہیں بنا سکتا۔ (ٹینی سن)
- اگر تم چاہو تو اپنے خیالات کو بدل کر زندگی بہتر بنا سکتے ہو۔ (آسکر وائلڈ)
- ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محنت نہ ہو۔
(خلیل جبران)
- خواہ کچھ بھی ہو مصیبت کے دن گزر جاتے ہیں اگر یہ نہیں گزرتے تو انسان خود ہی گزر جاتا ہے۔
(شیکسپیئر)
- دوسروں کو حقیر سمجھنا بے حد آسان ہے اور خود کو حقیر سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ (بوروف)
- میرا خیال ہے کہ ہم اجنبیوں کی حیثیت سے بہتر زندگی بسر کرسکتے ہیں۔
(شیکسپیئر)

نسبت گیلانی۔ کہروڑ پکا

اللہ پر یقین

حضرت سفینہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔ حضرت ابن منکدر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سفینہؓ روم کی سرزمین کے قریب اپنے لشکر سے پیچھے رہ گئے تو آپ کو قید کرلیا گیا، پھر آپ فرار ہوکر لشکر کو تلاش کرتے ہوئے واپس آرہے تھے کہ راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شیر کھڑا ہے۔ حضرت سفینہؓ نے شیر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے ابوالحارث! (یہ شیر کی کنیت ہے) میں سفینہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں، میرے ساتھ یہ معاملہ ہوگیا ہے۔ اتنے میں شیر دُم ہلاتے ہوئے حضرت سفینہؓ کی بغل میں کھڑا ہوگیا اور حضرت سفینہؓ جب کسی قسم کی (درندوں کی) آواز سنتے تو شیر کو پکڑ لیتے، چنانچہ حضرت سفینہؓ شیر کے ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ آپؓ نے لشکر کو پالیا۔ اس کے بعد شیر واپس لوٹ گیا۔

(مشکاۃ المصابیح 2/400 الرقم (5949))

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

حکومت و اقتدار

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ اس سوال پر کہ مسلمانوں کو حکومت و اقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا؟" کلام کرتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ کے احکام اور اوامر و نواہی کی حفاظت و رعایت جب تم اپنی ذات اور منزل زندگی میں نہیں کررہے ہو (جس پر تمہیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے) تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالے کردیا جائے۔ ایمان والوں کو حکومت ارضی دینے سے منشائے الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اور اس کے احکام

کو دنیا میں نافذ کریں۔ تو تم جب اپنے حدود و اختیار میں آج یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمہارے سپرد کرکے کل کے لیے تم سے اس کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔"

(الرسالہ۔ دہلی، اپریل 1985ء۔ صفحہ 46)

صدف عمران۔ کراچی

خیال میرا خوشبو سا،

- اگر تم وہ دیکھتے ہو جسے روشنی ظاہر کرتی ہے اور وہی سنتے ہو، جس کا اقرار آواز کرتی ہے تو درحقیقت نہ تو تم دیکھتے ہو اور نہ ہی سنتے ہو۔
- محبت سالوں تک ہمارے اندر پنپتی رہتی ہے اور ہم اس سے لاعلم رہتے ہیں لیکن پھر ادراک کا ایک لمحہ آتا ہے اور یہ ہم پہ کھلتی چلی جاتی ہے۔
- ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو اور جب محبت کے ساتھ عمل کرتے ہو، تب تم خود کو اپنے سے، ایک دوسرے سے اور اللہ تعالیٰ سے باندھ لیتے ہو۔
- دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ تفصیل پر اختصار کو ترجیح دی جائے کہ تفصیل ہمیشہ صبر آزما ہوتی ہے۔
- آپ وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو سوچتے ہیں۔
- ضرورت واحد چیز ہے جو قانون نہیں دیکھتی۔
- یہ ممکن ہے کہ آپ کسی چیز پر بلا استحقاق قبضہ کرلیں مگر یہ ناممکن ہے کہ آپ کسی چیز پر اپنے بلا استحقاق قبضے کو باقی رکھ سکیں۔
- غلطی کے بعد سرکشی مت کیجیے۔ خدا کے ہاں غلطی کی معافی ہے، سرکشی کی نہیں۔
- مشکل ایسا عذر ہے، جسے تاریخ کبھی تسلیم نہیں کرتی۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

بہتر کون،

ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی رات کے وقت معمول کے مطابق گشت پر تھے۔ ایک تندور کے پاس کسی شخص کو سویا ہوا دیکھا تو اس کو اٹھا کر پوچھا کہ وہ کون ہے؟

جواب میں اس شخص نے بتایا کہ وہ ایک غریب مزدور ہے۔ دن بھر مزدوری کرتا ہے اور رات کو اس تندور کے پاس ہی سو جاتا ہے۔

سلطان نے پوچھا کہ اس سردی میں رات کیسے گزرتی ہے تو اس مزدور نے جواب میں جو کہا اس نے سلطان کو ہلا کے رکھ دیا۔ مزدور نے کہا۔

"جناب نصف رات آپ کے انداز میں گزرتی ہے اور بقیہ نصف رات آپ سے زیادہ اچھے انداز میں گزارتا ہوں۔"

سلطان نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

مزدور نے جواب دیا۔ "جب تک تندور گرم رہتا ہے تو میں آپ کے جیسی نیند سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور جب تندور ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو میں اللہ کی عبادت شروع کر دیتا ہوں۔ جو آپ کے مقابلے میں بہتر ہے۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

زندگی کی حقیقت،

- زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن جب انسان مرتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا رزق بنا لیتی ہے۔
- پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو چیونٹیاں اسے کھاتی ہیں۔
- وقت کبھی بھی بدل سکتا ہے، ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلی بنا سکتا ہے، مگر ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔
- انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا کہ جاگتے ہوئے اپنے پیدا کرنے والے رب سے نہیں ڈرتا۔

حرا۔ وہاڑی

یکم محرم الحرام،

اسلامی سال کا آغاز اس جانباز انسان کی

شہادت سے ہوتا ہے جو بائیس لاکھ ایکڑ زمین پر تنہا حکومت کرتا تھا۔ جو اپنے دور میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر لوگوں کی خبر گیری کرتا تھا۔ جس کے قدموں کی آہٹ سن کر شیطان میلوں بھاگ جاتا۔ جو حکمران ہونے کے باوجود سوکھی روٹی کھاتا جس کے خوف سے کفار کانپتے تھے۔

یہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ تھے۔

عنبی۔ کراچی

استغفار کی مقبولیت،

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے صاحبزادے عمرؒ بیان فرماتے ہیں کہ والد کی وفات کے بعد ایک مرتبہ وہ مجھے خواب میں دکھائی دیے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے وہاں کس عمل کو سب سے بہتر پایا؟ تو انہوں نے جواب دیا۔

"اس جہان میں استغفار سب سے مقبول چیز ہے۔" (کتاب القبور)

صبح کی نماز،

سیدنا سلمانؓ، سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی عیادت کے لیے آئے۔ آپ موت کی کشمکش میں تھے۔ سیدنا سلمانؓ نے گھبراتے ہوئے عرض کیا۔

"اے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے وصیت کیجیے۔"

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تم پر دنیا کے دروازے کھولے گا لیکن تم اس میں سے بقدر ضرورت ہی لینا اور یہ کہ جو شخص صبح کی نماز پڑھ لیتا ہے وہ اللہ کی پناہ و امان میں آجاتا ہے۔ لہٰذا تم اس کی پناہ کو نہ توڑنا ورنہ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیے جاؤ گے۔"

عزت اور بہشت،

دو آدمی قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ایک اپنے دولت مند باپ کی قبر پر اور دوسرا اپنے درویش باپ کی قبر پر۔

امیر زادے نے درویش لڑکے کو طعنہ دیا۔ "میرے باپ کی قبر کا صندوق پتھر کا ہے۔ اس کا کتبہ رنگین اور سنگ مرمر کا ہے اور فیروزے کی اینٹ اس میں جڑی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں تیرے باپ کی قبر کیسی خستہ حال ہے کہ دو مٹھی مٹی اس پر پڑی ہے اور دو اینٹیں اس پر رکھی ہیں۔"

درویش زادے نے جواب دیا۔

"یہ درست ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ قیامت کے دن جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے اس سے پہلے کہ تیرا باپ بھاری پتھروں کے نیچے جنبش کرے میرا باپ بہشت میں پہنچا ہوگا۔"

نوال افضل ثمن۔ گجرات

امام زین العابدین اور اولاد کی محبت،

امام زین العابدین ایک دن اپنے ننھے بچے کو گود میں کھلا رہے تھے۔ بھائی پر باپ کی شفقت دیکھ کر ان کی چھ سال کی لڑکی نے پوچھا۔

"ابا! کیا آپ بھائی سے بہت محبت کرتے ہیں؟"

امام نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

یہ سن کر لڑکی رونے لگی۔ امام زین العابدین سمجھے، شاید یہ اس خیال سے رو رہی ہے کہ مجھے اس سے محبت نہیں۔ اس لیے اسے سینے سے لگا کر بولے۔

"جان پدر! مجھے تجھ سے بھی بہت محبت ہے۔"

یہ سن کر بھی لڑکی چپ نہ ہوئی۔ باپ نے وجہ پوچھی تو بولی۔

"آپ ایک دن کہہ رہے تھے نا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے بہت محبت ہے۔ بھلا جس دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو اس میں بیٹے اور بیٹی کی محبت کیسے سما سکتی ہے؟"

یہ سن کر امام زین العابدین بہت روئے اور اس دن سے بیٹی کو بیٹے کی بہ نسبت زیادہ پیار کرنے لگے۔

✻

عروسہ شہوار ——— جہلم

ایسے نہ تھے ہم اہل دل، اتنے کہاں خراب تھے
ہم بھی کسی کی آس تھے، ہم بھی کسی کا خواب تھے
دل پہ کسی کے نقش تھے صورت حرف آرزو
اس کی کتاب زیست میں لائق انتساب تھے

تحریم شاہد بخاری ——— کوٹ ادو

کہاں ممکن تھا میں دل سے تیری یادیں مٹا دیتا
بھلا کیسا میں جیتا پھر اگر تجھ کو بھلا دیتا
تیری رسوائی کے ڈر سے لبوں کو سی لیا ورنہ
تیرے شہر منافق کی میں بنیادیں ہلا دیتا

طہ گل ——— نامعلوم

وہ اگر مل کر بچھڑتا تو کوئی بات بھی تھی
جس کو پایا ہی نہیں اسے کھونا کیسا

انیقہ انا ——— چکوال

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جان کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

سندس رفیق سندر ——— عبدالحکیم

ہمیشہ ہی نہیں رہتے چہرے نقابوں میں
سبھی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

حما قریشی ——— ملتان

خیال یار کو عہد جنوں میں کیا کیجیے
شب فراق گزر جائے دعا کیجیے
بچھڑنا اُن کا قیامت سے کم نہیں تو تو
نہ زندگی کو بری، مجھ سے یوں جدا کیجیے

عفیفہ فاطمہ ——— بہاولپور

جس دور پہ نازاں تھی دنیا، ہم اب وہ زمانہ بھول گئے
دنیا کی کہانی یاد رہی، اور اپنا فسانہ بھول گئے

زرباریہ خالد ——— لاہور

اک لامحدود اداسی ہے
اک بے پرواہ محبت کے بعد

سیدہ لوبا سجاد ——— کہروڑ پکا

کوئی تو بات ہے آخر میری مہمان نوازی میں
کہ غم اک بار آتے ہیں تو پھر واپس نہیں جاتے

حیا نور ——— چھوٹا لاہور صوابی

اس تخ ہوا سے برسر پیکار ہم بھی تھے
اپنے ہی گھر میں بے در و دیوار ہم بھی تھے
دامن دریدہ ہم ہی نہیں تھے فقط وہاں
بے آبرو کھڑے سر بازار ہم بھی تھے

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

عجیب لوگ بستے ہیں تیرے شہر میں محسن
مرمت کانچ کی کرتے ہیں پتھر کے اوزاروں سے

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

نورین زینب ——— کہروڑ پکا

کب تلک شمع جلی یاد نہیں
شام غم کیسے ڈھلی یاد نہیں
اس قدر یاد ہے اپنے تھے سبھی
کس نے کیا چال چلی یاد نہیں

شبنم شمشاد ——— برزمان

کیا جانیے کیوں تیز ہوا سوچ میں گم ہے
خوابیدہ پرندوں کو درختوں سے اڑا کر

صدف عمران ——— کراچی

ثبوت عشق کو بس ایک ٹھنڈی آہ کافی تھی
گنوا دی زندگی ہم نے مثالوں اور دلیلوں میں

نمرہ، اقرا ______ کراچی

بھٹکا تو بہت بھٹکا سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے

فائزہ بھٹی ______ پتوکی

وہ آنکھ تھی کہہ گئی سب کچھ
لفظ ہوتے تو مکر گئے ہوتے

صائمہ جیمی، خدیجہ سیم ______ کراچی

وہ سراپا سامنے ہے، استعارے مسترد
چاند، جگنو، پھول، خوشبو اور ستارے مسترد
تذکرہ جن میں نہ ہو اس کے لب و رخسار کا
ضبط وہ ساری کتابیں وہ شمارے مسترد

نسرین حبیب ______ کراچی

پتھروں کے دیس میں تھا مجھ کو تنہائی کا غم
کیا خبر تھی راستے میں آئینہ مل جائے گا
چاہتوں کی رہگذر میں آج بھی تنہا اداس
اک پرندہ پیڑ پر بیٹھا ہوا مل جائے گا

ثریا شاہ ______ کہروڑ پکا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اس نے، مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

گیلانی سسٹرز ______ کہروڑ پکا

خوابوں کی طرح تھا نہ خیالوں کی طرح تھا
وہ علم ریاضی کے سوالوں کی طرح تھا
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی حل ہو نہیں پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑ پکا

کیا مجھ عشق کوں ظالم نے اب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ
ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں انکھوں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

سدرہ بتول ______ ملتان

اس قدر دنیا کے دکھ اسے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

عائشہ فاطمہ ______ لودھراں

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

فرحت ناز ______ ٹھاکڑاں ہڈالی

سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں
کہانیاں ہی سہی، سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے، تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

زوباریہ خالد ______ لاہور

تاریخ ہزاروں سال میں بس اتنی سی بدلی ہے
تب دور تھا پتھر کا، اب لوگ ہیں پتھر کے

واجدہ ماجد ______ میر پور خاص

محبت میں ذرا اضافہ کیجیے
یادوں سے گزارا اب نہیں ہوتا

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

مانا کہ تم ہو اجالوں کے اجالے
مگر اک دیا احتیاطاً گھر رکھنا
دل توڑنا تو سبھی کو آتا ہے
مگر تم دل جوڑنے کا کوئی ہنر رکھنا

سیدہ ثوبیہ عباد ______ کہروڑ پکا

مکمل دو ہی دانوں پہ یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ تو ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
محبت کی نمازوں میں امامت ایک کو سونپو
اسے تکنے اسے تکنے سے نیت ٹوٹ جاتی ہے

شاہینہ عارف ______ احمد نگر ٹاؤن

ایسے نہ ہو کہ درد بنے درد لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

مرحا گل ______ داؤد خیل کلاں

تمہارے بعد کیسی رونقیں اس دل کی نگری میں
سب ہی چراغ مدہم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ
تمہاری یاد اب بھی دل کو بہت تکلیف دیتی ہے
نگاہیں بھی تو پر نم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ

جس دھج سے

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

پاکستان سے محبت میں ایک اور محب وطن مطیع الرحمن نظامی کو پھانسی دے دی گئی، لیکن انہیں احساس تک نہیں جن کے لیے وہ مر مٹے۔

مولانا مطیع الرحمن نظامی صاحب اور ان کے ساتھی اللہ کے سامنے سرخرو ہوئے۔ انہیں اس جرم کی سزا دی گئی کہ جب مکتی باہنی اور انڈیا مل کر پاکستان کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور بنگلہ دیش بنانے کی سازش کر رہے تھے تو انہوں نے پاکستان کو بچانے کی کوشش کی اور پاک فوج کا ساتھ دیا۔ بنگلہ دیش بنے 45 سال ہو چکے ہیں۔ بنگلہ دیش کے قیام کے وقت مولانا مطیع الرحمن نظامی پچیس سال کے نوجوان تھے، لیکن انڈیا نے اس جرم کو معاف نہیں کیا اور آج اتنی مدت کے بعد ایک نام نہاد انٹرنیشنل عدالتی ٹربیونل میں ان پر یک طرفہ مقدمات چلائے گئے اور ان رہنماؤں کو جیل میں ڈال کر موت کی سزائیں سنائی گئیں اور انہیں تختہ دار پر چڑھا دیا۔ پھانسی سے قبل اپنے اہل خانہ سے ملاقات کے وقت ان کے چہرے پر کسی قسم کا خوف یا پریشانی نہ تھی، وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر والوں سے کہہ رہے تھے کہ۔۔۔ "میں بوڑھا ہو گیا ہوں، عمر کے اس حصے میں شہادت نصیب ہونا بڑی سعادت ہوگی۔" انہوں نے بنگلہ دیشی صدر سے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا تھا کہ۔۔۔ "میرے لیے اللہ کا رحم کافی ہے۔"

(سوال یہ ہے کہ آج اگر بنگلہ دیش کو توڑنے کے

لیے انڈیا سازش کرتا ہے تو بنگلہ دیش کے عوام کس کا ساتھ دیں گے۔ بنگلہ دیشی فوج کا یا انڈیا کی فوج کا۔۔۔؟)

جلن

بھارتی بیٹسمین روہت شرما نے پاکستانی باؤلر محمد عامر کو ایک عام باؤلر قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ۔۔۔ "جو توجہ انہیں دی جا رہی ہے وہ اس کے حق دار نہیں ہیں۔ (اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہو روہت شرما؟) اس کے بارے میں بات کرنا اب بند کر دیں، وہ کوئی انوکھا باؤلر نہیں ہے، پاکستان کے پاس پانچ دوسرے باؤلرز بھی ہیں۔ (کیوں تمہیں ڈر لگ رہا ہے اس سے جو۔۔۔؟) ایشیا کپ میں جب بھارت کے خلاف محمد عامر نے بہت عمدہ اور بہترین باؤلنگ اسپیل

کیا تھا تو عامر کی تعریف اور ہر طرف ہونے والے چرچے کے متعلق روہت نے کہا کہ۔ "اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی چرچا کیا جارہا ہے۔ میرے خیال میں تو ایک میچ کے بعد اسے اتنی اہمیت دینا ٹھیک نہیں۔" (تمہارے خیال کی تو۔ بھئی ایسی کی تیسی) وہ اچھا باؤلر ہے۔ (سو تو ہے۔) مگر اسے ہر بار یہ بات ثابت کرنا ہوگی' اب ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کے سامنے کوئی بھٹر نہ سکے اور وہ سب کو آؤٹ کردے۔ (اور اگر تمہیں کردیا تو۔؟ ویسے اتنی جلن۔۔؟)

جواب

حمزہ علی عباسی ایک مقبول اداکار ہی نہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ ذہانت سے بھی نوازا ہے' اس کا ثبوت گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر آئے ان کے ایک پیغام سے ہوتا ہے۔ حمزہ نے کہا تھا۔ "بھارت میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے خلاف احتجاج اور دھمکیوں کی خبریں سامنے آنے کے بعد کچھ نام ونہاد لبرل تجزیہ نگاروں نے پاکستانی ٹی وی پر بیٹھ کر یہ کہا تھا کہ ایسے عناصر پاکستان میں بھی ہیں اور انڈیا میں بھی ہیں۔" "میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستان میں ایسے پاگل عناصر نہیں ہیں۔ کوئی سیاسی یا مذہبی گروپ یا فرد یا تنظیم کبھی پاکستان آنے والے کسی بھارتی مہمان کے خلاف احتجاج نہیں کرتی' نہ ہی انہیں دھمکیاں دیتی ہے' پاکستان اور پاکستانی اپنے تمام مہمانوں کی بہت عزت کرتا ہے' چاہے وہ بھارت سے یا کسی بھی ملک سے آئیں۔ (حمزہ دل خوش کردیا پاکستانیوں کا آپ نے تو۔؟ ہمارے ہاں تجزیہ نگاروں کو تو ساری خرابیاں صرف پاکستان اور پاکستانیوں میں ہی نظر آتی ہیں۔)

راس آنا

صوفیہ احمد کو شوبز میں آئے 14 سال ہوچکے ہیں۔ لیکن ان کے کریڈٹ پر کوئی قابل ذکر ڈراما نہیں ہے۔ اس بارے میں صوفیہ احمد کہتی ہیں کہ۔ "شکر ہے کہ میں نے تھوڑا کام کیا ہے' لیکن جتنے ڈائریکٹر ملے اچھے ملے ہیں۔ چار سال سے ایک ہی پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ کام کررہی ہوں' لیکن لاہور سے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ اسی لیے کیا ہے کہ لاہور کے آرٹسٹ نے کبھی لاہور کے آرٹسٹ کو سپورٹ نہیں کیا۔ (پر ہم نے تو کچھ اور ہی سنا ہے صوفیہ جی! کہ۔) اگر کراچی میں کوئی ڈراما بن رہا ہے تو وہاں پر لاہور کا کوئی فنکار گیا ہے تو اس کی کوشش ہوگی کہ اس

کاسٹ میں لاہور کا کوئی آرٹسٹ نہ ہو' کراچی سے ہی کوئی آرٹسٹ لے لیا جائے۔ (تو اس میں حرج کیا ہے صوفیہ!) میں اس بات کو پسند نہیں کرتی۔ (کیوں۔۔۔؟) ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ کراچی کے ڈائریکٹر لاہور کے آرٹسٹ کو کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ (تو اس میں برائی کیا ہے؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے؟) مجھے کراچی راس آیا ہے۔ (کراچی کی خوبی یہی ہے کہ یہ سب کو دل کھول کر خوش آمدید کہتا ہے) یہ کراچی والوں کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے کام دیا۔ (صوفیہ جی! فن کار کراچی یا لاہور کا نہیں ہوتا' یہ تو پورے پاکستان کا بلکہ دنیا کا ہوتا ہے۔)

اِدھر اُدھر سے

☆ ترکی نے بنگلہ دیش سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ ترکی کے شہر استنبول میں مطیع الرحمن کی نماز جنازہ کا سب سے بڑا اجتماع ہوا۔ مصر میں اخوان المسلمون کی قیادت نے بنگلہ دیش کے خلاف مظاہرہ کیا۔ الجزائر میں بھی ردعمل سامنے آیا۔ یہ ایک طمانچہ ہے' حسن نثار جیسے لبرلز کے منہ پر جو یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ امت مسلمہ نامی کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔

(سوشل میڈیا سے)

☆ اس ملک کے افق پر آزاد میڈیا بندوق سے زیادہ خوف ناک ہتھیار یعنی کیمرہ اٹھائے گھوم رہا ہے اور یہ اخلاقیات سے اس قدر عاری ہے کہ کسی بھی بے گناہ شریف آدمی کی عزت نفس کو پامال کرکے اسے ذلیل و رسوا کرکے بھاگ جاتا ہے۔ میڈیا اس معاملے میں متعصب بھی ہے' وہ جس کو چاہتا ہے اسے بے آبرو کرتا ہے اور جس مجرم کا جرم چھپانا ہو۔ اس کو عوامی نمائندہ قرار دے کر خاموشی کی چادر تان دیتا ہے۔

(اوریا مقبول جان۔۔۔ حرف راز)

☆ برصغیر تقسیم ہوا تو مغربی پاکستان کی آبادی تین کروڑ تھی' آج بیس کروڑ ہے۔ آج اللہ اس سرزمین پاکستان سے بیس کروڑ کو رزق دیتا ہے۔ بھارت میں رہ جانے والے ڈیڑھ کروڑ مسلمان تھے۔ شاید انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ پاکستان ہجرت کرنے پر اللہ انہیں رزق دے گا۔ کوئی ان کی حالت زار تو دیکھے۔ صوفی کانفرنس میں کوئی ان کی محرومی اور ذلت کا اندازہ تو کرے۔

(اوریا مقبول جان۔۔۔ حرف راز)

☆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکا اور فریب کے ہوں گے اور ان میں رویبضہ بات کریں۔ پوچھا گیا رویبضہ کون ہیں؟ فرمایا۔
"گھٹیا لوگ جو لوگوں کے اہم معاملات پر گفتگو کریں گے۔" (مسند احمد)
رات کو آپ کوئی بھی چینل دیکھ لیں۔ آپ پہچان لیں گے رویبضہ کون ہیں اور کیسے بولتے ہیں۔

(اوریا مقبول جان۔۔۔ حرف راز)

☆ عمران خان کو وہ کمیشن چاہیے جو صرف شریف خاندان کا احتساب کرے' اگر کمیشن نے قرضے معاف کرنے والوں اور بیرون ملک آف شور کمپنیوں کے تمام کھاتے کھولے تو خان صاحب سمیت نہ بچے گا علیم نہ ترین اور نہ خود خان صاحب یہی وجہ ہے خان صاحب کو ایک وسیع کمیشن قبول نہیں' ایک محدود کمیشن ضرور قبول ہے' جو کھلی منافقت ہے۔

(مجیب الرحمن شامی)

☆ محسن انسانیت نے دوران جنگ عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث میں بچوں اور عورتوں کے قتل کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ابن بطال رحمتہ اللہ نے امت مسلمہ کے تمام فقہاء کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ کفار کے بچوں کا قتل حرام ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ لاہور کے معصوم بچوں اور خواتین کو خاک و خون میں ملانے والا مسلمان نہیں ہو سکتا' چاہے اس کا تعلق اسلام سے واجبی سا ہی کیوں نہ ہو۔

(روزنامہ۔ امت)

دستک
دستک
دستک

شاہین رشید

احسن خان

"کیا حال ہیں جی۔۔۔؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"بیوی' بچے راضی خوشی ہیں؟"

"جی الحمدللہ۔۔۔۔"

"آج کل تو بہت مصروف ہوں گے؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں تو جب سے اس فیلڈ میں آیا ہوں۔۔۔ راضی خوشی بھی ہوں اور مصروف بھی ہوں۔"

"بہت اچھے۔۔۔ "اڈاری" کا کیا رسپانس مل رہا ہے آپ کو؟"

"بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ اس کی رائٹر کمال ہیں اور پھر ڈائریکٹر تو ظاہر ہے کہ ڈراما ہٹ ہونا ہی تھا۔۔۔ اور ویسے بھی یہ ایک سچی کہانی ہے تو لوگ بھی حیران ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ایسا بھی ہوتا ہے۔"

"اپنے کردار کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"کردار؟ اچھا رول (ہنستے ہوئے) آپ بتائیں' کیسی پرفارمنس ہے؟"

"بہترین۔۔ سنا ہے کہ آپ یہ رول کرنا نہیں چاہتے تھے۔"

"بالکل جی۔۔۔ میں نے ہمیشہ پوزیٹو ہیرو کے رول کیے ہیں اور میرا ایک امیج بن چکا ہے۔ تو میں نے سوچا کہ بے شک میں ہیرو تو ہوں' مگر میرا رول نیگیٹو ہے۔ تو خواہ مخواہ میرا امیج خراب ہوگا۔ لیکن پھر تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد میں یہ کردار کرنے پر راضی ہو گیا۔"

"کیا سوچ کر راضی ہوئے؟"

"یہ ہی کہ فن کار کو ہر کردار کرنے چاہئیں۔۔۔ اور اپنے آپ کو صرف پوزیٹو کردار کے لیے محدود نہیں کرنا چاہیے۔ اگر فن کار بھی امیج کو دیکھنے لگ جائیں تو پھر محدود ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ کردار کرنے چاہئیں جن کی لوگ توقع نہ کریں۔"

"برا تو کہہ رہے ہوں گے لوگ آپ کو؟"

"بالکل جی۔۔۔ مجھے نہیں۔۔۔ میرے کردار کو۔۔۔ کہ اس کے اندر کتنا شیطان بھرا ہوا ہے۔"

"پہلی بار نیگیٹو رول کر رہے ہیں آپ؟"

"جی پہلی بار کر رہا ہوں۔ اس لیے جھجک رہا تھا۔۔۔ کیونکہ یہ سب کچھ میری نیچر کے خلاف ہے۔۔۔ مگر کردار اس لیے بھی کیا کہ تجربہ ہی سہی۔"

"آپ کو بظاہر بہت اچھا دکھایا گیا ہے' مگر اندر آپ کے شیطان ہے تو اچھے لوگوں سے اعتبار اٹھ نہیں

جائے گا؟"

"بے شک۔۔۔ مگر حقیقت کو جھٹلایا بھی تو نہیں جاسکتا اور سچ بتاؤں کہ میری ملازمہ کے بچے کے ساتھ بھی غلط کام ہوا' تو مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ ہمارے معاشرے میں بہت برائیاں ہیں' جس کی نشان دہی ہم ڈراموں کے ذریعے ہی کرسکتے ہیں۔"

"مگر کیا کیا ٹھیک کریں گے' یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

"جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔"

ثروت گیلانی

"کیا حال ہیں۔۔۔ کہاں غائب ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔۔۔ غائب نہیں ہوں۔۔۔ جلد ہی آپ کو اسکرین پہ نظر آؤں گی۔"

"گزشتہ دنوں مدرز ڈے پہ آپ کو دیکھا۔۔۔ بہت اچھا بھی لگا اور آپ فریش بھی لگیں؟"

"جی۔۔۔ وہ ایک اچھا پروگرام تھا۔ ماں کے ساتھ شرکت کرکے بہت مزہ آیا اور ماں ساتھ ہو تو پھر بندہ فریش ہی رہتا ہے۔"

"بیٹا کیسا ہے؟"

"الحمدللہ بالکل فٹ۔"

"کم نظر آنے کی وجہ گھریلو مصروفیات ہوں گی؟"

"یقیناً"۔۔۔ اور ویسے بھی آپ کو پتا ہے کہ میں ذرا چوزی ٹائپ کی آرٹسٹ ہوں۔۔۔ ہر آفر کو قبول نہیں کرتی۔۔۔ میرا ایک بڑا اچھا امیج بنا ہوا ہے کہ جب بھی آؤں گی اچھے رول میں آؤں گی۔۔۔ بس اسی لیے ذرا کام کم کرتی ہوں۔"

"جذباتی رول آپ پر بہت سوٹ کرتے ہیں۔۔۔ آپ کا خود کیا دل چاہتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ جی۔۔۔ مجھے اندازہ ہے کہ مجھے پسند کرنے والے ناظرین مجھے جذباتی اور سنجیدہ رول میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔۔۔ بس اسی لیے ایسے رولز کا انتخاب کرتی ہوں۔۔۔ اور مجھے خود بھی مزہ آتا ہے۔۔۔ سنجیدہ اور

جذباتی رول کرتے کرتے۔"

"ثروت! آپ نے فلموں میں بھی کام کیا۔۔۔ یہ تجربہ کیسا رہا؟"

"فلم میں کام کرنے کا تجربہ بہت اچھا رہا۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں اب فلمیں بننے لگی ہیں اور لوگوں نے سینما کی طرف رخ کرنا شروع کردیا ہے۔۔۔ میری پہلی فلم "دل میرا دھڑکن تیری" تھی اور مجھے اس کا بہت اچھا رسپانس ملا تھا۔ تب ہی ہمت بندھی مزید کام کرنے کی۔۔۔ اور "جوانی پھر نہیں آنی" میں بھی واسع چوہدری کی بیوی کا کردار کیا اور بہت اچھا لگا کام کرکے۔"

"سنا تھا کہ آپ کا ارادہ پروڈکشن کی طرف آنے کا ہے؟"

"جی بالکل ہے اور بہت جلد آپ مجھے پروڈکشن میں دیکھیں گی۔۔۔ اب ہماری فلم انڈسٹری کافی آگے بڑھ رہی ہے اور ملک سے باہر بھی اسے پسند کیا جارہا ہے۔۔۔ تو بہت اچھی امیدیں وابستہ ہیں ہمیں اپنی فلم انڈسٹری سے۔"

"آج کل آپ ڈراموں سے زیادہ کمرشلز میں نظر آرہی ہیں؟"

"کمرشلز میں تو بہت کشش ہے۔" "کم وقت بالا نشین" "کام جلدی ہو جاتا ہے اور کمرشلز بھی اچھے مل رہے ہیں۔ مگر میں ہر آفر قبول نہیں کرتی' بلکہ اچھی اور معیاری پروڈکٹ میری پہلی ترجیح ہوتی ہے۔"

"گڈ۔ فیشن کس حد تک پسند ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل فیشن کی دل دادہ ہوں۔ میک اپ کی بھی۔ جیولری بہت زیادہ پسند ہے۔ مگر میچنگ اور ہلکی پھلکی پسند کرتی ہوں۔ بھاری جیولری پسند نہیں ہے۔ کپڑوں میں ایسا لباس پہنتی ہوں جو آرام دہ بھی ہو اور مجھ پر اچھا بھی لگے۔ البتہ میک اپ میں۔ میں اپنی آنکھوں کے میک اپ پہ خاص توجہ دیتی ہوں۔ اور اداکاری کے وقت تو خاص کر۔ کیونکہ مجھے اپنی آنکھوں سے اداکاری کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"اب تو فارغ وقت نہیں ملتا ہو گا" بیٹے کی وجہ سے۔"

"انسان اپنے شوق کے لیے سارے ٹائم نکال لیتا ہے۔ مجھے مطالعہ کا شوق ہے تو فیض احمد فیض۔ احمد فراز اور بابا بلھے شاہ کا کلام بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ پینٹنگ کا شوق ہے تو اس کے لیے بھی ٹائم نکال لیتی ہوں۔"

"اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

"الحمد للہ۔"

عشنا آغا

"کیسی ہو۔؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ میری رفوگری۔" ڈرامے کا نام کچھ زیادہ لمبا نہیں ہو گیا؟"

قہقہہ۔ "جی۔ لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھتا۔ لوگ کہتے ہیں وہ جو آپ کا رفوگری والا سیریل آرہا ہے نا۔ وہ ایسا ہے ویسا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تنقید ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ بالکل بھی تنقید نہیں ہو رہی۔ بس لوگ اس طرح بولتے ہیں۔ میری تو بہت تعریف ہو رہی ہے۔"

"تمہاری اداکاری ہے ہی اتنی اچھی کہ تعریف تو ہوگی۔ ویسے بھی تم رونے کی اداکاری بہترین کرتی ہو۔ اس میں تو پھر مار کٹائی بھی ہے۔ سچ مچ مار پڑتی ہے۔"

"تھپڑ تو سچ مچ نہیں پڑتے' مگر اب دھکے تو نقلی نہیں ہو سکتے' وہ اصلی ہی ہوتے ہیں۔ اور مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک رونے کی بات ہے تو میرے رونے کے انداز کو سب ہی بہت پسند کرتے ہیں۔"

"ڈراموں میں' ماڈلنگ میں۔ کمرشلز میں تو بہت نام کما لیا۔ فلم کے لیے کیا پلاننگ ہے؟"

"سچ بتاؤں۔ میری پلاننگ ہی یہ ہی تھی کہ مجھے فلم میں کام کرنا ہے۔ اور جب میں آئی تو فلمیں بننا شروع ہو گئیں۔ اب بہت اچھی فلمیں بن رہی ہیں تو ضرور کام کروں گی' بس کوئی اچھا پروجیکٹ ہاتھ آجائے۔"

"ہمارے ایک آرٹسٹ ہیں' انہوں نے کہا کہ اب میں صرف فلموں میں کام کروں گا ڈراموں میں

نہیں۔ تو تمہارا ابھی ایسا کوئی ارادہ ہے؟"

"نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ڈرامے بیرون ملک بہت زیادہ پاپولر ہیں۔ بہت زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ڈراموں میں کام کرکے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے اور میں نے ڈراموں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"ہماری بہت سی خواتین فنکارائیں بھارت کی فلموں میں بڑی شان اور بڑے فخر سے کام کررہی ہیں' آپ کا بھی ارادہ ہے؟"

"نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ میں بھارت جاکر کام کروں۔ مجھے اپنی اقدار' اپنی حدود بہت پیاری ہیں۔ مجھے پاکستان نے ہی عزت' شہرت اور پیسہ دیا ہے۔ مجھے اس کی قدر کرنی ہے۔ اپنے ہی ملک سے پیار کرنا ہے۔ جو کمانا ہے اور مزید جو نام بنانا ہے اپنے ملک میں رہ کر ہی بناؤں گی۔"

"عشنا! آپ کہہ رہی ہیں کہ ٹی وی ڈراموں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ جبکہ اداکاری تو آپ کے گھر کی باندی ہے۔ پھر سیکھنے کی نوبت کیسے آئی؟"

"میری والدہ نے' میری بہن نے ٹی وی اور تھیٹر کے لیے بہت کام کیا ہے' مگر زیادہ تر کام انہوں نے میری پیدائش سے پہلے کیا ہے اور ویسے بھی میں اردو تھیٹر سے زیادہ انگریزی تھیٹر کے قریب رہی ہوں۔ تعلیم بھی میری ملک سے باہر ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کینیڈا میں تھی تو اس وقت جب میں پانچویں کلاس کی طالبہ تھی تو اپنی کلاس کے تھیٹرز کو ڈائریکٹ کیا کرتی تھی۔"

"وہاں کے ریڈیو پہ بھی تو کام کیا؟"

"جی جی۔ بالکل۔ سکھوں کے ریڈیو اسٹیشن کے لیے پروگرام کیے اور سکھوں کی پنجابی زبان سیکھ کر میں ان کے لیے پروگرام کرتی تھی اور مجھے بہت مزا آتا تھا۔ ریڈیو پہ شروعات تو میں نے لاہور سے کی' جب میں صرف چھ سال کی تھی۔"

او کے۔ عشنا ان شاءاللہ پھر بات کریں گے۔

رمضان کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن رول

اجزا :

پیٹابریڈ	دوعدد
مرغی	ایک پاؤ
ادرک	ایک درمیانہ ٹکڑا
لہسن	دو سے تین جوے
شملہ مرچ	آدھی
گاجر	آدھی
بند گوبھی	حسب ضرورت
ہرادھنیا	حسب ضرورت
ہری پیاز	دوعدد
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی کھٹائی	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے
تیل	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

پہلے پین میں تیل گرم کریں۔ پھر اس میں ایک درمیانہ ٹکڑا ادرک، دو سے تین جوے لہسن، ابلی مرغی کے باریک ریشے، پیاز، آدھی گاجر، آدھی شملہ مرچ، بند گوبھی، ہرادھنیا، نمک، کٹی لال مرچ، کالی مرچ، پسی کھٹائی آدھا چائے کا چمچہ، پسی لال مرچ ڈال کر نرم کریں۔

اب ایک دوسرے پین کو تیل سے چکنا کرلیں اور دو سلائس پی تا بریڈ کو سینک لیں۔

پھر پیٹا بریڈ پر تیار کیا ہوا آمیزہ رکھ کر رول بنائیں اور گرم تیل میں فرائی کرلیں۔

تیار ہونے پر گرم گرم چکن رول کو کسی بھی چٹنی یا کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

ویجی ٹیبل رول

اجزا :

مانڈا پٹی	آدھا پیکٹ
شملہ مرچ	ایک عدد
گاجر	ایک عدد
گوبھی	ایک چوتھائی ٹکڑا
ہری مرچ	دو سے تین عدد
ہری پیاز	ایک عدد
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
اویسٹر ساس	دو کھانے کے چمچے
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

پہلے ایک عدد شملہ مرچ، ایک عدد گاجر، گوبھی، ہری مرچ اور ایک عدد ہری پیاز کو باریک کاٹ لیں۔

اب پین کو تیل لگا کر چکنا کرلیں۔ پھر اس میں تمام کٹی سبزیاں، دو کھانے کے چمچے سویا ساس اور دو کھانے کے چمچے اویسٹر ساس ڈال کر نرم ہونے تک فرائی کریں۔

پھر اس میں حسب ذائقہ نمک اور ایک چائے کا چمچہ کٹی لال مرچ بھی شامل کرکے کچھ دیر تک مکس کریں اور چولہے سے اتارلیں۔

جب سبزیاں ٹھنڈی ہو جائیں تو مانڈا پٹیوں میں بھر کر رول تیار کر لیں۔
اب پین میں تیل گرم کر کے ویجی ٹیبل رول کو تل لیں۔
گولڈن رنگ آنے پر نکال کر کسی بھی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

گجراتی دہی بڑے

اجزا :

ماش کی دال	آدھا کپ
(ایک گھنٹہ پہلے بھگو دیں)	
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کلو
زیرہ بھنا ہوا	دو چائے کے چمچے
ہری مرچ	دو چائے کے چمچے
ہرا دھنیا	تھوڑا سا باریک کٹا ہوا
مونگ کی دال	آدھا کپ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ثابت لال مرچ	چار عدد
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کوکنگ آئل	دو کپ
کڑی پتا	تھوڑا سا

ترکیب :

دونوں دالوں میں نمک' لال مرچ اور پیاز ڈال کر باریک پیس لیں اور تیل گرم کر کے اس میں چھوٹی چھوٹی پھلکیاں فرائی کر لیں اور پھر انہیں پانی میں ڈال دیں تاکہ نرم ہو جائیں۔ دہی کو ڈونگے میں ڈال کر اس میں کٹی ہوئی ہری مرچ اور کٹی ہوئی لال مرچ' پسا ہوا زیرہ ایک چمچہ' نمک اور ایک کپ پانی ڈال کر پھینٹ لیں۔ اب اس میں پھلکیاں ہاتھ سے دبا کر ڈال دیں اور ایک فرائنگ پین میں دو چمچے آئل لے کر اس میں کڑی پتا' ثابت زیرہ اور ثابت لال مرچ کڑکڑا کر دہی بڑوں پر ڈال دیں۔

سبزی کے سموسے

اجزا :

میدہ	دو پیالی
نمک	حسب ذائقہ
گھی	آدھی پیالی
آلو	دو عدد
مٹر	ایک پیالی
گاجر	دو عدد
پیاز	دو عدد
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کری پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	حسب ذائقہ
پودینہ	حسب ذائقہ
انڈا	ایک عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

آلو' گاجر' پیاز باریک کاٹ لیں۔ ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کر کے پیاز ہلکی سنہری تل لیں۔ اس میں سبزیاں' نمک' ہلدی' لال مرچ اور کری پاؤڈر ڈال کر چند منٹ بھونیں۔ بعد ازاں چولہا بند کر دیں اور آمیزہ ٹھنڈا کر لیں۔ ایک پیالے میں میدہ' نمک اور گھی ڈال کر گوندھ لیں۔ میدے کا پیڑا بنا کر بیل لیں۔ وسط میں سبزی کا آمیزہ ڈال کر چاروں طرف سے بند کر دیں اور تکون یا گول کاٹ لیں۔ انڈا پھینٹ کر ہر سموسے پر معمولی سا لگائیں اور تیز گرم تیل میں سنہری تل لیں۔

امت الصبور

یہ واقعہ 1932ء میں عراق میں پیش آیا

دو جلیل القدر صحابہ کرامؓ

حضرت حذیفہ الیمانیؓ اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ دو انتہائی جلیل القدر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی مقرب صحابہؓ تھے۔ وہ جنگ و امن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ ان دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کتنے ہی غزوات میں جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیا اور اسلام کی سربلندی کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو مدائن کا گورنر مقرر کیا تھا اور وہ حضرت علیؓ کے دور میں بھی وہاں کے گورنر رہے۔ ان کا انتقال مدائن میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ بھی حضرت حذیفہؓ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی قریبی اور جانثار صحابی تھے۔ کئی احادیث بھی ان دو محترم صحابہؓ سے مروی ہیں۔ ان کا انتقال بھی 94 سال کی عمر میں مدائن میں ہوا اور ان کو بھی مدائن ہی میں حضرت حذیفہؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔

شاہ عراق کا خواب

1932ء بمطابق 1351ھ میں عراق کے شاہ فیصل نے خواب دیکھا کہ ایک بزرگ ان سے مخاطب ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

"اے بادشاہ! میں حذیفہ الیمانیؓ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، میرے اور میرے ساتھی صحابی جابر ابن عبداللہؓ کی قبروں کو یہاں سے کسی محفوظ جگہ منتقل کردو کیونکہ میری قبر میں پانی اتر گیا ہے اور برابر میں جابر ابن عبداللہ کے مزار میں بھی نمی در آئی ہے اور جلد ہی اس میں بھی پانی آجائے گا۔ ہماری قبروں کو جلد از جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پر منتقل کردو۔"

شاہ عراق اپنی مصروفیات کی وجہ سے حضرت حذیفہؓ کے خواب میں آنے کا واقعہ بھلا بیٹھے اور امور سلطنت نمٹانے میں مصروف رہے۔ حضرت حذیفہؓ ایک اور رات شاہ عراق کے خواب میں آئے اور اپنی بات یاد دلائی اور مزارات کی منتقلی کی تاکید کی۔ شاہ عراق پھر اس خواب کو یا تو بھلا بیٹھے یا انہوں نے اسے خواب سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی کسی سے اس کا ذکر کیا۔

مفتی اعظم عراق کے خواب میں آنا

تیسری مرتبہ حضرت حذیفہؓ عراق کے مفتی اعظم کے خواب میں آئے اور فرمایا کہ میں دو مرتبہ بادشاہ کو تاکید کرچکا ہوں کہ ہمارے مزارات کو یہاں سے منتقل کردو کیونکہ میری قبر میں پانی آچکا ہے اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی قبر میں بھی نمی آگئی ہے۔ لہذا بادشاہ کو تاکید کریں کہ وہ ہمارے مزار جلد از جلد یہاں سے منتقل کریں۔

مفتی اعظم اور وزیراعظم بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں اس خواب کے بارے میں مطلع کیا۔ بادشاہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ محترم صحابیؓ دو مرتبہ ان کے خواب میں بھی آکر انہیں اس بات سے مطلع کرچکے ہیں، لیکن مصروفیات کی وجہ سے اور اس بات کا ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے کہ واقعی مزارات میں پانی داخل ہوچکا ہے۔ میں نے کوئی کارروائی کرنے سے گریز کیا اور اسے محض خواب سمجھ کر کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔

مزارات کی قریبی زمین کا ارضیاتی تجزیہ

شاہ فیصل، وزیراعظم نوری ال سعید پاشا اور مفتی اعظم عراق کی باہمی مشاورت سے مزارات کے قریب زمین کا ارضیاتی سروے کیا گیا اور اس کے بعد قریبی زمین کی کھدائی کی گئی تاکہ محض خواب کی بنا پر صحابہ کرامؓ کے مزارات کی بے حرمتی نہ ہو۔ چنانچہ محکمہ تعمیرات کے انجینئروں نے مفتی اعظم کے سامنے مزارات سے دریا کے رخ پر 20 فٹ کے فاصلے پر بورنگ کروائی اور اس بورنگ کے نتیجے میں نیچے گہرائی سے نکلنے والی مٹی کو تجربہ گاہ میں تجزیے کے لیے بھیجا گیا۔ رپورٹ کے مطابق اس مٹی میں نمی کا شائبہ تک نہ تھا۔ رپورٹ ملنے کے بعد سب بے فکر ہو گئے۔

حضرت حذیفہؓ کا خواب میں دوبارہ آنا

رپورٹ آنے کے بعد ایک دن بعد ایک رات پھر حضرت حذیفہؓ مفتی اعظم کے خواب میں آئے اور ناراض ہو کر شکایت کی کہ ہماری بات پر توجہ نہیں دی گئی۔ مفتی اعظم نے اس خواب کے بارے میں پھر بادشاہ سے رابطہ کیا جو مفتی اعظم پر سخت ناراض ہوئے کہ وہ خواب کو اہمیت دے رہے ہیں ہم نے اور آپ نے تو ماہرین ارضیات کی مٹی اور بورنگ کی رپورٹ بھی دیکھ لی ہے کہ یہاں زیر زمین نمی کا شائبہ تک نہیں ہے۔

اس مرتبہ مفتی اعظم ڈٹ گئے کہ حضرت حذیفہؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ کا بار بار خواب میں آنا اور اصرار کرنا بلاوجہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہوں نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ مزارات کو یہاں سے منتقل کیا جائے۔ شاہ فیصل نے مفتی اعظم سے کہا کہ وہ مزارات کی یہاں سے منتقلی کے لیے فتویٰ صادر کر دیں۔

مزارات کی منتقلی کا فتویٰ

چنانچہ شاہ عراق، وزیراعظم اور مفتی اعظم کی مشاورت سے مزارات کی قبروں کو کھولنے اور دونوں صحابہ کرامؓ کے اجساد خاکی کو دریائے دجلہ (Tigris) سے دور محفوظ جگہ منتقل کرنے کے بارے میں عراق کے مفتی اعظم سے فتویٰ حاصل کر لیا گیا اور وزیراعظم نوری السعید پاشا نے اخبارات اور ذرائع ابلاغ کو یہ خبر جاری کر دی۔ یہ اعلان کر دیا گیا کہ حج کے فوراً بعد 10 ذی الحج کو نماز ظہر کے بعد محترم صحابہ کرامؓ کی قبروں کو کھول کر ان کے متبرک اجساد خاکی وہاں سے منتقل کر دیا جائے گا چونکہ یہ خبر پوری دنیا میں پھیل چکی تھی اور لاکھوں حجاج حج میں مصروف تھے۔ ان میں سے بہت سے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہزاروں حاجیوں نے شاہ فیصل سے درخواست کی کہ صحابہ کرامؓ کی قبور کشائی کو مزید چند روز کے لیے ملتوی کیا جائے تاکہ حج سے فارغ ہو کر اس روح پرور تقریب کو دیکھ سکیں۔

قبر کشائی موخر کر دی گئی

ہزاروں افراد کے اصرار پر عراق کے شاہ فیصل نے قبر کشائی کی تاریخ 10 ذی الحجہ سے بڑھا کر 20 ذی الحجہ 1351ھ کر دی۔ نماز ظہر کے بعد جب اس قدیم قبرستان کے قریب میدان میں ہزاروں افراد جمع تھے۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندے اور فوٹو گرافر موجود تھے، تاکہ وہ اس واقعے کو قلمبند کر سکیں اور کیمرے میں بند کریں اور فلم بنا سکیں۔ اس واقعے کو دیکھنے کے لیے مسلم اور غیر مسلم بڑی تعداد میں دوسرے ملکوں اور علاقوں سے بغداد پہنچے تھے۔

تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد اور کرینوں کی تنصیب کے بعد قبر کشائی کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ پہلے حضرت حذیفہؓ کی قبر کشائی کی گئی، پھر مٹی اور ملبہ ہٹانے کے بعد کفن میں مقتدر صحابہ کا جسد خاکی اسٹریچر پر رکھا گیا جسے بعد میں کرین کے ذریعے اٹھا کر پہلے سے تیار شدہ شیشے کے تابوت میں رکھا گیا تو سب نے دیکھا کہ قبر میں پانی آ چکا تھا۔ اس اسٹریچر کو جس پر حضرت حذیفہؓ کا جسد خاکی رکھا گیا تھا، اسے بادشاہ، مفتی اعظم اور وزیراعظم چلا کر کرین تک لائے۔

اسی طرح دوسرے صحابی حضرت جابر ابن عبداللہؓ کا کفن لپٹا ہوا جسد خاکی قبر سے اٹھا کر اسٹریچر پر رکھا گیا اور وہاں سے کرین کی مدد سے شفاف شیشے کے تابوت میں لے جایا گیا۔

صحابہ کرامؓ کی نورانی آنکھیں اور پر جلال چہرے

اس کرشماتی اور حیرت انگیز واقعے کو دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد جمع تھے' دونوں صحابہ کرامؓ کی نعشیں بالکل محفوظ تھیں اور کفن بھی پرانے معلوم نہیں ہو رہے تھے اور معجزاتی طور پر دونوں محترم صحابہ کرامؓ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ 1300 سال گزرنے کے بعد بھی صحابہ کرامؓ کے کفن اور داڑھی بالکل سفید تھے اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی کچھ گھنٹے قبل ان صحابہؓ کی وفات ہوئی ہے۔

اگرچہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا وصال 36 ھ میں اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کا وصال 74 ھ میں ہوا تھا جبکہ خواب میں ان صحابہ کرامؓ کا آنا اور قبر کشائی کا واقعہ 1351 ھ ہجری بمطابق 1932 ء میں پیش آیا۔ دونوں صحابہ کے چہرے نور سے چمک رہے تھے اور آنکھوں میں بے انتہا چمک تھی۔

وہاں موجود لوگوں نے صحابہؓ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہیں تو ان پر خوف طاری ہو گیا۔ کوئی ان کی آنکھوں سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین معجزہ تھا جو ہزاروں افراد اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں مقدس اجساد خاکی کو بغداد سے تیس میل دور سلمان پارک لے جایا گیا جہاں پر ایک اور عظیم اور جلیل القدر صحابہ حضرت سلمان فارسیؓ مدفون تھے جن کے مزار کے قریب ان دونوں محترم صحابیوں کو لحد میں اتارا گیا۔

اس معجزاتی واقعے سے سائنس دان' فلسفی' ڈاکٹر' دانش ور اور اہل علم و بصیرت اور اکابرین دین حیرت زدہ رہ گئے اور اللہ کی قدرت کے قائل ہو گئے۔

فوج کی سلامی

جس وقت صحابہ کرامؓ کو نئے مزارات میں منتقل کیا جا رہا تھا' فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں' فوجی بینڈز اور توپوں کی گھن گرج سے گونج رہی تھی اور فضا میں عراقی فضائیہ کے طیارے غوطے لگا لگا کر ان کو سلامی پیش کر رہے تھے۔

یہ محیر العقول واقعہ 1932ء بمطابق 1351 ھ میں رونما ہوا تھا۔ اس واقعے کو دنیا بھر کے اخباروں نے شائع کیا تھا۔ عراقی حکومت نے اس کرشمے کی فلم تیار کی تھی۔ اس فلم کو دیکھ کر بھی بے شمار غیر مسلم' اسلام پر ایمان لے آئے تھے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ دنیا بھر اور ہندوستان کے اخبارات میں بھی اس وقت اس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال چھپا تھا۔

1947ء میں پاکستان بننے کے بعد بھی پاکستانی اخباروں میں اس واقعے کی روداد چھپی تھی۔ اس چشم کشا اور کرشماتی اور روح پرور واقعے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ کی قدرت' انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے اور اللہ اپنے برگزیدہ بندوں اور نبیوں کی ان کے وصال کے بعد بھی نگہداشت کرتا ہے اور ان کے کارنامے رہتی دنیا تک حق و انصاف کا بول بالا کرتے رہیں گے۔

(محمود عالم صدیقی بہ شکریہ۔ جسارت)

موسم گرما میں رمضان المبارک

ماہ رمضان کی پرنور و بابرکت ساعتیں ہم پر سایہ فگن ہیں۔ روزے کا بنیادی مقصد تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ جسمانی نظام و افعال میں بہتری لاتا ہے۔ سحر و افطار میں مناسب مقدار میں متوازن غذا کے استعمال سے ہم روزوں کے بہترین نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ موٹاپے کا شکار خواتین اپنے وزن پر قابو پا سکتی ہیں۔ تاہم اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس ماہ اکثر خواتین کا وزن مزید بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سحر و افطار میں مرغن اور چٹ پٹے کھانوں کا بکثرت استعمال ہے۔ خواتین کی کوشش ہوتی ہے کہ سحر و افطار میں دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے سجا دیے جائیں تاکہ گھر والوں کو روزے کی حالت میں کمزوری محسوس نہ ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مناسب مقدار میں متوازن غذا کا استعمال کیا جائے۔ مرغن اور ثقیل غذائیں استعمال نہ کی جائیں۔ سادہ غذا کے استعمال سے روزے کی حالت میں بدہضمی، سینے کی جلن اور طبیعت بھی بوجھل نہیں ہوتی۔

☆ روزہ کھجور اور پانی سے افطار کرنا چاہیے۔ اس سے جسم کو فوری توانائی حاصل ہوتی ہے کیونکہ کھجور کے ریشوں میں پانی میں فوراً" حل ہو جانے کی خاصیت ہوتی ہے۔ لہٰذا کھجور فوری طور پر جزو بدن ہو کر توانائی فراہم کرتی ہے۔

☆ سحری اور افطار میں دہی کا استعمال جسم کو چاق و چوبند رکھتا ہے۔ اس سے روزے کی حالت میں پیاس بھی نہیں لگتی۔ دہی کے روزانہ استعمال سے ہڈیاں، دانت، مسوڑھے اور ناخن مضبوط رہتے ہیں جبکہ جلد اور بالوں میں رونق اور چمک پیدا ہوتی ہے۔

☆ پھل اور سبزیاں کثرت سے استعمال کریں۔ پھلوں کی چاٹ بنانے کے بجائے ان پر ہلکا سا نمک چھڑک کر کھانا زیادہ مفید ہے۔ سبزیوں کا سلاد بنا کر کھائیں۔

☆ روزے کی حالت میں سارا دن پانی نہ پینے کی وجہ سے جسم پانی کی کمی کا شکار ہو سکتا ہے، چنانچہ افطار اور سحر کے درمیانی اوقات میں پانی زیادہ پئیں۔

☆ جن لوگوں کو روزے کی حالت میں سر درد کی شکایت رہتی ہو، وہ کافی اور کیفین ملے کولا مشروبات کا استعمال یکسر ترک کر دیں۔

☆ سحری میں مناسب مقدار میں نشاستے کا استعمال سارا دن چاق و چوبند رکھتا ہے۔ اس کے حصول کے لیے سحری میں سادہ چپاتی، مکھن، سویاں اور پھل کھائیں۔ چکنائی کا استعمال بالکل ترک نہ کریں کہ جسم کے لیے تھوڑی چکنائی بھی ضروری ہے۔

☆ اکثر خواتین موٹاپے پر قابو پانے کے لیے روزے کی حالت میں ورزش کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح جسم سے زیادہ کیلوریز خارج کر کے فوری نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

☆ تاہم حقیقت اس کے برعکس ہے۔ روزے کی حالت میں ورزش کرنے سے جسم کے خلیات زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ ماہ رمضان میں ورزش کا بہترین وقت تراویح کے بعد یا سحری سے پہلے کا ہے۔ اس دوران کی گئی ورزش جسم کو مناسب حد تک کم کرنے کے ساتھ ساتھ تندرست و توانا بھی رکھتی ہے۔